
دل دریا تن صحرا
رفعت سراج

''امی'' سچ۔امی۔میں آپ کو کبھی دکھ نہیں دوں گی۔میں پڑھائی کے بعد آپ کا ہاتھ بٹاؤں گی۔''

''مجھے قول نہیں عمل پسند ہے۔''اس نے بیٹی کی بانہیں خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''بیٹی کے چہرے پر سایہ سالہرا گیا''وہ بجھی بجھی سی ایک طرف بیٹھ گئی۔

''اور ہاں دیکھو۔حنا ہوم ورک کر چکی۔''اس نے اسی تپتے لہجے میں کہا۔

''بیٹی!وہ کاشف بیٹا روئے چلے جا رہے ہیں''بوا نے فوراً کمرے کے سوگوار ماحول میں کچھ ہلچل سی مچا دی۔

''اچھا۔''!وہ اسی سرد مہری سے جواب دیتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

اس کاشف کو کاٹ سے اٹھایا۔اور کندھے سے لگا کر بہلانے لگی۔مگر۔ریں ریں بند ہونی تھی نہ ہوئی۔

''اللہ۔اللہ''اب اس نے منہ سے بھی کام لیا۔''او اللہ کے بندے چپ بھی ہو جا۔''

اللہ کا بندہ چپ ہونے کے بجائے مزید چیخ چیخ کر رونے لگا۔

''الو کا پٹھا''!اس نے اسے بیڈ پر پٹخ دیا اور شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگی۔

بوا کاشف کے چیخنے پر حواس باختہ سی بھاگی آئیں۔

''بیٹی''!انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

''بوا!''اسے لے جاؤ۔ورنہ میں پیٹ ڈالوں گی اسے۔''

''بچے اس طرح بہلائے جاتے ہیں!یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ وجہ کیا ہے جو روئے جا رہا ہے؟شاید بھوک لگ رہی ہوگی؟اسے کیا خبر پیٹ میں درد نہ ہو رہا ہو۔آپ نے تو حد کر دی۔''

کاشف بوا کی گود میں برابر مچل رہا تھا لیکن وہ نظر انداز کر کے باہر نکل گئی۔

''ہما۔ جاؤ۔ حنا کو بلا لاؤ اور کھانا کھاؤ۔''

''امی۔ حنا نہیں آ رہی وہ کہہ رہی ہے میں ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔''

''اچھا۔''! وہ لاؤنج میں چلی آئی۔ ''چلو حنا! یہ کھانے کا وقت ہے۔''

''امی۔ میں'' پھر وہ اس کی طرف دیکھ کر سہم گئی اور کھڑی ہوگئی۔

''جی۔ اچھا۔ امی!'' وہ اس کی گھورتی آنکھوں سے خوفزدہ ہوکر ٹی وی بند کرنے کھڑی ہوگئی۔

''اور یہ جو تم نے اپنے باپ جیسے طور طریقے اپنا لیے ہیں مجھے قطعی پسند نہیں۔ سمجھیں۔ اگر میری کسی بات پر اگر مگر کیا تو۔ حشر برا کر دوں گی۔ اور اگر کبھی میرے صبر وضبط کا امتحان لینے کی کوشش کی نا؟'' وہ رکی۔ ''تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گی۔'' دونوں سہمی سہمی نوالے حلق سے اتارتی رہیں۔ (بھلا اتنے مکدر ماحول میں بھی کھانا کھایا جاتا ہے)

''ٹھیک سے کھاؤ'' وہ غرائی

''بوا! کاشف نے دودھ پی لیا۔؟''

''ہاں۔ بی بی! پی لیا۔'' بوا روٹھے ہوئے انداز میں بولیں۔ لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔ اور اسے اٹھالیا۔

''بوا! جاؤ تم سو جاؤ۔'' وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔

کاشف کو بٹھا دیا۔ خود بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے کھلونے میں چابی دے کر اس کے پیر کے پاس چھوڑ دیا۔ وہ کھلکھلا کر پیچھے ہٹا تب اس نے اسے بیڈ پر گرا دیا اور خود اس پر جھک کر بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ ''ماشاء اللہ نظر بددور۔'' ماں نے نہال ہوکر پھر چوما تو اس نے اس کے بلاؤز کا گلا تھام لیا۔ اسی وقت کال بیل بجی تو اس نے منہ بنالیا۔ اب یہ کون سا وقت ہے کسی کے گھر آنے کا۔ اس نے ساڑھی کا آنچل سر پر ڈالا۔

اور جو اندر آیا۔ اسے دیکھ کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''تم۔؟؟''

''بچے کہاں ہیں'' وہ سگریٹ منہ سے نکال کر بولا۔

''کہیں بھی ہوں تم کیوں آئے ہو۔؟''

''بے فکر رہو تم سے ملنے نہیں آیا۔''

''پھر اس وقت آنے کی وجہ۔؟''

''اپنے بچوں سے ملنے آیا ہوں۔ تم سے نہیں۔ دن میں اسی لیے نہیں آیا کہ بچوں کے سامنے تم غل مچانے سے باز نہیں آؤ گی۔''

وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ کتنا معصوم بنتا ہے غل میں مچاؤں گی۔؟

''لیکن بچے اس وقت سو رہے ہیں'' وہ سرد مہری سے بولی۔

''میں تم سے اجازت لینے نہیں آیا'' وہ آگے بڑھ گیا۔

وہ سلگ کر رہ گئی۔

''ہما بیٹے۔''! اس نے پکارا۔ وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔

''پپا۔؟ آداب پپا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''کیسے ہیں بیٹے آپ؟''

''ٹھیک ہیں ہم۔ آپ اتنی رات کو۔ اور امی۔؟'' تیرہ سالہ ہما سہم سی رہی تھی۔

''بس بیٹے ہمیں اب ٹائم ملا ہم اب آ گئے۔''

''حنا۔ حنا۔ دیکھو پپا آئے ہیں۔'' ہما نے حنا کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''گڈو۔ کو لاؤ بیٹا۔''

تب وہ پردے کے پاس سے ہٹ کر کمرے میں آ گئی۔ حنا نے پردہ اٹھا کر جھانکا۔

وہ بے نیاز سی بن گئی۔

''امی۔ وہ میں۔ گڈو کو لے جاؤں۔'' وہ ہکلا کر بولی۔

''ہوں۔!''

حنا نے گڈو کے ہاتھ سے کھلونا لیا پھر اسے کندھے سے لگا کر باہر نکل گئی۔

پھر کافی دیر بعد راہداری میں قدموں کی آوازیں ابھریں۔

''پپا۔ آپ پھر آئیں گے نا؟'' حنا کی آواز آئی۔ اس کا لہجہ ملتجی تھا۔

تب وہ باہر نکل آئی۔

''نہیں یہ یہاں نہیں آئیں گے۔ تم لوگوں کو ملنا ہو تو تم خود چلی جایا کرنا۔ اگر تم ان کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو دونوں چلی جاؤ۔ کہیں یہ سمجھ رہے ہوں کہ مجھ پر احسان کر رکھا ہے۔''

''ہاں۔ ہاں چلیں بیٹا۔ ہمارے ساتھ چلیں۔ میں تو آپ لوگوں سے پہلے ہی کہہ رہا تھا''

''سوری پپا۔! حساس بلکہ بے حد حساس سی ہما نے معذرت کی اس قسم کی فضاؤں میں اس طرح کے ماحول میں تو بچے ویسے بھی میچور مائنڈڈ ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتی تھی کہ ماں مزید اندھیروں میں چلی جائے گی جبکہ پاپا جہاں چاہے چراغ جلا سکتے ہیں۔

''آپ کی مرضی بیٹا۔ اچھا۔ پھر''

''پھر کبھی آپ یعنی حسن زیدی یہاں نہیں آئیں گے۔ ورنہ نتائج مزید خراب ہو جائیں گے۔''

''اچھا تمہیں ابھی تک نتیجے کی فکر ہے۔ حیرت ہے۔'' وہ طنز سے بولا۔

''میں اپنے بچوں کی بات کر رہی ہوں۔ میرے اور تمہارے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جس میں ''میں آپ'' کی گنجائش ہو۔''

''تم لوگ جاؤ اپنے اپنے کمروں میں اور کاشف کو میرے کمرے میں لٹا دو۔'' اس نے بچوں کو وہاں سے ہٹانے کے لیے کہا۔

''آپ بھی جا سکتے ہیں۔'' وہ اہانت آمیز لہجے میں بولی۔

''اگر میں تمہیں آج طلاق دے دوں تو یہ سارا کروفر یہیں رکھا رہ جائے گا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔

''یہ کروفر تمہارا مرہون منت نہیں۔ اتنے داغ لگا چکے ہو کہ طلاق نما داغ ان داغوں میں چھپ جائے گا۔ میں تو طالب ہوں'' دو دیتے کیوں نہیں۔ شاید یہ بھی تمہاری کوئی احمقانہ سزا ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے تم سے ہر طرح سے ذہنی تعلق بھی ختم کر لیا ہے۔ میں تمہاری سزا وغیرہ کو محسوس کرنے کی اہلیت کھو چکی ہوں۔ تم میرے کچھ نہیں لگتے۔ مجھے نفرت ہے۔ تم سے سخت نفرت۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں تمہیں مجھ سے محبت ہی کب تھی۔'' وہ طنزیہ مسکرایا۔اور باہر نکل گیا۔

تب وہ اپنے چکراتے سر کو تھامے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''تمہیں مجھ سے محبت کب تھی۔؟ کب تھی؟؟''

''کب۔تھی۔؟''

''کب۔تھی۔؟''

''کمینہ۔بے ایمان۔بے حس۔''

پھر آ گیا۔مجھے ستانے۔رلانے۔نیندوں میں بھی۔خیالوں میں بھی۔

خدایا۔کس مٹی سے اس انسان کا خمیر اٹھا ہے؟

یہ ہر دلعزیز آدمی۔جس نے اپنی بیوی کو اتنے کچوکے دیے ہیں۔کوئی یقین کر سکتا ہے۔جس آدمی کے ساتھ تین دن پرسکون رہنا محال ہو گیا تھا۔میں نے چودہ سال گزارے ہیں۔کیسے؟؟

جب دھڑکنوں کو چھڑنے کے لیے کسی مضراب کی ضرورت ہوئی۔حرارت سانوں میں رچی تپش والے مضراب کی تو چچی اور چچا نے اسے اپنے بیٹے کے لیے مانگ کر کنواری راتوں کے بہلاوے کا سامان کر دیا اب تو مزید راتوں کی تنہائیوں میں خوابوں کی محفلیں سجنے لگیں۔اس نے بار بار دیکھا تھا۔باتیں بھی کی تھیں۔جو اس سے پانی منگا کر ہمیشہ بھول جایا کرتا اور جب وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر گلاس آگے کرتی تو چونکنے کی کامیاب ایکٹنگ کرتا۔اس سے ملنے پر کبھی کوئی اعتراض کر ہی نہیں سکتا تھا۔

وہ اس کا سگا چچازاد تھا۔

پابندی تو جب لگی جب اس کے نام کی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں آ گئی۔وہ البتہ آتا رہا۔پھر بھی کبھی اس نے اپنی جھلک نہ دکھائی۔وہ کبھی نگو سے کہلواتا۔

''ایپا سے کہو آپ کی غزل کل کے ادبی صفحے پر پڑھی بہت شاندار تھی۔''

''ایپا سے کہو کل ریڈیو آل پر پاکستان کالجز مشاعرہ سنا۔دونوں غزلیں بہت پسند آئیں۔''

وہ کیا کہتی۔مسکرا دیتی۔''بہت بہت شکریہ زندگی۔''! خود ہی چپکے سے اپنے آپ سے کہتی۔

پھر وہ سب لوگ کوئٹہ چلے گئے۔مستقل۔ساری روشنیاں پھیکی پڑ گئیں۔آنکھوں کے آگے ہلکے ہلکے پردے رہنے لگے۔اور جب ایم اے مکمل کیا تو اس گھر کے دن بھی پورے ہو گئے۔سارا سارا دن اپنے کپڑے سجاتی رہتی۔جب یہ نیلا جوڑا پہن کر اس کے سامنے آؤں گی۔؟

یہ رائل بلو کامدانی ساڑھی پہنوں گی۔

اس پر موتیے کی کلیوں کی بالیاں پہنوں گی گجرے سجاؤں گی۔تو۔؟

جو جوڑا تیار کرتی جاتی اس کے پہننے کا ٹائم بھی مقرر کرتی جاتی۔

اور پھر۔وہ دن بھی آ گیا جب سرخ انگارہ جوڑا پہن کر وہ وہ گلیاں چھوڑ گئی۔

جہاں چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر رات کو اپنے آپ سے ہونے والی باتوں کی بازگشت تھی۔جہاں کنوارے سپنوں کو اس نے اپنی راتوں کا اپنی نیندوں کا ایندھن دیا تھا۔

لیکن اس نے بازوؤں میں لے کر سارا غم بھلا دیا تھا۔اس نے کہا تھا۔اس کی بند آنکھوں پر پھونک مارتے ہوئے۔

''میری زندگی۔کچھ راز لو میرے۔جان!

مرد عورت کے معاملے میں بہت حساس ہوتا ہے!

وہ جتنا فطین ہوتا ہے اتنی ہی ذہانت سے اپنے لیے عورت کا انتخاب کرتا ہے۔

جب عورت نگاہیں اٹھا کر دیکھتی ہے تو کسی خوبصورت شعر کی طرح زبانی یاد ہو جاتی ہے۔

بھلا لڑکی اور عورت میں یہی فرق ہوتا ہے کہ جب لڑکی یا بچی کسی کو دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں سے پتا چل جاتا ہے کہ اس کے احساس زمانہ شناس نہیں اس کی پلکوں پر جھریوں کا بوجھ نہیں کتنی معصومیت ہوتی ہے۔ایسی معصومیت کسی لڑکی میں مرد کو نظر آئے تو وہ لٹ جاتا ہے۔

''کیوں۔؟ اب تم اسے مرد کا فطری پن کہو۔سپریسی کا احساس کہو یا کچھ اور، مرد چاہتا ہے جب کوئی اس کا بن کر اس کی دنیا میں آئے تو وہ ہی اسے زمانہ سازی سکھائے اور جو کچھ اسے کہے۔بتائے۔سمجھائے تو ساتھی کی آنکھیں حیرانی سے بند ہونا بھول جائیں یا شرما جائیں۔اوروں کی بات تو نہیں کرتا مگر میرے ہاں معصومیت کا معیار یہی ہے۔ابھی تمہاری شاعری میں سطحی پن ہے کیونکہ تم حادثاتی شاعرہ نہیں ہو۔تم فطری طور پر شاعرہ ہو۔جب تم شاعری کرتی ہو تو اپنے تخلیقی جذبے کو تسکین پہنچاتی ہو۔مگر اب تمہیں گرائیاں مل جائیں گی۔ہم دیں گے۔'' وہ اس پر جھکتا ہوا بولا۔وہ شرما گئی۔

اس کے بولوں کے سحر سے نکلی۔پور پور۔مطمئن تھی۔

اسے کتنا گہرا ادمی ملا ہے۔

کتنا حساس ساتھی ملا ہے۔

وہ تو اپنے آپ کو بہت میچوڑ سمجھ دار سمجھتی ہے۔یہ معصوم کہتا ہے۔

بولتا کتنا اچھا ہے۔بھلا اپنا آپ اوروں سے کیوں نہیں منواتا۔لوگوں میں اتنا سوبر کیوں بنا رہتا ہے۔؟

وہ ساتھی تھا۔کہ دو آتشہ شراب۔کہ لوگ صبح کہہ رہے تھے۔

''اتنی سرخ آنکھیں۔'' کسی شوخ نے جملہ کسا۔

''ابھی تک جھوم رہی ہے۔'' ایک اور آواز

''ابھی تک وہیں ہے۔پیاری واپس آ جاؤ۔''

وہ جھینپ گئی۔شرما گئی۔''بے ایمان۔رسوا کر کے رکھ دیا۔''

وہ تو خود لفظوں سے کھیلنے کا گر جانتی تھی۔اس کے لیے تو لفظ نگینے کی حیثیت رکھتے تھے۔

وہ تو اس کی باتوں سے مسحور ہو جاتی۔پاگل ہو جاتی۔اس کی دیوانی ہو گئی۔وہ کمرے سے نکلتا تو پیچھے ہی خود بھی آ جاتی۔ہر قدم پر نظروں سے سلام دیتی۔زیادہ سے زیادہ سامنے رہتی۔جب آفس جانے کے لیے تیار ہوتا تو پور پور التجا کرتی۔رواں رواں پکارتا۔

نہ جاؤ۔

نہ جاؤ۔

یہ چھ گھنٹے۔یہ چھ صدیوں کے برابر لگتے ہیں۔میرا دل نہیں لگتا۔، اس کا دل چاہتا پوچھے۔''یہ چھ گھنٹے تمہارے کیسے گزرتے ہیں؟ کیا تمہارے ہاں میرے جذبوں کی سی تپش نہیں۔؟ تم کتنے آرام سے مسکرا کر گاڑی بڑھا دیتے ہو۔''

مگر وہ چپ رہتی۔ چاہتی ہر جذبے کا اظہار اس طرف سے ہی ہو۔ وہ تو بس سنے۔ سنتی رہے۔ اس کو رخصت کر کے سب سے پہلے اپنے بیڈروم کو ٹھیک کرتی بستر پر دیر تک بیٹھی رہتی۔

پھر کچن میں چلی آتی۔ صفائی کرتی ایک ایک چیز چمکاتی۔ ایک ایک چیز اتار کر برتن دھونے والی کو دیتی جاتی۔ اسے شروع سے عادت تھی۔ کچن پر وہ روزانہ بہت محنت کرتی تھی۔ صفائی پسندی میں جنونیت۔ جب تک چیز اپنی جگہ پر نہیں پہنچ جاتی وہ بے کل ہی رہتی۔ اس کے گھر میں ہر چیز کا ٹھکانہ تھا۔ اپنا اپنا مقام تھا۔ کوئی چیز بے کار نظر نہیں آتی تھی۔

پھر۔ سب کے کمروں کی جانب آتی۔ ثریا کے کمرے میں جاتے ہوئے اسے بہت ڈر لگتا تھا اتنی بری طرح گھورتی کہ وہ سہم سی جاتی۔ شادی کے چند روز بعد جب وہ اس کے کمرے کو ٹھیک کرنے آتی تو اس کے بالوں میں گلاب اور موتیے کے پھول سج رہے تھے۔

تب ثریا نے اتنی بے دردی سے گجرے نوچے کہ تکلیف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے لیکن وہ آرام سے نوچے ہوئے پھولوں کو سونگھ رہی تھی۔

تب وہ بولی تھی۔

''چڑیا۔ اٹھو۔ میں تمہارا بستر ٹھیک کر دوں۔'' تب ثریا نے اسے بازوؤں سے پکڑا اور کمرے سے باہر لے آئی اور اسے راہداری میں کھڑا کر کے دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''حسن۔ مجھے ثریا سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' پھر اس نے ساری روداد گوش گزار کی۔

''ابھی تم اسے اجنبی لگ رہی ہو عادی ہو جاؤ گی۔ تم بھی اور وہ بھی۔''

''آپ اس کا علاج کیوں نہیں کراتے؟''

''کیوں کیا کراچی میں تمہارے سامنے علاج نہیں کرایا؟ بہت جگہ اور بھی کرایا۔ بس اتنا فرق ہے کہ زنجیروں میں نہیں باندھنا پڑتا اور رات کو سب سو جاتے ہیں پہلے اس کی حالت بہت خراب تھی۔ کمرے میں تالا لگا کر رکھنا پڑتا تھا۔''

اور وہ واقعی دکھی ہو گئی۔

''بس تم اس کا خیال رکھا کرو۔ دیکھو اسے دوا وقت پر دے دیا کرو۔ کل سے اسے حرارت اور زکام ہے۔''

''جی بہتر۔'' وہ سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

یہ اس کی سسرالی ذمہ داریوں میں ایک بھاری اضافہ تھا۔

اس کی عادت تھی کہ وہ عشا کی نماز کے بعد ہی ہلکا ہلکا میک اپ کرتی تھی اس کا استقبال صرف کپڑے بدل کر اور بال بنا کر کرتی تھی۔ دھلا دھلا نکھرا چہرہ اسے دیکھ کر اندرونی خوشیوں سے قدرتی طور پر بے پناہ دلکش ہو جاتا۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر وہ بیڈروم میں بیڈ کور اٹھا دیتی۔ ہلکا ہلکا میک اپ کرتی۔ خوشبو لگاتی۔

روشنی ہلکی کر دیتی۔ پھر وہ ڈھیروں باتیں کرتے۔ پھر وہ جب سو جاتا تو آہستہ سے اٹھتی کپڑے تبدیل کرتی سونے کا لباس پہن کر چہرہ صاف کرتی کوئی اچھی سی کولڈ کریم لگا کر کمرے میں اندھیرا کر دیتی کیونکہ حسن کو رات کو کمرے میں ہلکی روشنی بھی بری لگتی تھی۔ شروع شروع میں وہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بہت خوفزدہ ہوئی۔ ایک بار حسن سے کہہ دیا تو لفظوں کے بازی گر نے اسے خوف دور کرنے کی جو راہ بتائی تو وہ جھینپ گئی۔ بے ایمان کہیں کا۔

اور پھر صبح کو وہ بہت جلدی اٹھ جاتی تھی۔ گھر میں جوان نند تھی ایک تو خیر اپنے آپ سے بھی بے گانہ تھی۔ مگر

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی تنہائیوں کی داستان اندھوں کی کتاب کی شکل نہ بن جائے جس پر ہاتھ کی انگلیاں پھیر کر آسانی آنکھیں بند کر کے پڑھا جا سکتا ہے وہ تو اپنی خلوتوں کی کتاب پر بالکل سادہ کور چڑھائے رکھنا چاہتی تھی کہ بس وہ بلا عنوان ہے۔ تم لوگ کھوجی مت بنو مجھے نہ ٹٹولو۔ نہ پڑھو مجھے لیکن یہ تو فطری سی بات ہے کہ جوان نظریں اس دیر سویر کے اٹھنے پر متجسس ہو سکتی ہیں حیا کی بات تو ہے محسوس کرنے والوں کے لیے۔ اور اس طرح وقار بھی قائم نہیں رہتا۔

سو وہ منہ اندھیرے اٹھنے کی عادی تھی۔ باقی افراد اس کے بعد ہی اٹھتے تھے۔ ناشتہ وہ ہی بنایا کرتی تھی۔ نماز و تلاوت سے فارغ ہو کر گیلے اور خوبصورت بالوں میں ڈھیروں پھول سجاتی اور بڑی تر و تازہ سی رہتی جلدی جانے والوں کے لیے فوراً ہی ناشتہ سجا دیتی اور پھر ایک کپ ہاتھ میں تھامے اپنے کمرے میں چلی آتی۔

''سرکار۔! بندی چائے اور نوید صبح کے ساتھ حاضر ہے۔'' کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ جانے لگتی۔

''کہاں جا رہی ہو؟ ابھی تو میں جاگا نہیں ہوں۔'' وہ سینے پر ہاتھ باندھ لیتے لیٹے لیٹے۔

تب وہ کھلکھلا پڑتی۔ ''اچھا ابھی پانی لاتی ہوں چھینٹے مارنے کے لیے۔''

''ادھر تو آؤ۔''

''اوں۔ ہوں۔ کچھ لوگ ناشتے کی میز پر ہیں۔ ثریا کو ناشتہ کرانا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ نکل جاتی اور کمرے میں اپنی مہک چھوڑ کر۔

''اچھا بھابی! خدا حافظ۔'' عالیہ نے ہاتھ ہلایا اور امان کے ساتھ اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔

''امان آتے ہوئے رائٹنگ پیڈ ضرور لے آنا۔ اچھا۔؟''

''بہتر بھابھی۔ لیکن اس چڑیل کو بھی سمجھا دیجئے جانے کہاں کہاں کی الف لیلوی داستانیں اپنی سہیلیوں کو سناتی رہتی ہے۔ میں گیٹ پر احمقوں کی طرح کھڑا رہتا ہوں۔''

''ہاہا۔ ہا۔ ہا'' عالیہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ''جو جیسا ہے اسی طرح تو کھڑا ہوگا۔''

''بد تمیز۔'' وہ ہنس پڑی۔

پھر وہ ثریا کے کمرے میں ٹرے لیے آ جاتی۔

''لو ثریا! ناشتہ کر لو۔''

وہ چپ چاپ اس کے پاس آ بیٹھتی۔ اسے مکھن سے سخت چڑ تھی اور وہ غلطی سے مکھن کی ٹکیہ لے آئی تھی۔ اس نے مکھن کی ٹکیہ فرش پر دے ماری۔

''سوری ثریا۔ اچھا لو چائے پی لو'' اس نے چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامی پھر بجلی کی سی سرعت نے چائے اس پر پھینک دی۔ وہ اس ناگہانی افتاد پر پیچھے ہٹی لیکن چائے گردن اور سینہ جھلسا گئی۔ بے ساختہ ایک چیخ نکل گئی۔

چچی جان اور چچا جان۔ بھاگے ہوئے آئے۔

''اوہو۔ ہو۔ ہو'' چچا جان بدحواس ہو گئے۔ وہ ہونٹ دانت تلے دبا کر گردن پر رکھے ہوئے تھی۔

چچی جان تیزی سے باہر گئیں چونے کا پانی لائیں۔ پھر اسے کمرے سے نکال کر اس کے بیڈروم میں لائیں۔

''شاباش بیٹی! یہاں لیٹ جاؤ۔ کوئی بات نہیں برنال مجھے جلدی میں ملی نہیں ابھی ڈھونڈتی ہوں۔ آپ تماشا دیکھتے رہے اتنی دیر میں تو'' چچا جان بے چارے پہلے ہی پریشان تھے۔

''میں کہاں ڈھونڈوں۔ جاؤ جلدی جاؤ۔''

''اسی وقت حسن باتھ روم کا دروازہ کھول کر سر تولیے سے رگڑتے باہر آئے۔''اوہ کیا ہوا اباجی۔؟''

''ثریا نے چائے پھینک دی چائے بہت گرم تھی۔''

اسی وقت چچی جان برنال کی ٹیوب لے کر آ گئیں۔''جایئے آپ اپنی تیاری کیجئے۔''انہوں نے چچا جان کو ٹالا۔

''اچھا۔''

چچی جان نے دوپٹہ اس کے سرہانے رکھ دیا۔

''امی اچھی طرح لگا دیں۔''ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ خود لگانے بیٹھ جاتے مگر ماں کی موجودگی میں بڑی معیوب سی بات تھی گردن سے نیچے تک سرخی ہی سرخی تھی۔اور وہ اب ٹھنڈک محسوس ہونے پر سکون سا محسوس کر رہی تھی۔

''اچھا،تم لیٹی رہو۔توبہ جلے کی تکلیف۔توبہ توبہ۔اب۔آرام کرو۔کیا کر لیا صبح صبح۔؟وہ ٹیوب میز پر رکھ کر چلی گئیں۔

''شیلی۔تکلیف زیادہ تو نہیں ہو رہی۔؟''

''آپ تیاری کریں میں تو ٹھیک ہوں بس ذرا سی جلن ہو رہی ہے۔آپ کے لیے ناشتہ لاتی ہوں۔''

''جی نہیں شکریہ۔ناشتہ آپ کے حرکت کیے بغیر بھی مل سکتا ہے۔''وہ اسے واپس لٹاتے ہوئے بولے۔

''اور یہ ثریا بگڑی کس بات پر۔؟''

''میں غلطی سے مکھن کی ٹکیہ لے گئی تھی اس لیے اسے غصہ آ گیا۔''

''مجھے افسوس ہے شیلی۔''!

''اور آپ کا یہ اجنبی بن کر افسوس کرنا اس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ۔آخر وہ میری بھی بہن ہے۔اس کا جو غم آپ سب کو ہے وہ ہی غم تو مجھے بھی ہے۔آپ نہیں جانتے مجھ کس قدر دکھ ہوتا ہے۔''

حسن ڈریسنگ روم میں چلے گئے۔تیار ہو کر باہر ڈریسنگ ٹیبل کے قد آدم آئینے میں بال بناتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے۔وہ بھی مسکرا دی۔

''کچھ فرق ہوا جلن میں۔؟''

''وہ تو تعلق گہرے ہونے پر مزید بڑھ رہی ہے کمی کا تو امکان نہیں۔''وہ انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے جبراً مسکرا کر بولی تو وہ اس کی معنی خیز بات پر مسکرا دیے۔

''جب میں آفس جا رہا ہوں تو ایسی پاگل کر دینے والی باتیں نہ کیا کرو۔کسی روز ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔''

''ماشاءاللہ آپ تو پھول برسا کر جا رہے ہیں۔''وہ برا مان کر بولی۔

''اوہ۔''وہ اس کے رخسار کو چھو کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''بھابھی۔بھابھی۔''!عالیہ پکارتی ہوئی آئی اس کے ہمراہ دو اور لڑکیاں تھیں۔

''آداب۔''!

''آداب۔''!

''بھابھی!یہ میری کلاس فیلوز ہیں۔ساجدہ اور نزہت۔آپ سے ملنے آئی ہیں۔''

''اور بھئی،یہ ہماری بھابھی جان ہیں سابقہ شہلا احمد حالیہ شہلا حسن۔''

''میں نے ایک بار اخبار میں آپ کی نظم ''ساجھے دکھ'' پڑھی تھی۔مجھے جو چیز بھی اچھی لگتی ہے اپنی بیاض میں لکھ لیتی ہوں۔میں وہ نظم بہت مرتبہ پڑھ چکی ہوں کچھ آپ کے نام میں بھی کشش ہے۔''

''بہت شکریہ۔آپ لوگ بیٹھیں میں ابھی چائے بنا کر آتی ہوں۔''

''چائے میں بنا لاتی ہوں آپ ان سے باتیں کریں۔''عالیہ باہر نکل گئی۔

''ہم تو سمجھ رہے تھے۔آپ کوئی بہت غمزدہ آنکھوں والی،تنہائی پسند،سنجیدہ سی ہوں گی۔''ساجدہ پھر بولی تو نصرت نے بھی ناقدانہ سی نگاہ ڈالی۔

سرو قد اور گداز بدن پر لپٹی میرون سفید بارڈر والی ساڑھی بڑی بڑی مسکراتی آنکھیں حسین سے ہاتھ۔بات بے بات مسکراتے ہونٹ۔

''اللہ کتنی پیاری بھابی ہے عالیہ کی لیکن۔''

ساڑھی کا پلو کلائی پر آ گرا تو وہ گردن پر چپکے پیلے پیلے دھبوں والے رومال نے چونکا دیا۔

''یہ کیا ہوا بھابھی جان۔؟''

''یہ۔؟اچھا۔وہ چائے گر گئی تھی۔''

''چچ۔چچ۔بہت گرم تھی۔؟''ساجدہ نے سادگی سے اس کی گردن پر نظر جما کر پوچھا۔

''ہوں۔زیادہ نہیں۔''وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اور گھٹنوں پر ہاتھ باندھ کر مسکرا دی۔

نصرت کو ہلکے ہلکے ہلکورے لیتی یہ بظاہر بے نیاز سی لڑکی بہت اچھی لگی۔

''کیسے گر گئی تھی؟''ساجدہ نے پوچھا۔

''بس گر ہی گئی کسی طرح تو۔''اسی وقت عالیہ ٹرالی دھکیلتی اندر آئی۔تو وہ بولی۔

''بہت سوال ہو چکے چائے پر۔اب آپ لوگ چائے پئیں۔''

''چائے پر سوالات؟''عالیہ مسکرائی۔

''بھابھی کی گردن اور سینے پر چائے گر گئی ہے نا تمہیں معلوم نہیں شاید،ورنہ تعارفی کلمات میں اس حادثے کا ذکر بھی ہو جاتا۔''ساجدہ نے شوخی سے کہا۔

وہ کھلکھلا دی۔لیکن عالیہ نے تشویش سے دیکھا۔

''کب گری؟کیسے گری بھابھی۔؟؟''

''ارے بھئی کونسا بڑا حادثہ ہو گیا؟ثریا سے گر گئی تھی۔اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟''

''اوہ۔!''وہ سمجھ گئی کہ گری نہیں پھینکی گئی ہے جانے کیوں وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''ثریا کون عالیہ؟''نصرت نے پوچھا۔وہ پہلی مرتبہ آئی تھیں وہ بھی شہلا احمد سے ملنے کیوں کہ باتوں باتوں میں انہیں پتا چلا تھا شہلا کا۔اور وہ عالیہ کی خاص دوست بھی نہیں تھیں۔

''میری بڑی بہن ہیں ثریا وہ ذہنی مریضہ ہیں۔''عالیہ نے بہن کی حالت کے بارے میں نرم سے نرم استعمال کیا۔

''اوہ۔کب سے۔؟''

عالیہ کی بجائے شہلا نے جواب دیا۔''جب یہ دو سال کی تھیں تو ایک حادثہ ہو گیا تھا۔''

"اوہ۔ چچ چچ۔" نصرت نے افسوس کیا۔

"اب تو سب عادی ہو گئے ہیں۔" عالیہ نے کہا اور گویا جتا دیا کہ وہ ہمدردی نہ کرے۔

پھر وہ لوگ چلی گئیں وہ اور عالیہ انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئیں۔

انہیں شہلا بہت پسند آئی تھی۔ اس بات سے عالیہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

وہ دوپہر کو کھانے سے فارغ ہو کر سو گئی تھی اور پھر کسی نے اٹھایا بھی نہیں کہ آرام کرنے دو۔

عصر کی نماز میں بہت تھوڑا وقت رہ گیا تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ جلدی سے نماز پڑھ کر باہر آئی اور سیدھی کچن میں گھس گئی۔ مغرب کے بعد جب نماز اور کام سے فارغ ہوئی اور پورا گھر برقی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تو اس کا دمساز بھی آ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح پذیرائی کے لیے راہداری میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ مسکرا دیا۔

"آج بہت دیر ہو گئی۔" اس نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ دیکھی۔

"اور کیسی ہو جان۔؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ بریف کیس اس کے ہاتھ سے لیتی ہوئی بولی۔

کوٹ اتارتے ہوئے وہ بولی۔ "چائے کہاں پئیں گے۔" یا کھانا کھا لیں پہلے، اب شام بھی گزر چکی ہے۔"

"امی کہاں ہیں۔؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"چائے وہیں لے آؤ۔ پہلے ان کو سلام بھی کر لوں۔ اور چند باتیں بھی۔ ٹھیک۔؟ کھانا بعد میں۔"

وہ غسل کر کے ماں کے کمرے میں پہنچا تو وہ چائے بھی لے آئی۔

"اب تکلیف تو نہیں ہو رہی۔؟"

"اللہ۔" وہ ہنس دی۔ "چائے ہی تو گری ہے کاسٹک سوڈا تو نہیں۔"!

"آج میں تمہاری طرف سے بہت پریشان رہا۔"

"جب کہ میں بہت فریش رہی۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا آج آپ پریشان نہیں کریں گے۔ آج آمد ہے۔"

"کس کی؟"

"ایک غزل کی"

"ہاں یار! یاد آیا تم نے شادی کے بعد کچھ لکھا نہیں۔"

"یہ ناصر صاحب کون ہیں"

"ادبی صفحے کے انچارج ہیں اب تو انہوں نے اپنا ادبی میگزین نکال لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ رسالے کے لیے کچھ لکھوں۔"

"اچھا ضرور۔"

پنڈی سے چچی جان کی بہن اور ان کے بچے آئے تھے۔ ایک بات اس نے محسوس کی کہ عالیہ بہت خوش ہے۔ اور صمد سے بہت کٹتی ہے۔

"بھابھی! میں آپ کی کالی ساڑھی پہن لوں۔" عالیہ نے پوچھا۔ "آج وہ لوگ سیر کے لیے کہیں جا رہے

ہیں اس سے بھی کہا تھا لیکن اس نے معذرت کر لی کہ حسن صاحب کے بغیر وہ سیر وغیرہ کے لیے نہیں جاتی۔ ہر چند اس کی اس بات پر انہوں نے اسے تنگ کیا تھا۔ ویسے بھی نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے نو بیاہتا جوڑوں میں بہت کشش معلوم ہوتی ہے۔ ان کی ذرا ذرا سی باتوں سے حظ اٹھایا جاتا ہے۔

تب اس نے اپنی کالی ساڑھی پہننے کی اجازت دے دی۔ اس سے قبل کبھی عالیہ نے اس کے کپڑے نہیں پہنے تھے۔ اس کے پاس بہت خوبصورت کپڑے تھے۔ وہ شرارت سے مسکرائی۔

"عالیہ!"

"جی؟"

"ایسا کرو میرا نکاح والا سوٹ پہن لو۔ صمد صاحب خوش ہو جائیں گے۔"

"بھابھی۔" وہ سہم کر، کچھ حیران ہو کر پلٹی اسے بے ساختہ مسکراتے دیکھ کر جھینپ گئی۔

"بھابھی وہ میرے کزن ہیں نا۔؟"

"میں نے کب کہا کہ اٹھائی گیرے ہیں۔ کوئی بات نہیں جانی۔"!

"بھابھی۔"! وہ شرما گئی۔ اور شہلا کے گلے سے لگ گئی۔

"مجھے تو خیال ہی نہیں رہا کہ میری بھابھی حساس فنکار ہے۔ جس کی آنکھیں نہیں کیمرہ ہیں۔"

"اچھا بس جھٹ تیار ہو کر جاؤ کسی کو اختلاج نہ ہونے لگا ہو۔"

تب وہ ہنسی میں اپنی جھینپ مٹاتی چلی گئی۔

اور وہ مسکرا دی۔

"اے آپا! ذرا سی چائے دینا۔"

وہ چونک کر پلٹی۔ ثریا اپنا مخصوص کپ تھامے کھڑی تھی۔

"یہ تمہاری آپا نہیں ہے بھاوج ہے۔ بھابھی جان کہا کرو۔" چچی جان دھنیا صاف کرتے کرتے تنقید بھی کر گئیں۔

"کوئی بات نہیں تایازاد بہن بھی تو ہوں کہہ لیا کرو آپا" اس نے مسکرا کر اس کے تام چینی کے پیالے میں چائے ڈالی۔ روز برتنوں کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اسے یہ پیالہ لا کر دے دیا تھا۔ چائے لے کر وہ باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

کبھی یہ ہوتا کہ چچی جان پاندان کھولے بیٹھی ہیں وہ آ گئی۔

"اے عالیہ کی امی! ذرا سا دینا"

"ہوں۔ اوں۔ تیری بھی تو امی ہوں۔" وہ پور چاٹتی ہوئی سرزنش کر ڈالتیں۔

بس۔ جب اسے ضرورت ہوتی چائے کی تب ہی وہ کسی سے براہ راست مخاطب ہوتی یا چچی جان کے پاس ہر آدھے گھنٹے کے بعد پان چھالیہ کے دانے مانگنے آ جاتی۔ ورنہ کسی سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ بس اپنے آپ ہی منہ ہی منہ میں جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہتی تھی۔ عموماً اسے دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ اور جب دورہ پڑتا۔

ہاتھوں کو تیزی سے ایک دوسرے سے رگڑتی رہتی اور مسلسل کمرے میں تیز تیز چکر لگاتی۔ تب شہلا بہت خوفزدہ ہوتی تھی۔

شاید اسے کہیں سے روپیہ مل گیا تھا۔ جو یقیناً پاندان میں سے ملا ہوگا۔ بس وہ روپیہ لیا اور سڑک پر گزرنے

والے مونگ پھلی والے کو روک لیا۔

''ذرا سی مونگ پھلی دے دو۔'' تقریباً تمام ہی پھیرے والے اسے جانتے تھے۔ اس نے مونگ پھلی دی اور تین چونیاں واپس کر دیں۔ بس پھر تین دن اور مسلسل مونگ پھلیاں لی گئیں اب روپیہ ختم تھا۔

شہلا چیخ پکار کی آواز پر چونکی کاریڈور سے گیٹ کی طرف دیکھا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ نزدیک گئی۔

''کیا ہوا۔؟'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ثریا نے مونگ پھلی والے کو گریبان سے پکڑ لیا تھا۔ اور اس بے چارے کا دھان پان سا وجود لرز رہا تھا۔

''بیگم صاب۔ مجھ سے مونگ پھلی مانگ رہی تھی میں نے غلطی سے کہہ دیا کہ پیسے تو دو بس جی کہہ رہی ہے کہ روپیہ دیا تھا۔ روزانہ تو پیسے دیتی ہوں۔ جی ان پیسوں کی تو میں نے اسے مونگ پھلی دے دی تھی۔''

''اچھا اچھا۔ ثریا چھوڑ دو اسے۔ دے دے گا تمہیں مونگ پھلی۔'' تب اس نے چھوڑا۔ بہت ساری مونگ پھلی لفافے میں ڈلوائی اور اسے دی خود اندر پیسے لینے چلی گئی۔

''اور سنو جو چیز بھی یہ تم سے مانگا کرے دے دیا کرو میں دوں گی تمہیں مونگ پھلی کے پیسے۔'' اس نے کہا تو وہ سر ہلا کر بولا۔

''اچھا جی۔!'' تب وہ اسے اندر لے آئی۔

سب سے زیادہ مشکل کام اسے غسل پر آمادہ کرنا تھا۔

چچی جان ڈانٹ کر غسل خانے میں لے جاتیں۔ بڑی مشکل سے سر دھوتیں۔

وہ اپنی مامتا سے مجبور تھیں اور جب اسے غسل خانے سے لے کر نکلتیں تو ایسا معلوم ہوتا اسے غسل دینے کی بجائے خود غسل لے کر آئی ہوں۔

بعض دفعہ رو پڑتی تھیں اسے کوسنے دینے بیٹھ جاتیں۔ پھر گھنٹوں اداس رہتیں۔ چھوٹی نند سے دو سال سے اس لیے خفا تھیں کہ اس نے مشورہ دے دیا تھا کہ چھوٹی بھابھی ثریا کو پاگل خانے بھجوا دیں۔ تب انہوں نے برافروختہ ہو کر کہا تھا۔

''میں اپنی بچی کا ہر کام خود کرتی ہوں جس دن تم سے کہوں گی اس روز بولنا۔ اللہ کا شکر کرو کہ اس نے تمہیں صحت مند اولاد دی۔ بھلا تمہیں میرے دکھ کا کیا احساس۔''

ایک بات تھی کہ وہ گھر کی دیکھ بھال بالکل لومڑی کی طرح کرتی تھی۔ جو بھی اجنبی چہرہ نظر آتا اسے گھورتی رہتی تھی۔ اس کی بعض باتیں بہت ہنسایا کرتی تھیں۔

ایک بار رات گئے تک گیٹ کے دونوں پٹ کھلے رہے فوراً آئی امی کے کمرے میں۔

''وہ دیکھو ذرا باہر جا کر۔ دربار کھلا پڑا ہے۔! اے دربار کھلا پڑا ہے۔'' وہ اس کے پیچھے چل دیں۔

بس اس روز سے اماں نے یہی بات گرہ میں باندھ لی تھی۔

''یہ تم اتنی سردی میں کہاں سے آ رہے ہو اتنی رات گئے۔؟''

''دربار دیکھنے گیا تھا۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

''ہا۔ ہا۔ ہا۔'' سب ہنس پڑے۔

''شرم کرو۔ بڑی بہن ہے۔ خوب مذاق بناؤ۔ پاگل ہے نا۔'' وہ خفا ہو گئیں۔

''دیکھو مانی! مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ میرے سامنے اس کا مذاق نہ اڑایا کرو۔'' وہ آبدیدہ ہو گئیں۔

وہ شرمندہ ہو گیا۔ ''امی میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

وہ اوندھی لیٹی۔ کتاب پڑھ رہی تھی اسے احساس ہوا کہ کوئی دروازے میں کھڑا ہے وہ فوراً پلٹی۔

''اوہ۔ آؤ ثریا۔'' !وہ آ گئی۔ تمام کمرے میں نظریں گھماتی ہوئی۔ اس کی شادی کی تصویر کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''یہ بھائی ہے۔ یہ دلہن ہے۔ ہے نا؟''

''ہوں۔ !حسن کی اور اپنی یادگار تصویر دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرائی۔''

کچھ دیر وہ کھڑی رہی۔ پھر تصویر اٹھا کر باہر نکل گئی۔

''اوہ۔ سنو۔ ثریا۔ ثریا۔'' وہ اس کے پیچھے لپکی۔ لیکن اس نے کمرے میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

وہ واپس کمرے میں آ گئی۔ کمرہ خالی خالی سا لگ رہا تھا۔

''ارے۔ تصویر کہاں گئی۔؟'' حسن نے برش ہاتھ میں تھام کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

''ثریا لے گئی ہے۔ نیگیٹو دوں گی دوسری بنوا لیجیے گا۔''

''اوہ اچھا اچھا۔!'' وہ پھر بے نیاز ہو گئے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ لوگ بن دیکھے شہلا حسن کے دیوانے ہو گئے۔

کالج کی لڑکیاں اس کے کہے شعر ایک دوسرے کو سناتیں۔

''ہائے اللہ ایسا لگتا ہے ہم سے پوچھ کر لکھتی ہے۔ اللہ میں تو حیران ہو جاتی ہوں۔ کتنی زمانہ شناس ہے۔''

''سنا ہے کل وہ کسی مشاعرے میں آئے گی۔''

''کہاں ہو رہا ہے۔؟''

''ہائے اللہ۔!''

وہ بہت مقبول ہو گئی تھی۔ لہٰذا خط بھی ڈھیروں کے حساب سے آتے۔

ایک صاحب اسے باقاعدگی سے خط لکھا کرتے تھے۔ نواز ملک۔ ہر خط کے آخر میں ضرور لکھتے تھے۔

''اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میں دل برداشتہ ہو جاؤں گا۔ شاید آئندہ خط لکھنے کا حوصلہ نہ ہو۔ مجھے لگتا ہے آپ مغرور ہیں اخبار میں آپ کی تصویر دیکھی تھی۔ اگر وہ خالی کیمرے کا کمال نہیں اور درحقیقت آپ ویسی ہی ہیں تو یقیناً مغرور ہونے میں حق بجانب ہیں آپ۔''

''ہا۔ ہا۔'' وہ ہنس پڑتی۔ خط حسن کے سامنے ڈال دیتی۔ وہ پڑھتے اور کڑوا سا منہ بنا لیتے۔

''بھئی، تم بیگم شہلا حسن لکھا کرو۔ تاکہ تصور میں کوئی بھاری بھرکم سی خاتون آئے۔''

وہ ہنس پڑتی۔ ''آپ جیلس ہو رہے ہیں۔؟''

''فطری بات ہے بھلا میں کیوں چاہوں گا کہ میری بیوی کے تصور سے کوئی دوسرا آدمی اپنی تنہائیاں آباد کرے۔''

''چاہے اس بے چارے کے دماغ میں یہ خیال سرے سے آیا ہی نہ ہو۔''

''اتنا زبان دراز خط لکھا ہے۔ مجھے تو ایک ایک لفظ بھیانک عفریت لگ رہا ہے۔''

''اللہ توبہ۔'' وہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

کراچی میں کل پاکستان مشاعرہ تھا۔ اسے بڑی پرزور دعوت ملی تھی اس کا دل ویسے بھی کراچی جانے کو چاہ رہا تھا۔

''نہ جاؤ۔''

''پلیز حسن۔!''

''بھئی، بڑی بوریت ہوگی۔تمہارے بغیر۔'' وہ مسکرائے۔

''اور پھر تمہاری طبیعت بھی درست نہیں۔کچھ ہوگیا تو۔؟''

''ابھی تو ٹھیک ہوں۔'' وہ جھینپ گئی۔

''اچھا خراب کب ہوگی۔''؟

''اللہ۔'' اسے ڈھیر ساری شرم آ گئی۔

''جانے دیں نا؟''

''بس یار دل نہیں چاہتا۔''

''اللہ حسن۔سچ اس بہانے امی وغیرہ سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔'' وہ ٹھنکی۔

''اچھا ایسا کریں آپ بھی چلیں۔''

''نہیں بھئی۔آج کل تو کسی طور نہیں جا سکتا۔البتہ لینے آ جاؤں گا۔''

''مگر اگلے ہی دن نہیں۔''

دونوں ہنس پڑے۔

سب اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔کوئٹہ کی تازہ اور کھلی آب و ہوا اسے خوب راس آئی تھی۔ پھر خدا۔ اسے زمین پر اعلیٰ مرتبت بنانا چاہا تھا۔وہ روپ اسے مزید دلکش بنا گیا تھا۔سب قابل رشک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

گولڈن شلوار سوٹ ہلکے ہلکے زیور میں وہ جھینپی جھینپی سب سہیلیوں کے جواب دے رہی تھی۔حسن نے پاپا فون کر کے اطلاع کر دی تھی وہ اسے ایئرپورٹ سے لے آئے تھے۔

''حسن کیوں نہیں آئے؟''

''انہیں چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔''

''زبیدہ کے ساتھ آ جاتیں۔'' امی کو اس کا تنہا آنا بہت کھلا تھا۔

''امی چچی جان تو ثریا کی وجہ سے بہت مجبور ہیں اور امان اور عالیہ کالج جاتے ہیں پھر میں باقاعدہ پروگرا کے تحت تو نہیں آئی۔یہاں مشاعرے میں شرکت کرنا تھی ان سب لوگوں کی پرزور دعوت تھی۔''

سب اس کی شہرت و کامیابی سے بہت خوش تھے۔سہیلیاں بہت فخر سے خود سے اس کا تعلق بتاتیں۔

''تم تو شاعرہ لگتی نہیں ہو ویسی ہی ہو بالکل بس خوبصورت زیادہ لگتی ہو۔'' نازیہ نے کمنٹس دیے۔وہ ہنس دی

اگلے روز اس کی آمد کی خبر چھپی اس نے فون پر ناصر صاحب کو اطلاع دے دی تھی۔

ناصر صاحب اور دوسرے لوگ اس سے ملنے آ گئے تھے۔وہ نگو کو چائے کا کہہ کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی گلابی ساری میں اپنا سراپا چھپائے وہ ان سب سے بڑی خوش اخلاقی سے ملی۔

ناصر صاحب کے فوٹوگرافر نے میگزین کے لیے فوراً اس کی تصویر بنائی۔اس نے پھر شکریے کے ساتھ انہیں رخصت کیا۔

مشاعرہ بہت کامیاب رہا تھا اس کی تخلیقات کو بے حد سراہا گیا تھا۔سب نظروں میں ستائش تھی۔وہ بہت

پروقار لگ رہی تھی بے پناہ خوداعتمادی، بے ساختہ مسکراہٹ، سرو قد سراپا، بے حد خوبصورت سجی سنوری آنکھیں، ہر نظر گھوم پھر کر اسی پر آ ٹھہرتی تھی۔

مشاعرے کے اختتام پر بہت سے لوگ ملنے آ گئے۔وہ سب سے مسکرا مسکرا کر ملتی رہی۔لڑکیاں بھی تھیں لڑکے بھی خواتین بھی مرد بھی۔ستائیس اٹھائیس سال کا ایک آدمی اس کی طرف بڑھا۔

ہاتھ بڑھایا۔

''ملک نواز۔''!

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دی بڑھایا ہوا ہاتھ نظر انداز کر دیا۔اور اجازت لے کر چلی آئی۔فرداً فرداً تو بات کرنے سے رہی۔راستے میں وہ تقریب کے بارے میں سوچتی رہی۔اوہ۔ملک نواز۔اسے یاد آ گیا اس کے تو خط آتے رہے ہیں۔اوہو اس بے چارے نے بات بھی نہ کی۔

اسے افسوس سا ہوا۔اتنی ہڑبونگ میں تو ویسے بھی وہ گھبرا رہی تھی۔اسے افسوس سا ہوا بے چارا کس لگن سے آیا ہوگا۔بات کرنے لینے میں کیا حرج تھا۔چلو مغرور ہی سمجھے گا۔

پھر وہ اس پرآشوب شہر سے گھبرا کر اپنے پہاڑی نشیمن پر چلی آئی۔حسن صرف دو دن کے لیے آئے تھے۔ ناصر صاحب کو معلوم ہوا تو وہ حسن سے ملنے چلے آئے۔حسن بھی ان کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے۔

راستے بھر وہ اپنی مصروفیات کے بارے میں بتاتی آئی۔ملک نواز سے ملاقات کی دلچسپ روداد بھی سنائی۔

گھر آئی۔تو سب بہت خوش ہوئے۔رات کو سونے سے پیشتر حسن نے پوچھا۔

''مشاعرے میں کیا پہنا تھا۔؟''

وہ حیران ہوئی کہ پہلے تو کپڑوں میں کبھی دلچسپی نہیں رہی۔

''ساڑھی پہنی تھی۔!''

''کون سی۔''؟

''نیوی بلو سرخ پھولوں والی جو آپ لنڈی کوتل سے لائے تھے۔''

''پھر تو بہت اچھی لگ رہی ہوگی۔''

''پتا نہیں۔'' وہ شرما گئی چاہنے کے باوجود کہہ نہ سکی کہ میرا آئینہ تو آپ ہیں۔

پھر اس نے ڈھیروں باتیں بتائیں۔

''اس کا مطلب ہے بہت مصروف رہیں۔یہ خیال بھی نہ رہا ہوگا کوئی تنہائی کی بھٹی میں جھلس رہا ہوگا۔''

''ایسے ہی۔آپ کے حوالے سے تو مجھ سے باتیں ہوتی تھیں۔''

''سچ۔؟''

''نہیں جھوٹ۔'' وہ اترا گئی۔

''ظالم۔!'' وہ پاگل ہو اٹھا۔

''اوں۔ہوں۔پلیز۔''

دونوں اس وقت تک ایک دوسرے میں کھوئے رہے جب تک نیند رقیب روسیا بن کر نہ آ گئی۔

پھر سفر حیات جاری رہا۔وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ ان لوگوں کو کبھی احساس نہ ہو کہ وہ ایک مشہور شاعرہ ہے

اور گھر سے روگردانی کر رہی ہے۔ پہلے وہ ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتی تھی۔ کبھی کوئی تصور کوئی خوبصورت خیال ستاتا تو ثریا کے کھانے کا ٹائم ہو جاتا۔ خیالوں کی یورش سے گھبرا کر کمرے میں آتی تو چچی جان کے کوئی ملنے والے آ جاتے۔ وہ دل مسوس کر قلم دراز میں ڈال کر اٹھ کھڑی ہوتی۔

کبھی خطوط کے جواب دینے بیٹھتی تو وہ ستمگر فون پر کوئی فرمائش کر دیتا۔

"یہ پکا لینا، وہ بنا لینا گوشت کھانے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا۔"

وہ اندر ہی اندر سے سلگ اٹھتی اور پھر سارے دن کی تھکن نیند بن کر ضدی بچے کی طرح اس کی آنکھوں میں آ بیٹھتی تب ایک کپ چائے کا بنا کر لائبریری میں چلی آتی۔

دو بجے کے قریب اپنے کمرے میں آتی۔ تو وہ تکیوں سے لپٹا غافل سو رہا ہوتا۔ اسے رشک سا آ جاتا۔

"یہ ساری آگ مجھ میں ہی کیوں بھر گئی ہے۔ یہ خیالوں کے قافلے کا پڑاؤ میرے تھکے ذہن میں کیوں پڑتا ہے۔ سونا چاہتی ہوں تو اپنی مرضی سے سو نہیں سکتی۔ اللہ"

اب دو بج رہے ہیں۔ صبح پانچ بجے پھر اٹھنا ہے۔ وہ کپڑے بدل کر تکیے پر سر رکھتی تو چند لمحوں میں خود سے غافل ہو جاتی۔

خدا نے ایک نہایت خوبصورت بیٹی دی تو نئے جذبوں کی گرمی سے وہ مزید دہک اٹھی۔

حسن نے اپنی پسند اور اپنے باپ کی رائے سے بیٹی کا نام ظل ہما رکھا۔ جو سب کو پسند آ گیا۔ سب کے لیے کھلونا ہاتھ آ گیا۔ عالیہ کالج سے آتے ہی کمرے میں آ جاتی۔

"بھابھی۔!" عالیہ اسے پکارتی۔

"کیا ہوا۔؟" وہ بھاگی ہوئی آتی۔

"اللہ بھابھی ہما سوتے میں ہنس رہی تھی بچی بہت پیاری لگ رہی تھی"

"ہوں۔ ماشاء اللہ" وہ مسکرا دیتی۔

پھر وہ انتہا سے زیادہ مصروف ہو گئی کیونکہ اپنا دیوان بھی ترتیب دے رہی تھی۔ اب تو حسن سے بھی اس انداز کی باتیں نہیں ہوتی تھیں۔ وہ جھلا جھلا پڑتا۔

"تم میں بالکل نظم وضبط نہیں ہے۔ میں تو تمہارے ساتھ رات کو ہی ہوتا ہوں۔"

"اللہ" وہ روہانسی ہو جاتی۔ بے حس کہیں کا۔ سارا دن کتنی مصروفیت رہتی ہے چچی جان نے تو بالکل ہی ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ ہاں بس ہما کو سنبھال لیا کرتی تھیں مگر وہ جب روتی تو وہ اس کی گود میں ڈال کر چلی جاتیں۔

اس بے مہر کو تو میرا بالکل احساس نہیں۔

"بس آپ تو یونہی کہہ دیتے ہیں آپ کو کیا پتا۔"

"جی ہاں مجھے کیا پتا! بیگم صاحبہ! شہرت دولت تو آنی جانی چیز ہے گھر بنایئے گھر۔" وہ طنزیہ کہتا۔

"ہائیں تو اتنے سالوں سے کیا جھک مار رہی ہوں۔"

اب اسے خود پر قابو نہ رہتا۔ آنکھیں بھر آتیں۔ "ایک تو تھکن سے چور ہوں۔ اوپر سے" وہ لان میں چلی آتی اور خوب آنسو بہا کر جی ہلکا کرتی۔

"سندیسے" کی رونمائی پر وہ بہت خوش تھی۔ تقریب کراچی میں ہی ہوئی تھی۔ وہ حسن اور ہما کے ہمراہ ہمیشہ کی

طرح میکے کی دیوار کو ہاتھ لگانے آئے تھے۔

تقریب بہت شاندار رہی تھی حسن بھی خوش تھے۔ وہ سرخ ساڑھی میں خوبصورت سی کرسی پر بیٹھی اپنی تعریفیں سن سن کر شرماتی رہی۔

حسن نے بھی اسے ڈھیروں مبارک باد دی تھی۔

"تو دیوی جی! آپ بھی صاحب کتاب ہو گئیں۔"

وہ جواباً مسکرا دی۔

پھر جب وہ گھر آئی تو بہت سے خطوط اس کے منتظر تھے۔

بہت دنوں بعد اس کا خط آیا تھا ہمیشہ کی طرح ناصر صاحب کی معرفت۔

اس کی کتاب کی تعریف تھی۔ کچھ زیادہ ہی۔

مزید لکھا تھا کہ بہت پہلے جب آپ کراچی کے ایک مشاعرے میں ملی تھیں تو آپ نے بہت بری طرح نظر انداز کر دیا تھا۔ مجھے قطعی امید نہ تھی کہ اتنی حساس شاعرہ اتنی کٹھور ہو سکتی ہے۔ پھر مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ شادی شدہ ہیں تو مجھے اس شخص پر بے پناہ رشک آیا جو آپ کی حیات کا مالک بن بیٹھا ہے۔ لیکن اس مشاعرے کے بعد جب گھر آیا تو احساس ہوا کہ نہیں آپ سرد مہر نہیں ہو سکتیں کیونکہ آپ کی وہ پرخلوص اور بے ساختہ مسکراہٹ اس بات کی مظہر تھی کہ آپ درحقیقت مخلص ہیں۔ پھر سوچا کہ آپ کے پاس تو بہت سے اور خطوط آتے ہوں گے۔ بہر کیف آپ فرداً فرداً جواب دینے سے تو رہیں مگر پلیز مجھے تو صرف ایک بار اپنی تحریر سے نواز دیں۔

اس عظیم شاعرہ کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معافی کا طلب گار ہوں۔

وہ پڑھ کر مسکرا دی۔ حسن صاحب کو دکھاؤں گی۔ وہ شرارتاً مسکرائی۔

لیکن وہ بہت دیر میں آیا۔ بہت سنجیدہ تھا اس کی ہمت نہ پڑی اس قسم کا مذاق کرنے کی اور اس کے روزانہ والے ناز اٹھا کر اور ہما کو سلا کر خود بھی سو گئی۔

سخت سردی ہو رہی تھی۔ وہ گرم کپڑوں میں خود کو لپیٹے کچن سے ہما کے کمرے میں جھانکنے چلی آئی لیکن ہما وہاں نہیں تھی۔

سامنے سے عالیہ ڈھیروں دھلے ہوئے کپڑے لیے چلی آ رہی تھی چچی جان پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔

"اوہ۔ اماں کے پاس ہو گی۔"

"اماں۔" ہما کہاں ہے؟"

"پتا نہیں بھابھی۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ باہر آئی تو ثریا کے کمرے سے ہما کے رونے کی آواز آئی۔ وہ تیر کی طرح اس کے کمرے میں گھسی۔

ثریا نے اسے ٹھنڈے فرش پر لٹایا ہوا تھا اور اسے ہاتھ پاؤں مار مار کر روتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ بری طرح برافروختہ ہو گئی۔ خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا اور ہما کو اٹھا کر اپنی شال میں چھپا لیا اسے خاموش کرایا اور گرم کپڑوں میں چھپا کر کچن میں واپس آ گئی۔ عالیہ کچن میں کھڑی گوشت بھون رہی تھی۔

"کہاں ہے بھابھی ہما۔؟"

"ثریا لے گئی تھی۔ اپنے کمرے میں ٹھنڈے فرش پر لٹایا ہوا تھا" باوجود کوشش کے وہ اپنے خراب موڈ پر قابو

نہ پا سکی۔ عالیہ نے بھاوج کو دیکھا اور سر جھکا لیا۔

☆☆☆

رات کو ہما کو بخار چڑھ گیا تو وہ بالکل ہی آؤٹ ہو گئی۔

''اگر کوئی پاگل ہے یا ذہنی مریض ہے تو اسے اس طرح کھلی چھٹی نہیں دینی چاہئے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔'' حسن اس کی تلخ آواز پر حیران ہو کر پلٹے۔ ''کیا ہوا۔؟''

پھر اس نے اسی خراب موڈ میں تمام واقعہ گوش گزار کر دیا۔

''میرے ساتھ جو کچھ ہوتا رہے ٹھیک ہے۔ اب بچوں کو تو تختہ مشق بنانے سے رہی۔''

''آج لڑنے کا موڈ ہے تو۔ بھلا میں کیا کر سکتا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا۔

وہ مزید بھنا گئی۔ ''یہاں تو کسی بات کو لفٹ ہی نہیں دی جاتی۔''

اور پھر جب تک ہما کا بخار نہیں اتر گیا اس کا موڈ خراب ہی رہا۔

ایک اور مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ انہی دنوں۔

چچی کی مرضی تھی کہ عالیہ شہلا کے بھائی صبور کو دیں۔ صبور ہمہ صفت انسان تھے اور ایک مشہور ایئر لائنز کمپنی میں شاندار عہدے پر فائز تھے۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ عالیہ صمد کو بہت پسند کرتی ہے۔ اب اس کی شادی کی باتیں چل نکلی تھیں تو وہ سخت پریشان تھی۔

''بھابھی۔ پلیز کچھ کریں۔''

''بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔''

''اللہ بھابھی ایسے تو نہ کہیں۔'' وہ رو دی۔

''کیا صمد نے کچھ کہا کبھی......؟''

''کچھ......؟ ...... بہت بھابھی۔!'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''تو پھر تم اسے فون کر کے ساری صورت حال بتا دو...... ٹھیک......؟ جب ادھر سے پیغام آئے گا تب ہی کچھ ہو سکے گا...... پھر میں تمہارے بھائی جان سے کہہ دوں گی......''

''بھابھی! میں کیسے کہوں...... آپ تائی اماں کو منع کر دیں نا وہ انکار کر دیں......''

''پاپا کا خط چچا جان کے نام آ چکا ہے...... کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں...... اب اگر میں کچھ کہتی ہوں تو...... تو پھر تمہیں معلوم ہی ہے کہ میرا تمہارا رشتہ کتنا نازک ہے...... حسن، چچا، چچی یہی کہیں گے نا کہ میں تم سے بھاوج والا ازلی بیر رکھتی ہوں اور تمہیں بھابھی بنانا نہیں چاہتی۔ میری بات مانو صمد کو فون کر دو......''

عالیہ سر جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی...... ''ٹھیک ہے بھابھی......!''

پھر واقعی عالیہ کی خالہ جان آ گئیں۔

''باجی! آپ نے تو میکہ بالکل بھلا دیا...... سسرالیوں میں سے بہو تو لے آئیں...... بیٹی بھی وہیں دیں گی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آپ میرے اشارے سمجھ رہی ہیں۔''

''زاہدہ...... پہلی بات تو یہ کہ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ تم نے عالیہ کے لیے کبھی کوئی اشارہ کیا ہو......

تمہارے بھائی کا تو پکا ارادہ ہے عالیہ کو اپنے بھائی کے ہاں دینے کا......'' وہ ہمیشہ کی طرح ٹھوس انداز میں بات کر کے چھالیہ کترنے لگیں۔

''وٹے سٹے کی شادی تو آج کل کرنا ہی نہیں چاہئے...... آپ کو ڈر نہیں آتا...... باجی......؟''

''پہلی بات تو یہ کہ زید اور احمد بھائی، حقیقی بھائی ہیں...... ہمارے تعلقات آپس میں ہمیشہ اچھے رہے ہیں...... اور پھر زید، احمد بھائی کو باپ کا درجہ دیتے ہیں...... تم انہی سے بات کر کے دیکھو۔ میں کہوں گی تو کہیں گے کہ بہن کی حمایت میں بول رہی ہوں...... اس کے بعد جو بھی فیصلہ کریں...... میرے لیے تو صمد اور صبور دونوں ہی برابر ہیں......'' پھر ایک دم چونکیں۔

''اے...... تمہیں فرشتے خبر دینے گئے تھے کہ کراچی سے پیغام آیا ہوا ہے......؟''

''بڑی جلدی خیال آ گیا۔ زاہدہ ہنسیں۔'' عالیہ نے فون کیا تھا صمد کو اور صمد نے مجھے بھیج دیا۔

''اے کیا معموں میں بات کر رہی ہو...... صاف صاف بولو......''

''سمجھ تو خیر گئی ہیں آپ...... اب کیا بولوں...... میری بھی بیٹی ہے عالیہ......''

''ٹھیک ہے تم اپنے دولہا بھائی سے بات کرنا......''

جب تک معاملہ طے نہیں پا گیا ہر شخص بے چین و مضطرب رہا۔

بہر کیف پاپا کے آنے پر بند کمرے میں اجلاس ہوا...... اور معاملہ خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔ وہ پاپا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ان کی تواضع میں لگی رہی...... ان کے آگے پیچھے پھرتی رہی۔

''بابا......! کچھ چاہئے......؟''

''بابا......! یہ تھرمس میں چائے بنا کر رکھ دی ہے...... بابا! تہجد کے لیے اٹھیں گے...... کتنے بجے کا الارم لگا دوں......؟''

''جاؤ بیٹا...... تم بھی آرام کرو...... میں تو بغیر الارم کے اٹھ جاؤں گا۔''

''خدا تمہیں جزائے خیر دے...... خوشیاں دے...... سکھی رہو......'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

''اللہ'' وہ روشنیوں کے منبع سے کتنی دور آ گئی ہے۔ ''بابا......! میں آپ لوگوں کو یاد آتی ہوں؟'' وہ سچ مچ لاڈلی بیٹیوں کے انداز میں بولی تو وہ مسکرا دیے۔

''بیٹا! کوئی اپنی اولاد کو بھلا سکتا ہے...... وہ بھی اتنی فرمانبردار اور قابل بیٹی کو......''

''اللہ'' وہ سرشار ہو گئی۔ بابا نے آج پہلی مرتبہ اس کے منہ پر اسے سراہا تھا۔

''اور بیٹا تم کیسے رہ رہی ہو......؟''

''بابا! میں بہت خوش ہوں...... یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں...... بہت مخلص، بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں۔''

''ثریا کیسے رہتی ہے...... اس کا علاج ہو رہا ہے......؟''

''جی! مجھے ثریا کو دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے...... اس کی وجہ سے سب ہی بہت پریشانی اٹھا رہے ہیں اور پھر......''

''اے تم یہاں بیٹھی ہو...... سارا گھر تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔'' زاہدہ خالہ نے اندر داخل ہو کر کہا۔

''اوہ...... بس اپنے بابا سے باتیں کرنے بیٹھ گئی تھی۔ خیال ہی نہ رہا وقت کا......''

''اچھا بابا...... شب بخیر......''

عالیہ کی شادی کے ہنگاموں میں وہ بالکل ہی کھو کر رہ گئی۔ ہما تو عالیہ کی گود میں بیٹھی رہتی وہ لٹو کی طرح ادھر ادھر چکر لگاتی رہتی۔ بہت سارے مہمان آ گئے تھے۔ ان کے بچے بھی وہ نوکرانی کو لیے کبھی ادھر نظر آتی۔ کبھی ادھر......

''دیکھو......ڈرائنگ روم کے دروازے بند کر دو......''

''ادھر جھاڑو لگا دو......لان چیئرز آم کے درخت کے نیچے لگا دو......''

''مالی بابا......! بچوں کو پھول مت توڑنے دینا......!''

اپنی صفائی پسند طبیعت سے مجبور تھی......اپنا آرام اور چین تج دیا تھا......

کبھی آواز آ رہی ہے۔

''دلہن......! عالیہ کا زیور تو دکھاؤ......''

''دلہن...... پان ختم ہو گئے......''

''دلہن......ٹانکنے والے جوڑے مجھے دے دو......''

''دلہن......دوپہر کو کیا پکے گا......؟'' عالیہ کے ننھیالی رشتہ دار زیادہ تھے......

وہ پیسے لینے کمرے میں آئی......حسن کمرے میں بیڈ کے پاس کھڑے خط پڑھ رہے تھے......

''کس کا خط ہے......؟'' اس نے ان کی پشت پر سے جھانکا۔

''اوہ......'' ملک نواز کا پرانا خط تھا......وہ بے نیازی سے گزر گئی اور سیف کھولنے لگی......

''موصوف دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں......تم ایک مرتبہ خط لکھ کر طبیعت صاف کیوں نہیں کر دیتیں......؟''

''کیا لکھا ہے بے چارے نے......؟ اور پھر میں کوئی فلم ایکٹریس تو نہیں ہوں شاعرہ ہوں۔ بے کار میں کسی کو تلخ خط لکھ کر اپنے شاندار ذہن اور بلند اخلاق کا مظاہرہ کروں......''

''یہی تو میں کہتا ہوں۔ آپ کو اپنی شہرت، اپنی ذات بہت عزیز ہے۔ ایک تسبیح کرنے والا کم ہو جائے گا......''

''دیکھیں پلیز......! میں ویسے ہی بہت پریشان ہوں......آپ پتا نہیں کیا چاہ رہے ہیں؟''

اسے سخت غصہ آ گیا۔ یہ بھی کوئی بات ہے ''آ بیل مجھے مار'' کبھی اس نے تو اتنی سنجیدگی سے کوئی بات سوچی نہیں اور سرتاج صاحب ایویں ہی آؤٹ ہو رہے ہیں......اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

اتنی چاہت سے کپڑے بنائے تھے پہننے کو دل ہی نہ چاہا......حسن یوں ہی بگڑے بگڑے رہے......

کیا شے ہے مرد ذات بھی خود پر اعتماد تو ہے ہی نہیں......وہ روہانسی ہو رہی تھی......

ہما کو کپڑے پہنا کر امان کے حوالے کر دیا اور خود بارات کے انتظام میں لگ گئی......اور لوگوں کے ساتھ۔

''دلہن! تم کپڑے کیوں نہیں بدل رہیں......؟'' عالیہ کی ممانی نے ٹوکا......پرنٹڈ سوٹ و دوپٹہ میں بڑی بکھری بکھری سی لگ رہی تھی......دراز چوٹی کھل چکی تھی......ایک بل ہی باقی رہ گیا تھا۔

''جی بدل لوں گی......'' وہ پلٹی تو حسن ڈھیروں ہار لیے اس کے پیچھے کھڑے تھے۔......وہ بنا دیکھے پلٹ آئی......چچا جان کے لیے چائے دم کر رہی تھی کہ حسن پیچھے آ کھڑے ہوئے......

''ایک کپ میرے لیے بھی بنا دو......'' اس نے پہلے ان کے لیے ایک کپ بنایا اور بڑھا دیا......

''تیار کیوں نہیں ہوئیں......؟''

اس کی آنکھوں سے دو موتی نکل کر رخساروں پر ٹھہر گئے۔

اسے معلوم ہے کہ وہ کس قدر حساس ہے پھر بھی ایسی باتیں کر جاتا ہے جو بھلائے نہیں بھولتیں۔

''اچھا جاؤ......کپڑے بدلو......لوگ کہیں گے کہ بیوی کو کپڑے بھی بنا کر نہیں دیے......''

''بس......لوگوں کی باتوں کا خیال ہے......'' وہ جل کر بولی۔

''آپ کا بھی بہت ہے......آئی ایم سوری شیلی......!''

''پلیز......!''

وہ اپنے کمرے میں چلی آئی......فیروزی غرارہ پہن کر ڈھیروں پھول بالوں میں سجائے۔ جوڑا وہ بہت کم باندھتی تھی۔ اس کا قد بھی خوبصورت تھا اور بال بھی دراز تھے......اس لیے ایک چوٹی بہت جچتی تھی......ڈھیلی چوٹی باندھی اور کھلی......نفیس طلائی سیٹ پہنا......ساتھی چاہنے والا نثار ہونے والا ہو تو سنورنے میں بھی لطف آتا ہے......دل کو اطمینان ہوتا ہے کہ یہ سنورنا بے کار نہیں جائے گا کوئی سراہنے والا موجود ہے......

تیار ہونے کے بعد طلائی چوڑیاں پہن رہی تھی۔ سر جھکائے اور آئینے میں صاف نظر آ رہی تھی......فلش لائٹ پر چونکی......حسن کے ہاتھوں میں کیمرہ تھا۔

''کمال کر دیا یار......!'' وہ اسے کندھوں سے تھام کر مسکرایا......وہ شرما گئی۔

''بس اب یہیں بیٹھی رہو......''

''کیوں جناب......؟''

''یہ بھی کوئی بات ہے......چیز ہماری اور دیکھیں دوسرے......''

''ہاہا......ہا......'' وہ کھلکھلا دی۔

''اچھا......بس بہت ہو چکا......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دراصل تم بگڑ گئی ہو......نخرے اٹھانے والا بے دام جو مل گیا ہے......''

''اللہ......نہیں......گھر میں مہمان بھرے ہوئے ہیں......''

اسی وقت امان، ہما کو تھامے اندر آ گیا۔

''اوہ......آپ یہاں ہیں......میں سمجھا......'' وہ بوکھلا گیا

''آپ کو ابا جان ڈھونڈ رہے تھے......''

وہ کھڑی ہوئی تھی اور وہ بیڈ کے کنارے پر نیم دراز تھا......فوراً اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''اور بھابی......! یہ ہما تنگ کر رہی ہے......'' ہما کی سبز آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''میرے بیٹے کو چچا جان نے مارا ہے......؟ جاؤ بیٹا......! اب پپا کو تنگ کرو......'' وہ اسے انگلی سے پکڑ کر اس کے پاس چھوڑ کر امان کے پیچھے نکل آئی۔

عالیہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

''بھائی، آپ کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑے ہیں......سنبھالیں۔'' اس نے ماحول کی مکدر فضا کو خوشگوار بنانے کی غرض سے شوخی سے صمد سے کہا......لیکن عالیہ سسکیاں بھرتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔

''بھابی......! میری بھابی......!''

''پاگل! اس طرح بھی کوئی روتا ہے......بری بات......'' اب وہ خود کو نہ سنبھال سکی......اور آواز بھرا گئی۔

رخصتی سے فارغ ہو کر وہ لاؤنج میں آئی تو امان سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ اس کا دل دکھ گیا۔

''چندا.....پاگل مت بنو.....اس نے جانا تو تھا ہی.....'' وہ اس کے پاس صوفے پر بیٹھ کر تسلی دینے لگی۔

''میں کہتی تھی نا مت لڑا کرو.....یہ تو پرائی چیز ہے.....''

تب وہ اس کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔

''امان.....! مانی.....! دیکھو اچھے بھائیوں کی طرح مان جاؤ.....ہمیں کتنی دور سے لے کر آئے تھے اور کتنی خوشی سے.....دیکھو یہ سلسلہ تو چلتا رہے گا.....اب تمہاری دلہن بھی لائیں گے تو تم کتنے خوش ہو گے.....اور جو آئے گی اس کا کیا حال ہو گا۔ وہ بھی تو کسی کی بہن ہو گی.....نا؟''

پھر ایک دم بہت سارے لوگ آ گئے تو وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا.....چچی جان کو بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے.....شہلا کی امی برابر سنبھال رہی تھیں۔

''زبیدہ.....! ہوش کرو، بچوں کا کیا حال ہو گا؟.....وہ دیکھو ثریا تمہیں کیسے دیکھ رہی ہے.....''

''ہائے.....بھابھی.....میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے، ایک اپاہج تھی۔ اس کا دکھ کیا کم تھا.....ہائے میری عالیہ.....''

''توبہ.....زبیدہ.....! ایسے بھی کوئی کرتا ہے.....عالیہ تو سسرال کے ہوتے ہوئے بھی میکے میں ہے۔ اپنی خالہ کے گھر تو گئی ہے.....''

''ہائے بھابھی.....! اتنی دور.....ترس جاؤں گی دیکھنے کو.....''

بڑی مشکل سے انہیں سنبھالا۔

''سنو!'' وہ دونوں ہاتھ پیچھے کیے دیوار سے لگی کھڑی تھی کہ حسن نے بلایا۔

''جی.....!''

''کچھ لوگ جا رہے ہیں۔ ذرا چائے وغیرہ کا انتظام کرو.....'' وہ بہت سنجیدہ تھے۔

تب وہ اس پرآشوب ماحول سے نکل آئی۔

کچھ دن اور سرکے.....ہما نے اسکول جانا شروع کر دیا تو.....

حنا چلی آئی.....وہ دوبارہ پھنس گئی۔

ثریا کو بھی دورے پڑنے لگے.....وہ رات بھر چیختی تھی.....

ادھر ناصر صاحب کسی کام سے کوئٹہ آئے تو اس سے ملنے چلے آئے۔ انہوں نے شام کو آنا تھا۔ اس نے حسن کو بتا دیا تھا۔ اس لیے وہ جلدی چلے آئے۔ زرد ساڑھی میں، کھلے بالوں میں بڑی اداس اداس سی لگ رہی تھی۔ حسن کے ساتھ وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ناصر صاحب کے ہمراہ ایک اور نوجوان مرد تھا۔ دونوں نے حسن سے ہاتھ ملائے۔

''ناصر محمود!''

''ملک نواز!''

حسن کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔

یہ ہمارے نائب ایڈیٹر ہیں۔ تین ماہ ہوئے ہیں انہیں ہمارے میگزین میں کام کرتے ہوئے۔ بہت محنتی آدمی ہیں۔ دو دنوں کے لیے آئے ہیں۔ میرا قیام البتہ ایک ہفتے تک رہے گا۔

وہ اسی انداز میں چائے بناتی رہی۔ حسن نے ہی اسے بتایا کہ ہمارے ہاں دوسری بیٹی تولد ہوئی ہے۔

دونوں نے مبارک باد دی۔

''آپ کی بڑی بچی کہاں ہے؟'' ناصر صاحب نے پوچھا۔

''اپنے چچا کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے'' وہ مسکرا کر بولی۔

ملک نواز نے ایک نظر دیکھا.....اور بولا۔

''بیگم صاحبہ! آپ کی کوئی تازہ غزل و نظم نظر سے نہیں گزری؟''

''جی ہاں، میں بہت عرصے سے علیل رہتی چلی آ رہی ہوں۔ اب تو ویسے بھی بچوں کا ساتھ ہے۔''

''اس مشاعرے کے بعد تو شاید آپ نے کسی اور مشاعرے میں شرکت نہیں کی؟''

''کی ہے اس کے بعد بھی.....کوئٹہ میں تو ہوتے ہی بہت کم ہیں۔ البتہ اسلام آباد بھی گئی تھی.....صوبائی سطح پر ہی ہوا تھا وہ مشاعرہ۔''

وہ مزید باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ جس کا اندازہ اس کی حرکتوں سے ہو رہا تھا لیکن اس کا پروقار اور ٹھہرا ہوا لہجہ آنکھوں میں بے پناہ خود اعتمادی، شوہر کی سنگت اسے خاموش رہنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ناصر صاحب، حسن کے ساتھ کراچی اور کوئٹہ کے موسم پر بات چیت کر رہے تھے۔

حسن نے کہا۔

''آج رات کھانا ہمارے ہاں کھائیے۔''

''بہت بہت شکریہ مسٹر حسن!'' انہوں نے بڑی محبت سے معذرت کر لی۔

''کیوں، حرج کیا ہے؟ ناصر صاحب!''

''بس شہلا صاحبہ! کام بہت ہے اور وقت بہت کم۔ امید ہے آپ خیال نہ کریں گی۔''

وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''آپ لوگ کراچی آئیں تو غریب خانے پر تشریف ضرور لائیے گا۔'' ملک نواز نے سر کو اس کے سامنے ہلکا سا خمیدہ کر کے کہا۔

''انشاءاللہ'' حسن خاموش رہے تو اسے بولنا پڑا۔

دونوں انہیں گیٹ تک چھوڑنے آئے۔

حسن نے ناصر صاحب کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ملک نواز سے صرف چھونے کے سے انداز میں۔ اسے ملک نواز کے ساتھ حسن کی بداخلاقی بہت کھلی۔ کیا کرتی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

''بھلا گھر آئے کے ساتھ اتنی بداخلاقی برتنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''کیا بداخلاقی کی میں نے؟ ناصر صاحب تو بہت خوش تھے۔''

''ملک نواز سے تو کوئی بات ہی نہیں کی۔ کیا سوچتا ہو گا۔ آخر مہمان تھا۔''

''میزبانی کے لیے آپ کافی نہیں تھیں؟''

دیکھیں.....مجھے ایسی باتیں پسند نہیں۔ میں لاابالی اٹھکلیاں کرنے والی لڑکی نہیں دو بچوں کی ماں ہوں۔

اسے غصہ آ گیا۔

''بھئی اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟''

”اگر آپ کو میری بداخلاقی پر دکھ ہوا ہے تو میں فون کر کے ان سے معذرت کراوں گا۔“

”آخر آپ میرے شوہر ہیں۔ وہ کیا سوچے گا؟“

”پھر وہی خطرہ کہ شہرت پر آنچ آ جائے گی۔ بھئی، میں نے کبھی یہ خبر مشتہر نہیں کرائی کہ میں بااخلاق ہوں۔ قدرت کی ستم ظریفی کہ شوہر بداخلاق اور بیوی بااخلاق...... چچ...... چچ......“

”پلیز حسن! ایسی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔ آپ تعلیم یافتہ انسان ہیں۔“

”جی ہاں،“ اہل ڈگری ہونے کا گنہگار ہوں۔ آپ کی طرح انسائیکلو پیڈیا نہیں۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

”یہ بعض اوقات آپ کو نجانے کیا ہو جاتا ہے۔ لڑنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔“

”سر پھرا ہوں اس لیے......“

”اللہ......“ وہ قالین پر بیٹھ گئی۔ ”آپ کو میرا ذرا خیال نہیں۔ ایک تو میری طبیعت درست نہیں۔ اس پر آپ“ وہ رونے بیٹھ گئی۔

”اچھا زیادہ فیل مچانے کی ضرورت نہیں ...... ایک بات غور سے سنو...... مجھے اس شخص کی خط و کتابت پر سخت اعتراض ہے...... اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ شخص کبھی میرے گھر میں آئے......“

”لیکن میں اس سے کیونکر یہ سب کہہ سکتی ہوں...... کیا جواز ہے؟...... اور بھی بہت سے لوگ خط لکھتے ہیں۔ ناصر صاحب کے ذریعہ سے کوئی بھی آ سکتا ہے۔ یہ بھی نہیں کہ تمام لکھنے والے مجھ سے ملنے بنفس نفیس آئیں گے۔ آپ کے حوالے سے اگر اس سے کہہ بھی دوں تو یہ سب آپ کی ذہنیت کی اعلیٰ شان کا مظہر ہوگا......“

”یہی تو ہے اپنی قابلیت کا زعم...... اتنا احساس بھی نہ رہا کہ تم شوہر سے بات کر رہی ہو......“

”اور شوہر بھی کسی پتھر سے بات نہیں کر رہا۔ آپ مجھ پر بے اعتمادی کا اظہار کر کے میری توہین کر رہے ہیں۔ جس شخص سے دعا سلام سے زیادہ بات نہ ہوئی...... آپ نے اس کی طرف سے جانے کون کون سے خیالات اپنے دل میں سمو لیے ہیں۔ حد ہو گئی۔“ وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”بھابھی! بھائی جان کہاں ہیں......؟“ امان اندر آ گیا وہ فیڈر تیار کر رہی تھی۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

”پھر کیسے معلوم ہوگا......“

”کہہ جو دیا مجھے نہیں معلوم۔ وہ سرد مہری سے بولی۔“

”ارے معاملہ واقعی گڑبڑ ہے“۔ وہ سامنے آ گیا۔

”میں تو یہی دیکھنے آیا تھا...... ادھر بھائی جان کا بھی موڈ سخت خراب ہے۔ اسی لیے ادھر جائزہ لینے آ گیا تھا۔“

”اچھا...... راستے سے ہٹو۔“ وہ فیڈر ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ بھی ایک ہی تھا۔ پیچھے ہی چلا آیا۔

وہ راہداری میں رک گئی۔

”امان...... ! جاؤ مجھے تنگ نہ کرو......“ اس کا لہجہ اتنا روکھا تھا کہ امان ٹھٹک گیا...... اور پھر سر جھکا کر واپس مڑ گیا...... وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

اپنی خفگی کا اظہار کرنے کے لیے وہ کوچ پر دراز ہو گئی...... نیند کس کم بخت کو آنی تھی۔ حسن نے کمرے میں داخل ہو کر ایک نظر اس پر ڈالی پھر لائٹ بجھائی اور سو گئے...... وہ کچھ دیر اپنی جان جلاتی رہی پھر سو گئی...... خود بھی...... ایک خاموشی تھی جو ٹوٹنے کا نام نہ لے رہی تھی۔

وہ نہایت سنجیدگی سے خفا تھی...... بھلا یہ بھی کوئی بات ہے...... بلا جواز کسی پر شک کرنا...... تنگ نظری ہے۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی عوامی حیثیت کیا ہے...... آخر وہ اس کے متعلق اتنی نیچ بات کیوں کر سوچ لیتا ہے۔ اس نے اس کی خدمت میں کیا کوتاہی کی ہے...... کب اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے...... بیوی نہ ہوئی زرخرید لونڈی ہو گئی۔

اس قدر جلنے کڑھنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ ان لوگوں میں سے تھی۔ جو امن و امان سے رہنا چاہتے ہیں اور خوشی و آسودگی حاصل کرنے کی ہر ممکن سعی کرتے ہیں۔ اپنے سے متعلق ہر فرد کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے خواہ مخواہ کا الجھاؤ یا جھگڑا اعصابی بیماری بن کر ان کی ذات سے چمٹ جاتا ہے...... اس میں انا بھی بہت تھی۔ مگر وہ یہ جانتی تھی کہ بیوی اور ”انا“ میں زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہونا چاہئے۔ ایک ضدی عورت نہ اچھی بیوی بن سکتی ہے نہ اچھی ماں نہ اچھی رشتہ دار...... شوہر تو شوہر ہوتا ہے...... جو عورت سے بہت سی چیزوں کا طالب ہوتا ہے...... محبت...... جان نثاری...... خدمت گزاری...... حتیٰ کہ ماں تا کی سی شفقتیں...... جو عورت یہ سب چیزیں اپنے مرد کو دے دیتی ہے...... وہ اپنا آپ اس کے حوالے اس طرح کر دیتا ہے کہ جیسے اب اس پر اس کا اپنا کوئی حق نہیں...... اور پھر ابھی تو ابتداء ہی تھی۔

وہ جائے نماز پر دعا مانگنے کے بعد بیٹھی مسلسل حسن کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی نیندوں کا کوئی توڑ نظر نہ آ رہا تھا...... وہ اٹھی جائے نماز بغیر تہہ کیے ہاتھوں میں تھامے اس کی طرف چلی آئی اور بیڈ کے کنارے سے ٹک کر اس کے بالوں میں انگلیاں الجھا دیں۔

”حسن......“

حسن نے کسمسا کر کچھ توقف کے بعد آنکھیں کھولیں...... سامنے گلابی دوپٹے کے ہالے میں گلابی مسکراتا چہرہ تھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں...... وہ اس کے چہرے پر جھک آئی......

”ساڑھے چھ بج چکے ہیں...... اٹھ جائیے......“

حسن نے کروٹ لی اور سیدھا ہو گیا...... اور اسے بغور دیکھنے لگا جو صلح کن مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھی...... تب حسن نے اس کے ہاتھ تھام لیے......

”تیرے سارے انداز فنکارانہ ہیں...... اگر تو ہر صبح کو اتنی رنگینیاں دے ناں تو ہر رات تجھ سے لڑ کر سویا کروں۔“

”بس بس...... میرا سارا خون خشک ہو جاتا ہے...... آپ کی ٹھہریں رنگینیاں......“ وہ بناوٹی غصے سے بولی۔

”زندگی...... یہ سارے جھگڑے لڑائیاں...... اس محبت کے ہی تو ہیں...... میں تو سائے کو بھی اپنا رقیب سمجھتا ہوں...... تو کیا ہے...... میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں...... مگر......“

یہ زبان...... اس کی محبت کی زبان تھی...... ”آپ“ مہذبوں کی زبان ہے...... محبتوں کی نہیں...... غیریت کے کبھی نہ طے ہونے والے فاصلے...... ”تم“ اس سے ذرا کم...... مگر ”تو“ جس میں پیاز کی باریک جھلی جتنا فاصلہ بھی نہیں۔ تو...... بس...... من و تو...... اور کچھ بھی نہیں...... کہیں بھی نہیں...... کہ بس میں تو ہوں اور تو میں...... فاصلوں کی...... تکلفات کی پرت بھی نہیں...... سایہ بھی نہیں......

وہ ایسی ہی زبان بولتا تھا...... عالمی کتب کی قاریہ کو اس نے ایسے ہی مٹھی میں نہیں لے لیا تھا۔

ایسے ہی تو اس کی دیوانی نہیں تھی...... سب پڑھا بھول جاتی تھی بس اس کا کہا یاد رکھتی تھی۔

وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ وہ کوٹ پہنا رہی تھی۔ تب وہ شرارت سے اس کی طرف جھکا۔

''میں سوچتا ہوں کاش اتنا بڑا زمین پر اتر جاتا تو کیا اچھا ہوتا...... یہ جتنا عرصہ ''بڑا'' ہونے میں لگ گیا یہ بھی تمہارے ساتھ گزر جاتا......''

''آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری بھی یہی خواہش ہے...... میں تو عام انسانوں کی طرح ہی اپنی عمر کے مدارج طے کرنے کے حق میں ہوں......'' وہ مزید گویا ہوئی۔

''شکر نہیں کرتے کہ اچھا ہوا جو ایسا نہ ہوا...... بھلا کس قدر طویل انتظار ہو جاتا آپ کا...... بحث سنجیدہ ہو چلی تھی۔''

دونوں بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

وہ پورچ سے واپس آ رہی تھی اور امان کالج جانے کے لیے پورچ میں کھڑی اپنی موٹر بائیک کی سمت آ رہا تھا۔ اس نے نہایت سنجیدگی سے بھابھی کو سلام کیا۔ اس سے اس کی خفگی عیاں تھی۔

وہ مسکرا دی...... امان کتابیں رکھ رہا تھا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''ناراض ہو؟'' وہ اس کے چہرے کی سمت جھک آئی۔

''نہیں تو......''

''بنو مت...... اچھا...... ورنہ پٹو گے...... اچھا چلو اپنی بھابھی کا قصور معاف کر دو......''

''بھابھی......!'' وہ شرمندہ ہو گیا۔

وہ اس کی پشت پر ایک دھپ مارتی ہوئی واپس چلی آئی۔

''جبر'' انسان کے ہر زندہ احساس کی موت ہوتی ہے۔

وہ جس ابھرتے احساس پر جبر کرتا ہے...... احساس مر جاتا ہے۔

احساسات کی موت انسان کے اعصاب و قویٰ کو مضمحل کر دیتی ہے۔

وہ جس مزاج کی تھی...... ایک خاص طبع کی مالک...... مگر اس گھر میں آ کر اس نے وہ کام مقدم رکھے جنہیں سب کی تائید حاصل تھی...... جن سے سب خوش ہوتے تھے...... وہ ایک باشعور و سمجھدار لڑکی تھی...... سب کی خوشیوں کو مقدم جاننے والی۔

''ثریا'' اس کے لیے کھلا چیلنج تھی...... جو اسے باطنی بے چینی دینے کے علاوہ جسمانی ایذا دینے سے بھی نہ چوکتی تھی۔ وہ پھر بھی اس کو اپنا عادی بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ یہ سننا نہیں چاہتی تھی کہ گھر والے اسے شہرت کے زعم کا طعنہ دیں۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ ایک لڑکی ہے...... عورت ہے...... جس کا صحیح مقام اس کا گھر ہے...... اس کے بچے ہیں...... اس کا شوہر ہے...... آس پاس کے بہتیرے لوگ ہیں...... اسے بہت کچھ سمجھتے ہیں...... اس سے بہت سی توقعات رکھتے ہیں...... وہ ان آئینوں کی شبیہ بننا چاہتی تھی، خوبصورت قبول نظر شبیہ......

اسی شبیہ کو نکھارنے اور سنوارنے کے لیے وہ کیا کیا جتن نہ کرتی تھی...... اپنی صورت ثریا سے مخو اکر بھی وہ خاموش رہی کہ اس میں کسی دوسرے کا کیا دوش......؟ کسی کا کوئی قصور نہیں......

حسن...... اگر کسی سے رقابت محسوس کرتا ہے تو فقط اس لیے کہ وہ اس کی محبت کا جنونی ہے...... پیاسا ہے پیاسے کو شفاف گلاس میں پانی دیا جائے اور بے دھیانی میں کوئی بھوری کہ کالی چیونٹی اس میں پڑ جائے تو پیاسے کی ذہنی

کوفت کے کیا کہنے...... بھوکے کے آگے کھانا چن دیا جائے...... اور کھانے میں نکل آئے کوئی بال تو کھانے والے کی حالت کی کیا بات ہے...... بس...... وہ جان گئی تھی...... جتنی شدت عمل میں ہو گی اتنی شدت ردعمل میں بھی ہو گی...... اس کی کوشش یہ تھی...... کوئی چیونٹی...... کوئی بال...... درمیان میں نہ آئے۔ جو جتنی توقع کر کے جو شے مانگ رہا ہے...... اسے دے دو...... اسے ناامید نہ کرو...... اس نے کڑے پہرے اپنی ضدوں...... اپنی انا پر بٹھا لیے...... صبر و ضبط کے کڑے پہرے...... بات ہی کچھ نہیں ہوتی...... بات ہی سب کچھ ہوتی ہے۔

حنا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لیے وہ پڑوس کی شادی میں نہ جا سکتی تھی...... ہما البتہ دادی کے ہمراہ چلی گئی تھی۔ پورے گھر میں وہ اور حنا اور دو ملازم تھے۔ یا پھر ثریا......

شب کے آٹھ بجے ہوں گے۔ وہ حنا کو تھپتھپاتے ہوئے خود بھی غنودگی میں کھو گئی تھی کہ حسن نے اسے جگایا۔

''شہلا......!''

''ہوں......؟''

''ثریا...... کہاں ہے......؟''

''اپنے کمرے میں ہو گی......'' اس نے کروٹ بدلی۔

''کمرے ہی میں تو نہیں ہے...... اس لیے تو پوچھ رہا ہوں......''

تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے کو حسن کا سنجیدہ چہرہ دیکھا پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تھوڑی دیر پہلے تو وہ کمرے میں ہی تھی...... میں کھانا دے کر آئی تھی'' وہ پلنگ سے اترتے ہوئے بولی۔

دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے تو چچی جان برآمدے میں بے قراری سے ٹہل رہی تھیں...... حسن کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

''امان اور تمہارے ابا جی دیکھنے گئے ہیں...... خدا معلوم کہاں نکل گئی......'' وہ بہو سے بولیں۔

''بیٹی......! دھیان رکھا ہوتا...... تمہیں تو معلوم تھا کہ......'' جب سے اس نے سسرال میں قدم رکھا تھا۔ پہلی بار ساس کا لہجہ شکایتی ہوا تھا...... اور اتنی سی بات پر وہ گڑ کر رہ گئی تھی۔

''وہ...... دراصل حنا رونے لگی تھی ناں...... میں اسے سلانے اس کے کمرے میں چلی گئی تھی......''

چچی جان خاموش رہیں...... گاڑی ابا جی لے گئے تھے...... موٹر بائیک امان...... حسن پہلے تو ٹہلتے رہے پھر گیٹ سے باہر نکل گئے۔

''یا اللہ......! میری بچی کی حفاظت کرنا...... زمانہ خراب ہے...... خدایا! اس کی حفاظت کرنا......'' چچی جان رونے لگیں...... تو وہ آگے بڑھ آئی...... ساس کے شانے تھام کر بولی......

''آدھ گھنٹہ پہلے تو یہیں تھی...... یہیں ہو گی...... آپ گھبرائیں مت......''

موٹر بائیک کی آواز پر دونوں ساس بہو نے سر اٹھایا...... ثریا۔ امان کے پیچھے تھی...... ماں تھیں کہ بے حال ہو کر آگے بڑھیں۔ سبز آنکھوں والی خوبصورت ثریا نے ماں کا آنسوؤں سے تر چہرہ نہایت بے نیازی سے دیکھا...... ماں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا......

''کم بخت...... کیا میری ہڈیاں پھونکے گی...... کیسا نفسا نفسی کا زمانہ ہے...... نامراد...... کیوں ہمیں روگ لگائے گی...... دیکھنے والے جانیں تو پاگل ہے یا ہوش مند ہے......''

آج ماں کے احساسات پھر شدت سے جاگ اٹھے تھے...... وہ آج کے بہانے سے جانے کیوں اس قدر رو رہی تھیں...... زار و قطار رو رہی تھیں...... امان...... اور وہ انہیں سنبھالنے لگ گئے تھے۔ ثریا اندر چلی گئی تھی۔

جب وہ اندر جانے لگیں تو امان نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''امی...... ! آپ باجی کو کم بخت وغیرہ نہ کہا کریں...... مجھے دکھ ہوتا ہے......''

''امان...... ! کہاں تھی ثریا؟'' اس نے پوچھا۔

''سیخ کباب والے کے ٹھیلے پر بیٹھی تھیں۔'' اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں سب ہی واپس آ گئے۔ جب ابا جی اندر داخل ہوئے، انتہا سے زیادہ شکست خوردہ تھے مگر بہو کے منہ سے یہ سن کر کہ ثریا اندر ہے، انہوں نے ایک طویل اور گہرا سانس سینے سے خارج کر دیا تھا...... حسن بھی بہن کی طرف سے بہت فکرمند تھا۔ اس نے بھی سکون کا سانس بھرا تھا۔

اور......

ادھر وہ مزید محتاط ہو گئی تھی۔

زندگی بہت مصروف ہو کر رہ گئی تھی

ساس سسر کی خدمت......

ثریا کی دیکھ بھال......

حسن کے نخرے......

امان کی شرارتیں......

بچوں کا رونا پیٹنا

اور جو ایسے میں...... عالیہ اور صمد آ جاتے تو ان کے ہنگامے......

نئی غزلیں لکھنا...... بعض غزلوں کو خوشخط کرنا...... بعض قریبی دوستوں کے خطوط کے جواب لکھنا۔ کام وہ سب کرتی تھی...... کوئی نہ چھوڑتی تھی......

یہ کام تھے...... تو ایک کام اور بھی تھا...... اور وہ تھا...... اس دیوانے ملک نواز کی مبہم کلامی پر خون جلانا اخواہ پھونکنا...... پہلے وہ حسن کے سامنے ہر بات اس لیے کر دیا کرتی تھی کہ شوہر کا اعتبار حاصل رہے......

مگر اب محتاط ہو گئی تھی...... مگر اب سمجھ گئی تھی...... کہ ہر بات اس کے سامنے کرنا گویا ناک پکڑنے کے مترادف ہے جو کہیں سے بھی پکڑو بات ایک ہی ہے...... وہ بات کر دے تو وہ مزید بگڑے...... حذف کر جائے تو بہتر ہے...... اس نے اب ان باتوں کو حذف کرنا ہی بہتر جانا کہ وہ اپنے باطن سے مطمئن تھی۔

کہ ویسے بھی اس بے مہر کو ''اصناف گفتگو'' میں ''صنف گلہ'' مرغوب و محبوب تھی کہ بس گلے و شک کا بہانہ چاہیے۔ سو وہ بالکل خاموش ہو چلی تھی۔ اپنے پرستاروں کے متعلق کوئی بات اس سے نہ کرتی تھی۔

پھر ایک روز اس نے شب و روز کے معمولات سے اکتا کر کراچی جانے کا پروگرام بنا لیا۔

''میں نے سوچا ہے کہ ایک ماہ کے لیے کراچی ہو آؤں؟'' رات کو جب حسن سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا۔

تب حسن نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے ریوالونگ اسٹول پر بیٹھی اپنی انٹیلیکچوئل بیوی کو دیکھا۔

''گھر کا کیا ہوگا؟ اب عالیہ بھی نہیں ہے۔ امی کو ثریا کا بھی کرنا پڑتا ہے...... اور بچیاں......''

''بچیاں میرے ساتھ جائیں گی۔ وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ میں انہیں چھوڑ کر دو گھنٹے کے لیے کہیں جاتے ہوئے کتراتی ہوں تو کراچی کیسے جا سکتی ہوں۔''

''ابھی تو ہما کا ایڈمیشن ہوا ہے...... نرسری میں......''

''تو میں کونسا کل ہی روانہ ہو رہی ہوں...... ایک ماہ رہ گیا ہے سرما کی چھٹیوں میں......''

''وہ سب تو ٹھیک ہے...... مگر پھر وہی مسئلہ گھر......''

''تو کیا اب میں ساری زندگی اپنے والدین کی شکل کو ترستی رہوں گی......؟'' اس کا دماغ ضبط کی وجہ سے جھنجھنانے لگا۔

''میں نے یہ کب کہا......؟'' ایسا جگر پھونکنے والا لہجہ تھا۔

''تو پھر کیا مطلب......؟ یہ گھروں کے بکھیڑے تو سدا ہی رہتے ہیں...... رہیں گے...... جس طرح آپ کے والدین ہیں، ویسے ہی چاہنے والے میرے بھی ماں باپ ہیں...... کس طرح خط لکھ لکھ کر بلاتے ہیں۔ میں ہمیشہ ٹال جاتی ہوں۔ کہ گھر کا کیا ہوگا؟ کیا چھ مہینے میں، میں انہیں مل بھی نہیں سکتی...... انہوں نے مجھے رخصت کیا تھا۔ فاتحہ تو نہیں پڑھ لی تھی۔ شادی کے بعد کبھی پانچ دن سے زیادہ نہیں رکی...... سب گلہ کرتے ہیں...... سب سمجھتے ہیں میں بدل گئی ہوں۔''

''بند کرو یہ بکواس...... میری ایک معقول بات کے جواب میں تم سو دلیلیں دینے لگتی ہو...... پتا ہے تم تعلیم یافتہ ہو...... جانتا ہوں کیسا دماغ رکھتی ہو......''

''تو پھر آپ خود ہی سوچیں...... یہ ظلم نہیں کہ میرا جی چاہتا ہے جب بھی جانے کو کہتی ہوں چچی کہتی ہیں ابھی نہ جاؤ۔ ایک ماہ بعد چلی جانا...... آپ سے کہوں تو کہتے ہیں...... گھر......؟ آخر جب میں نہیں تھی۔ اس وقت بھی تو گھر کا نظام چلتا تھا۔ عالیہ کالج جاتی تھی...... سردیوں میں جانے لگوں تو کہتے ہیں گرمیوں میں چلی جانا...... گرمیاں آئیں تو کہتے ہیں وہاں گرمی ہوگی۔ بچیاں پریشان ہوں گی......''

''ٹھیک ہے...... چلی جاؤ...... جب تک جی چاہے رہو...... جب دل بھر جائے چلی آنا...... ایک بات اور سنو تم اپنی دانست میں یہ سمجھتی ہوگی کہ تم عالمانہ دلائل سے گفتگو کر رہی ہو...... محترمہ! میں اسے زبان درازی کہتا ہوں...... بدزبان بیوی، نکھٹو اور جاہل مرد کو بھی بھاری لگتی ہے...... جب کہ میں کچھ حیثیت بھی رکھتا ہوں۔''

اور جیسے اسے کسی نے کچل کر رکھ دیا ہو۔ اتنی ریاضتوں کا صلہ یہی ملنا تھا ''بدزبان بیوی''...... مارے خجالت کے وہ گڑ کر رہ گئی...... آج محسوس ہوا کہ الفاظ کی سنگ باری کیا ہوتی ہے...... بالکل ایسے ہی جیسے کسی جھونپڑی یا کچے مکان میں بیٹھے ہوئے جاہل شخص نے حقے کی نے سے منہ ہٹا کر لڑتی بھڑتی جاہل عورت کو جھاڑ دیا ہو۔

''چپ کر جا کتیا......''

بالکل اسی کے مترادف اسے حسن کی بات محسوس ہوئی تھی۔ وہ باتھ روم میں گھس کر اس ذلت پر دل بھر کر روئی۔ حساسیت تو اس کا اوڑھنا بچھونا تھی...... اسے یہ بات بہت محسوس ہوئی تھی۔ لو بھلا اب شوہر سے ہر قسم کی بات نہیں کریں گے تو کس سے کریں گے۔ میں کون سا اونچی آواز میں بول رہی تھی۔ یہی تو چاہ رہی تھی ناں کہ خوشی سے اجازت مل جائے کافی دیر رونے کے بعد وہ بچیوں کے کمرے میں چلی آئی۔ چار سالہ ہما اور ڈھائی سالہ حنا نہایت گہری نیند میں تھیں۔ اس نے دونوں کو اپنے دائیں بائیں کیا اور خود بیچ میں لیٹ کر سو گئی۔

اس نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ نماز پڑھ کر اس کا بھی شانہ ہلا کر جگایا۔ ہما کو تیار کیا دونوں چچا بھتیجی کو ناشتہ کرایا۔ چچا چچی کا ناشتہ ان کے کمرے میں دے کر آئی۔ ثریا کو اس کے ٹوسٹ اور چائے تھما کر آئی پھر ہمیشہ کی طرح اس کے لیے ناشتہ لائی...... دکھا ہوا دل بار بار آنسو بہانے پر مجبور کر رہا تھا...... ایک تو اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔ دوسرے اس کی پتھریلی بات پر......

وہ بھی چپ تھی......

اور وہ بھی خاموش......

بس یہ ہوا کہ آج وہ پورچ تک نہ گئی تھی۔

وہ آفس سے مغرب کی اذان سے پیشتر ہی لوٹتا تھا مگر آج عشاء کی اذان بھی ہو گئی تھی...... وہ بچیوں کو لباس تبدیل کرا کے انہیں کمرے میں چھوڑ آئی تھی۔

اور بیڈ کی پشت سے ٹکی میگزین دیکھ رہی تھی کہ سبز شال اوڑھے ثریا چلی آئی...... دروازے میں ہی کھڑے ہو کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا...... خالی خالی...... ہر تاثر سے عاری آنکھیں......

بھاوج سے نگاہ ملتے ہی نگاہ ہٹا کر بولی۔ ''بھائی......!''

''بھائی تو ابھی نہیں آئے تمہارے...... آتے ہوں گے...... آ جاؤ بیٹھ جاؤ۔''

وہ اندر چلی آئی...... اور بھاوج کو قطعی نظرانداز کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

کبھی فیس پاؤڈر منہ پر لگایا کبھی حسن کی برل کریم اٹھا کر منہ پر ملی۔ آئی لائنر ناخن پالش سمجھ کر خوب خوب ناخنوں پر لگایا۔

بھاوج خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہی...... اسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی...... عین اسی وقت حسن اندر داخل ہوا۔ بیوی کی بے نیازی اور بہن کی مصروفیت پر بیک وقت نظر پڑی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے ثریا؟'' حسن کا لہجہ کافی تلخ تھا۔

ثریا خوفزدہ سی کھڑی ہو گئی...... ڈریسنگ ٹیبل کا برا حشر سامنے تھا۔

''جاؤ اپنے کمرے میں جاؤ...... اس طرف مت آیا کرو...... کتنی بار کہا ہے......'' بھائی کی آواز کا کھردراپن اس نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ جانے پگلی کو کتنا احساس ہوا کہ بھائی کا ڈانٹا سمجھ گئی۔ بھاوج کی پشت سے لپٹ کر رو پڑی۔

''دلہن...... بھائی...... بھا...... بھا...... بھائی''

(جب وہ دلہن بن کر اس گھر میں آئی تو چچی نے ثریا کو دلہن دکھاتے ہوئے کہا تھا۔ یہ تیرے حسن بھائی کی دلہن ہے۔ بس اس روز سے اگر اس نے کبھی خطاب کیا تھا تو دلہن ہی سے)

اسے ثریا پر ترس آ گیا۔ اس نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے بیڈ پر بٹھا لیا۔ کس چاہ سے بھائی کو پوچھنے آئی تھی۔

''رو کیوں رہی ہو...... بری بات ثریا......! اور تم نے نہانے کے بعد بال نہیں بنائے۔ دیکھو تو کتنے الجھے ہیں...... لاؤ تمہارے بال سلجھا دوں......''

اس نے کوکونٹ آئل اس کے سر میں ڈال کر مساج کیا اور اس کے خوبصورت سنہری بالوں کی ایک چوٹی بنا دی۔ پھر برش سے بال نکال کر اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''جاؤ...... اب جا کر سو جاؤ۔''

تب وہ ابھی باتھ روم سے نکلتے ہوئے حسن کو بچوں کی سی خفگی سے گھورتی ہوئی باہر نکل گئی۔

حسن نے جو ابھی دیکھا تھا۔ اس کے طرز عمل نے انہیں مزید متاثر کیا...... شرمندہ تو وہ رات ہی کو ہو گئے تھے۔ اس کی حقانیت کو رات ہی جانچ گئے تھے...... وہ کھانا گرم کرنے کچن میں چلی آئی باقی سب تو کھا چکے تھے۔

وہ جب کھانے کے ہمراہ اندر داخل ہوئی تو حسن بریف کیس میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اس نے ٹرالی اس کے سامنے روک لی، جب اس نے کافی دیر رخ نہ موڑا تو اسے مجبوراً بولنا پڑا۔

''کھانا کھا لیں......''

''ہوں...... اوں......'' اس نے مصروفیت کے عالم میں کہا تھا۔

پھر اس کے مقابل کھڑے ہو کر ایک لفافہ اسے تھمایا......

''یہ کیا ہے......؟'' وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ تنخواہ کا لفافہ تو ہو نہیں سکتا کہ آج سترہ تھی۔

''کیا ہے اس میں......؟''

''تمہارے اور بچیوں کے ٹکٹ ہیں اگلے ماہ کی چھ تاریخ کے......''

گزشتہ رات کی باتیں یاد آتے ہی اس نے لفافہ اس کی جانب واپس بڑھا دیا...... ''میں نہیں جا رہی......''

''لیکن کل تو......'' وہ بھی کل کو یاد کر کے جھجکا۔

''میں نے آپ سے اجازت مانگی تھی ٹکٹ نہیں...... جس کے جواب میں جواب تک قدر افزائی ہوئی ہے۔ اس کی شکر گزار ہوں...... یہ ٹکٹ وغیرہ تو بہت بعد کی باتیں تھیں......''

''زیادہ اکڑنے کی ضرورت نہیں......'' اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

تب وہ سسک کر اس کے ساتھ لگ گئی۔

''آپ ذرا ذرا سی باتوں پر وہ تیر کی سی باتیں کہہ دیتے ہیں لہولہان کر دیتی ہیں...... مجھے۔ آپ نے مجھے بدزبان کیوں کہا؟ شوہر نہ ہوا بادشاہ ہو گیا کہ جائز بات کہتے ہوئے بھی 'جان کی امان پاؤں' ضرور کہا جائے...... باپ کے برابر ہو گیا کہ ہر جائز ناجائز پھٹکار پر چپ سادھ لی جائے۔ کب میں نے ایسا کیا کہ جائز بات پر آپ سے بحث کی ہو...... آخر میں بھی انسان ہوں...... مجھے بھی اپنے ماں باپ......''

''تب حسن...... اس کی چمکتی مانگ کو دیکھ کر مسکرا دیا...... بات ایسی کوئی بھی نہیں تھی۔ میاں بیوی لڑائی میں جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں...... وہ دراصل فنکار تھی جو عام انسان کی بہ نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے۔''

''دیوانی......'' اس نے اپنے ہونٹوں سے شریک حیات کی پلکوں پر سجے شکوے چن لیے۔

''بس میں نہیں جا رہی......'' نہ اتنی کڑی کہی تھی نہ اٹھائی نہ جھیلنے کی قدرت تھی...... دکھا من، من کے ہی نہ دے رہا تھا اور...... اور پھر آخر منا ہی لیا اسے......

وہ کراچی کیا آئی میکے کی رونق بڑھ گئی...... ملنے جلنے والے آنے لگے۔ اسے دعوت دیے گئے تھے۔ رشتہ دار تو پہلے بھی اچھے ہی تھے مگر یہ فطری سی بات ہے۔ کسی شہرت یافتہ اور مقبول شخصیت سے لوگ اپنا تعلق بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں۔ سچی بات تو یہ تھی کہ سسرال میں تو اس کی حیثیت گھر کی مرغی دال برابر والی تھی۔ ایک عالیہ قدردان تھی سو وہ جا چکی تھی۔ چچی بے چاری بقول ان کے کہ ہمارے زمانے میں تو قرآن پڑھی لڑکی کو بہت پڑھا سمجھ لیا جاتا تھا۔ چچا جان کا مطالعہ صرف اسلامی و تاریخی کتب تک محدود تھا۔

حسن کو کبھی فرصت ملتی تو دوستوں کے دیے ہوئے غیر ملکی میگزین دیکھ لیا کرتا تھا یا وہ ریڈرز ڈائجسٹ منگا لیتی تھی تو وہ پڑھ لیتے تھے۔ گویا خاک میں رلتی تھی۔ اپنی ذات کی انفرادیت کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

دو بزرگ شعراء جو دور طالب علمی میں اس سے بے پناہ شفقت سے پیش آتے تھے۔ وہ بھی اپنے گھر کی دعوت کا کہنے آئے۔ وہ اتنے عظیم لوگوں کے اس طرز عمل سے کس قدر شرمندہ ہو گئی تھی اور اپنی اس قدر افزائی پر خوش ہوئی تھی...... بچیوں کو نانی اور خالاؤں کے سپرد کر کے وہ سب جگہ گئی...... سب کی دعوت قبول کی۔

صبور بھائی کے ہمراہ وہ ناصر صاحب سے ملنے ان کے دفتر چلی آئی۔ وہ بہت خوش ہوئے تھے۔

انہوں نے اپنے نئے ایڈیٹر سے تعارف کرایا۔ پہلے اس سیٹ پر ملک نواز تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا...... ناصر صاحب نے خود بتا دیا کہ بھئی اب ملک نواز ہمارے چیف ایڈیٹر ہیں...... پھر انہوں نے تمام ایڈیٹرز کو اپنے کمرے میں بلوا کر اس کا تعارف کرایا۔

سب سے آخر میں ملک نواز داخل ہوا...... پیازی ساڑھی میں وہ کسی بات پر چھوٹا سا قہقہہ لگاتی اتنی دلکش لگی کہ وہ بری طرح چونک گیا...... خوشی سے اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں۔

''السلام علیکم...... مادام!'' اس نے نہایت وقار سے سلام کر کے اس کا وقار بڑھایا۔

اس نے ملک نواز پر ایک سرسری نظر ڈال کر سر کی جنبش سے جواب دیا۔

وہ شہلا کے سامنے ہی ڈٹ گیا...... قہقہے بکھرنے لگے...... سب ہی لوگ اچھے تھے، صبور بھائی کو ذرا اجنبیت کا احساس نہ ہوا۔

''مسز حسن! کل شام کی چائے آپ میرے ہاں پیجئے۔''

''ملک نواز کی آواز پر وہ چونک سی گئی...... دعوتیں تو سب ہی دے رہے تھے۔ اس نے کوئی نئی بات نہ کی تھی''

''کل تو میں بہت مصروف ہوں...... اور پھر اس تکلف کی ضرورت کیا ہے...... پھر کبھی سہی......''

''آپ جس دن فارغ ہوں گی میں گاڑی بھجوا دوں گا...... بس آپ دن بتا دیجئے۔ بچیوں کو بھی لائیے گا...... صبور صاحب! آپ بھی تشریف لائیں گے تو یہ میرے لیے بہت خوشی کی بات ہو گی......''

جب صبور بھائی اس کے اخلاق سے متاثر ہو کر حامی بھر بیٹھے تو وہ مجبور ہو گئی۔

''ارے بھئی تم واقعی بہت معزز ہو چکی ہو۔'' ناصر بھائی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر ہنس کر چھیڑا۔

''بس ناصر بھائی! ان لوگوں کی مہربانی و محبت ہے، سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب ناصر صاحب کا کمال مہربانی ہے۔ پہلے تو میرے اشعار میں وزن تک نہیں ہوتا تھا مگر ناصر صاحب ان میں وزن کرتے تھے کہ خیال کی بلندی موجود ہے۔ انہوں نے ہی مجھ سے کہہ کر جاری رکھنا۔ اس قدر لکھوا لکھوا کر چھاپا ہے یعنی مجھے غزل یا نظم بھیجے بہت دن ہو جاتے فون کر ڈالتے۔ ورنہ میں شاید لکھتی تو رہتی یعنی شعر کہتی ضرور مگر شاید اس قدر اپنا کلام نہ چھپوا سکتی۔ انہوں نے مجھ میں بلا کا اعتماد پیدا کیا تھا۔'' اس نے خلوص سے ان کی محبت کو سراہا۔

''تو پھر کل چل رہی ہو ناں نواز صاحب کے ہاں......؟''

''ہوں......'' اس نے آہستگی سے کہا۔ ''آپ نے حامی جو بھر لی ہے، جانا ہی پڑے گا۔''

''گویا اگر میں حامی نہ بھرتا تو ہم نہ جاتیں......؟''

''شاید۔'' وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

اس نے ہما کو اپنے ساتھ لے جانے کے خیال سے تیار کیا...... سبز خوبصورت فراک میں سبز آنکھوں کے ہمراہ اس کی بیٹی بہت پیاری لگ رہی تھی......

''ہما کو بھی لے جا رہی ہو......؟'' صبور بھائی نے پوچھا۔

''ہوں...... ظاہر ہے اب میرے بچے میرے ساتھ ہوا کریں گے۔'' وہ ہما کو جوتے پہناتے پہناتے مسکرا کر بولی۔ خود اس نے آف وائٹ ساڑھی پہنی تھی۔ اس کے ہمراہ سیاہ بلاؤز...... گلابی رنگ و روپ کے ہمراہ وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ اتنی کہ استقبال کرتے ہوئے نواز نے اسے دل ہی دل میں سراہا...... وہ بہت خوش تھا۔

اس کے گھر میں سناٹا تھا جو بہت محسوس ہو رہا تھا۔

''ارے آپ بالکل تنہا ہیں......؟'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

''بہت بڑا خاندان ہے میرا۔ دراصل ہم لوگ خالص دیہاتی ہیں...... بس ہم دو چار کزن پڑھ لکھ کر مختلف شہروں میں بکھرے ہوئے ہیں۔''

''آپ کی شادی نہیں ہوئی......؟'' صبور بھائی نے دریافت کیا۔

''فی الحال تو تنہا ہوں......'' وہ سادگی سے مسکرایا۔

''چائے پر بہت اہتمام تھا۔ ناصر صاحب بھی آ گئے تھے۔ خوب رنگ آیا تھا اس مختصر محفل پر۔ ملک نواز بہت خوش تھا۔ ہما کو گود میں اٹھا کر اس نے گہرے جذبوں میں ڈوب کر کہا۔''

''مسز حسن......! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائی ہیں۔''

''ارے بھئی، اب ایسا بھی نہیں ہے۔ بھلا کیا ہوں میں جو آپ اس قدر قدر افزائی کر رہے ہیں۔'' وہ مسکرا دی۔

واپسی میں ملک نواز نے ایک قیمتی ٹوائے کار دی تو وہ بول پڑی۔

''ارے نواز صاحب! یہ آپ کیا تکلیف کر رہے ہیں؟''

''مسز حسن! اس قدر تکلف مت برتیے...... میں آپ کے شایان شان تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ شاید آپ کو احساس نہیں کہ میں کتنا قدر دان ہوں آپ کا......'' اس نے آہستگی سے کہا۔

وہ خاموش سی ہو گئی۔

گھر آئی تو معلوم ہوا کہ حسن کا فون آیا تھا۔

''اپیا! میں نے بتا دیا تھا کہ آپ اپنے کسی ایڈیٹر صاحب کے ہاں چائے پر مدعو ہیں۔ حسن بھائی پوچھنے لگے کیا نام ہے میزبان کا۔ میں نے بتا دیا کہ ملک نواز......''

یہی نام ہے ناں...... ''نگو نے تسلی کرنے والے انداز میں پوچھا۔

''ہوں......'' جانے کیوں اس کا دل دھڑک گیا۔

گر کبھی کسی رشتہ دار کے ہاں مدعو ہوتی تو شاید حسن کبھی نام نہ پوچھتا...... وہ اتنی معمولی باتوں کو توجہ دینے والا نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسی لمحے گھر میں مہمان آ گئے تو وہ چند لمحوں کو بھول بھال سی گئی۔

مہمانوں کے جانے کے بعد وہ امی اور نگو کے ساتھ کام سمیٹنے میں لگی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

نگو نے ریسیور اٹھایا۔ پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر بلند آواز سے بولی۔

''اپیا! حسن بھائی کا فون ہے......'' وہ تیزی سے فون کی طرف آئی۔

''خیریت تو ہے...... دوسری مرتبہ فون کیا ہے ان آٹھ گھنٹوں میں......'' نگو شرارت سے مسکرائی۔ مگر وہ فون پر متوجہ ہو چکی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے بہت پیار سے کہا۔

''وعلیکم السلام...... بھئی...... کیسی ہو؟''

''بہت اچھی...... بچیوں کا بھی بہت دل لگ رہا ہے۔''

''مزید کب تک دل لگانے کا ارادہ ہے؟''

''جی......؟''

''بھئی، واپسی کب ہوگی؟''

''ایک ہفتہ ہی تو ہوا ہے ابھی...... دس پندرہ دن مزید لگ جائیں گے۔ 23 تاریخ کو ''انعام جلالی'' صاحب کی کتاب کی یعنی شعری مجموعے کی رونمائی ہے۔ وہاں مضمون بھی پڑھنا ہے۔ بہت اصرار و تاکید سے مدعو ہوں۔ 23 کے بعد ہی واپسی ممکن ہے۔''

''گویا بہت مصروف ہو۔''

''جی...... مگر اتنی بھی نہیں کہ آپ یاد نہ آئیں۔'' اس کے سرد ردیے پر اس نے اپنی جانب سے خوش کن فضا پیدا کرنا چاہی۔

''تم زیادہ بہتر جانتی ہو......''

''کیوں کیا آپ کو یقین نہیں آیا......''

''یقین......؟...... آ گیا بھئی...... آج شام چار بجے میں نے تمہیں فون کیا تھا......''

''بتایا تھا نگو نے...... وہ میں ایک جگہ چائے پر مدعو تھی۔ ان کا گھر یہاں سے بہت فاصلے پر ہے۔ اسی لیے جلدی نکل گئے تھے۔ ہما اور صبور بھائی ہمراہ تھے......''

''کس کے ہاں مدعو تھیں......؟''

''ملک نواز کے ہاں...... آپ کو بہت پوچھ رہا تھا...... پیچھے ہی پڑ گئے تھے محترم...... لہٰذا صبور بھائی نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی......''

''صبور بھائی نے......؟ اچھا......'' وہ ہنسا

''جب نواز سے ملاقات ہوئی تو بھائی جان میرے ساتھ تھے۔ کنوینس پرابلم بھائی جان سے ہی تو حل ہوتی ہے۔ اس نے صبوز بھائی کو بھی دعوت دی تھی......''

''اچھا......! ویسے بہت وضاحتیں کر رہی ہو...... حالانکہ ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں......''

''آپ ملک نواز کا خاص نوٹس لیتے ہیں ناں......'' اس نے ہلکی سے خفگی سے کہا۔

''کیوں بھئی...... میں کیوں نوٹس لینے لگا...... پرستار تمہارا ہے...... میرا تو نہیں......''

''پرستار تو نہیں شاید قدردان......'' وہ دھیمے سے بولی۔

''شہلا......!''

''جی......''

تم جانتی ہو میں اس شخص کے عاجزانہ اور نیم عاشقانہ خطوط بھی برداشت نہیں کرتا...... میرے اور تمہارے درمیان اگر تلخ کلامی ہوئی ہے تو صرف اس شخص کی وجہ سے......

تمہیں اس کی کوئی دعوت قبول کرتے ہوئے...... مجھے اور میرے اس کے بارے میں خیالات کو مدنظر رکھنا چاہئے تھا...... مجھے اپنی باتیں دہرانا پسند نہیں......''

''مجھے پتا ہے حسن......! مگر وہ بے ضرر سا سیدھا سادہ شخص ہے...... اور پھر میری سماجی حیثیت کے سبب کوئی بھی مجھے خلوص سے مل سکتا ہے، میں شادی شدہ بال بچوں والی عورت ہوں...... مجھے آپ کے اس طرز عمل سے تکلیف ہوتی ہے۔''

''بہرحال میں نے اس معمولی سی بات کے لیے فون کیا تھا......'' اس نے فون رکھ دیا۔

اور وہ ریسیور ہاتھ میں تھامے گم صم کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆

اس کے دل نے سکڑ کر سمٹ کر ایک خدشہ ظاہر کیا تھا۔ ہولے ہولے اندر عجیب سا سہم جاگا تھا وہ خواب جانا ہی چاہتی تھی۔ گھر اور گھر والا بہت شدت سے یاد آ رہا تھا۔

اسے معلوم تھا وہ بے مہر نہیں ہے سارا جھگڑا ان شدتوں ہی کا تو ہے۔

میکے آ کر بچوں کو تھپک کر سلاتے ہوئے اسے اپنے اس جزو بدن کا بارہا خیال آتا تھا۔

اس نے فوراً ہی صبور بھائی کو سیٹیں ریزرو کرانے کا کہہ دیا اور گھر اپنی واپسی کا فون کر دیا اور تیاریوں میں مصروف ہو گئی گھر والوں نے بڑی اداسیوں اور چاہتوں کے ہمراہ رخصت کیا تھا۔

اسے معلوم تھا وہ ایئرپورٹ پر بے تاب کھڑا ہوگا۔ وہ بھی بھول جائے گی کہ وہ پرانی شادی شدہ ہے۔ شوہر شدتیں آنکھوں میں لے کر کھڑا ہو تو بیوی محبوبہ بن جاتی ہے۔ اسے معلوم تھا مہینوں کا عرصہ اس میں پھر سے نیا حجاب برپا کر دے گا وہ پھر سے شرم محسوس کرے گی ناراض ہوگا تو منا لے گی۔

ایئرپورٹ سے باہر تو سارے جذبے وہیں دفن ہو گئے۔ وہاں اکیلا مانی کھڑا تھا وہ مرجھا سی گئی مانی نے اسے سلام کر کے ہما کو گود میں اٹھا لیا۔

''ارے میری چڑیا۔ کیسی ہے تو۔ اور بھابھی۔ کیا حال ہے۔؟''

''ٹھیک ہوں۔ وہ کہاں ہیں۔؟''

''وہ۔ جہاں ہیں خیریت سے ہیں ان ہی کے کہنے پر حاضر ہوا ہوں وہ میٹنگ میں مصروف تھے۔'' مانی نے ہما کو گود سے اتار کر سامان ڈگی میں رکھنا شروع کیا۔

اس نے بچیوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔

مانی بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ تمام راستے اپنی مخصوص شرارتوں سے اسے محظوظ کرتا رہا مگر اس کا ذہن کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔

گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تو آلوچے توڑ کر کھاتی ثریا اندر بھاگ گئی۔

''آپا دلہن آ گئی۔ دلہن آ گئی۔''

چچی جان پشتم پشتم باہر آئیں جھٹ پوتیوں کو پیار کیا۔اس کے سلام کا جواب دے کر دعا دی۔خیر خیریت پوچھی معلوم ہوا عالیہ آئی ہوئی ہے کسی سہیلی سے ملنے گئی ہوئی ہے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔کمرہ جوں کا توں تھا وہ پنکھا چلا کر بیڈ پر دراز ہو گئی۔

ایک عجیب سے سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

سامنے حسن کا پورٹریٹ تھا۔وہ چند لمحے دیکھتی رہی۔ایسی بھی کیا مصروفیت۔

''ایسا محسوس ہو رہا ہے حسن تم مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہو۔'' اس نے افسردگی سے سوچا۔

وہ اپنی جذباتیت سے عاجز تھی۔وہ آج تک اس حسن کو اپنے ذہن سے نکال نہ پائی تھی جو اس کا کزن تھا منگیتر تھا جس سے وہ حجابوں میں ملتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھی اور نہا دھو کر تیار ہوئی بچیوں کو تیار کیا۔گھر کی روشنیاں جل اٹھیں۔اس کے دل میں چراغاں کرنے والا نہ آیا۔البتہ عالیہ آ گئی۔آتے ہی والہانہ اس سے لپٹ گئی۔

''ارے میری بھابی۔کب سے انتظار ہو رہا ہے آپ کا۔''

''ہوں کبھی بھول کر خط تو لکھا نہیں۔سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔'' اس نے شکوہ کیا۔''اور ماشاءاللہ صحت تو خوب بنا رکھی ہے۔خوب آب و ہوا کا اثر ہے۔''

دونوں باتیں کرتی اندر آ گئیں۔

رات آٹھ بجے نوکر نے کھانے لگنے کی اطلاع دی۔اس کا دل بجھ چکا تھا مگر سب کے اصرار پر چلی آئی۔

کھانے کی میز پر بیٹھی ہی تھی وہ دشمن جان بریف کیس ہاتھ میں تھامے چلا آیا۔اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں اس نے آہستگی سے سلام کیا۔براؤن سوٹ میں اس کی صحت ہمیشہ کی طرح قابل رشک تھی۔

اسے آہستگی سے سلام کا جواب ملا تھا۔سیاہ پھولدار سوٹ میں اس نے اپنی مرجھائی ہوئی محبوب بیوی کو یوں چوری سے دیکھا تھا گویا کسی جرم کا مرتکب ہو رہا ہو۔

جھک کر بے بی سیٹ پر بیٹھی حنا کو پیار کیا۔

''کیسی ہو میری جان۔؟'' وہ بیٹی سے والہانہ پوچھ رہا تھا۔

''فائن پاپا'' حنا کی باریک آواز ابھری۔سب مسکرا اٹھے اس نے جھک کر دوبارہ حنا کا رخسار چوما اور اندر بڑھ گیا۔

''ارے بھابی کھانا کھائیں بھائی جان لباس بدل کر آتے ہیں۔'' اسے گم صم دیکھ کر عالیہ نے شوخی سے کہا تو وہ ساس سسر کی موجودگی محسوس کر کے جھینپ گئی۔اس کے برابر کی کرسی خالی پڑی تھی وہ وہیں آ کر بیٹھ گیا اس کے وجود سے اٹھتی مخصوص خوشبو دلوں کے فاصلے کم کرنے لگی۔

اس نے خالی پلیٹ اس کے سامنے رکھی اور ساتھ ہی سالن کا ڈونگہ بھی۔

ڈونگہ تھامتے ہوئے ہاتھ ٹکرا گئے۔اس کے پورے وجود میں پہلی شب والا نشہ دوڑنے لگا۔

بچیوں کو سلا کر وہ دیر تک بیٹھی چچی جان اور عالیہ سے کراچی کی باتیں کوتی رہی تھی۔اسے ایسا کرنا پڑا تھا۔کچھ تو اپنی خواب گاہ میں جانے کی تیاری تھی کہ دل کو بھی سنبھالنا تھا فون پر سنی حسن کی تلخ آواز ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔دوسرے یہ بھی خیال تھا کہ چچی جان کہیں برا نہ مان جائیں کہ ان سے رشتہ داروں سے متعلق تفصیلی باتیں نہیں

کیں ان کی تشفی نہیں کی کہ۔

فلاں کی بڑی لڑکی کی شادی کب کی ٹھہری......؟

ڈھکانی خالہ کے رنڈوے بیٹے کی دوسری شادی ہوئی یا نہیں۔؟

اور وہ جو فلاں پھوپھی کے ہاں پوتا ہوا تھا اس کا نام کیا رکھا۔؟

''تم نے اتنے دن کیوں لگا دیے۔عالیہ کئی دنوں سے آئی ہوئی ہے خیر سے دوسرے جی سے ہے تم بھاوج ہو خیال کرنا۔ارے میں تو تمہیں اٹھتے بیٹھتے یاد کرتی تھی۔لوگوں کا کیا ہے کہتے ہی رہتے ہیں کہ کوئی پوتا نہیں ہوا۔ارے میں کہتی ہوں کہ کونسی میری بہو بوڑھی ہو گئی ہے۔خدا جوڑی سلامت رکھے پوتے بھی ہو جائیں گے۔اے حسن بڑا بے قرار تھا میں سمجھی تم دوسرے جی سے گئی ہو۔؟''

''خیر خیریت تو ہے نا دلہن۔؟''

''جی۔چچی۔!'' وہ جماہی لیتے لیتے جھینپ کر بولی۔(توبہ چچی جان آپ کے ہاں تو تین تین سال کا وقفہ ہے مجھے سال بھر بھی سانس نہ لینے دیں گی......؟) نہیں۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

عالیہ اس دوران سویٹر بنتی رہی یا بیچ میں ٹکڑے لگاتی رہی۔

''امی جان۔بھابی تھک گئی ہوں گی باقی باتیں صبح کر لیں گے۔'' عالیہ نے اس کی مدد کی تو نند کے لیے اس کے دل میں جذبہ تشکر جاگ اٹھا۔سب سے پہلے عالیہ خود ہی اٹھ گئی تھی۔

وہ آہستگی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

ٹیبل لیمپ آن کیے حسن حسب عادت کسی کتاب میں گم تھا۔اس نے آہستگی سے شب خوابی کا لباس نکالا۔چند منٹوں میں تبدیل کیا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر کانوں سے بڑے بڑے بالے اتارنے لگی۔

''کہاں کہاں کی سیریں ہوئیں سرکار......؟'' حسن کا نو شگفتہ سادہ لہجہ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب کر گیا۔

میاں بیوی کے رومانس میں جدائی کیسی خوش وقتی لے آتی ہے۔

''بہت اچھا۔وقت گزرا۔گرمی خاصی تھی سیریں وغیرہ تو نہیں ہوئیں بس گھر میں زیادہ وقت گزرا۔'' وہ آہستگی سے کہتی ہوئی بیڈ کے نزدیک آ گئی۔

جانے کس نے کہہ دیا تھا شادی محبت کی موت ہوتی ہے۔

ہو سکتا ہے سچ ہی کہا ہو۔مگر ان چند سالوں میں روٹھنے منانے کے ایسے مرحلے آئے تھے کہ شدت کی خفگیوں نے کبھی انہیں ایک دم اجنبی بنا دیا تو کبھی صلح نے یکجائی کی منزل پر لا کر نئی آسودگی دی ہر جنگ پر وہ اسے سفاک دشمن لگا ہر صلح پر رجھانے والا رومانی ہیرو۔اس نے شادی کے بعد تلخیاں کٹھن اٹھائی تھیں اور باذائقہ معشوقہ بن کر زندگی کا ایک نیا لطف لیا تھا۔وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔اس نے حسن کی سمت دیکھا دو بچیوں کا باپ پھر سے تر و تازہ تھا۔وہ اس کے دل میں اور رات صبح کے دامن آہستہ آہستہ اترنے لگی۔

''ہماری نند کے ہاں جب پہلوٹھی کا لڑکا ہوا تو ہم نے ہل کر نند کو پانی نہیں پینے دیا۔زچگی نند کے ہاں ہوئی تھی حال ہمارا برا تھا۔بھئی ہمیں کوئی کہتا تھوڑا ہی تھا اپنی خوشی سے کہتے تھے آج تک نند یاد کرتی ہیں۔''

وہ حنا کا ہوم ورک چیک کر رہی تھی عالیہ کچن میں روٹی ڈال رہی تھی۔وہ ساس کی بات پر چونکی پھر سمجھ گئی۔

''میں نے تو بہت کہا عالیہ سے وہ کہنے لگی تھوڑی سی روٹیاں ہیں تو ڈالنا ہیں۔میں تو خود اس سے کہتی ہوں کہ

اب تو تم ہمارے ہاں مہمان ہوتی ہو۔"

ساس کے جتانے پر اسے برا تو بہت محسوس ہوا تھا جبکہ وہ صبح سے مصروف تھی۔ خدا معلوم ساسوں کو بہوؤں کے کیے ہوئے کام کیوں نظر نہیں آتے۔ وہ اٹھ کر کچن میں عالیہ کے پاس چلی آئی۔

اسی دم ثریا مالی کا ایک سال کا بیٹا دوپٹے میں لپیٹے ہنستی ہوئی کچن میں گھس آئی۔

"عالیہ...... اسے چولہے کے پیچھے چھپا لو۔ وہ دیکھ لے گا تو لے جائے گا میں اس سے کھیلوں گی۔"

"ہیں۔ ہیں۔" عالیہ نے بوکھلا کر اسے روکا ورنہ وہ تو شاید بچہ چولہے پر رکھ دیتی۔

"دیکھو۔ اسے چھپا لو وہ لے جائے گا میں اس سے کھیلوں گی۔" اس نے جھپٹ کر سامنے پلیٹ سے ایک سرخ آڑو اٹھا کر بچے کے منہ میں ٹھونسنا چاہا۔

"ار۔ ر۔ رے۔ بھئی اس کے دانت نہیں ہیں۔" شہلا نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

"جی نہیں۔ مجھے پتا ہے اس کے دانت ہیں۔"

"بھئی، یہ ثابت آڑو نہیں کھا سکتا۔ ثریا آپا۔" عالیہ نے سمجھایا۔

"کیوں کیا اس کا منہ نہیں ہے؟ میں اسے یہ امرود ضرور کھلاؤں گی۔"

"یہ امرود نہیں ہے۔" شہلا نے مسکرا کر تصیح کی۔

"جی نہیں مجھے پتا ہے یہ امرود ہے۔ امرود ایسے ہی ہوتے ہیں۔" وہ ضد سے بولی۔ تو وہ دونوں مسکرا کر خاموش ہو رہیں۔

"دلہن! میں بتاؤں اس کی امی اسے کیسے نہلاتی ہیں۔؟" ثریا نے بچے کو دیکھتے ہی دیکھتے سنک میں بٹھا کر نل کھول دیا۔

"ار۔ ر۔ رے۔" شہلا نے آگے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔ بچہ گھبرا کر رونے لگا تھا۔

"ہوں۔ اپنے بچے تو دیتی نہیں ہو اسے بھی اٹھا لیا۔" ثریا نے بچے کو تیزی سے جھپٹ لیا۔

"میں اسے نہلاؤں گی۔ میں اسے نہلاؤں گی۔" وہ بری طرح چیخنے لگی۔

عالیہ نے زبردستی بچے کو اپنی گود میں لیا اور تیزی سے باہر لپکی۔ اس کے پیچھے ثریا اور ثریا کے پیچھے شہلا۔

"ارے بھائی کیا پکڑم پکڑائی کھیل رہے ہیں آپ لوگ" مانی یہ منظر دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا وہ موٹر سائیکل دھکیلا باہر کی سمت جا رہا تھا۔

"مانی۔ جلدی سے یہ بچہ مالی کو دے آؤ۔" عالیہ نے تیزی سے کہا۔ "لو۔ اور مالی سے کہو بچے کو لان میں نہ بٹھایا کرے۔" مانی نے خوبصورت اور صحت مند بچہ عالیہ کی گود سے اچک لیا۔

ثریا غضب ناک ہو کر عالیہ پر پل پڑی۔ شہلا نے اسے ہٹانا چاہا مگر وہ جنونی ہو رہی تھی اسی وقت چچی نے دو ہنٹر ثریا کی پیٹھ پر رسید کیے۔

"ارے کیا دو جانوں کا خون کرے گی نامراد۔ میرے کلیجے کا ناسور بنتی جا رہی ہے" عالیہ بے دم سی ہو رہی تھی۔ عالیہ کی یہ حالت دیکھ کر چچی نے کس کے ثریا کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کیا۔

"ارے کچھ ہو گیا تو کیا منہ دکھاؤں گی داماد کو۔ ارے تو مر کیوں نہیں جاتی۔"

ان کے کوسنوں کا اختتام حسب سابق آنسوؤں اور سسکیوں پر ہوا تھا عالیہ آہستگی سے چلتی ہوئی اندر جا رہی

تھی۔ ثریا پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی ماں کو کبھی شہلا کو دیکھ رہی تھی۔

"ہوں خود تو مجھے کہتی ہیں نہاؤ۔ نہاؤ۔ جب میں کسی کو نہلاتی ہوں تو مارتی ہیں۔"

"چل تو اندر بھاگ۔"

"ارے دنیا صبر آزمانے کو کھڑی ہے ارے میری کوکھ جنی تو تو کسر رہنے دے۔ آگے ہی دکھڑے کیا کم ہیں۔ ارے کیسے امتحان میں ڈالا ہے مولا۔ ارے اس جوان بچی کی کہاں تک خبر گیری کرتی رہوں۔ ارے میرے حال پر رحم کر مالک۔"

وہ جب سے کراچی سے آئی تھی دیکھ رہی تھی کہ مانی بہت کم گھر میں نظر آ رہا تھا عجیب سی عجلت و بے چینی اس پر سوار رہتی تھی وہ کچن سے فارغ ہو کر باہر آئی تو بادامی شلوار سوٹ میں نک سک سے درست مانی پھر کہیں جانے کو پر تول رہا تھا۔

"ارے بھئی سیٹھ کہاں رہتے ہو آج کل۔؟" اس نے پیچھے سے جا کر کہا تو وہ چونک کر مڑا سامنے بھابی کو دیکھ کر مسکرا دیا۔

"بس بھابی آج کل ذرا ساتھ والوں کے ہاں گیم رہتی ہے۔ شطرنج کی۔" اس نے مسکرا کر کف کے بٹن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی یہ تو کچھ زیادہ ہی مصروفیت ہے۔ مجھے شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ حسن تو شام گئے آتے ہیں، تم ہو کہ گرفت میں نہیں آتے۔"

"بھئی اب تو شام ہو چلی ہے کل سہ پہر لے چلنا۔"

"خوش رہو بھابی۔" مانی نے بے ساختہ کہا۔ تو اس نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے بہت خوش رہنے لگے ہو۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔

"خوش تو میں ہمیشہ رہتا ہوں۔ نظر نہ لگا دیجیے گا۔" وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں طے کر گیا۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی وہ گیٹ کے بائیں جانب مڑ گیا۔

وہ اندر پلٹ آئی۔

"یار۔ اتنی دیر لگا دی۔" آصف نے مانی کا بازو تھام کر بے تابی سے کہا۔

مانی نے مسکرا کر ادھر ادھر دیکھا وہ ایک کونے میں کھڑی پودوں کو پانی دے رہی تھی۔

ساری بے تابیوں کو قرار آ گیا۔

"ویسے آج نجمہ وغیرہ کہہ رہی ہیں کہ لانگ ڈرائیو پر چلنا ہے بھئی اب مہمانوں کا اصرار ہے تو بات ماننا پڑتی ہے۔ چلو گے۔؟"

"پہلے ایک بازی ہو جائے۔" وہ ڈرائنگ روم کی سمت مڑ گئے۔ آنچل کی اوٹ سے جھانکتی بے چین نظروں نے ڈرائنگ روم کے دروازے تک پیچھا کیا۔

ہاتھوں کی حرکت رک گئی۔ بلند قامت مضبوط سراپا۔ سارے جہاں سے بڑا قلعہ نظر آ رہا تھا۔

"ساحرہ۔ مانی بھائی آ گئے۔؟" نجمہ نے پیچھے سے آ کر پوچھا تو وہ اچھل پڑی۔

"جی۔؟"

"مانی بھائی آ گئے۔؟" نجمہ نے سوال دہرایا۔

"جی۔! اس نے آہستگی سے رخ موڑ کر جواب دیا۔"

"ہائے اللہ۔راحت۔سعدیہ۔اے۔آ جاؤ۔" وہ شور مچاتی ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔"دیکھیں جی فوراً اٹھ جائیں ورنہ بساط الٹ دی جائے گی۔"

"یا اللہ خیر۔مانی بھائی۔عجیب ہیں آپ بھی آصف بھائی کو لے کر بیٹھ گئے۔آصف بھائی کو تو بہانہ چاہیے دیکھیے ہماری کزن پشاور سے آئی ہیں اور کہیں بھی نہیں گئیں آصف بھائی کے پاؤں پڑتے پڑتے کمر خم زدہ ہو گئی تب کہیں ہامی بھری وہ بھی اس شرط پر کہ اماں کو ساتھ لیں گے زیادہ لطف آئے گا۔بس اب اٹھ بھی چکیے۔"

دونوں نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

مانی ڈرائیونگ سیٹ پر تھا ساتھ میں آصف پیچھے چاروں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ساحرہ دروازے کے بالکل ساتھ تھی۔مانی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی بیک ویو مرر کا زاویہ بدلا۔اس کا چہرہ مکمل مانی کی نظروں کے حصار میں تھا۔

ساحرہ کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئی تھیں۔وہ اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

ایک اسنیک بار کے سامنے گاڑی رکوائی گئی۔سب کی پسند کے ساتھ آصف نے مانی کی پسند پوچھی۔

"یار! تمہیں کیا پسند ہے۔؟"

"مجھے۔؟" مانی کی......نظریں ویو مرر پر اٹھیں۔ساحرہ کی پلکیں اس کے رخساروں پر تھرتھرا رہی تھیں۔گلابی لہر مارتے بھرے بھرے رخسار۔

"مجھے پشاور کے سیب پسند ہیں۔جب کہ لوگ خواہ مخواہ کشمیری سیب کو ترجیح دیتے ہیں۔" گاڑی میں قہقہے ابل پڑے۔

"حد ہے مانی بھائی۔بھئی اسنیکس میں پسند پوچھ رہے تھے یہ سیب کہاں سے آ ٹپکے یہ اپنے کوئٹہ کے سیب کیا برے ہوتے ہیں۔؟" نجمہ نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

"بھئی سیب تو کوئٹہ کے بھی اعلیٰ ہوتے ہیں لیکن پشاور کے سیب کی بات ہی اور ہے۔" اس نے شرارت سے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

"آپ نے کھائے ہیں کیا۔؟"

"ہوں۔اکثر سالم نگلے ہیں۔" اس نے اپنی پرکشش نظریں اٹھا کر ویو مرر پر ایک لمحے کو مرکوز کر دیں۔

"اس سے تو آپ بہت بے صبر ثابت ہوئے۔" نجمہ نے رائے دی۔

اس اثناء میں آصف کی منگائی چیزیں آ گئیں اور تقسیم شروع ہو گئی۔

"کیا بات ہے مانی بھائی بہت چہک رہے ہیں۔؟ شہلا بھابھی کراچی میں لڑکی وڑکی پسند کر کے تو نہیں آ گئیں۔؟" سعدیہ نے بھی حصہ لیا۔

"ارے نہیں بھائی خدانخواستہ وہ پاگل نہیں ہیں انہوں نے پانچ سال قبل لڑکا پسند کیا تھا ابھی تک بھگت رہی ہیں۔" مانی نے کون پر منہ مارا۔

"پتا نہیں بات کو کہاں لے جاتے ہیں میرا مطلب ہے آپ کی شادی وادی کا چکر۔"

"پہلے تو نوٹ کر لو۔شادی بندھن ہوتا ہے چکر نہیں۔دوسری بات وہ چکر نہیں چلاتیں بس کام کرتی ہیں۔

چکر چلانے کو میں ہی کافی ہوں۔"

ساحرہ کو احساس تھا کہ وہ مسلسل اس کی نظروں میں ہے اس سے کچھ کھایا بھی نہیں جا رہا تھا مانی نے یہ بات نوٹ کر لی تھی۔وہ گاڑی سے اتر کر کاؤنٹر پر چلا گیا۔

گاڑی میں بیٹھی چاروں لڑکیوں نے اس کی شخصیت کے جادو کو محسوس کیا۔

اس کا ہیئر اسٹائل باوقار تھا اس کی چال شاہانہ تھی اس کی باتوں میں شوخی تھی۔اس کی نظر دل کھینچ کے لیے جاتی تھی۔راحت نے اس کی شخصیت کو دل سے سراہا۔

ساحرہ اپنی ہتھیلیاں صاف کر رہی تھی جو پسینے سے تربتر ہو رہی تھیں۔

ساحرہ اور سعدیہ سوتیلی بہنیں تھیں ساحرہ بڑی تھی یعنی اپنے والد کی پہلی مرحومہ بیوی سے تھی سعدیہ اور ایک بیٹا دوسری بیوی سے تھا۔راحت سعدیہ کی خالہ زاد تھی آصف اور نجمہ، سعدیہ، ساحرہ کے سگے پھوپھو زاد تھے۔سعدیہ، ساحرہ، راحت اپنی اپنی ماؤں کے ہمراہ کوئٹہ ملنے ملانے کی غرض سے آئی ہوئی تھیں۔

مانی اور آصف تو بچپن کے دوست تھے۔ملازمت کی وجہ سے چند سالوں کی دوری ہو گئی تھی۔مگر اب اس کی پوسٹنگ دوبارہ کوئٹہ ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں اب اس کا زیادہ وقت آصف کے پاس گزرتا تھا اور اب تو کچھ زیادہ ہی گزرنے لگا تھا۔ایک ہی وار میں اس کا کام تمام ہوا تھا چار پانچ روز قبل جب وہ آصف کو ساتھ لے جانے کی غرض سے گیٹ میں داخل ہوا تھا تو ایک لڑکی کی چیخ سنی تھی اس کے ساتھ ہی وہ گیٹ کی سمت بھاگتی نظر آئی تھی۔آصف کا "مایہ ناز" کتا "ٹومی" اس کے پیچھے تھا۔لڑکی اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔

"دیکھیے محترمہ۔!" مانی نے اسے سنبھالا تھا "یہ کاٹے گا نہیں بے فکر رہیں۔آپ نے سنا نہیں جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔"

"لل۔لیکن اس نے تو میرا دوپٹہ پکڑ لیا تھا۔" وہ ہنوز خوفزدہ تھی۔

"عجیب ہے یہ جانور۔کیا انسانوں جیسے کام کر رہا تھا۔" اس نے گردن موڑ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہا۔

لڑکی نے ٹپٹا کر اسے دیکھا تھا۔

"مراد خان۔!" اس نے مالی کو دوسرے گیٹ سے اندر داخل ہوتے مالی کو آواز دی۔

"یہ ٹامی کو باندھو۔بھئی۔جلدی سے۔"

"بھئی، آپ اتنے جوش و خروش سے چیخ رہی تھیں اور گھر میں سے کوئی باہر نہیں نکلا۔؟" وہ متعجب ہوا۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔کام کرنے والی ہے وہ بھی اونچا سنتی ہے۔" اس نے سادگی سے بتایا۔

"مگر آپ بھی تو کچھ کم اونچا نہیں چیخ رہی تھیں۔" مہندی رنگ کے سادہ سے سوٹ میں ملبوس گھبرائی، بوکھلائی لڑکی اس کی باتوں سے مزید گڑبڑا رہی تھی۔میں تو لان سے پھول توڑ رہی تھی۔کہ" وہ اتنے شوق سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا کہ اس کی جان پر بنی تھی۔

"آپ کون ہیں۔کس سے ملنے آئے ہیں؟" اس نے خود پر جلد قابو پا کر ذرا رکھائی سے پوچھا۔

"دیکھیے۔جن سے ملنے آئے تھے وہ تو ہیں نہیں۔زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔پھر آ جائیں گے۔" وہ دھیمے سے مسکرایا۔

پھر اسے معلوم ہو گیا کہ وہ ساحرہ ہے آصف کی کزن۔تب سے وہ اس کے سحر میں تھا وہ واپس گاڑی تک آیا

دروازہ کھولا اس کے وجود کی مہک اس کے سانس میں حلول ہوگئی۔ بعض اوقات قربتیں کتنی دلکش اور یادگار ہوتی ہیں۔ انسان ساری گزری زندگی فراموش کر کے ایک ناقابل فراموش قربت نہ بھولنے والی ملاقات نہ بھولنے والا وصل یادگار ہے محسوس کرتا ہے۔

دل پسند قربت کا لمحہ بعض اوقات ان مٹ ہوتا۔ پھر بار ہا شادمانیاں آتی ہیں مگر ایسی نہیں آتیں۔ مکرر نہیں ہوتیں۔

"اب کہاں چلا جائے۔؟" وہ اس قربت کو طویل کرنا چاہتا تھا۔

"کہیں بھی لے چلیے۔ آخر یہیں کے پلے بڑھے ہیں۔ راستوں سے انجان تو نہیں ہیں۔"

نجمہ نے جھاڑ پونچھ کی۔ "بعض اوقات راستے بھول بھی تو جاتے ہیں۔"

اس نے آہستگی سے کہا۔

"تو میں اور آصف بھائی کس لیے ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔"

"پکی بات ہے ناں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بے ساختہ ویو مرر میں جھانکا وہاں گھبراہٹ یکساں عالم تھا۔

☆☆☆

مانی جب گھر میں داخل ہوا تو شہلا کہیں نظر نہیں آئی اس نے ماں کی سمت دیکھا جو نماز پڑھ رہی تھیں۔ عالیہ بھی کہیں نظر نہیں آئی۔ اس نے بھائی کی خواب گاہ پر دستک دی۔

"آ جاؤ۔!" حسن کی آواز آئی تو وہ ذرا سنبھل گیا۔ اور وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

شہلا وہاں بھی نہیں تھی۔

حسن نے اسے چاروں سمت نظریں دوڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو۔؟"

"بھابھی کہاں ہیں۔؟" بھائی کے سامنے تو وہ بہت سنجید نظر آنے کی کوشش کرتا تھا۔

"حنا کو سلانے گئی ہیں۔ کیا بات ہے۔؟"

"جی انہی سے کہنے والی ہے۔" وہ دھیمے سے مسکرا دیا۔

"ہوں۔!" حسن دوبارہ کتاب گم ہوگئے۔ وہ "کڈز روم۔" میں چلا آیا۔

شہلا حنا کو تھپک رہی تھی۔ مانی کو دیکھ کر مسکرائی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ دہلیز دروازے پر کھڑا ہو کر سر کھجانے لگا۔

شہلا آہستگی سے اٹھی۔ اور دروازہ بولٹ کرتی ہوئی باہر آ گئی۔

"بچے بھی سو کر نہیں دیتے۔ اور تم کہاں تھے شام سے نواب صاحب۔؟" وہ لابی میں آ کر خبر لینے لگی۔

"بھابھی آپ ساتھ والوں سے کبھی ملی ہیں۔؟"

"یہ ادھر۔ نجمہ لوگ؟۔"

"ہوں۔!"

"بھابھی ذرا آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ میرے کمرے میں۔"

"تم آ جاؤ ناں میرے کمرے میں حسن کو بھی سنا دینا۔"

"ارے غضب خدا کا۔ انہیں تو ہوا بھی نہ لگائیے گا۔" اس نے گھبرا کر کہا وہ مسکراتی ہوئی اس کے ہمراہ چلی آئی۔

"جی۔ کیا ہوا ساتھ والوں کو۔؟"

"کیا کوئی نجمہ سے چکرو کر چلا بیٹھے ہو۔!" وہ تکیے پر کہنیاں ٹکا کر مسکرائی۔

"حد کرتی ہیں آپ۔ اگر وہ اس قابل ہوتی تو اتنی دیر۔ بھابھی۔ آپ ایسا کیجئے گا۔ کل عالیہ کو لے کر ناں آپ نجمہ کے ہاں چلی جایئے گا اس کے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ کافی ساری لڑکیاں۔"

شہلا کو اس کی سادگی پر شفقت آمیز پیار آ گیا۔

"جی۔؟ پھر۔؟ کیا کہہ رہے تھے کافی ساری لڑکیاں۔؟" وہ بناوٹی سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

"آپ کو ان میں جو لڑکی سب سے زیادہ اپیل کرے تو ہمارے لیے۔"

"ارے بہت چل نکلے ہو۔ پتا ہے امی کیا کہہ رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہی تھیں۔؟"

"کہہ رہی تھیں ابھی مانی کی شادی دس سال نہیں کروں گی۔"

"کچھ خوف خدا کریں بھابھی کیا کہہ رہی ہیں۔ پینتیس سال تک میں اکیلا عیش کروں گا میرے بچے تو بس پنشن پر پلیں گے پھر۔"

شہلا کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ "اف مانی۔ توبہ۔"

"اچھا بتاؤ کیا واقعی لڑکی بہت اچھی ہے۔؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"بس آپ کل دیکھ لیجئے گا۔ مگر امی کو مت بتایئے گا ابھی۔ کبھی گڑبڑ کر دیں۔ ان کو ڈ ذرا خراب ہو جائے تو بنتے بنتے کام بگڑ جاتے ہیں اور نہ بھائی جان کو۔ پہلے آپ اور عالیہ پاس کر دیں۔ دیکھیں ابھی کسی اور کو مت بتایئے گا۔"

"اچھا بتاؤ۔ صرف آنکھوں کی ہنکائی ہوا ہے یا کوئی بات وات بھی ہوئی ہے۔؟"

"ار۔رے۔ بھابھی۔ اس سے زیادہ آسان تو امی سے بات کرنا ہے۔"

"چچی جان کو تم یونہی بدنام کر رہے ہو۔ سب سے زیادہ تو تمہیں ہی چاہتی ہیں۔"

"اللہ بچائے ایسی چاہت سے۔ اب بھی اسی طرح لتاڑتی ہیں گویا چار برس کا ہوں۔" اس نے کانوں کی لوؤں کو چھوا۔

"سچ بھابھی۔ اس وقت تو آپ بہت عظیم نعمت ثابت ہوئی ہیں۔"

"کھانا وانا نہیں کھاؤ گے۔" اسے ایک دم خیال آیا۔

وہ باہر جاتے جاتے رک گیا۔ گردن موڑ کر نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر شرارت سے مسکرا دیا۔ "سیر ہوں۔"

"بدتمیز۔!" وہ بھی ہنس دی۔

اپنی خواب گاہ میں آئی تو حسن نے پوچھا۔

"مانی تمہیں پوچھ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا۔؟"

"کچھ نہیں۔ ایسے ہی پوچھ رہا ہوگا۔" وہ باتھ روم۔ کے دروازے کو کھولتی ہوئی آہستگی سے بولی۔

حسن نے دوبارہ کتاب چہرے کے سامنے کر لی تھی۔

مانی صبح ہی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ دیکھیں مہم پر کب روانہ ہوتی ہے۔

اسے شام ہی کو فرصت ملی تھی۔

گلابی سوٹ زیب تن کر کے کلائی پر ریسٹ واچ باندھتے ہوئے اس نے ساس سے کہا تھا۔

"چچی جان۔ ذرا ہم ساتھ والوں کے ہاں جا رہے ہیں۔"

"ارے دلہن آج تمہیں ساتھ والوں کا خیال کیسے آ گیا۔ تم تو مہینوں گھر سے باہر نہیں نکلتیں۔" انہیں اچنبھا ہوا۔

"بس۔ ایسے ہی میں نے سوچا۔ عالیہ بھی آئی ہوئی ہے پھر نجمہ کی امی بھی شکوہ کرتی رہتی ہیں۔" اس نے وضاحت کی۔

"لو۔ خوب کہی شکوہ کرتی رہتی ہیں خود تو جیسے روز حاضری لگاتی ہیں۔"

ویسے ان کا دھیان تھا نجمہ کے لیے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا۔ مگر بھئی میں نے بھی جتا دیا تھا کہ ہمارے تو خاندان میں ہی لڑکیاں بہت ہیں۔"

وہ کچن جاتے جاتے رک کر گفتگو کرنے لگی تھیں۔

"بس ذرا جلدی آ جانا۔ اور ہو سکتا ہے وہ تمہیں پٹی پڑھانے کی کوشش کریں نجمہ کے لیے۔ تم ان کی باتوں میں نہ آ جانا۔"

انہیں یہی گمان تھا کہ نجمہ کی ماں نے اسی نیت سے شہلا کو زور دے کر بلایا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ وہ بلاوے سے نہیں جا رہی تھی۔ اسے چچی جان کا یوں بیٹے کی ماں کی حیثیت سے ناز کرنا کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔

"پتا نہیں لائق بیٹوں کی ماؤں کو یہ خوش گمانی کیوں ہوتی ہے کہ لوگ ان سے مطلب سے ہی ملتے ہیں۔"

اتنے میں پھولدار چادر اوڑھے عالیہ بھی باہر آ گئی تھی۔

مانی کے بے قرار دل نے انہیں جاتے دیکھ کر سکون کا سانس بھرا۔

وہ گیٹ میں داخل ہوئیں تو سب لڑکیاں لان میں ہی بیٹھی تھیں نجمہ انہیں دیکھ کر پذیرائی کو آگے بڑھی۔

"ارے۔ آج ہمارے ہاں کون آیا ہے۔ امی۔ امی۔"

"آیئے شہلا بھابھی۔ عالیہ باجی۔" وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

شہلا نے، پر اشتیاق نظر ڈال کے سب لڑکیوں کو دیکھا۔ براؤن سوٹ میں ملبوس ایک سادہ سی اور دلکش لڑکی سب میں ممتاز نظر آ رہی تھی۔ یہ جان کر یہ مانی کی بھابھی اور بہن ہیں اس نے بطور خاص انہیں دیکھا تھا۔ مگر شہلا کو اپنی سمت دیکھتا پا کر اس نے نظریں جھکا لی تھیں اس پر شہلا کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ آبجیکٹ (Object) یہی ہے۔ (ارے مانی کے بچے۔ کہاں پہنچا ہے تو) اس نے دل ہی دل میں مانی کے انتخاب کو سراہا۔ نجمہ کی امی نے خوش ہو کر ان کا استقبال کیا۔

"ارے دلہن۔ تم تو بہت ہی نروٹھی ہو۔ دو قدم کا فاصلہ ہے مہینوں نظر نہیں آتیں۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"نہیں خالہ جان ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ویسے بھی میں امی کے ہاں گئی ہوئی تھی کراچی۔"

"ہاں بتایا تھا تمہاری ساس نے۔" انہوں نے صوفے سے پشت ٹکا کر بات مختصر کی۔

"اور عالیہ بچپن میں سارا سارا دن یہاں کھیلتی رہتی تھی۔ سسرال جا کر تو سب بھول گئی ہے۔ بہت بے مروت ہو گئی ہے۔"

عالیہ خفیف ہو کر مسکرا دی۔

"ارے لڑکیو کہاں ہو بھئی یہاں آ کر بیٹھو۔"

لڑکیاں یکے بعد دیگرے اندر آ گئیں۔ راحت لباس بدل کر تھوڑے سے اہتمام سے اندر آئی تھی سعدیہ اور نجمہ حسب سابق تھیں۔ ساحرہ آخر میں اندر آئی تھی۔ آ کر خاموشی سے بیٹھ گئی تھی۔

راحت نے بتایا کہ ہر چند وہ ایم اے کر رہی ہے مگر اسے مزے مزے کے کھانے بنانے اور نت نئے فیشن کے ملبوسات تیار کرنے کا بے حد شوق ہے۔ مزید یہ کہ امی اس کی حد درجہ صفائی پسند عادت سے نالاں ہیں۔

سعدیہ کو کرکٹ کا بہت شوق تھا اس کا موضوع کرکٹرز تھے۔

نجمہ اور ساحرہ نے بہت کم گفتگو میں حصہ لیا تھا۔

"ان کی مائیں تو ذرا ملنے ملانے گئی ہوئی ہیں ورنہ ان سے بھی ملاقات ہو جاتی۔" نجمہ نے سب سے تعارف کرا دیا تھا۔

"ارے بڑا پیارا نام ہے آپ کا۔" عالیہ بے ساختہ کہا تھا۔

ساحرہ نے مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔

"نہیں بھئی" صرف نام ہی پیارا انہیں خود بھی تو پیاری ہیں۔" شہلا نے کھلے دل سے تعریف کی۔

"پڑھتی ہیں۔؟" عالیہ نے پوچھا۔ اسے سارے واقعے کا علم نہیں تھا وہ اپنے طور پر اسے مانی کے لیے پسند کر رہی تھی۔

"جی۔ فی الحال تو بی۔ اے کا ایگزام دیا ہے۔" وہ شائستگی سے بولی۔

"اب کیا ارادے ہیں۔؟" عالیہ نے مزید پوچھا۔

"بھئی ان کی زندگی کا کوئی "ایم" (آورش) نہیں ہے۔ انہیں تو پڑھنے کا بھی خاص شوق نہیں تھا۔ مگر بڑوں کے کہنے پر پڑھنا پڑا۔ اب تو بس انہیں گھر داری ہی سے دلچسپی ہے۔ دلچسپی بھی کیا کہیے آخر فراغت کا کوئی مصرف بھی ہو۔" راحت نے عجیب کٹیلے انداز میں اس کی ذات کو پرت پرت ادھیڑا۔

اور وہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

خالہ جان چائے کا انتظام کر کے واپس آ گئی تھیں۔

"ان میں سے کسی کی منگنی ونگنی بھی ہوئی ہے۔" شہلا نے رنگ برنگی لڑکیوں کو شوق سے دیکھا۔

"ارے بیٹی۔ کہاں۔ یہی تو آج کل سب کا مسئلہ ہے۔ اچھے رشتے ہی نہیں ملتے ہمارے خاندان میں اللہ کی رحمت تو کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"خیر۔ جس نے پیدا کی ہیں۔ جوڑے بھی اتارے ہی ہوں گے۔"

"اب یہ ساحرہ ہی ہے۔ جو آتا ہے باوا کو پسند ہی نہیں آتا۔ اب عمر سرک جائے گی اس سے چھوٹی سعدیہ ہے۔ مگر ان کے پلے تو بات ہی پڑتی جب تک اس کی نہیں کرتے تو چھوٹیوں کی کیسے ہو جائے گی۔ ابھی پچھلے دنوں ہی ساحرہ کا اتنا اچھا رشتہ آیا لڑکے کا اپنا ورکشاپ تھا۔ مگر یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تعلیم کم ہے۔"

اب ایک ایک چیز دیکھنے بیٹھیں تو ہو لیں لڑکیوں کی شادیاں۔"

شہلا کو محسوس ہوا تمام حاضرین میں کوئی ساحرہ کا خیر خواہ نہیں ہے۔ ایسی عظیم الشان لڑکی جسے دیکھیں تو گنوانے کا جی نہ چاہے۔ اس کے لیے موٹر مکینک کو مناسب ترین خیال کیا جا رہا تھا۔ اسے احساس ہوا مانی کی یہ تمنا آسانی سے پوری نہ ہو سکے گی۔ پہلے تو اپنے ہی گھر میں۔ چچی جان۔ اس کے بعد شاید نجمہ کی والدہ۔ وہ کیسے سہہ سکیں گی کہ ان کے منتخب کردہ لڑکے سے نجمہ کے بجائے ساحرہ بیاہی جائے۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے مشکلات کا اندازہ کر لیا۔

"ساحرہ۔ ہماری طرف بھی آنا ناں تم۔" اس نے محبت سے کہا۔ پھر اپنے خصوصی التفات پر چونک کر سب کو

مسکرا کر دیکھا۔ ''ان سب کے ساتھ آنا۔ بھئی ہمیں تو آپ سب بہت اچھی لگیں۔'' اس نے دل رکھا۔ اس کا حساس ذ
کمپیوٹر کی طرح سب کو پڑھ رہا تھا۔

چائے سے فراغت پا کر نجمہ کی قصیدہ خوانی سے محظوظ ہو کر وہ گھر چلی آئی تھیں۔

عالیہ آج کل اپنی طبیعت کی ''خرابی'' کی وجہ سے ذرا کم گو سی ہو گئی تھی۔

مگر باہر نکلتے ہی اتنا ضرور کہا تھا۔

''بھابھی۔ یہ ساحرہ آپ کو کیسی لگی۔؟ کیا خیال ہے اسے چھوٹی بھابھی بنا لیا جائے۔''

''دیکھیں گے۔ امی کو تو دکھا دیں پہلے۔''

''لیجئے۔ اتنی پیاری تو ہے امی کیوں ناپسند کریں گی۔ یہ تو ان لوگوں میں سے ہے جسے دیکھتے ہی اٹھا بھاگنے کو جی چاہے۔'' وہ ہنس پڑی خود ہی اپنی بات پر۔

''تم مانی کے سامنے یہ جملہ نہ دہرا دینا۔ کہیں عملی طور پر۔'' اس نے جان کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

چچی جان نے دونوں کو ہنستے دیکھا تو بولیں۔

''اے کون سے لطیفے پر ہنس رہی ہو۔؟ کیا کہہ رہی تھیں نجمہ کی ماں...... میرا تو پوچھ رہی ہوں گی۔؟''

''لطیفہ تو کوئی نہیں امی۔ جب انسان خوش ہو تو ہنس ہی پڑتا ہے۔''

اس نے پیچھے سے جا کر ماں کو بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

''سچ امی۔ اتنی اچھی لڑکیاں آئی ہوئی ہیں نجمہ کے ہاں کہ بس کیا بتاؤں۔''

''ہوتی رہیں اچھی۔ بھئی تمہیں۔ کیا۔'' چچی جان کو تو بھلا للہی بغض تھا ہمسائی سے۔ ''آج تو حسن بھی جلدی آ گیا۔ پوچھ رہا تھا کہ دونوں کہاں گئی ہوئی ہیں۔ اتنی دیر لگا دی آخر چپاتیاں بھی ڈالنا ہیں۔''

وہ اندر کمرے میں آئی تو حسن غسل کے بعد کہیں جانے کو تیار ہو رہا تھا۔

''اچھا تو کہیں جانا تھا۔ میں حیران ہو رہی تھی کہ آخر آج آپ جلدی آ کیسے گئے۔'' حسن نے بڑے مصروف سے انداز میں اسے دیکھا۔

''یار۔ تم بھی عجیب ہو گھر آؤ تو غائب۔ بھئی میرا جلدی سے کوئی ڈنر سوٹ نکال دو۔''

''اف خدایا۔ کیسی عجلت ہے کیا گاڑی چھوٹ رہی ہے۔'' وہ وارڈ روب کھول کر سر دیے دیے بولی۔ جواب میں حسن خاموش رہا۔

کپڑے تبدیل کر کے بالوں کو اسپرے کر کے وہ ریسٹ واچ باندھنے لگا تو شہلا نے سفید رومال خاص انداز سے طے کر کے کوٹ کی بالائی جیب میں ٹکایا۔ اور ایک بہتر خوشبو اٹھا کر اس پر اسپرے کیا۔ پرس اٹھا کر تھمایا۔ جو اس نے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

''کب تک انتظار کروں۔؟'' اس نے دلربائی سے مسکرا کر سجے سنورے حسن کو دیکھا۔

''کب تک کر سکتی ہو؟'' وہ شرارت سے اسے آئینے میں دیکھ کر بولا۔

''بارہ بجے تک۔'' اس نے تیقن سے کہا۔

''اگر بارہ بجے تک نہ آؤں۔؟ تو کیا سو سکتی ہو۔؟''

''جب پتا ہی ہے تو تنگ کرنے کا مطلب۔؟'' اس نے جھک کر اسپرے پر ڈھکن جمایا۔

''بات یہ ہے کہ میں دور دراز سے آئے ہوئے دوستوں کو ڈیوڈنر دے رہا ہوں۔ ایک ماہ پہلے وعدہ کیا تھا۔ اتنا مصروف رہا کہ یاد ہی نہیں رہا۔ بچے کیا کر رہے ہیں۔؟''

''کیا کرنا ہے انہوں نے۔؟'' وہ اس خوشبودار مرد سے دور ہٹ کر بولی جسے پانچ سال شادی ہونے کے باوجود نظر لگنے کا خدشہ تھا۔

''بھئی۔ حنا کو خاص توجہ دیا کرو۔ ویسے بھی وہ ماشاءاللہ بہت ذہین ہے۔''

''جی۔ میں تو خیر توجہ دوں گی۔ آپ بھی تو کبھی اسے چیک کیا کیجئے۔''

''تم تو جانتی ہو۔ اچھا بھئی پھر باتیں ہوں گی۔ اگر جاگتی ہوئیں تو رات کو۔ او کے۔ ڈارلنگ۔'' وہ چابیاں اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اس کے نکلتے ہی مانی تیزی سے اندر آیا تھا۔

''اوفوہ۔ ایک تو چچی جان کے ''دونوں بیٹوں'' نے مجھے تنگ کر دیا ہے۔'' وہ بے قرار سے مانی کو دیکھ کر شرارت سے مسکرائی۔

''تم نے کہا تھا بھابھی جو لڑکی سب سے اچھی ہو۔ بھئی مجھے تو سب سے اچھی مائی جیروں، نوکرانی کی لڑکی لگی۔ چلو خیر اس کا تمہارا تو کوئی جوڑ نہیں۔ البتہ ان لڑکیوں میں جو میرے دل کی پوچھتے ہو تو یہ ہے کہ راحت سب سے زیادہ ہے دقعی بھئی کیا لڑکی ہے۔''

''جی۔؟ راحت۔ بھابھی۔ وہ۔؟'' مانی نے ہاتھ کے اشارے سے راحت کا ہیئر اسٹائل بنا کر بتایا۔ وہ بھابھی۔''

''بھئی مجھے تو بہت پسند آئی۔ میں ابھی چچی جان سے اس کے بارے میں ہی بات کر رہی تھی انہوں نے بھی دیکھ رکھا ہے۔ کہنے لگیں مانی کو پسند ہے تو۔ بسم اللہ۔''

''آ۔ آپ نے۔ امی سے بات بھی کر لی۔ کم از کم مجھ سے تو معلوم کر لیا ہوتا۔ راحت سے شادی سے بہتر ہے میں تاحیات غیر شادی شدہ رہوں۔''

''افوہ۔ بھابھی۔ قسم سے مجھے آپ کے حسن نظر کا عالم پتا ہوتا تو میں نام بتا کر بھیجتا۔ راحت۔ لاحول ولا قوۃ۔ آپ کو اتنی جلدی کیا تھی کہ امی سے بھی کہہ دیا۔''

''لو خود کو اتنی جلدی تھی کہ پرسوں دیکھا آج مجھے بھیج دیا۔ ویسے ان کے ہاں...... ایک عجیب سی لڑکی ساحرہ آئی تھی۔ میں نے سوچا اب تم اتنے بھی کھسکے نہیں ہو جو اس کا انتخاب کرو گے۔ کہاں راحت۔ کہاں ساحرہ۔''

''گویا آپ کو ساحرہ پسند نہیں آئی۔؟'' اس کی آواز دھیمی اور سنجیدہ تھی۔

''تو کیا تم ساحرہ کے لیے کہہ رہے تھے۔ مگر بھئی اس کا تو نکاح ہو چکا ہے۔''

''جی۔!'' مانی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

''مگر بھابھی۔ میں تو واقعی اس کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔''

''تو کیا اسے طلاق دلوا کر اپنے ساتھ زبردستی نکاح پڑھواؤ گے۔؟'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

مانی خاموش ہو گیا۔ چند لمحے کھڑا سوچتا رہا پھر دروازے کی سمت بڑھا۔ تو شہلا کو ترس آ گیا۔

''اے مانی کے بچے۔!'' اس نے مانی کا بازو تھام...... کر اپنی سمت موڑا۔

''سچ مانی۔ واقعی لڑکی لاجواب ہے۔ بہت تیز نکلے۔ بھئی میں نے تو عالیہ سے تذکرہ نہیں کیا تو بھلا امی سے

ابھی سے کیسے کہہ دوں۔ میں تو مذاق کر رہی تھی کوئی نکاح وغیرہ نہیں ہوا۔ عالیہ کو بھی بہت پسند آئی اس نے تو اپنے اسے تمہارے لیے پسند کیا ہے۔ اب اگر کہو تو بات آگے چلے۔؟''

''دیکھیں بھابھی۔ آج تو آپ نے میرے تمام مذاقوں کا بدلہ کھڑے کھڑے لے لیا۔ بہت بھیانک تھا۔'' اس کے چہرے پر خوشی لہریں مارنے لگی تھی۔

''بھابھی۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہے۔ مجھے تو امی سے ڈر لگتا ہے۔ وہ تو ہر کام الٹ کرنے کی عادی ہیں۔''

''بھئی مانی۔ مجھے یہ بات اتنی آسان نہیں لگ رہی اس لیے کہ چچی جان تو ان لوگوں کو قطعی پسند کرتیں۔''

''آپ یہ کیوں کر کہہ رہی ہیں۔؟'' وہ پریشان ہوا تھا۔

''لو ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے۔ غالباً وہ اپنی بہن یا بھائی کی لڑکی تمہارے لیے پسند کر چکی ہیں سینکڑوں بار تو مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ مانی کی شادی غیروں میں نہیں کروں گی۔''

''تو آپ کچھ کیجئے گا ناں۔؟''

''ہاں بھئی کریں گے۔ دیکھیں گے۔ حسن اور چچا جان مان گئے تو پھر ہو سکتا ہے چچی جان نرم پڑ جائیں۔ نہیں میری بچیاں کیا کر رہی ہیں۔ پتا نہیں۔ حنا نے دودھ بھی پیا یا نہیں۔'' اسے ایک دم بچیوں کا خیال آ گیا۔ وہ باہر گئی۔ چچی جان حنا کو گود میں لیے ٹہل رہی تھیں۔

''دودھ پی لیا اس نے۔؟'' شہلا نے آگے بڑھ کر حنا کو گود میں لیا۔

''ہاں پی لیا۔ تمہارے جانے کے بعد تو بہت روئی۔ دلہن۔ اتنے چھوٹے بچوں کو تو ساتھ ہی رکھا کر ہیں۔ اچھے فیشن ہیں آج کل کے۔ بچے ماؤں سے دور ہوئے جا رہے ہیں۔ اچھی مائیں ہیں آج کل کی نہ اپنا دودھ ہیں نہ گودوں میں کھلاتی ہیں۔'' وہ حسب عادت تقریر کرنے لگیں۔

''سو رہی تھی ناں یہ۔ اس لیے لے کر نہیں گئی تھی۔'' اسے چچی جان کا یوں خواہ مخواہ لتاڑنا کافی ناگوار گزرا

صبح سے اس کے پاؤں میں چکر آ جاتا تھا۔ حسن اور حنا کی تیاری۔ حنا کو تو خیر مانی اسکول چھوڑ آتا تھا۔ لے کر وہ خود آتی تھی کبھی سسر گھر ہوتے تو وہ لے آتے۔ آج بھی وہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی غسل کر کے تازہ دم ہوئے کہ پیچھے ملازم لڑکا آج کی ڈاک لیے چلا آیا۔ خط۔ سندیس۔ خوبصورت بند لفافے۔ اندر کچھ ایسی کشش رکھتے ہیں کہ کتنا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ کتنی ہی جلدی کیوں نہ ہو۔ لفافہ کھولے بنا رہا نہیں جا اس نے جلدی جلدی تمام لفافے چاک کیے سب پر تیز تیز نظریں دوڑائیں۔ کوئی پرستار تو تھا کوئی ایڈیٹر۔ ایک خط گھر آیا تھا۔ دو ایک سہیلیوں کے تھے۔ آسمانی لفافہ چاک کرتے ہیں اس کا ذہن لمحے بھر کو منتشر ہو گیا۔ لکھا تھا۔

محترمہ شہلا حسن صاحبہ!

السلام علیکم!

جب سے آپ کراچی سے گئی ہیں آپ کی کوئی چیز اشاعت کے لیے موصول نہیں ہوئی۔ بے چینی سے آپ کے کلام کا منتظر ہوں۔ کوئٹہ میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہو رہا ہے۔ نامور شعراء حضرات پہنچیں

آپ سے ملاقات رہے گی۔

اب مہینوں آپ کی چیز موصول نہیں ہوتی کبھی دوسرے میگزین یا اخبار میں آپ کو دیکھتا ہوں تو احساس ہوتا ہے آپ ہمیں فراموش کر رہی ہیں۔ کوئٹہ میں تو سردیاں شروع ہو گئی ہیں۔

باقی باتیں کوئٹہ آنے پر ہوں گی اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ

خیر اندیش

ملک نواز

سب ایڈیٹر

اس نے خاموشی سے تمام خطوط دراز میں ڈال دیے۔ بات کچھ بھی نہیں تھی۔ مگر اس کی زندگی میں یہی نام پتھر کی طرح اس کے اعصاب پر پڑتا تھا۔

''حسن تم نے اس معصوم و بے ضرر انسان کو خواہ مخواہ اتنا اہم بنا دیا ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر خود سے کہا۔

جب اسے مشاعرے کا دعوت نامہ ملا تو اس نے بہت سوچا جائے یا نہ جائے۔ اس کی ایک دو تازہ غیر مطبوعہ غزلیں رکھی ہوئی تھیں جنہیں لکھ کر عجیب سا سرور حاصل ہوا تھا۔ بعض شعر تو بہت ہی اچھے ہوئے تھے۔ ایک فنکارہ کی حیثیت سے وہ داد کی طلب سے دامن نہ بچا سکی۔ اور مشاعرے میں چلی آئی اس کے ہمراہ مانی آیا تھا۔

سفید شلوار قمیض میں ملبوس ملک نواز کو اس نے دور سے پہچان لیا تھا مگر انجان بن گئی تھی۔ وہ خود اس کے پاس چلا آیا تھا۔ اس نے بس رسمی علیک سلیک کے بعد اپنا رخ ساتھی شاعرہ کی جانب پھیر لیا تھا۔ مشاعرہ نہایت کامیاب ہوا تھا۔ اسے بھی بے پناہ داد ملی تھی۔ سرمئی ساڑھی اور آف وائیٹ شال میں اس کا چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ وہ ملک نواز سے دامن بچا کر رات گئے گھر آئی تھی۔ مانی بھی اپنی بھابھی کی تعریفوں پر خوش ہو رہا تھا۔ بہت زیادہ۔

بارش تو شام سے ہو رہی تھی۔ مگر اب زور بڑھ گیا تھا۔ مانی کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باقی سب لحافوں میں دبک کر شاید سو چکے تھے۔

خلاف معمول حسن بھی جلدی سونے چلا گیا تھا۔

اس نے گھر کو چیک کیا دروازے وغیرہ بند کیے۔

عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر لحاف میں دبکنے کے خیال سے ہی اسے راحت محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ برآمدے کے دروازے لاک کر کے پلٹی ہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔

''یا اللہ خیر یہ اتنی رات گئے اس طوفانی بارش میں کون چلا آیا۔ مانی کو کہوں۔ کہیں سو نہ گیا ہو۔ یا حسن کو جگاؤں۔؟''

اسی وقت بادل زور سے گرجے کھڑکیوں کے شیشے روشن ہو گئے۔

خود ہی کیوں نہ پوچھ لوں کہ کون ہے۔ گھنٹی دوبارہ بجی پہلے سے زیادہ شدت سے۔ وہ خود ہی چھتری سر پر تانے باہر آ گئی۔ باہر کی لائٹس آن تھیں۔

اس نے سامنے گیٹ پر دیکھا کوئی بلند قامت آدمی کھڑا تھا۔ وہ مزید نزدیک آئی۔ اوہ۔ وہ گھبرا گئی۔ سامنے ملک نواز کھڑا تھا۔

''السلام علیکم!'' برستی پھواریں بھی اخلاقیات نہ بھلا سکیں۔

وہ مارے گھبراہٹ کے سلام کا جواب بھی نہ دے پائی اور بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

"اندر تشریف لے آئیے۔"

وہ جیسے اس جملے کا منتظر ہی تھا فوراً ہی اس کے پیچھے ہولیا۔

برآمدے تک آ کر وہ رک گئی۔

"غالباً آپ کہیں جا رہے تھے۔ درمیان میں یہ ناوقت بارش آ گئی۔" اب اس کے لہجے میں اعتماد آ چکا تھا۔ اس کے تمام شعوری احساسات توانا ہو گئے تھے اسے احساسات تھا کہ ایک شناسا سا مجبوری کی حالت میں اس کی دہلیز تک آ گیا ہے۔ اور اس غضب کی سردی میں بھیگا کھڑا ہے۔

"جی آپ درست سمجھیں میں بخاری صاحب کا انٹرویو لینے آیا تھا۔"

اس کے بائیں ہاتھ میں ایک چرمی بیگ بھی تھا۔ جو شہلا نے نہیں دیکھا تھا۔

"بارش تو کبھی بھی کسی مقررہ وقت پر نہیں ہوتی خیال تھا ابھی تو بادل جمع ہو رہے ہیں بارش میں دیر ہے راستے میں ہی تھا کہ۔"

"آپ تو بری طرح بھیگ گئے ہیں۔ میری بداخلاقی دیکھیے ابھی تک نہ آپ کے بھیگنے کا احساس کیا نہ بیٹھنے کو کہا۔ آپ تشریف رکھیے میں پہلے لباس کا بندوبست کرتی ہوں پھر رہائش کا۔ گھر والے سردی کی وجہ سے جلدی اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں میرے شوہر تو ویسے بھی جلد سونے کے عادی ہیں۔"

وہ اتنی وضاحت کے بعد برآمدے کے آخر میں بنے زینے کی طرف بڑھ گئی تھی۔

سیدھی اپنے بیڈروم کی طرف آئی تھی۔ حسن کو جگانے۔ ہینڈل تھاما مگر گھمائے بغیر چھوڑ دیا۔ نہ ہی وہ جاگتے ہوئے مانی کی طرف مڑی تھی بلکہ چچا کے بیڈروم کا دروازہ آہستگی سے بجایا تھا۔

دروازہ چچا نے ہی کھولا تھا۔ اسے سامنے دیکھ کر کسی انہونی پر ان کا دل دھڑکا تھا۔ شاید ثریا۔

"چچا جان۔ وہ کراچی سے ایک میگزین کے ایڈیٹر کوئٹہ سے آئے ہوئے ہیں ناں۔ وہ ادھر کسی انٹرویو کے لیے آئے تھے۔ واپسی پر بارش کا سامنا ہو گیا۔ ہمارا گھر راستے میں پڑتا ہے تو یہیں چلے آئے۔ اس غضب کی سردی میں بے چارے بری طرح بھیگے ہوئے ہیں۔ میں کافی بناتی ہوں اتنے میں آپ انہیں دیکھ لیں۔"

"اچھا۔ اوہو۔ بھئی۔ کہیں وہ بیمار نہ ہو جائیں۔ بھئی کراچی والے کہاں برداشت کر سکتے ہیں یہ موسم۔" وہ تیزی سے برآمدے کی سمت گئے تھے۔

وہ کافی کا سامان ٹرے میں لگا رہی تھی کہ چچا جان کچن ہی میں چلے آئے۔

"بیٹے! وہ میں نے نیچے والا بیڈروم کھول دیا ہے اور لباس وغیرہ ملک صاحب کو دے دیا ہے۔ کافی تیار کر لی ہو تو لے آؤ۔ میں ان کے پاس ہوں۔ اور ہاں بھئی انہیں سخت چھینکیں آ رہی ہیں۔ کوئی ٹیبلیٹ بھی لے آنا۔"

"جی اچھا۔!"

"اور بیٹے! کیا حسن اور امان سو چکے ہیں۔؟"

"وہ" تو سو چکے ہیں مانی کا پتا نہیں۔" بہو کا جواب سن کر وہ واپس چلے گئے وہ چھوٹی سی ٹرے میں تمام لوازمات کے ہمراہ نیچے چلی آئی تھی۔

چچا جان کے سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس وہ سرخ کمبل لپیٹے ہوئے تھا۔

ناک اور ہونٹ بے اندازہ سرخ ہو رہے تھے۔

"بیٹی ملک صاحب کو فوراً گرم گرم کافی دو۔ تم نے ملک صاحب کو سردی میں مار دیا۔ پہلی فرصت میں انہیں لباس دیتیں حسن کا یا مانی کا۔"

"ملک صاحب! بہت زیادتی ہو گئی۔ آپ کے ساتھ۔"

"چچا جان۔ آپ کے لیے کافی بناؤں۔"

"ضرور بھئی۔ ابھی مہمان کے پاس بیٹھنا ہے ناں۔"

"آپ میری خاطر اتنی تکلیف نہ کیجئے۔" ملک نواز کو اس حد درجہ خلوص پر جیسے شرمندگی ہو رہی تھی۔

آتشی گلابی گرم شلوار سوٹ پر طاؤسی شال اوڑھے وہ شب کے سلیقے میں تھی۔ چہرہ بے داغ اور بال بے سلیقہ تھے۔ کپڑے شکن آلود۔ آنکھوں میں نیند بے چین تھی۔ مگر مارے اخلاق کے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔

اس کا ناتا اس سے قلمی تھا۔ قلمی ناتے بڑے معتبر اور واہموں اور اندازوں پر استوار ہوتے ہیں۔ ہر توقع کی بنیاد اپنا ذاتی علم و تجربہ ہوتا ہے۔

ان میں مسلسل ملاقاتوں کا دخل کم ہوتا ہے۔ اس لیے ان ناتوں میں اتنی شیرینی اور گداز ہوتا ہے۔

اس نے کسی نئی کتاب کو موضوع نہیں بنایا۔ اس نے اپنی غزلوں کی بابت کوئی بات نہیں کی۔ اس نے کسی ادبی گروپ و قبیلے پر تبصرہ نہیں کیا۔ کسی ادیب کے بیان کو موضوع بحث نہیں بنایا جبکہ اس سے سارے رشتے انہی حوالوں سے تھے۔

وہ اس کا کلاس فیلو، رشتے دار، ہمسایہ کچھ بھی نہیں تھا اور شاید محض شناسا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کا کچھ بھی نہیں تھا اور وہ اسے نظرانداز بھی نہیں کر سکتی تھی۔ شاید اس کا شوہر اسے وفا کا اعتبار دیتا تو اس ملاقات کا چہرہ اور ہوتا وہ اپنی فطری خوش اخلاقی سے پیش آتی اس طرح کہ وہ اس نامور شاعرہ کے ہاں قیام کو زندگی کا یادگار واقعہ تعبیر کرتا۔

وہ انسانی شعور و اخلاق کو احتیاط کی زنجیر پہنا کر بصرف مروت برت رہی تھی۔

"آپ لوگ آرام کیجئے۔ میں تو آپ لوگوں سے از حد شرمندہ ہوں کہ ناوقت آپ کو تکلیف دی۔"

وہ پشیمان سا تھا۔

"نہیں بھئی تکلیف کیسی۔ ملک صاحب ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ اچھا آپ آرام کیجئے صبح ملاقات رہے گی۔"

انہوں نے کافی کا مگ ٹرے میں رکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے وہ بھی سسر کے ساتھ کھڑی ہو گئی جھک کر ٹرے اٹھائی۔ پھر جاتے جاتے پلٹ کر گویا ہوئی۔

"شب بخیر۔!"

"شب بخیر۔!" وہ اسی زاویے سے بیٹھا تھا۔

بستر پر لیٹ کر بھی دیر تک اس کی آنکھوں میں نیند نہیں اتری۔

شاید کل کا سورج مہربان نہیں ہو گا۔ صبح دنیا کو توانائی اور مصروفیت دے گی اور اس کے اندر واہموں اور ناکردہ گناہوں کا سورج دہکے گا۔

وہ مجرم نہیں ہے۔

مگر وہ اسے اس طرح دیکھے گا کہ ساری عمر کا علم و تجربہ اس کی ایک نظر میں ضائع ہو جائے گا۔ جواز گناہ گار کے پاس ہوتے ہیں۔ وہ گناہ گار نہیں تھی۔ پڑتال کے جواب میں خاموشی ہو تو وہ بھی جرم بن جاتی ہے۔ وہ بہت کچھ کہے گا۔

اور وہ چپ رہے گی۔

اس کا جرم اس قدر کڑا ہے کہ سزا مل کر رہے گی۔ اس کا سب سے سنگین جرم فطری مروت ہے۔ اس سے بھی بڑی خطا یہ ہے کہ وہ اس جفا جو کی انتہائی دفادار ہے وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اتنی محبت کہ ہر نظر سلامی دیتی ہے۔ ہر دھڑکن دعا دیتی ہے۔ بھلا کتنا سنگین جرم ہے اس کا۔

وہ گمنام نہیں ہے۔ وہ کم نام بھی نہیں ہے۔ اس کی معمولی نشست و برخاست کی خبر بھی لگ جاتی ہے۔ اس کی آمدورفت کو بھی خبر بنا کر لگایا جاتا ہے۔

وہ اس مہذب انسان اور بے ضرر شخص سے کس طور کہے کہ میرا شوہر تمہاری قدر دانی پسند نہیں کرتا۔ اس کا خیال ہے میں انتہائی شفاف ہوں پرستار کی نظر سے آلودہ ہو جاتی ہوں۔ برائے مہربانی مجھے دعوت نامے نہ بھیجا کرو۔ مجھ سے خط لکھ کر فرمائش نہ کیا کرو۔ مشاعروں اور ادبی تقریبات میں اپنے کیمرے کا رخ میری سمت نہ کیا کرو۔

میں تم سے یہ سب کیسے کہہ دوں۔ تم یقیناً حیران پریشان ہو جاؤ گے اور میرے شوہر کے بارے میں جو رائے قائم کرو گے۔ وہ میری محبت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

میں کیسے بتاؤں۔

اس نے گردن موڑ کر پہلو میں خواب حسن کو دیکھا۔

میں کیسے بتاؤں۔

یہ جو میرا ساتھی ہے۔ بہت اعلیٰ ہے۔ بہت آگاہ ہے۔ اس کا علم میری صلاحیت کا زیور بنا ہے۔ اس نے مجھے مکمل کیا ہے۔ میں اسے پڑھتی ہوں۔

میں اسے جانتی ہوں۔

میں نے اسے اندر سے پالیا ہے۔

میں اسے برا بھی نہیں کہہ سکتی۔

میں اس سے لڑ بھی نہیں سکتی۔

میں اسے سارے جہان سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔

جب ہی تو اتنا روتی ہوں کہ

محبت کا مقدر آنسو ہیں

محبت کا زیور محرومی ہے۔

یہ شدید ہو رہا ہے۔

اور میں اس سے محروم ہو رہی ہوں۔

یہ میرا محبوب بھی ہے۔

ہمارے درمیان۔ ہجر و فراق کے اضطراب نہیں ہیں۔

مگر خوف و شک کا اضطراب ہمیں ایک ساتھ زنجیر کر رہا ہے۔

محبت جب حد سے بڑھ جائے تو دل بے اعتبار ہو جاتا ہے۔ کسی موڑ پر بچھڑنے کا خوف زندگی اذیت ناک بنا دیتا ہے۔

صبح۔ اے کاش صبح نہ ہو۔

ورنہ محبتوں کی جنگ ہو جائے گی۔

دونوں طرف پسپائی ہو گی۔

الفاظ و جملے جنگی قیدی بنیں گے۔

دل کے قید خانوں میں بند ہو کر اذیت کا سامان کریں گے۔

وہ اپنی شدتوں پر خفگی کے خاردار تار لگا دے گا۔ میں دنوں اسے کاٹوں گی۔ میرے ہاتھ لہولہان ہو جائیں گے۔

بے بنیاد وجہ۔ مجھے کتنی اذیت دے گی۔ یہ ہے محبت کا انجام؟

وہ شاید زیادہ دیر نہ سو سکتی تھی۔

بہت جلد ہی اٹھ گئی تھی۔

غسل کر کے نماز پڑھی قرآن کی تلاوت کی۔

باہر لان سے گلاب کے پھول اور بیلے کی کلیوں کا گجرا بنا کر نم اور خوبصورت بالوں میں لگایا۔ آنکھوں کو کاجل سے سجایا۔ اسے ہمیشہ سے صبح ہی صبح خود کو سنوارنا بہت پسند تھا۔ وہ اسے اٹھاتی اور وہ خوابیدہ آنکھوں سے اس کا اجلا اور مصفا سراپا دیکھ کر ساری دنیا کی الجھنیں بھول جاتا۔

وہ آہستگی سے بیڈ پر آ کر ٹک گئی۔

وہ آنکھوں پر بازو رکھے ایک مسیحی اور آسودہ نیند لے رہا تھا۔

گھنی مونچھوں تلے کشمیریوں جیسے صحت چھلکاتے سرخ ہونٹ جانے کون سے تصور میں مسکرا رہے تھے۔ وہ اس کے بے خبر سراپے کو دیکھتی تو وصل کے کتنے یادگار لمحے اسے حیا سے نظریں جھکا دینے پر مجبور کر دیتے تھے۔

اس نے حیا سے نظریں جھکا لی تھیں۔

”حسن۔ اٹھ جایئے۔ ساڑھے سات ہو رہے ہیں۔“

”اونہوں۔“ اس نے کروٹ بدل لی۔

”پلیز حسن۔ پھر مجھ پر بگڑیے گا کہ دیر سے اٹھایا ہے۔“ وہ حسن پر جھک آئی۔

حسن نے کوئی جنبش نہیں کی۔

”دیکھیے۔ بس آخری بار اٹھا رہی ہوں۔ پھر مجھے نہ کہیے گا۔“ وہ اٹھنے لگی۔

سونے کے کنگن کھنکھنا کر رہ گئے۔ اس کے نرم ہاتھ حسن کے مضبوط ہاتھوں میں تھے۔

”مجھے خوشبوئیں آئی ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ آج پھر تو پہلی شب کی دلہن بن کر آئی ہے۔“ اس کی دھیمی اور بھاری آواز ابھری۔

”سچ حسن۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ چچی جان صبح سے کچن میں ہیں میں نے تو جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ کیا سوچتی ہوں گی۔“

”جب تو ان کے سامنے جائے گی تو وجہ سمجھ جائیں گی۔“

”پلیز حسن میرا ہاتھ چھوڑیں۔ گھر میں مہمان بھی ہیں۔ بس جلدی سے اٹھ کر غسل کر لیں۔ میں ناشتہ لگاتی ہوں۔ بچیاں الگ پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

حسن نے کروٹ بدلی اور سیدھا ہو گیا۔

اس کی سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر ٹک گئیں۔

''ایسا لگتا ہے۔ صبح تیری خاطر ہوتی ہے۔''

''اچھا بنائیے مت۔''

''یہ مہمان کون آ گئے؟''

''آپ اٹھیے تو سہی۔''

وہ اس کا سنگھار بگاڑنے کی خطائیں کرنے لگا تو وہ تیزی سے کھڑی ہو گئی۔

''پلیز حسن! بعض اوقات تو آپ بہت تنگ کرتے ہیں۔''

''میں اسے محبت کہتا ہوں۔''

''اچھی پر تشدد'' وہ کھلکھلا کر باہر چلی آئی۔

ہما کو تیار کر کے مانی کے حوالے کیا۔

چچی جان نے بتایا۔

''تمہارے چچا تو مہمان کے پاس اخبار لے کر گئے تھے وہیں کے ہو رہے ہے۔ دو اخبار ہوں گے تو یہی ہو گا۔''

''دو اخبار'' وہ کیتل کا سوئچ بند کرتے ہوئے متعجب ہوئی۔ ''اخبار تو ایک ہی آتا ہے۔''

''تمہارے چچا کسی اخبار سے کم ہیں کیا۔''

''اے۔ دلہن۔ یہ رسالے والا آدھی رات کو بارش میں کیا چہلیں کرنے نکلا تھا؟''

''نہیں چچی جان۔ ہم سے آگے والا جو ایریا ہے ناں وہاں بہت بڑے شاعر رہتے ہیں۔ ان کا انٹرویو کر کے واپس آ رہے تھے کہ بارش نے راستے ہی میں زور پکڑ لیا۔ ان کی قسمت اچھی تھی کہ ہمارا گھر راستے میں پڑتا ہے۔''

''ناشتے پر کیا کیا رکھنا چاہتی ہو۔''

''جو بھی کچھ ہے۔ وہی رکھ دیں گے۔''

''ارے اتنی دور کا مہمان ہے۔ کچھ تو اہتمام کرنا ہو گا۔'' چچی جان فطرتاً مہمان نواز تھیں۔

''ذرا میں حسن کو دیکھتی ہوں تیار ہو رہے ہیں یا ابھی بستر پر ہی ہیں۔'' وہ باہر نکل آئی۔

وہ بالوں پر اسپرے کر رہا تھا۔ اسے آئینے میں دیکھ کر مسکرایا۔

''چلیں جناب! ناشتہ تیار ہے۔''

''چلیے صاحب'' اس نے ایک نظر رسٹ واچ پر دوڑائی۔ وہ آگے پیچھے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے۔ عین سامنے کی کرسی پر ملک نواز اور اس کے مقابل چچا جان تھے۔ مانی ملک نواز کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ حسن کی تیز چال مدھم پڑ گئی تھی۔ یا شاید اتفاق کی ضرب اتنی بھاری تھی کہ زمین کی گردش رک گئی تھی۔

ملک نواز نے حسن کو دیکھ کر انتہائی اخلاق سے کرسی چھوڑ دی۔

''السلام علیکم حسن صاحب!'' حالانکہ یہ انداز حسن صاحب کا ہونا چاہیے تھا۔

اور حسن نے اسی سرد مہر انداز میں ہاتھ ملایا۔

سیاہی مائل گرین سوٹ اور ہم رنگ ٹائی میں حسن مردانہ وجاہت میں ایک ہی لگ رہا تھا۔ اس کا گنگناتا ذہن۔ ایک نقطے پر ٹھہر گیا تھا۔ تحیر کے نقطے پر ڈرائنگ سے ڈائننگ تک کا فاصلہ۔ آدھے گھنٹے کی ملاقات سے لے کر اس

گھر میں شب بھر کا گزر۔ کتنے بڑے بڑے کام ہو گئے۔ کس قدر لاتعلق ہے وہ۔ کتنا لاعلم۔

اس نے گردن موڑ کر سرخ سوٹ اور سبز شال میں ملبوس اپنی سجی سنوری بیوی کو ایک لمحے کے لیے دیکھا۔ جس کے وجود کی مہک اس کے سینے سے ابھی معدوم نہیں ہوئی تھی۔

''آؤ بھئی حسن! تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا۔''

''بھئی یہ ملک صاحب اتفاقیہ مہمان ہوئے ہیں مگر خوب ہوئے ہیں بہت دلچسپ آدمی ہیں۔'' چچا جان نے بے حد اخلاق کا مظاہرہ کیا جس کے جواب میں بیٹا خاموش رہا۔

''ارے تم ناشتہ نہیں کر رہے۔''

''بس ذرا جلدی ہے مجھے۔''

''سنا ہے ملک صاحب۔ بھابی کو آپ نے بنایا ہے۔''

''نہیں بھئی۔ انہیں تو اللہ نے بنایا ہے۔'' بڑی برجستگی سے ملک نواز بولا تھا۔

''ارے نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ آپ ہی بھابی کو اکساتے رہے ہیں لکھنے پر۔''

''نہیں امان صاحب۔ اگر اکسانے سے لوگ فنکار بنتے تو سب ہی فنکار ہوتے کہ شہرت تو سب کو اچھی لگتی ہے۔ میں نے تو بیگم صاحبہ کو اس وقت دیکھا جب یہ بہت بڑی شاعرہ بن چکی تھیں۔ البتہ میں ابتداء سے ان کی شاعری پسند کرتا رہا ہوں کہ ان کی شاعری ہر حساس دل کی آواز ہے۔''

''حسن! آپ یہ بوائل انڈا لے لیں۔ دوپہر کو بھی کھانا دیر سے کھاتے ہیں۔''

وہ اس کے برابر بیٹھی اس کے ناز اٹھا رہی تھی۔

''بھابی۔ بھائی جان کا خیال تو روز رکھا جاتا ہے۔ اپنے مہمان کو بھی دیکھ لیں۔'' مانی شاید اس کی اس درجہ لاتعلقی پر حیران تھا۔

''ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ ملک صاحب قطعی تکلف نہ کیجیے گا۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اپنا ہی گھر سمجھیے۔'' مانی نے ٹکڑا لگایا۔

حسن نے چائے کا کپ رکھا۔

''ملک صاحب! ڈونٹ مائینڈ میں ذرا جلدی میں ہوں۔'' لہجہ معذرتی نہیں سرسری تھا۔

''اچھا خدا حافظ۔'' وہ گویا سب کو خدا حافظ میں نمٹا گیا۔

''بھئی حسن۔ آج دوپہر کے کھانے پر آ جاؤ۔ ملک صاحب کے ساتھ بھی ایک وقت کا کھانا ہو جائے۔''

حسن کی بد اخلاق نظریں ملک نواز کی سمت اٹھیں۔ (گویا یہ حضرت دوپہر تک بھی یہیں ہوں گے؟)

''دیکھوں گا۔''

وہ اس کے پیچھے پیچھے نکل آئی۔

اس نے پورچ میں آ کر گاڑی کا لاک کھولا۔

''سنیں۔ گیارہ بجے تک گاڑی بھجوا دیجیے گا۔ کچھ ضروری چیزیں لینے بازار جانا ہے۔''

اس کا لہجہ عاجزانہ تھا۔ کیسی ڈھول مٹی اوقات کر لی تھی اپنی۔

وہ دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ بریف کیس پیچھے ڈال دیا۔ پھر ترچھی نظر سے شہلا کو دیکھا۔ جو حرم سرا کی معمولی

کنیز بنی کھڑی تھی۔ کیا مجبور ہو جاتا ہے انسان محبت میں۔

''سب ضروری چیزیں گھر ہی میں ہیں۔'' وہ گاڑی بیک کر گیا۔

وہ انگارے اچھال گیا تھا۔ جن پر اسے اس کی واپسی تک چلنا تھا۔

☆☆☆

''سنو تم کون ہو۔؟''

اس نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس خوبصورت افتاد کو دیکھا۔

''مجھے ملک نواز کہتے ہیں۔'' اس کے انداز میں پر تکلف مہمان کی جھلک تھی۔

''کیوں کہتے ہیں۔؟'' اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''جی۔؟'' وہ متعجب ہوا۔

''تمہیں بھائی جان کیوں نہیں کہتے۔؟ ملک نواز کیوں کہتے ہیں۔؟''

''یہ میرا نام ہے۔'' اس نے حیرانی پر قابو پا کر وضاحت کی۔

''ہونہہ۔ بڑا اچھا نام ہے؟'' اس نے ناک چڑھائی۔

''سنو تم اس کمرے میں کیوں آئے۔؟ آپا ماریں گی۔ جلدی سے بھاگ جاؤ۔''

''جی۔؟'' اس کا شبہ یقین میں بدل گیا۔

''پتا ہے کیا ایک دفعہ میں نے مالی کی بکری اس کمرے میں باندھ دی تھی آپا نے مجھے بہت مارا تھا۔ بہت مارتی ہیں مجھے۔'' اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

اس نے سوا پانچ فٹ اونچی بہار کی جھومتی شاخ کو دیکھا۔ نیلے کپڑوں اور سرخ سویٹر میں بغیر دوپٹے کے بے پناہ حسین لگ رہی تھی۔

''بی بی۔ تم کون ہو۔؟''

''خود ہوں گے ''بی بی'' میں تو ثریا ہوں۔ سب مجھے ثریا بولتے ہیں۔ وہ جو سعید چائے والا ہے ناں۔ وہ مجھے پگلی کہتا ہے۔ ہوگا خود ہی۔''

اس نے پھر معصوم بچوں کی طرح ناک چڑھائی۔

اس نے لپک کر ایش ٹرے اٹھائی اور آلتی پالتی مار کر قالین پر بیٹھ گئی۔

''سنو۔ تم سگریٹ پیتے ہو۔؟''

''ہوں۔؟''

''اچھا مجھے ناک سے دھواں نکال کر بتاؤ۔'' وہ ٹھنکی۔

''ہائیں۔!'' ایک لمحے کو تو وہ ہونق ہو گیا۔

''بتاؤ ناں۔'' وہ آگے کھسک آئی۔ ہمارے مالی کو تو اتنا اچھا دھواں نکالنا آتا ہے۔ میں بتاؤں۔؟ اس نے آگے بڑھ کر سگریٹ کی ڈبیہ اٹھالی اور ایک سگریٹ نکال کر بغیر سلگائے منہ میں آدھا بھر لیا اور سانس اندر کھینچا۔ پھر باہر نکالا۔ جب دھواں نہ نکلا تو سگریٹ توڑ موڑ کر پھینک دیا۔

''ہونہہ۔ بڑا اچھا سگریٹ ہے۔''

باہر قدموں کی آواز سنائی دی تو وہ گھبرا گئی۔

''شاید آپا آ رہی ہیں۔ ہائے اللہ جلدی سے بھاگ جاؤ۔ بہت زور سے مارتی ہیں۔ بھیا۔ میں تو چھپ جاتی ہوں۔'' وہ جھٹ دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔

چچا جان کمرے میں داخل ہوئے۔

''ارے یہاں تو ثریا کی آواز آ رہی تھی۔'' وہ حیران ہوئے۔

ثریا کی کھنکھتی ہنسی دروازے کے پاس سے ابھری تو وہ چونک کر پلٹے۔

''ارے بیٹا۔ بھئی بہت تنگ کرتی ہو۔ تمہاری آپا تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ جاؤ ناشتا کر لو۔ شاباش۔''

''یہ۔ یہ۔!''

''بیٹی ہے میری۔'' ان کا سر جھک گیا۔

''غالباً۔'' وہ آگے نہ بول پایا۔

''بہت چھوٹی تھی یہ ہماری لاپروائی کی نذر ہو گئی اس کی زندگی۔'' اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی شامل ہو گئی۔

''اوہ۔!'' اسے واقعی افسوس ہوا۔

''کیا ہوگا اس کا ہمارے بعد۔؟''

''علاج نہیں کرایا۔''

''کون سا علاج ہے جو نہیں کیا۔ یہ تو اس کی تھوڑی بہت بہتر پوزیشن ہے پہلے تو بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اب انشاء اللہ باہر لے کر جاؤں گا۔ آخر آس ٹوٹی تو نہیں ہے۔ یہاں تو سب نے ویسے مایوسی ہی ظاہر کی ہے۔'' ان کا لہجہ ٹوٹ رہا تھا۔

ملک نواز نے موضوع بدل دیا۔

''خان صاحب! آپ کھانے وغیرہ کا بلاوجہ تکلف کر رہے ہیں۔ بس مجھے اجازت دیجئے۔''

''نہیں بھئی۔ کوئی تکلف نہیں ہے۔ یہ سب ہم اپنی بیٹی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ آخر آپ اس کے مہمان ہیں تو ہمیں بھی عزیز ہیں اور پھر کافی دور سے آئے ہیں۔'' چچا جان کے مہذب و مشفق لہجے سے وہ مجبور سا ہو گیا تھا۔

''آپ خیال نہ کیجئے گا۔ شہلا آپ کو زیادہ وقت نہ دے سکی۔ بہت ذمہ دار بیٹی ہے۔ پورے گھر کو سنبھالا ہوا ہے۔ ہر کام میں ماسٹر۔ مجھے تو بہت فخر ہے۔ میں اس سے کب سے کہہ رہا تھا کہ بھئی اپنی شاعری کا مجموعہ چھپواؤ تب اس نے مجموعہ چھپایا۔ آپ نے تو پڑھا ہوگا۔'' ''سندیسے۔؟''

''جی۔ میں نے ان کی شاید ہی کوئی چیز چھوڑی ہوگی۔ منیر نیازی۔ مجید امجد کے بعد میں نے سب سے زیادہ آج کے شعراء میں ان کو پڑھا ہے۔ تمام دنیا کے معاملات پر ان کی گرفت۔ ان کی وسیع معلومات، خوبصورت انتخاب الفاظ اور غم دواں کی بھرپور عکاس ہے ان کی شاعری۔ جو انہیں پڑھتا ہے۔ ان کا ہو جاتا ہے۔ آج کی بے مثال شاعرہ۔''

چچا جان بہو کی اتنی ڈھیروں ڈھیر تعریف پر پھولے نہ سما رہے تھے۔

وہ دوپہر کے کھانے پر نہیں آیا تھا۔ ادھر اس کے حلق سے بھی دو چار نوالے ہی اترے تھے۔ چچی جان کے ہمراہ اس نے کھانے کا خاصا اہتمام کیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے ہی تھی کہ عالیہ کا فون آ گیا۔ واپس سسرال جانے کے بعد اس کا فون پہلی بار آیا تھا۔ وہ کافی دیر بات کرتی رہی فون چچی جان کو تھما کر باہر آئی تو ملک نواز باہر برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔

"مسز حسن۔اب اجازت دیجئے۔ بہت زحمت دی آپ کو۔"

"ار۔رے نہیں۔یہ تو ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ ہمارے مہمان ہوئے۔" اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔؟"

"نہیں جی۔اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔آپ کے گھر میں قیام تا حیات یاد رہے گا۔سب گھر والے بہت اچھے ہیں۔یقین کیجئے میں آپ سب کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

"نہیں ملک صاحب۔کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔یہ تو ہمارا فرض تھا۔"

وہ اپنا سوٹ پہنے کھڑا تھا۔مضبوط سراپا اپنے اندر بے پناہ کشش رکھتا تھا۔اس پر اس کا نرم اور دھیما لہجہ۔کس قدر معصوم آدمی ہے یہ۔حسن۔کاش تم اسے پڑھتے اور اس قدر بد اخلاقی کا مظاہرہ نہ کرتے۔

وہ چلا گیا۔تالاب میں کنکر پھینک کر۔

وہ سر شام بھی نہ آیا تھا۔

شہلا بے پناہ ہراساں تھی۔

سب کھانا کھا چکے تھے اور وہ بے قرار پھر رہی تھی۔وہ چاہتی تھی کہ معرکہ ہو جائے تاکہ سکون ہو جائے اور نیند اپنی ہو جائے۔

رات دس بجے کے قریب گھنٹی بجی تھی وہ تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی۔گیٹ کھول دیا۔

وہ گاڑی اندر لے آیا۔

وہ گیٹ بند کر کے پلٹی تو وہ گاڑی بند کر کے اندر جا چکا تھا۔

تب وہ آہستہ روی سے بیڈ روم میں آئی تھی۔

حسن ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا۔ٹائی ڈھیلی کر کے ریسٹ واچ کف لنکس وغیرہ اتار کر رکھ رہا تھا۔اس نے سر جھکایا ہوا تھا وہ آئینے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

"بہت دیر ہوگئی آج۔؟" اس نے ہمت کر کے پہل کی۔

وہ خاموش رہا۔

"کھانا لگاؤں۔؟"

خاموشی۔

وہ نئی بات سوچنے لگی۔اور حسن لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلا گیا اسے معلوم تھا وہ منہ ہاتھ دھونے باتھ روم جائے گا۔وہ باتھ روم کے دروازے پر آ کھڑی ہوگئی۔اس کا تو اسے اطمینان تھا کہ صبح چچا نے ملک نواز کی آمد کی وجہ بیٹے کے سامنے دہرا دی تھی باتوں باتوں میں۔

حسن سیدھا باتھ روم کی سمت گیا تھا۔مگر وہاں اسے ایستادہ دیکھ کر چند ثانیے ٹھٹکا اس کو نظر انداز کرتے ہوئے ہینڈل گھمانے لگا۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں۔کھانا لگاؤں۔؟"

اس کی اجنبی نظریں بیوی کی سمت اٹھیں۔

"میں آدھی رات کو کھانا نہیں کھاتا۔"

"کھا کر آئے ہیں۔"

"ظاہر ہے۔اگر تم مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ تب بھی کھانا تو کھاؤں گا ہی۔"

"میں کیوں جانے لگی کہیں۔اپنے گھر میں رہتی ہوں۔"

وہ خاموش رہا۔تب وہ ہٹ گئی۔

دروازے وغیرہ بند کر کے وہ اندر واپس آئی تو وہ کمبل تان کر لیٹ چکا تھا۔ایک لمحے کو تو وہ تپ کر رہ گئی بنا بات کے وہ آخر استخواں کیوں پھونکتا ہے۔

"کیا جرم کیا ہے میں نے۔شعر کہنا چھوڑ دوں۔؟لوگوں سے ملنا چھوڑ دوں چلو یہ سب بھی کرلوں کیا لوگ میرا ماضی کا آئینہ ڈھانپ دیں گے۔وہ تو پرانی یادگار کی طرح تجھے پھر بھی کھوج لیں گے۔"

وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"حسن۔آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اتر آئی تھی آخر وہ اس کی بے رخی کیوں کر برداشت کر سکتی تھی۔؟

"حسن۔!"

"حسن۔ایسے مت کیجئے۔مجھے ڈانٹ لیجئے، مجھے بہت کچھ کہہ لیجئے۔میں نے کیا کیا ہے یہ آئے دن مجھے کس بات کی سزا ملتی ہے۔"

خاموشی۔

"حسن میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ میاں بیوی کو سارے پرانے جھگڑے نمٹا کر سونا چاہئے۔تاکہ نئی صبح کا سواگت خوش دلی سے ہو۔پھر آپ مجھے یہ اذیت کیوں دے رہے ہیں؟"

"یہ تم کیا بے وقت کی راگنی لے کر بیٹھ گئی ہو۔"

"مت میرے سامنے یہ اداکاری کیا کرو۔" اس نے چہرے سے کمبل ہٹا کر اسے بری طرح جھاڑ دیا۔

وہ اس کی تیز آواز پر ایک دم ڈر کر پیچھے ہوگئی۔

"آپ مجھے ناحق تنگ کرتے ہیں۔میرے ستھرے ذہن کو پراگندہ کرتے ہیں۔بلاوجہ، بے قصور، یہ میرا ہی حوصلہ ہے جو میں برداشت کرتی ہوں۔آپ سے کچھ نہیں کہتی۔حسن آپ نے مجھ سے میری ذات کا اعتماد چھین لیا ہے۔اتنا ڈرایا ہے کہ رسی سانپ لگنے لگی ہے۔" آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

"بتائیے۔میرا قصور کیا ہے۔آخر سارے گھر میں صرف آپ ہی کو کیوں شکایت ہوتی ہے۔چچی جان، عالیہ مانی اب سب سے میرا کتنا نازک رشتہ ہے۔مگر انہیں آج تک مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔پھر صرف آپ کو۔"

"دماغ خراب ہے میرا۔خبطی ہوں۔جاؤ مجھے پریشان نہ کرو۔"

"پہلے یہ بتائیے۔موڈ کیوں خراب ہے۔؟" کتنی نڈر ہوگئی تھی۔اپنی بات پر اڑ گئی تھی۔

"کیا چاہتی ہو تم۔کہیں اور جا کر سو جاؤں۔؟" اس نے کمبل پھینک دیا اور جھک کر سلیپر ڈھونڈنے لگا۔وہ ایک دم ڈر کر کھڑی ہوگئی۔بے بسی پر آنسوؤں کے پھندے حلق میں اٹکنے لگے وہ نیچے چلا جائے گا۔سب سے آخر میں حسن ہی اٹھتا ہے۔

صبح نئی کہانی بنا دے گی۔

جب یہ نیچے گیسٹ روم سے نکلے گا۔ سب میرا چہرہ پڑھیں گے۔ میں جو چھلکتا پیمانہ ہو رہی ہوں کیونکر چھپا پاؤں گی۔

بات اس کمرے سے نکل کر خوشبو کی طرح پھیلے گی۔ اس کا کچھ بھی نہیں بگڑے گا اس بلا عنوان کہانی کا عنوان ہر کوئی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق رکھے گا۔

اسے یہ بھی احساس نہیں کہ میری چادر پر چھینٹے لگا کر یہ مجھے ساری زندگی کے لیے سرنگوں کر دے گا۔

میں اس کی بے مثال چاہت کے کلمے پڑھتی ہوں۔

یہ مجھے کس جہنم میں ڈالنے لگا ہے۔

اے خدا اگر یہ اس کی محبت ہے تو مجھے اس سے محروم کر دے۔ مجھے محبت کی وہ صورت دکھا جس نے لوگوں کی راہوں میں دیے اجالے۔

اگر یہ میری تقدیر کی آزمائش موڑ ہے تو میرا ظرف بڑھا۔

وہ اس سے پہلے کمرے سے نکل گئی اور دروازہ بند کر دیا۔

پھر اس نے برآمدے کے ستون سے ٹک کر کس قدر آنسو بہائے تھے۔ محبوب جس دامن کی تمنا کرتا ہے۔ وہ اسے میسر تھا۔ مگر کس قدر تنگ تھا۔

اس کی خفگی سے زیادہ اس بات کا ڈر تھا کہ یہ افسانہ سچی کہانی نہ سمجھ لیا جائے۔ کہانی گھر گھر نہ پھیل جائے۔ وہ شاید ساری زندگی اس قدر نہ روئی ہوگی۔ اس کے دل کی کیفیت بھنور شناس ملاح ہی بخوبی سمجھ سکتا تھا۔ پھر وہ جانے کون سے پہر اپنے کمرے میں آئی تھی اور کمبل اٹھا کر آہستگی سے صوفے پر لیٹ گئی تھی۔

وہ حنا کو آغوش میں لیے تھپک رہی تھی۔ کہ امان چلا آیا۔

"ارے بھابھی۔ سخت غضب ہو گیا۔ بھئی۔ وہ لوگ شام کو پشاور جا رہے ہیں۔ بھابھی۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کچھ اسٹیپ تو اور لیں ناں۔" وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

"ارے بھئی تم تو یونہی پریشان ہو رہے ہو۔ چچی جان راضی ہو گئیں تو ہم رشتہ مانگنے پشاور چلے جائیں گے۔"

"اور جو امی کے راضی ہونے تک معاملہ ہی۔"

اس نے نظریں اٹھا کر مانی کو دیکھا اونچا لانبا۔ بہت حد تک حسن سے مشابہ۔

آخر بے قراری کے بعد یہ کیسا قرار آتا ہے کہ طوفانوں کے دائرے پھیلنے لگتے ہیں۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ ساحرہ کے لیے تمہاری چاہت سدا ایسی رہے گی۔"

"بھابھی ہم کوئی دل پھینک قسم کے ایسے ویسے۔

سچ اگر امی نہیں مانیں تو گھر چھوڑ دوں گا۔" اس نے بناوٹی انداز میں ڈائیلاگ بولے۔

"ارے۔ اے۔ تم تو بالکل ہاتھ سے گئے۔"

"پانچ سال پہلے ایک صاحب بھی ہاتھ سے جا چکے ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"بھابھی۔ پلیز فی الوقت تو آپ ہی چلی جائیے۔ انہیں یاد کرا دیجیے ہم لوگ بھی پشاور کا قصد کر رہے ہیں۔"

"لو۔ خواہ مخواہ انہیں آس دلاؤں چاہے چچی جان صفا چٹ انکار کر دیں۔"

"بھابھی۔ کچھ خوف کیجیے۔ کوئی گھڑی قبولیت کی بھی ہوتی ہے؟"

"مانی۔ تم واقعی چاروں شانے چت ہو۔"

"بھابھی۔ پلیز جائیے ناں۔ وہ لوگ سامان باندھ رہے ہیں۔"

"حلیہ دیکھ رہے ہو میرا۔؟"

"سب ٹھیک ہے۔"

"مانی بعض اوقات تو بالکل بچوں والی حرکتیں کرتے ہو میری بیٹی سونے لگی تھی لے کر ڈسٹرب کر دیا۔"

"یہ دیکھیے کتنا فرق ہے بیٹی اور دیور میں۔ میری ڈسٹربنس کا کوئی احساس ہی نہیں۔ پلیز چلیے۔"

"مگر بھئی کیوں۔؟ کیا کروں گی میں وہاں جا کر۔ خدا حافظ ہی کہنا ہے ناں جا کر کہہ آؤ۔ جب راہ ہموار ہو جائے گی تو ہم اس سے براہ راست پشاور میں جا کر مل لیں گے۔ اتنی جلدی جلدی پڑوسی کے ہاں جاؤں گی تو چچی جان شبے میں پڑ جائیں گی اور جب بات کھل جائے تو مورد الزام میں ہی ٹھہرائی جاؤں گی۔"

"بہت ہی ڈرپوک ہیں آپ تو۔ کس قدر پیار کرتی ہیں امی آپ سے۔"

"ٹھیک ہے۔ ان کی عنایت ہے۔ لیکن اس میں کچھ ہاتھ میرا بھی ہے۔ محترم۔ ایسے نہیں ہوتا مانی۔ اگر تمہاری قسمت ہے ناں تو وہ بس تمہاری ہی ہے۔ جو چیز تقدیر ہوتی ہے۔ اس کے سبب خود بخود بنتے ہیں۔ تمہارا تو بس نہیں چل رہا کہ کھڑے کھڑے دو بول پڑھوا آؤ۔"

"یہ بات نہیں ہے بھابھی۔ دراصل۔ میں نے اس جیسی لڑکی ابھی تک دیکھی ہی نہیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی لڑکی مجھے اس حد تک متاثر کرے گی۔"

"امان۔ اگر عالیہ صمد کی علالت کی وجہ سے فوراً پنڈی نہ جاتی تو میں آج ہی چچی جان سے بات کر لیتی۔ عالیہ آ گئی تو ہم پہلی فرصت میں تمہارا ہی کام کریں گے۔"

"لیکن فی الحال تو آپ چلیے ناں۔ کیا کہیں گے وہ لوگ کہ آپ لوگوں نے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔"

"بھئی خدا حافظ کہنے تو انہیں آنا چاہیے۔ چلو خیر چلتی ہوں۔ پھر کہو گے کہ بھابھی نے اتنی سی بات بھی نہیں مانی۔" اس نے حنا کو لٹا کر آئینے میں اپنے حلیے پر نظر دوڑائی۔ اور شال اچھی طرح لپیٹ لی۔

حنا کو گود میں بھر کر وہ چچی جان کے پاس آئی۔

"چچی جان! ذرا میں اور مانی نجمہ کے ہاں جا رہے ہیں وہ جو ان کے مہمان ہیں آج واپس جا رہے ہیں۔ بہت اچھی لڑکیاں ہیں۔ ذرا مل ہی آئیں۔"

"جلدی آ جانا دلہن۔ اور یہ مانی بھلا جا کر کیا پنکھا ہلا کر ہوا دے گا۔ اس کا کیا کام نری لڑکیوں میں۔ ارے بچے میری دوائیاں ختم ہو رہی ہیں۔ کب سے کہہ رہی ہوں۔"

مانی نے بے بسی سے بھابھی کو دیکھا اور وہ حنا کو سنبھالتی ہوئی گیٹ پار کر گئی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں مہمان بزرگ خواتین سے دیر تک باتیں کر کے سن گن لیتی رہی۔ ساتھ ہی ساحرہ کو بھی دیکھتی رہی جو پیکنگ میں مصروف تھی۔ کبھی کبھی مسکرا کر اس کی سمت دیکھ لیتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔ اور حنا کے پھولے پھولے رخساروں کو ہاتھ سے چھو کر پیار کرنے لگی۔

"میں تو نجمہ سے کہہ رہی تھی کہ کھانے کے بعد بھابھی سے مل آئیں گے۔ کتنی اچھی ہیں آپ خود ہی آ گئیں۔"

''ہاں مجھے مانی نے بتایا تھا کہ تم لوگ واپس جا رہے ہو۔ سو چا مل آؤ۔''

''بہت شکریہ آپ کا۔'' مانی کے ذکر پر اس کی پلکیں رخساروں پر سایہ فگن ہو گئیں۔

''باتیں کرتی ہے یہ۔؟'' وہ حنا کی بابت باتیں کرنے لگی۔

''ہاں تھوڑی بہت تو کر لیتی ہے۔ امی۔ پپا۔ دادی۔ انکل وغیرہ۔''

اس نے محبت سے بیٹی کو دیکھا جو بڑی نیک ساعت خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں میں پڑی خوبصورت چوڑیوں سے کھیل رہی تھی۔

''آپ کی بڑی بیٹی تو بالکل ثریا باجی کی ہمشکل ہے۔ حسن بھائی کو تو میں نے دیکھا نہیں۔ نجمہ تو بہت تعریف کرتی ہے ان کی۔''

''اچھا۔؟ امان میں ہی ملتے ہیں۔ بس معمولی سے جنریشن گیپ کا فرق ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''کوئٹہ پسند آیا۔؟'' اس نے ساحرہ کے دلکش چہرے پر نظریں جما کر پوچھا۔

''بہت۔!''

''اور کوئٹہ والے۔''

''وہ بھی۔ بہت پسند آئے۔''

''یعنی اگر تمہیں یہاں مستقبل رہنا پڑ جائے تو بور نہیں ہو گی۔؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''جی۔؟ جی نہیں'' وہ اس کے مسکرانے پر گڑبڑا گئی تھی۔

''یہاں کی تمہیں سب سے اچھی چیز کون سی لگی۔؟''

''خوبصورت پھول اور سادگی۔'' وہ صداقت سے بولی۔

''اور۔؟''

''بس۔ آپ آیئے ناں کبھی سرحد۔''

''دعا کرو۔ میرا مطلب ہے فرصت ہوئی تو ضرور آئیں گے تمہارے ہاں۔'' اسے ہراساں دیکھ کر اس نے بات بدلی۔

''آپ کا دل لگ گیا یہاں۔؟'' ساحرہ نے مخصوص دھیمے پن سے پوچھا۔

''جہاں دل لگانے والا موجود ہو تو۔'' وہ ہنس پڑی۔

''میرا مطلب ہے کراچی سے آئی ہیں نا آپ تو۔ وہ بڑا ہنگامہ پرور شہر ہے جبکہ یہاں تو بے حد سکون ٹھہراؤ ہے۔ وہ جھینپ کر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''

''جب نئی نئی شادی ہوئی تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا جب دھیان گیا تو عادت ہو چکی تھی۔'' وہ ہنس پڑی تو ساحرہ بھی مسکرادی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ گھر واپس آئی تھی۔ مانی کو چچی جان نے کہیں بھیجا ہوا تھا۔

''حنا کو تھپک کر سلا کر ساس کے پاس آ گئی۔''

''کیا کر رہی تھیں نجمہ کی ماں؟'' انہوں نے پنجسورہ سے نظریں ہٹا کر عینک کے شیشوں کے پیچھے سے جھانکا۔

''کچھ نہیں مہمانوں میں مصروف تھیں۔''

''کچھ تو بولی ہوں گی۔''

''آپ کی خیریت پوچھ رہی تھیں۔ بس''

''اب تو بہت دنوں سے آئیں نہیں۔ بیٹی کی تعریفوں کے پل باندھنے۔''

شہلا کو ساس کا بیٹے پر ناز اس قدر ناگوار گزرا مگر حسب سابق خاموش رہی۔ کوئی چچی جان کے سامنے کہے کہ تندرست بیٹی کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے یا معذور۔؟ کاش چچی جان اتنے بڑے بول بولنے سے پہلے گھر میں ہی ایک نظر ڈال لیا کریں۔

''شام کو کیا پکے گا۔؟'' وہ تخت پر پڑا چچی جان کا سامان ٹھکانے لگی۔

''اچھا کھانا پکانا ہوا۔ روز کی دردسری۔ چلوان کے لیے تو پھر بھی کوئی مسئلہ نہیں جن کے ہاں سب کچھ صبر و شکر اور بے نیازی سے کھا لیا جاتا ہے۔ مگر ان کی تو یہ مصیبت ہے جن کے ہاں ہر آدمی اپنی علیحدہ پسند بولے۔ ارے دلہن میرے لیے تمہارے چچا ہی کیا کم تھے اس پر حسن امان اور عالیہ۔ اور تو اور وہ زمانے سے بے نیاز ثریا۔ کسی کو دال پسند ہے کسی کو تو دیکھنا تک گوارا نہیں۔ سردیوں میں مجھے پائے پکانے کا تو جنون رہا ہے اب بھی ہے۔ وہ نخریلی عالیہ ''بڑے پائے۔'' سنتے ہی قے کر دے گی نامراد۔ اب بھلا چھوٹے پایوں میں کیا طاقت ہوتی ہے۔؟''

انہوں نے رک کر بہو کی تائید چاہی۔

''جی۔ اس نے چچی جان کے طاقت ور سراپے نظر ڈال کر لمبی سانس کھینچی۔'' کسی کو مچھلی پسند ہے کسی کو نام سے بھی نفرت۔ سبزی پکا لو تو وہ مانی۔ فوراً چڑ جائے گا کہ امی روز سبزی۔ اب تو ہم سب ہنہنانے اور ممنانے لگیں گے۔ وہ اسے جانوروں کا کھاجا بولتا ہے۔

اب تم ہی کہو روز کا کام ہے آخر روز کیا پکایا جائے دو سالن اس گھر میں سدا سے بنتے ہیں وہ بھی آدھوں کو پسند آتے ہیں۔''

اف خدایا۔

بیٹھ گئی کہ ابھی تو کافی ''سیتارام'' باقی تھی۔

اس نے تو نجمہ کے گھر سے متعلق موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی۔

''ارے دلہن۔ یہ رات حسن کتنے بجے آیا تھا۔'' چچی جان کو اچانک یاد آ گیا۔

''کافی رات ہو گئی تھی۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ارے خدا معلوم بعض اوقات اتنی دیر کیوں کر دیتا ہے۔ گھر کی بتیاں جلیں تو مرد کو گھر میں ہونا چاہئے۔ نصیب والے مرد ہی مغرب کا وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزارتے ہیں۔ دونوں وقت ملتے ہیں گھر بھرا ہونا چاہئے۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھا لیا جائے تو صحت بہت اچھی رہتی ہے۔''

''اب آدھی آدھی رات کو کھانا کھایا جائے گا تو ہضم کس وقت ہو گا۔''

''جی!''

''ائے۔ فجر کے بعد آج دعائے گنج العرش پڑھنا یاد نہیں رہی تھی سوچا آج ظہر کے بعد سہی۔ تم بھی تھوڑی دیر کمر سیدھی کر لو۔'' شاید وہ سمجھ گئی تھیں کہ بہو ذہنی طور پر اس وقت غیر حاضر ہے۔

سردی کی ابتدائی لہر نے حنا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس پر عالیہ کا فون آ گیا کہ صمد کی طبیعت نہیں سنبھلی پیلا (یرقان) ان پر آفت کی طرح ٹوٹا ہے۔

اس کی ڈلیوری کے دن بھی نزدیک ہیں۔ خالہ جان کہہ رہی ہیں پہلا پہلا سلسلہ ہے اماں کو بلوا لو۔ آپ امی کو

ساری بات بتادیں۔

فون اسی نے ریسیو کیا تھا۔ چچی جان کسی کے ہاں ملنے گئی ہوئی تھیں مانی نے آفس سے چھٹی کی ہوئی تھی اپنی زمینوں کا پھل ٹھکانے لگانا، پھر آموں کا حساب رکھنا اس کی ذمہ داری بن چکی تھی۔ کچھ ''پڑوسیوں'' کی وجہ سے بھی ''آفس ہڑتال'' ہوئی تھی اور وہ باقاعدہ ان کے ہمراہ ''رخصت کرنے'' اسٹیشن گئے ہوئے تھے۔

وہ حسن سے بات کرنا نہیں چاہ رہی تھی جو ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ حنا کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا۔ دوپہر کے بعد ہی سے اس کی حالت بگڑنا شروع ہوگئی تھی۔ چچی جان اُسے سوتا سمجھ کر نوکر کو بتانے کا کہہ کر ملنے ملانے نکل کھڑی ہوئی تھیں۔ اسے ثریا کا بھی دھیان رکھنا تھا۔ اس وقت خودترسی کی کیفیت میں مبتلا تھی۔ یا اللہ۔ وہ بھی کن خودغرض لوگوں میں پھنس گئی ہے۔ اگر لوگ خودغرض نہیں تھے تو اس نے ان کی عادتیں خرب کردی تھیں۔ سب کے سب اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر بیٹھے تھے۔ شاید۔

''خدایا جن کے ساتھ چلنا ہوتا ہے جن کی خاطر ہاتھوں سے راہوں کی رکاوٹیں سمیٹتے ہیں راستہ صاف پاتے ہی لوگ چھوڑ کر آگے کیوں نکل جاتے ہیں۔''

اس نے آزردہ ہو کر سوچا۔ واقعی آج کل ستارہ کچھ زیادہ ہی گردش میں تھا۔ ہر وقت کی افسردہ سوچوں میں اعصاب شل رہتے تھے۔

حنا چیخ چیخ کر رو رہی تھی اور چولہا دھیما کرتے ہوئے اس کا حنا سے زیادہ چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ کچن کا دروازہ بند کر کے وہ ماسٹر بیڈم روم میں آئی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے اور اس کے قدم حیران جذبوں کا ساتھ نہ دے سکے ٹھہر گئے۔

صحت مند حنا جو ہاتھ پاؤں پٹخ پٹخ کر رو رہی تھی۔ اونی کپڑوں کی وجہ سے مزید صحت مند لگ رہی تھی۔ شاید بخار کی حدت سے پریشان ہوگئی تھی۔

حسن نے بیٹی کو بازوؤں میں بھر لیا تھا اور اس کی جلدی پیشانی پر بوسہ دیا تھا وہ پلٹا ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ٹھٹھکا پھر باہر نکل گیا۔ وہ پتھر بن کر رہ گئی تھی۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے پر وہ بری طرح چونکی۔ بھاگ کر گیلری میں آئی۔ جھانکا تو گاڑی گیٹ سے باہر تھی۔

چچی جان تو بیٹی کا پیغام سن کر بے قرار ہوگئیں۔

''اےئ میں نے کہا سن رہے ہیں پنڈی کے لیے سیٹ بک کرادیں میری بچی بہت پریشان ہے وہاں۔'' چچا جان سے مخاطب ہوئیں۔ ''ہاں۔ ہاں۔ بھئی مانی سے کہہ دو کرا آئے گا بکنگ۔ اس میں ایسی فکر کی کیا بات ہے۔''

''آپ کے لیے فکر کی بات نہیں۔ لڑکی دوہری پریشانی میں مبتلا ہے اور آپ کے نزدیک کوئی فکر کی بات نہیں۔'' وہ شوہر کی بے نیازی پر تپ سی گئیں۔

''بھئی جانا تم نے ہر حال میں ہے۔ اب میں اس سلسلے میں کیا پریشانی ظاہر کروں۔ خدا اپنا کام کرے گا۔''

''ارے یہ صد تو وہمی ہی بہت ہے۔ اتنی تو دوائیاں کھاتا ہے یہ موئی انگریزی دوائیاں تو جگر میں گرمی کرتی ہیں۔ یہ پیلیا تو موا بہت ہی نامراد مرض ہے۔ دوا سے زیادہ ٹوٹکے کا اثر ہوتا ہے اس مرض میں۔ مگر یہ آج کل بچے ان باتوں پر یقین ہی نہیں کرتے۔ اماں ''چھلاوا'' سے گلے کی کنٹھی بنوا کر لے جاؤں گی۔ یرقان کے مریض کے میں ڈال دینے سے مرض سے بہت جلد ہی پیچھا چھوٹ جاتا ہے۔''

''آپ بازار جائیں گے صبح تو اماں چھلاوا کو کہتے جایئے گا کہ میں نے بلایا ہے۔''

''اچھا بھئی کہتا جاؤں گا۔'' چچا جان نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا۔ جانتے تھے کہ تردید انہیں بہت مہنگی پڑتی ہے۔

''اور وہ ثریا کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانے کو کہہ رہے تھے آپ۔'' دفعتاً انہیں یاد آیا۔

''ہاں کہا تو تھا مگر ڈاکٹر کراچی گیا ہوا ہے۔ آ جائے تو لے جاؤں گا۔''

حسن ابھی تک واپس نہیں ہوا تھا۔ وہ کھانا میز پر لگا کر چچی کو اطلاع دینے آئی تھی۔

''کھانا کھالیں گے آپ لوگ۔''

''بچے کہاں ہیں دلہن۔؟ نہ حسن دکھائی دے رہا ہے نہ مانی۔ حسن آ گیا کیا۔؟''

''جی۔ آنسو تو آ گئے ہیں۔ وہ حنا کو شاید ڈاکٹر کے ہاں لے گئے ہیں۔''

''شاید۔ تو کیا کہہ کر نہیں گیا۔؟'' انہیں شاید پر اچنبھا ہوا۔

''نہیں۔ میں دراصل کچن میں تھی۔ حنا کی حالت بہت خراب ہوگئی تھی دوپہر کے بعد۔ پتا نہیں ابھی تک کیوں نہیں آئے۔''

وہ فکرمندی سے بولی۔

''خدا معلوم کیسا موسم ہو رہا ہے۔ ہر گھر میں دو چار پڑے ہیں۔ ڈاکٹر کے ہاں بھی رش لگا ہوگا۔''

''ارے آج تو بڑا اخیر کا دن ہے۔ حسن کو بھی خیال آ گیا۔ بچوں کی دیکھ بھال کرنے کا۔ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے ورنہ۔ اسے تو گھر کی باتوں سے جیسے کوئی سروکار ہی نہیں۔ خیر اچھا شگون ہے۔'' وہ شال لپیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

چچا جان نے بھی صبح کا اخبار تہہ کرنا شروع کردیا۔

وہ مانی کے کمرے میں چلی آئی۔ جو ابھی ابھی واپس آیا تھا۔ اس نے کچن ہی میں اس کی موٹر سائیکل کی آواز سن لی تھی۔

''ارے بھئی ابھی سے بستر میں، کھانے کی چھٹی ہے کیا۔؟''

''ارے بھابھی۔ کیسا کھانا اپنی تو بھوک پیاس اڑ چکی ہے۔ مگر آپ کو کیا۔؟'' وہ سرد آہ بھر کر بولا۔

''اچھا اچھا۔ زیادہ اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں۔ کر آئے اپنے مہمانوں کو رخصت۔؟''

''اجی کہاں۔ وہ تو تصور میں مستقل مقیم ہیں۔'' وہ پیشانی سے بال سمیٹ کر بڑی ادا سے مسکرایا۔

''بڑے منجھے ہوئے فنکار لگ رہے ہو۔ کہاں سے سیکھی ہیں یہ ادائیں۔'' وہ صوفے پر سے اس کے کپڑے اٹھا کر وارڈروب میں لگانے لگی۔

''بھائی جان سے۔ بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا نہیں۔''

''بدتمیز۔!'' اسے ہنسی آ گئی۔

''اچھا چلو اٹھو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ اسے کہتی ہوئی واپس کھانے کے کمرے میں آئی۔

''امی۔ یہ دوائیں ہیں۔ تین ٹائم ڈوز دینی ہیں۔''

اس کے قدم دروازے پر ہی جم کر رہ گئے۔

''ارے تو دلہن کو بتاؤ۔ مجھے کیا کہہ رہے ہو۔''

''اچھا تو میرے بچے آپ کے کچھ نہیں لگتے۔'' وہ ناراضگی سے بولا۔

''خدا معلوم کیوں الٹی بات کرنے کی عادت ہے۔ بھئی بچوں کی دیکھ بھال ان کی ماں ہی کرتی ہے۔ میر یہ ہے کہ روتوں کو چپ کرادوں۔ دلہن کام میں لگی ہوں تو فیڈر بنادوں۔ دادیاں تو عموماً بچوں کے یہی چھوٹے موٹے کا کرتی ہیں۔ باقی تو سبھی ماں ہی کو کرنے ہوتے ہیں۔''

''اے لو۔ وہ آگئیں دلہن۔''

''دلہن۔ لو سنبھالو یہ دوائیں۔ حنا کی۔ تین ٹائم دینا ہیں۔'' چچی جان اسے دیکھ کر فوراً بولیں۔

اس نے بنا کچھ کہے آگے بڑھ کر دوائیاں اٹھالیں اور اپنے بیڈروم میں چلی آئی حنا کو شاید انجکشن دیا گیا جس کے اثر کے تحت وہ سو رہی تھی۔

اس نے حنا کی پیشانی چھو کر دیکھی پھر جھک کر اس کا رخسار چوم لیا اور کمرے کا دروازہ بند کرکے واپس کھانے کے کمرے میں چلی آئی۔

اور حسن کے برابر والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

مانی باپ کو زمینوں کی آمدنی سے متعلق معلومات دے رہا تھا۔

''ارے بچے۔ کبھی گھر میں جھانک کر دیا لیا کر۔ گھر صرف کھانے اور سونے کے لیے تو نہیں ہوتا۔'' چ جان۔ باپ بیٹے کی لمبی چوڑی گفتگو سے بے زار ہو کر بولیں۔

''کیا کروں جھانک کر۔ کیا ہالینڈ کی گائیں خرید لی ہیں آپ نے۔''

''ائے کیا ہر وقت گائیں، بھینسیں سوار رہتی ہیں تیرے سر پر ایک گھنٹے کے لیے گاؤں جاتا ہے۔ پھر گاؤں سر پر ہی سوار کرلاتا ہے۔'' وہ جھلائیں۔

''کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی ہیں چچی جان۔'' شہلا نے مسکرا کر مانی کو دیکھا۔

''چچی جان۔ مانی کو پشاور کی گائیں بہت پسند ہیں۔''

''ہائیں۔ یہ کون سے جنم میں گیا تھا پشاور۔؟'' وہ متعجب ہوئیں۔

''اس جنم میں جانے کا یہ پروگرام بنائے بیٹھا ہے۔ شاید پشاور کی گائے اس نے کوئٹہ میں کہیں دیکھ لی ہے۔''

''ائے کیا اب دودھ دہی کی دکان بھی کھولے گا۔ اور تو اس کے مشغلے بہت کم ہیں۔'' مانی پلیٹ پر جھک مسکرا دیا تھا۔

''اے یہ نامراد گائیں بھینس کہاں سے آمریں۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ پنڈی کے لیے میری سیٹ بک دو۔ کل ہی۔''

''خیریت۔؟'' وہ چونکا۔

''بے فکر رہو۔ تمہاری امی کوئی گائے دیکھنے نہیں جارہیں۔'' چچا جان نے شگفتگی سے کہا۔ وہ بھی گا بھینسوں کی تکرار سے محظوظ ہو رہے تھے۔

''ارے دفن بھی کریں اس قصے کو۔ بچے تو گھر میں ٹک کر بیٹھے تو کیا پتا چلے۔ ایسی افراتفری میں عالیہ گئی کی بیماری کا سن کر۔ مگر تو نے ایک دن جو بہنوئی کی خیریت پوچھی ہو۔ ابھی تک طبیعت خراب ہے۔ شام ہی کو فون آیا مجھے بلوایا ہے۔ بہت پریشان ہے بچی۔''

''مل جائے گا آپ کو ٹکٹ۔ فکر نہ کریں۔''

''آپ اکیلی جائیں گی امی۔؟'' حسن نے پلیٹ میں سالن نکالتے ہوئے پوچھا۔

''اکیلی ہی جاؤں گی۔ بیماری کی عیادت کو جارہی ہوں۔ تمہارے باپ کو تو فرصت نہیں رشتہ داریاں نبھانی تو انہیں عمر بھر نہیں آئیں۔''

''ارے بھئی۔ شام سے تم اپنے جانے کا ہی ذکر کررہی ہو۔ مجھے بھی چلنا چاہئے یا نہیں اس سلسلے میں تو تم نے کچھ نہیں کہا۔''

''اے ہاں۔ لو سنو۔ کتنے کہے میں ہیں میرے۔ اللہ کی شان۔ ان باتوں کا خیال تو آپ کو خود ہونا چاہئے۔'' وہ اپنے مخصوص تیکھے انداز میں گویا ہوئیں۔

''ساری زندگی ثریا کی وجہ سے ایسی بندھی رہی ہوں کہ کبھی دور دیار جانا بھی ہوا تو یوں جیسے کسی کی دیوار کو ہاتھ لگانے گئے تھے۔''

''ابو۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کی سیٹ بھی بک کرادیتا ہوں۔'' مانی نے باپ کی سمت دیکھا۔

''آپ بھی ہو آئیں۔ بہتر ہے۔''

''لیکن۔ ثریا۔؟''

''اے تو کیا آپ ثریا کا ہنڈولا بلاتے ہیں۔ دلہن ہیں گھر میں۔ ماشاءاللہ ذمہ دار ہیں۔ سنبھال لیں گی۔''

''سچی بات تو یہ ہے ابو۔ جب سے بھابھی آئیں ہیں۔ ثریا باجی کو وہی سنبھال رہی ہیں۔'' مانی نے اعتراف کیا۔

''خیر اس میں تو کوئی شک نہیں۔ ثریا کیا سارا گھر ہی سنبھالا ہوا ہے۔'' چچا جان نے بھی محبت آمیز لہجے میں اعتراف کیا۔

حسن اٹھ کر واش بیسن پر ہاتھ دھونے چلا گیا۔

سسرالیوں کے اعترافات نے کم از کم اس کی تھکن اتار دی تھی۔

سب کھانا کھاچکے تو وہ ہما کے پاس چلی آئی۔

وہ اوندھی لیٹی ہوم ورک کررہی تھی۔ وہ اسے جلدی کھانا کھلا دیتی تھی۔ تاکہ وہ جلد اپنا کام کرکے سو جائے۔

''کتنا کام رہ گیا ہے۔ امی۔ آپ ہمیں تھری کا ٹیبل یاد کرادیں۔''

اس نے اپنی چار سالہ حسین ومعصوم بیٹی کی پیشانی سے بال سمیٹے۔ ''میری اتنی سی بیٹی۔ اتنا بہت سا پڑھنے لگی ہے۔ ماشاءاللہ۔ چلو شروع کرو۔'' وہ اسے ٹیبل یاد کرانے لگی۔

ابھی حنا کو دوا بھی دینا تھی، حسن کے لیے دودھ بھی لے جانا تھا پھر اس کے دفتر جانے کے لیے سوٹ بھی تیار کرنا تھا۔

اسے سخت نیند آرہی تھی۔ مگر وہ اپنی ڈیوٹی بھگتائے بغیر سو نہیں سکتی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ سیر ہو کر کیسے سویا جاتا ہے۔ کنوارپنے میں اس لیے نہیں سو پائی کہ ایک محنتی طالبہ تھی۔ اکثر وقت پڑھتے ہی گزارا تھا بچے کھچے ٹائم میں گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

سسرال میں ابتدائی راتیں خوبصورت رت جگوں میں کٹیں۔ جب نئے انداز پرانے ہوئے تو ذمہ داریاں گلے ملنے کو بے تاب کھڑی تھیں۔

اسے حسرت تھی کہ وہ بھی کبھی نیند بھر کر سوئے۔

تمام دن اس قدر مصروف گزرتا تھا کہ تکیے پر سر رکھتے ہی غافل ہو جاتی تھی۔ بچے بھی چھوٹے تھے اور ہر تنگ کرتے تھے۔

اب تو خیر وہ ان سب باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔

وہ حنا کو بیچ میں لٹا کر خود لیٹ گئی اور حنا کو آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔

''امی۔ میں تھری کا ٹیبل بھول تو نہیں جاؤں گی؟'' ہما کے اعصاب پر تھری کا ٹیبل سوار تھا۔

''ابھی تو آپ نے تھوڑا ہی یاد کیا ہے۔ جتنا یاد کیا ہے وہ یاد رہے گا۔ بے فکر ہو بیٹے۔'' بچیوں کے ساتھ خود بھی نیند کے ماورائی جہاں میں سیر کرنے لگی تھی۔

''پنو۔ اے پنو۔ دیکھ تو سہی۔ دور سے تو بالکل نواج بھائی دکھ رہا ہے۔''

پنو کے تیز تیز حرکت کرتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ اس نے کھڑی فصل کے سبزے سے پار جھانکا۔ اس کے دل کی عجب کیفیت ہو گئی۔

''وہی تو ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

وہ اب قریب آ چکا تھا۔

''کسے'' (قسم سے' اس نے ہاتھوں کا پنجہ بنا کر سامنے دیکھا۔ ''ہاں وہی ہے۔'' آف وائیٹ سوٹ اور ہاتھ میں چھوٹا سا سیاہ سوٹ کیس اٹھائے نواز نے دھوپ کی تیزی کی وجہ سے سیاہ گلاسز بھی آنکھوں پر چڑھا رکھے تھے۔

لانبا۔ چوڑا۔ بے حد دلکش۔ اس پر سے بالکل شہریوں جیسا۔ صاف ستھرا۔ خوشبودار اس نے خود کو کھڑی فصل میں چھپا لیا۔ کلثوم کھی کھی کرنے لگی۔

لیکن وہ دم سادھے رہی۔ یہاں تک کہ وہ ان کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گیا۔ کلثوم کو خواہ مخواہ ہنسی آ رہی تھی۔

''اب تو گھر جا۔ نہا دھو۔ خبصورت (خوبصورت) لتے پہن۔ سر میں دھنے کا تیل ڈال۔ کالج سرمہ لگا جانے ہی گھر میں تجھے ڈھونڈے گا۔''

اس نے سہیلی پر ایک نظر ڈالی اور سر پر چادر جمانے لگی۔

گاؤں کی اس لڑکی کو بہت بھرم رکھنا آتے تھے۔

''پنو۔ وہی لال جوڑا پہن لے آج جو تو نے بیاہ کے دن پہنا تھا۔''

''ہاں پھر پہن لوں وہی منحوس جوڑا۔'' وہ چنگر بننے کا کام چھوڑ کر۔ آہستہ آہستہ گھر کی طرف ہو لی۔ ایک نظر ادھر ادھر دیکھا۔ کہ شاید کہیں اس کی نند بھی کھڑی ہو مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

ڈیوڑھی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے دھڑکتے دل کو سنبھالا چہرے کو چادر کے پلو سے صاف کیا۔

وہ بڑے سے صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ سیاہ گلاسز اس کے ہاتھ میں تھے اس نے سامنے سے آتی پنو کو لحظہ بھر کے لیے دیکھا۔ پھر دوبارہ اپنی ماں کی سمت متوجہ ہو گیا۔

پنو کا دل بجھ گیا۔ گو اس کا انداز نیا نہیں تھا۔ لیکن ایک خوش امیدی کا پھول اس کے اندر کھلا رہتا تھا۔ جب تک وہ جوان تھی یہ خوش امیدی کا پھول اس کے اندر کھلا رہتا تھا وہ جا کر ساس کے پاس بیٹھ کر اناج پھٹکنے لگی۔ سارے گاؤں کے لڑکوں سے زیادہ گھبرو۔ سارے گاؤں کے لڑکوں سے زیادہ پڑھا لکھا۔ اور بہت ہی خوبصورت نوجوان اس کا تھا۔ پھر بھی اس کا نہیں تھا۔

یہ دور جہالت اور قدامت کی زنجیر کی ایک کڑی تھی۔ وہ کم ذات نہیں تھے مگر جاہل تھے اور روپے پیسے کی فراوانی سے آگہی کے دروازے بھی سیل زدہ ہو گئے تھے۔

وہی ننانوے فیصد گھروں کی داستان۔

دیہاتوں میں اکثر بے جوڑ شادیاں ہوتی ہیں۔ مگر یہ تو بہت ہی بے جوڑ تھی۔ کہاں وہ اس قدر آگاہ۔ اپ ٹو ڈیٹ نوجوان کہاں یہ قبل مسیح کی روح۔ وہ اپنے باپ سے شکست کھا گیا۔ اٹھارویں برس میں لگا تھا جب اسے شہر سے بلوا کر شادی کر دی گئی تھی۔ اس وقت وہ ایک تصور پرست اور محض جذباتی نوجوان تھا۔ اس وقت اسے اس حادثے کی سنگینی کا شدت سے احساس نہیں ہوا تھا جتنا بعد میں ہوا۔

اس نے اتنا ضرور کہا تھا۔ ''ٹھیک ہے ابا جی۔ آخر آپ لوگوں نے کرنی ہی اپنی مرضی ہے تو ٹھیک ہے۔ لیکن جب تک میں پڑھ نہ لوں بیوی کو ساتھ نہیں رکھوں گا۔''

''اوئے۔ تو اس کی فکر نہ کر جتنا پڑھنا ہے پڑھ لے۔ کون منع کر رہا ہے تجھے۔ پنو تیری منگ ہے۔ کل بھی آنا ہے تو ابھی کیوں نہیں۔''

وہ ذہنی طور پر سب سے مختلف ضرور تھا لیکن شاید کم عمر ہونے کے سبب اختلافات کی جرات نہیں رکھتا تھا۔

ان کے ہاں صدیوں سے یہی ہو رہا تھا۔ رشتے ماں باپ ہی طے کرتے تھے۔ اپنی شادی سے متعلق بات کرنا نہایت بے غیرتی کی بات تھی۔

ان دنوں اسے روایت شکنی کے خواب بھی نہیں آتے تھے۔

لیکن پنو کو اس کے ذہن نے قطعی قبول نہیں کیا تھا۔ گزرتے وقت نے فاصلے بڑھائے ہی تھے کم نہیں کیے تھے۔ اس کا آئیڈیل۔ ایک طرح دار۔ ذہین عورت تھی۔ جو خوبصورت بھی تھی اور تعلیم یافتہ تھی۔ وہ ایک منفرد گھر کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ ایک گھر۔ گاؤں سے بہت دور جگمگ کرتے شہر میں۔ اور اس گھر میں ایک طرح دار غیر معمولی لڑکی۔ مشرق و مغرب کا امتزاج جو خدا کی عبادت گزار بھی ہو اور خوبصورت انگریزی بھی بولتی ہو۔ جو اس کی خلوت و جلوت میں اس کے دل کی راحت ہو۔

وہ تیل چپڑے بالوں والی پنو سے جبری تعلق نبھانے سے معذور رہا۔ مرد ضدی تو ہوتا ہے لیکن اپنی خواہشات کے معاملے میں غیر معمولی ضد پر اتر آئے تو پھر خدا پناہ میں رکھے۔

وہ اپنی روایات سے باغی تھا۔ وہ اپنوں کے ہر معاملے کو مخالفانہ سوچ سے ناپتا تھا اسے اپنوں کی محبت و خلوص بھی روایات کا ایک حصہ دکھائی دیتی تھیں۔ جن سے وہ غیر شعوری اور شعوری نفرت میں مبتلا تھا۔

وہ باپ کی علالت کے ''چوتھے یاددہانی خط'' پر گاؤں آیا تھا۔

اسے سامنے دیکھ کر وہ سامنے کمرے کی سمت بڑھ گیا جہاں علیل زمیندار ملک شہباز بیٹے کو سامنے دیکھ کر خود میں زندگی کی لہر دوڑتی محسوس کر رہے تھے۔

''السلام علیکم ابا جی۔!''

''پتر۔ ٹھیک ہے ناں؟'' گھنی مونچھوں تلے ہونٹ مسکرائے۔

''ٹھیک ہوں ابا جی۔ بہت اچھا ہوں۔''

''بہت کمزور ہو رہا ہے۔ کتنا کہا کہ بہو کو بلا لے روٹی کا آرام ہو جائے گا۔ ہوٹلوں کے کھانے جان کو بناتے

نہیں گھلاتے ہیں۔''

''میں ہوٹل میں نہیں کھاتا ابا جی۔ نوکر ہے میرے پاس۔'' وہ تلخ سے لہجے میں بولا۔

''پر۔ پتر۔ بہو اس گھر سے تو نہیں بیاہی۔ اس کا بیاہ تیرے ساتھ ہوا تھا۔''

''ابا جی۔ آپ بیمار ہیں۔ زیادہ نہ بات کریں۔ آپ کو میں آج ہی شہر لے چلوں گا۔''

اس نے باپ کو بیزاری سے منہ بنا کر مزید گفتگو سے باز رکھا۔

اور موڑھا کھینچ کر پاس بیٹھ گیا۔

''شہر تو یہاں بھی ہے۔ دو میل موڑ میں کیا پتا لگتے ہیں۔ بس علاج ہو رہا ہے یہیں اچھا بھلا ہو جاؤں گا۔ چل اسی بہانے تو نے صورت تو دکھائی۔ کیا بات ہے۔ ناراض ہے ہم سے۔ پر کوئی بات تو ہو۔''

باپ اس کے زخم ہرے کرنے لگا تو وہ اٹھ کر جانے لگا۔

''جا کہاں رہا ہے۔؟'' بیٹھ تجھ سے تو ابھی باتیں کرنا ہیں۔''

''رضیہ کی شادی کی بھی فکر ہے۔ تیرا چاچا تاریخ مانگ رہا ہے۔''

''تو کر دیں۔ مشکل کیا ہے۔ دے دیں تاریخ۔''

''نہ تو اپنی سہولت بتا۔''

''میرا کیا ہے کوئی تاریخ ہو چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔''

''ابا جی۔ آپ تو بھائی کو گھیر کر ہی بیٹھ گئے۔ ہم سے بھی باتیں کرنے دیں ابا جی۔'' رضیہ اسے لے کر واپس صحن میں آ گئی۔

''اچھا یہ بتاؤ۔ کتنے دن ٹھہرو گے۔؟'' رضیہ اس کے ساتھ ہی لگ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''پرسوں۔ پرسوں کی سیٹ ہے میری۔''

''ہاں بس۔ آپ کو شہر ہی اچھا لگتا ہے۔ ہم سے زیادہ۔ خون سفید ہو گیا ہے آپ کا۔ سچ آپ کو میں بہت یاد کرتی ہوں۔''

بھائی رب نواز بھی بولتا ہے کہ آپ اب کبھی گاؤں نہیں آؤ گے۔ پچھلے مہینے گیا تھا ناں۔ بھائی۔ بھابھی بھی وہ کہہ رہے تھے آپ کا گھر بہت اچھا ہے۔ آگے پیچھے باغ بنا ہوا ہے۔'' وہ بچوں کے سے انداز میں بولی۔

''ارے۔ وہ میرا گھر کہاں ہے کرائے کا ہے۔''

''پر رہتے تو آپ ہی ہیں ناں۔''

''چھوٹی بھابھی تو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔'' رضیہ نے اپنی دانست میں گویا چھیڑا تھا۔

کروشیہ چلاتی پینو کا دل دھڑک گیا۔ کہ جانے اب کیا جواب آئے۔ ملک نواز نے ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔ لیکن خاموش رہا۔

سادہ سی لڑکی ریشہ خطمی ہو رہی تھی۔ اس کا محبوب۔ سارے گاؤں میں سب سے اعلیٰ۔ آج آیا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھا ہے۔

اس کی مجیم شحیم ماں اندر سے برآمد ہوئی اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ پلنگ چرچرایا۔ چر ر۔ چر ر۔ چر ر۔

''پتر۔ اس واری پینوں کو اپنے نال ہی لے جا۔ بہت آرام ہندا ہے عورت سے۔''

''میں آرام سے ہوں اماں جی۔ جب سیٹ ہو جاؤں گا تو لے جاؤں گا۔''

''خورے۔ کدوں سیٹ ہووے گا۔ جہاں تو رہتا ہے وہیں اسے بھی رکھ لے۔ اس کے ماں باپ بہت ''مگروں'' پے رہے ہیں۔ اس کا باپ تو تیرا پتا مانگ رہا تھا۔''

''تو دے دینا تھا۔''

''آئے گا آج وہ۔ پتر۔ تیرے پاس۔ اور ٹھیک بھی ہے۔ جب سے بیاہ ہویا ہے توں۔ مڑ کے نہیں دیکھا۔''

''میرے اپنے بہت مسئلے ہیں میں اسے نہیں بلا سکتا ابھی۔ آپ لوگوں نے مجھے اس لیے بلایا تھا۔؟''

''ہائے۔ ہائے۔ گرم کیوں ہندا ہے۔ اور پریشانیاں ہمیں بتا۔ روپیہ پیسہ چاہئے۔ تو لے لے۔ تجھے منع کیہ ہے کسی نے۔ جو کچھ ہے تم دونوں بھائیوں کا ہے۔ زمیناں، جداداں (جائیدادیں) جناور۔ (جانور)۔ باغیچے۔ کیہ پریشانی ہے۔ بول تو سہی۔''

''بتا دوں گا فی الحال تو آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اکتاہٹ کے انداز میں بولا۔ اور اندر جا کر پلنگ پر لیٹ گیا۔

رنگین پایوں والے پلنگ پر بیٹھی اداس و منتظر لڑکی کے دل میں زور کا چھناکا ہوا تھا۔ شام کو اس کے ساس سسر آ گئے تھے ان سے بمشکل پیچھا چھڑایا۔ ملنے ملانے کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا تھا۔

رات کو وہ بڑے کمرے میں آیا کہ حسب عادت سونے سے پہلے تھوڑا سا مطالعہ کر لے تو۔ چیختے چلاتے نارنجی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس زیور پہنے آنکھوں میں کاجل کی ڈوریاں کھینچے پروین عرف پینو تشریف فرما تھیں۔ اسے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔ بہت پہلے بھی ایسی رات آئی تھی۔ بہت پہلے بھی اسی طرح بجی تھی۔ اور بہت۔ پہلے۔ بھی۔ دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ آدمی جتنا زیادہ بے وقوف ہو گا۔ اتنا ہی خوش امید۔ اسے پھر بھی بہت امید تھی کہ آج اس کی دعاؤں کا ثمر سامنے تھا۔

ملک نواز نے ایک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔

سارے کمرے میں دھنیے کے تیل کی خوشبو پھیل رہی تھی۔ اس کا دم الٹنے لگا۔

''کیا چیز گری ہے اس کمرے میں کس قدر بو آ رہی ہے۔'' وہ جھلا گیا۔

''گرا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ مم۔ میں نے سر میں تیل ڈالا ہے۔'' وہ خوفزدہ سے انداز میں بولی۔

''یا وحشت۔ میرا دم گھٹتا ہے اس بو میں۔'' وہ ہونٹ کاٹ کر بولا۔

وہ فوراً پلنگ سے اتر کر باہر چلی گئی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور بیگ سے ایک کتاب نکال کر لیٹ گیا۔

یہ کتاب ''سندیسے'' تھی جسے اس نے بار بار پڑھا تھا۔ اس کتاب میں اس کا تصور بولتا تھا۔ اس کے اشعار۔ اس کی نظموں میں جو نفس سانس لیتا تھا یہی نفس اس کا باطن۔ اس کا ''اندر'' تھا۔ اس کتاب میں شہلا حسن کائنات بن کر بولتی تھی۔ وہ اسے پڑھتا تو وہ اس کی روح میں حلول ہو جاتی۔ اس نے ورق گردانی کے انداز میں کتاب دیکھنا شروع کی۔ ''چاند گرہن'' اس نظم پر وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا۔

کل رات
مکمل چاند گرہن تھا
کل۔ زمین کا سایہ
چاند پر ''پورا'' پڑا تھا

کل ہی میرے اور اس کے درمیان
بے رخی کا پہلا پتھر حائل ہوا تھا
یا پھر تلخی کا پہلا کنکر
ایک اندھیرا سا یہ بن کر
میرے دل پر پڑا تھا
میرا دل۔ کہ۔ ایک ماہ کامل
ایک بحیرہ محبت
اک شہر محبت
اس پر تیرے الفاظ کا اندھیرا سایہ
پورا پڑا تھا
کل رات!
مکمل چاند گرہن تھا۔

اس نے کتاب کا دوسرا صفحہ الٹا۔ تیسرا الٹا۔ پھر چوتھا۔ معاً کتاب بند کر دی۔ سرورق کو غور سے دیکھنے لگا۔ سنہرے حروف سے ''سندیسے'' لکھا تھا پھر سنہری روشنائی ہی سے دستخط کے انداز میں شہلا حسن لکھا تھا۔ نام کے نیچے ہی اس کا اپنا ہی ایک شعر تھا۔

اس نے کتاب سینے پر رکھ لی اس کا ذہن کہیں بہت دور بھٹک رہا تھا۔

وہ مکمل طور پر کمرے سے غیر حاضر تھا۔

چوڑیاں بڑی زور سے بجی تھیں۔ چھن۔ چھن

تصورات۔ ٹوٹ کر چھنن چھنن میں تقسیم ہو گئے۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ سامنے پروین گیلے بال جھٹک رہی تھی۔

''کیا تماشا ہے بھئی۔؟'' آدھی رات کو اس کے بھیگے بال دیکھ کر متعجب ہوا۔

''خود ہی تو کہہ رہے تھے۔ تیل کی بو آ رہی ہے میں سر دھو آئی۔''

''عجیب احمق لڑکی ہو۔ سردی میں پانی میں بھیگنے چل دیں۔ کہیں اور جا کر سو جاتیں۔'' اسے اتنی سردی میں اس کے بھیگے بال دیکھ کر سخت کوفت محسوس ہوئی تھی۔

''تائی جی نے بولا تھا جب تک آپ یہاں ہو میں یہیں۔'' اپنی دانست میں وہ پڑھے لکھے شوہر سے نہایت تہذیب سے بول رہی تھی۔ ''آپ'' شاید دیہاتوں میں ''تہذیب'' کی ''معراج'' ہوتا ہے۔

''ہونہہ۔'' ہر تصور کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ وہ تولیے سے بال خشک کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کدھر جائے۔

اس نے پیٹھ موڑ کر سونے میں عافیت سمجھی۔

ابھی وہ عالم غنودگی میں تھا کہ نزدیک ہی تیز سسکیاں ابھریں۔ اس نے کروٹ بدل کر دیکھا۔ پیٹھ موڑے پروین رو رہی تھی۔

''کیا تکلیف ہے تمہیں۔؟'' اسے اتنے قریب دیکھ کر اس کا لہجہ نفرت سے تلخ ہو گیا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی طرح روتی رہی۔

''کیا چاہیے تمہیں۔؟'' وہ نیند میں بے ربط ہو گیا تھا۔

پروین کے آنسو تھم گئے۔ وہ جذبات کے جتنے علاقے گھیرے ہوئے تھی ملک نواز ان کی سرحد تک بھی نہیں پہنچا تھا۔ وہ سیدھی ہو گئی۔ حقدار کی صحیح پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ سوال نہیں کرتا۔ امید کی آخری لہر بھی مایوسیوں کے سمندر میں گم ہو گئی۔

وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا چاہیے۔

ہونہہ۔ اس نے اس کے مضبوط سراپے کو دیکھا۔ وہ بیوی تھی محض تصوراتی معشوقہ نہیں۔ ان کی شادی کسی رومان کا نتیجہ نہیں تھی کہ۔ وعدوں کا بھرم رکھنے کے لیے بھی قربانیاں دے دی جائیں۔

وہ۔ عورت تھی۔ جو پانچ سال سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ان گلی بندھی۔ دوسروں کے بھرپور عمل دخل سے مزین شادیوں میں اکثر رومانی لمحات بڑے محدود ہوتے ہیں۔ حقوق کی ادائیگی کے لمحے بے وقوف عورت ان ہی لمحات کو رومان سے منسوب کر سکتی ہے۔

اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھنے والا۔ یہ جاہل آدمی۔ اس کا جی چاہا نفرت سے تھوک دے۔

اس نے۔ ایک بے خبر کے قریب انگاروں کے بستر پر رات گزاری تھی۔

☆☆☆

اگلے روز چچا اور چچی کے چلے جانے سے گھر میں عجیب بے رونقی سی ہو گئی تھی۔ حنا ہمیشہ صبح اس کے ساتھ ہی اٹھ جاتی تھی۔

آج بھی اس نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی حالت کافی سنبھل گئی تھی۔

اس نے اس کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اونی کپڑے پہنائے سرخ کنٹوپ اس کے سر پر جمایا جوتے موزے پہنائے اور اپنے بستر میں گھسا دیا۔

''دیکھو بیٹا۔ امی بھی نماز پڑھیں گی۔ اللہ اللہ۔ کریں گی۔ بالکل شور نہیں کرنا۔ پھر ہم آپ کو کچن میں لے جا کر اچھی اچھی چیز کھلائیں گے۔''

اس نے بیٹی کو سمجھایا تو وہ خوش مزاجی کے مظاہرے کے طور پر مسکرا دی ہونٹ کھنچ کر ہلال بن گئے۔ صبح ہی صبح اسے اپنی بیٹی دنیا کی ہر شے سے زیادہ حسین بلکہ ماورائی مخلوق لگی۔

اس نے جھک کر اس کا رخسار چوم لیا۔ اور باتھ روم کی سمت مڑی تو حنا نے آواز نکالنی شروع کی۔ اس نے ایک پلٹ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''پپا سو رہے ہیں بیٹے۔ شور نہیں کرنا۔'' حنا نے گردن موڑ کر باپ کی سمت دیکھا۔ اور کوئی بے تکلفی کرنی چاہی مگر ماں کی سمت دیکھ کر رک گئی۔

وہ وضو کر کے آئی حنا بڑی خاموشی سے بیٹھی تھی۔ اس کی اس ادا پر اسے ٹوٹ کر پیار آ گیا۔ اس نے اپنا موتیوں کا ہار اتار کر حنا کے سامنے ڈال دیا کہ کھیلتی رہے گی۔ اور خود نماز پڑھنے لگی۔

نماز پڑھ کر تھوڑی دیر تلاوت کلام پاک کی۔ پھر حنا کی انگلی تھام کر کچن میں چلی آئی۔ اس کی فیڈر تیار کی۔ ایک انڈا ابال کر کے چمچ سے کھلایا اور اسے بے بی چیئر میں دھنسا کر اپنے معمولات میں مصروف ہو گئی۔

ہما کا منہ ہاتھ دھلایا۔ مانی کو اٹھایا۔

پھر حسن کی سمت آئی۔ ٹائم پیس اٹھا کر اس میں الارم سیٹ کیا اور اس کے کان کے پاس رکھ دیا۔ جب تک وہ باہر آئی الارم شروع ہو چکا تھا۔

جب سے ملک نواز کا قصہ ہوا تھا وہ اسی طرح اسے اٹھا رہی تھی۔ وہ اس سے کبھی ناراض نہیں رہی تھی مگر اب تہیہ کر لیا تھا کہ مزید خود کو نہیں گرائے گی جبکہ ہمیشہ وہ بے قصور ہی ہوتی ہے۔

مانی کو، ہما کو ناشتہ دیا۔

''امی۔ چچا جان مجھے کہتے ہیں میں چوہیا جیسی ہوں۔''

''میری بیٹی کیوں ہونے لگی چوہیا۔''

''ارے بھابھی۔ خواہ مخواہ دل نہ رکھیں ہما کا۔ سچ بالکل چوہیا۔''

''امی۔!'' ہما بسوری۔

''چھوڑو بیٹے۔ دیکھیں گے تمہارے چچا کو بھی۔ کون سے پہلوان ہوں گے ان کے ہاں۔'' وہ جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔ مانی نے قہقہہ لگایا تھا۔ ''اور بھابھی۔!'' وہ ایک دم خاموش ہو گیا۔ سامنے سے حسن داخل ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ کی سی عجلت۔ بریف کیس تک کھانے کے کمرے میں ہمراہ آتا تھا۔

وہ مڑ کر مانی سے کچھ کہنے لگی تھی۔ بری طرح حسن سے ٹکراتے ٹکراتے بچی بلکہ بے ساختہ اس کا شانہ تھام لیا۔

وہ تو جا کر بیٹھ گیا مگر مانی کی آنکھوں میں شرارت ناچ گئی۔ وہ ناشتا لے کر آئی تو وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

کچن میں گرم چائے لینے آئی تو وہ دونوں چچا بھتیجی ناشتہ کر چکے تھے۔ مانی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

ٹکرا گیا تم سے سر ہی تو ہے

وہ شرارت سے گنگنا رہا تھا۔

''اے مانی کے بچے۔'' وہ جھینپ کر مسکرا دی تھی۔ ''سچ مانی تم سے تو بس حد ہے۔ اور دیکھو آج ہما کی فیس بھی جمع کرانا ہے۔'' اس نے فوراً بات بدلی۔

''کمرہ ڈھیلی کیجئے۔ بالکل پیسے نہیں ہیں۔ جتنا کیش تھا امی نے ایئرپورٹ پر جھڑوا لیا۔''

''اپنے بھائی سے لے لو۔ میں ثریا کا ناشتہ لے کر جا رہی ہوں۔''

''یہ لیجئے۔ اب میں ان سے ایک لال نوٹ مانگوں گا۔ وہ کہیں گے میری بیٹی۔ کی فیس بھی جمع نہیں کرا سکتا۔ استاد کی پیشانی پر پڑے بل گننے تک کی تو جرات نہیں ہوتی۔'' اس نے خوف زدہ نظر آنے اداکاری کی۔

تب وہ زچ ہو کر روپے لینے اندر چلی گئی۔

پورچ میں آئی تو مانی ہما کو موٹر سائیکل پر بٹھا چکا تھا پیچھے اس کا بیگ تھا۔

''یہ لو مانی۔!'' اس نے روپے اس کی جیب میں ڈال دیے۔

''اور ذرا آہستہ چلایا کرو موٹر سائیکل۔''

''اچھا۔ جی۔ بھابھی۔ کھانے کا کمرہ زیادہ نزدیک ہے یا آپ کا بیڈروم۔؟''

''ہائیں۔ اس کے کچھ پلے نہ پڑا۔ کیا کہہ رہے بھئی۔''

''یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھے تو مشورہ دیا جا رہا تھا کہ بھائی جان سے پیسے لے لوں، خود جلدی میں ہونے کے

باوجود دوسری منزل سے لے کر آئی ہیں۔''

اس نے گھبرا کر مانی کی سمت دیکھا۔ کتنا تیز ہے یہ مانی۔

''بھابھی۔!'' اس نے موٹر بائیک اسٹارٹ کی۔

وہ خاموشی سے ہما کا ربن ٹھیک کرنے لگی۔

''بھابھی۔ شام کو آ کر پوچھوں گا بھائی جان سے کیوں ستاتے ہیں میری ہیرا بھابھی کو۔؟'' وہ زن سے بائیک اڑا لے گیا۔

اس کی اتنی سنجیدہ محبت و خلوص سے پُر بات پر اس کا دل بھر آیا۔ اس نے چھلکتے آنسو آنچل میں جذب کیے۔

''خدا تیرا بھلا کرے مانی۔ کیسا احساس دیا ہے اپنے پن کا۔ کوئی تو ہے جو میری قدر پہچانتا ہے۔!'' وہ پلٹ گئی کہ جوتوں کی آواز کا رخ پورچ ہی کی سمت تھا۔

وہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ڈرائنگ روم ہی میں بچوں کو لے کر بیٹھ گئی۔ مانی کا سویٹر تقریباً مکمل ہونے کو تھا۔ مانی نے فون پر بتا دیا تھا کہ رات کا کھانا کھا کر آئے گا۔

نیچے قالین پر ہی فوم کا گدا ڈال کر بچیوں کو لے کر بیٹھ گئی تھی اوپر سے سرخ کمبل اپنے اور بچیوں کے پیروں پر ڈال رکھا تھا۔

اس کے ہاتھ تیزی سے سلائیوں کو حرکت دینے میں مصروف تھے۔ بچیاں پوری دلچسپی سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ گھریلو ملازم شاید اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا۔ ایک سناٹا پورے گھر پر طاری تھا۔ ثریا کا کمرہ وہ باہر سے بند کر آئی تھی۔

فون بج اٹھا۔ گھنٹی بہت زور سے بجی تھی۔

مگر اس وقت اسے گھنٹی سے بے حد کوفت محسوس ہوئی تھی۔ وہ جیسے بہری بن کر سلائیاں چلانے میں مصروف تھی۔ ایک گھنٹے میں کتنی بار فون سننے اٹھی تھی۔ جن میں سے اکثر رانگ نمبر تھے۔

جب گھنٹی بجتی چلی گئی تو وہ اون سلائیاں ایک طرف رکھ اٹھنے لگی۔ پھر دنیا مافیہا سے بے خبر ہما کو دیکھ کر بولی۔

''ہما بیٹے۔ دیکھیے فون پر کون ہے۔''

ہما فوراً اٹھ گئی مگر اس کے چہرہ ٹی وی کی سمت ہی رہا کوئی ہفتہ وار کارٹون فلم چل رہی تھی۔ وہ فون کے پاس پہنچی ہی تھی۔

کہ اپنے پسندیدہ گولڈن ڈریسنگ گاؤن میں حسن نے اندر داخل ہو کر فوراً ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو۔!'' اس کی آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔

''اوہ۔ السلام علیکم امی۔''

''نہیں امی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ سب لوگ فون سے دور تھے۔ شاید کمروں میں۔ لابی سے ایکسٹینشن کی گھنٹی کمروں میں اوپر کہاں سنائی دیتی ہے۔ آپ ہی کی مرضی کے مطابق فون سیٹ رکھا گیا تھا۔

آپ ہی نے فرمایا تھا کہ کمروں میں سیٹ رکھنے سے نیند خراب ہوتی ہے۔

اچھا چلیں غصہ تھوک دیں۔ یہ بتائیں سب خیریت ہے نا۔؟

اوہ۔ یہ تو خوش خبری ہوئی۔ بہت بڑی خوش خبری۔ صمد کو میری جانب سے بہت بہت مبارک باد۔ اگر گھر پر ہیں صمد تو بلا لیں۔ دو چار باتیں ہی ہو جائیں بہت خوشی ہوئی سن کر کہ اب ان کی طبیعت بہتر ہے؟

''عالیہ کیسی ہے۔؟''

''ظاہر ہے امی۔ ماں یا باپ دونوں میں سے کسی ایک میں تو اکثر بچہ ملتا ہی ہے۔''

''پپا میں دادی سے بات کروں گی۔ ہما نے باپ کو چھو کر کہا۔''

''جی۔ جی۔ جی ہاں۔ امی یہ ہما ہے۔'' حسن نے ریسور ہما کو تھما دیا۔

''ہیلو دادی جان۔ سام مالیکم (السلام علیکم)''

''امی۔ سویٹر بن رہی ہیں۔ جی؟ حنا۔ بہت گندی ہے امی کو بہت تنگ کرتی ہے۔ مانی چچا۔ بہت کھراب ہو گئے ہیں اب مجھے سیر کرنے بھی نہیں لے جاتے۔ نہیں گھر پر نہیں ہیں۔''

''نہیں۔ ماریے گا نہیں۔ بس سزا دیجئے گا۔ ٹھیک۔؟'' وہ سر جھکائے ننگ میں مصروف ضرور تھی مگر ساری توجہ فون کی طرف ہی تھی۔ گویا عالیہ بیگم نہٹ گئیں۔ آخر حسن نے اسی سلسلے میں مبارک دی ہو گی۔ فون دوبارہ حسن نے تھام لیا۔

''اچھا۔ امی۔ جی۔؟ مانی۔ پتا نہیں آج ابھی تک کیوں نہیں آیا۔''

وہ اٹھ کر فون کے قریب چلی آئی۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اسے فون سننے نہیں دے گا۔ اور رکھ دے گا۔ وہ ساس سے بات کرنے کے لیے مری نہیں جا رہی تھی۔ وہ خوشخبری کی نوعیت جاننا چاہتی تھی۔

اس نے ریسور کی سمت ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ ریسیور لٹکا کر باہر نکل گیا۔

اس نے جھولتا ریسیور اٹھا لیا۔

''السلام علیکم چچی جان!''

''نہیں چچی جان۔ دراصل میں فون سے دور تھی۔ ''یہ'' نزدیک ہی ہوں گے۔ فوراً ریسیو کر لیا'' اسے بہانہ بنانا پڑا۔

چچی جان نے نہایت خوش ہو کر بتایا کہ عالیہ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ اس نے مبارک باد دے کر فوراً خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔ چچی جان تو مارے خوشی کے یہ بھی بھول گئیں کہ میزبانوں کا ٹیلی فون بل تیزی سے بڑھ رہا ہے لہذا اس نے خود ہی فون رکھ دیا۔

اسے خوشی ہوئی تھی سن کر کہ وہ ممانی بن گئی ہے۔

اب وہ منتظر تھی کہ کب مانی اور وہ اسے یہ خوشخبری سنائے۔

اسی دم مانی اندر داخل ہوا تھا۔

''السلام علیکم بھابی۔ ہیلو ننھی چڑیوں'' اس نے جھک کر ہما کا رخسار چوما۔

''وعلیکم السلام۔ بڑی عمر ہے ماشاءاللہ'' وہ اون کی سلائیاں ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جانتے ہو۔ ایک بڑی خوشخبری منتظر ہے تمہاری۔''

جوتوں کے تسمے کھولتا مانی چونک کر شہلا کی طرف دیکھنے لگا۔

''پڑوسیوں کے ہاں مہمان پھر آ گئے ہیں۔'' وہ دوبارہ تسمے کھولنے کے لیے جھک گیا۔

''ہاہا۔ ہا۔ بھوکے سے کسی نے پوچھا دو اور دو کتنے ہوتے ہیں۔؟ پتا ہے کیا جواب دیا چار روٹیاں۔ وہی حال تمہارا ہے۔ انشاءاللہ وہ خوشخبری بھی ایک دن ملے گی۔ مگر یہ خوشخبری بھی کچھ کم بڑی نہیں کہ آپ۔ ماموں بن گئے ہیں۔ عالیہ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ چچی جان کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھیں بہت خوبصورت اور صحت مند ہے۔''

''اچھا۔!'' وہ واقعی خوش دکھائی دینے لگا۔

''صمد بھائی کا کیا حال ہے۔؟''

''وہ بھی اچھے ہو رہے ہیں۔''

''کب واپس ہو گی وہ چڑیل۔؟'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''یعنی کب ڈسچارج ہو گی۔؟''

''خیریت۔؟''

''بھئی۔ اسے مبارک باد ہی دے دیں بذریعہ فون۔ آخر سنئیر ہو گئی ہے ہم سے۔'' وہ مسکرا دی۔

''چائے پیو گے۔؟''

''ہاں بھابی۔ پلیز۔'' اس نے تشکر آمیز نظروں سے شہلا کو دیکھا۔

''اور وہ آپ کے صاحب کہاں ہیں۔؟ انہیں بھی پوچھ لیں۔ ایسا نہ ہو میں چائے پیوں اور وہ زہر کے گھونٹ۔ بائی داوے۔ اس سرد جنگ کی وجوہات۔؟''

''ایسے ہی بعض اوقات ان کا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔'' وہ رخ موڑ کر چہرے کے تاثرات چھپا کر بولی۔

''عجیب بات۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''موڈ ہے یا پرانی گاڑی۔؟''

وہ بنا کچھ بولے باہر نکل گئی۔

مانی اس کے پیچھے پیچھے نکلا وہ کچن کی سمت مڑ گئی اور وہ زینے کی طرف۔

ہلکے سے دروازہ بجایا۔

''ہوں۔!'' اندر سے آواز آئی۔

''بات مت کیجئے گا۔ خاموشی سے چائے کا کپ رکھ دیجئے گا۔''

''تم پتا نہیں کیا سمجھ رہے ہو۔ بھئی مجھے تو بچیوں کو سلانا ہے۔ تم بھائی کو ایک کپ چائے بھی نہیں تھما سکتے۔'' وہ اس کی خوبصورت مگر گہری نظروں سے بچتی ہوئی بولی۔

''بھابی۔ ادھر دیکھئے۔''

''ہوں۔'' شہلا نے کپ میں چمچ چلاتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

''مجھے پتا ہے بھابی۔ آپ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتیں۔ بھائی جان بعض اوقات بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ ہیں نا۔؟''

اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ خاموش رہی۔

''چلیں دوستی کر لیں۔''

''تمہیں کس نے کہہ دیا ہماری لڑائی ہے۔ بے وقوف۔'' وہ بے نیازی بن گئی۔

''آپ کی مصنوعی ہنسی اور بجھے بجھے چہرے نے۔''

مانی نے کپ اٹھا لیا۔

''اور یہ۔؟'' شہلا نے دوسرے کپ کی سمت اشارہ کیا۔

''اپنے صاحب کا کام خود کیجئے۔ آپ کے اس گھر میں آنے سے پہلے۔ بہت خدمتیں کی ہیں ہم نے ان کی۔ میں اور عالیہ باقاعدہ طواف کرتے تھے ان کے کمرے کا۔''

اس نے مسکرا کر شہلا کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ مسکرادی۔ کپ اٹھالیا۔ ''بہت تنگ کرتے ہو مانی۔ بھائی کے اتنے کام کرتے تھے۔ اور بھابھی کا ایک ذرا سا ہاتھ نہیں بٹا سکتے۔'' وہ باہر نکل گئی۔

بے خوفی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی۔

''بھئی مانی میں نے پرسوں تمہیں ایک چیک دیا تھا جمع کرانے کے لیے۔ کیا ہوا۔؟''

وہ مانی نہیں تھی لہذا خاموشی رہی۔

''یار۔ ایک ذرا سا کام تھا۔'' حسن نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔

وہ جھک کر چائے سائیڈ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔

اس نے سیاہ شلوار قمیض پر سرخ شال اوڑھ کر رکھی تھی۔

وہی سیاہ سوٹ۔ جس کے گہرے گلے پر وہ اعتراض کرتا تھا۔ جس کے رنگ پر اسے کوفت محسوس ہوتی تھی۔ جس پر وہ کہا کرتا تھا۔

''مت پہنا کرو۔ ماتمی لباس۔ ایسا لگتا ہے۔ میرا سوگ منا رہی ہو۔'' عموماً وہ سخت سردیوں میں سیاہ لباس استعمال کر لیتی تھی۔ اس کا خیال تھا سیاہ کپڑوں میں سردی زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔

وہ ایک کھلے دماغ کی مالکہ تھی ان واہیات توہمات سے بہت پرے۔ حالانکہ سیاہ رنگ اس پر بہت کھلتا تھا۔ دودھیا رنگت کو کوئٹہ کی آب و ہوا نے گلابی کر دیا تھا۔ اس خوبصورت لباس میں اس کی گردن موم سے بنی لگتی تھی اور چہرہ مزید سفید و گلابی۔

اس نے تقریباً سال بعد یہ کپڑے استعمال کیے تھے۔ بلا سوچے سمجھے۔ حسن نے اپنی ''چڑ'' دیکھ کر اپنے اندر کڑواہٹ گھلتی محسوس کی۔

یہ زعم۔ یہ افتخار۔ شہلا۔ یہ تمہاری انا۔ اس سیاہ رنگ سے بھی زیادہ میرے اعصاب چٹخاتی ہیں۔

اس نے فائل بند کر دی۔ وہ واپس جا چکی تھی۔

اس نے چائے کو یوں گھورا جیسے وہ شہلا ہو۔

ہونہہ۔ شہلا۔ لوگ بیوی کے تمنائی ہوتی ہیں۔ نامور بیوی کے نہیں۔

دماغ خراب ہوتا ہے نامور عورتوں کا۔

ملک نواز۔ میری چڑ ہے۔ وہ میری چھت کے نیچے میری لاعلمی میں رات گزارتا ہے۔ مجھے عورت کی دلیل دینے کی عادت سے چڑ ہے۔ تم ہر بات میں دلیلیں ڈھونڈتی ہو، دلیلیں دیتی ہو اور مجھے تمہارا سیاہ لباس پہننا زہر لگتا ہے۔ مجھے پہن پہن کر دکھاتی ہو۔ یہ زعم اور افتخار کے ہی تو انداز ہیں۔ اس نے سلگ کر سوچا۔

اس نے واپس ڈرائنگ روم میں آ کر سامان سمیٹا۔ بچیوں کو ان کے کمرے میں لٹایا عموماً وہ خود بھی ان کے کمرے ہی میں سو جاتی تھی۔ حنا جب تک دودھ پیتی رہی وہ اسے اپنے پاس ہی سلاتی تھی۔ حسن کے پرزور احتجاج کے باوجود کہ بچے نیند خراب کر دیتے ہیں۔ اس نے بچیوں کے لیے اپنی جان گھلائی تھی۔ اس گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی اس کے باوجود کسی کے ذہن میں آیا رکھنے کا خیال نہیں آیا۔ دن میں جتنی ملازم عورتیں آتی تھیں بچیوں کے اکثر کام وہی دیا کرتی تھیں۔

اس نے خالص مشرقی انداز میں بچیوں کی پرورش شروع کی تھی۔ انہیں گود کی گرمی دی تھی۔ اپنا دودھ پلایا تھا۔ ان کو آداب سکھائے تھے۔ ہر چند کہ بہت چھوٹی تھیں۔ ہما کو کلمے۔ درود شریف یاد کرا دیا تھا۔ اتنی سی بچی جب اتنی ساری چیزیں زبانی سناتی تو سب بے اختیار ماشاءاللہ کہتے۔ اور ایسے میں وہ اپنے اندر ایک نیا ولولہ محسوس کرتی۔

ساس کی کسی سخت بات سے بچنے کے لیے اس نے کبھی آیا وغیرہ کا ذکر تک نہیں کیا۔ مبادا۔ ساس چار گھنٹے کے لیکچر پر آ جائیں۔ وہ بات ہی منہ سے کیوں نکالی جائے جو بے قدری کرائے۔ یوں گھریلو ملازم تو کئی تھے سوائے خانساماں اور آیا کے۔

اس نے بچیوں کو سونے پر آمادہ کیا۔

ان سے نمٹ کر ثریا کا جائزہ لیا۔ نہایت آہستگی سے دروازہ کھول کر جھانکا تھا وہ کروٹ کے بل سبز مخملیں لحاف میں بے خبر سو رہی تھی اس نے کلمہ شکر ادا کیا اپنے بیڈروم میں آ کر اپنا شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لباس بدلنے کا ارادہ کیا۔ شال اتاری سویٹر اتارا۔ قمیض کی آستینیں کہنیوں تک تھیں۔ سفید چم چم کرتے بازو۔ بظاہر ہر انجان حسن کو نمک بنانے لگے۔

وہ اس کی سمت سے پیٹھ کیے ہوئے تھے۔ دو بچیوں کی ماں کا انتہائی متناسب سراپا۔ دودھیا گردن اور چہرے کی جھلک۔ جسے دیکھنے کو اس کا دل بے قرار ہو گیا۔

''ہونہہ۔'' یہ اس قدر خوبصورت نہ ہوتی تو شاید اتنی گھمنڈی بھی نہ ہوتی۔

آٹھ دنوں میں اس نے ایک بار بھی نہیں جتایا کہ وہ اپنی غلطی پر نادم ہے۔''

شہلا نے وارڈروب سے لباس نکالا اور ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

''میرے خدشات محض نہیں ہیں۔ تو تو کسی کو بھی پاگل کر سکتی ہے۔ میں تیرا شیشہ سنبھالتا ہوں تیری سمجھ میں میری بات ہی نہیں آتی۔''

تو تو چیز ہی ایسی ہے شہلا کہ لوگ مجھ سے حسد کریں اور اپنی قسمت کو کوسیں۔ ہمارا خاندان کس قدر بڑا ہے۔ مگر کوئی بھی تیرے مقابلے پر نہیں۔ لہذا میں اپنی انا کی تسکین کے لیے تیری جانب سے بار بار اظہار محبت چاہوں گا۔ انا۔ مرد کی انا۔ کوڑیا ناگ سے زیادہ زہریلی ہوتی ہے جس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ مم۔ میں۔ میں۔ خود کو بہت سمجھاتا ہوں شہلا۔

''مگر میں حقیقتوں کو واہمہ سمجھ کر بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔''

تجھے بار بار احساس دلانا ہوگا کہ تو مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے جیسے کہ میں کرتا ہوں۔ وہ آج اس کے بغیر بے حد بے قرار تھا۔ سو تاویلیں نکالی تھیں دل نے۔ خود کو تسلی دینے کے سو بہانے۔ جائز قرار دینے کے ہزار جواز۔ آخر کوئی آ کر کیوں جتائے کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ تیرا قدردان ہے۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔''

وہ سردی کی وجہ سے اپنے بازو لپیٹے سی سی کرتی ڈریسنگ روم سے باہر آئی اور صوفے سے شال اٹھا کر اچھی طرح لپیٹی اور باہر نکل گئی۔ غالباً بچیوں کے کمرے میں اور حسن کا جی چاہا۔ کہ وہ اس خودی کے نشے میں چور عورت کو جان سے ختم کر دے۔ محبت انتہا پسندوں کے لیے سزا ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ ان کے پاس لاؤنج میں آ گئی۔

''مانی۔!''

''جی ثریا باجی۔''

"مانی۔ آپا نہیں آئیں۔ تم انہیں ریل گاڑی میں چھوڑنے گئے تھے ناں۔"

"نہیں ثریا باجی۔ ہوائی جہاز میں۔" وہ مسکرایا۔

"ہوائی جہاز۔ وہ جو اتنا اونچا اڑتا ہے۔" خوف سے ثریا کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"مانی۔ اگر آپا اور ابو آ گئے۔؟" وہ روہانسی ہوگئی۔

"نہیں۔ باجی۔ اور بھی بہت سے لوگ جاتے ہیں جہاز میں۔"

"وہ پتلے دبلے ہوں گے مانی۔ آپا موٹی ہیں اگر جہاز گر گیا۔؟"

وہ سخت پریشان تھی۔

"خدا نہ کرے۔ باجی۔ بس آنے ہی والی ہیں آپ کی آپا۔"

"پتا نہیں۔ کب آئیں گی روز کہتے ہو کہ۔ آنے والی ہیں۔"

چچی جان نے فون پر بتایا تھا کہ وہ عالیہ کو لے کر ہی آئیں گے اور کوشش کریں گی کہ صمد بھی ان کے ساتھ جائیں۔ اس نے مانی کو بتا دیا تھا۔

"چلو اچھا ہے عالیہ بھی آ رہی ہے۔ اب تمہارا کام بھی کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"ارے بھابھی۔ کوشش۔ اسٹرگل کہیے۔"

"اچھا بھئی اسٹرگل ہی سہی۔ ویسے میں نجمہ سے خبر لیتی رہتی ہوں اس کی۔ بہت سی معلومات فراہم کی ہیں نجمہ نے۔"

"مانی۔ سچ میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا تھا کہ کوئی اس کا بھلا نہیں چاہتا۔"

"میں تو چاہتا ہوں۔"

اس کی بے ساختگی پر شہلا ہنس پڑی۔

"بے وقوف۔ میرا مطلب ہے وہ مصنوعی رشتوں میں جکڑی ہوئی ہے کوئی بھی اس کا خیر خواہ نہیں دکھائی دیتا۔ تم میں ماشاء اللہ کوئی کمی نہیں۔ اس کی سوتیلی بہنیں جن کے انداز میں دیکھ ہی چکی ہوں کبھی نہیں چاہیں گی کہ ساحرہ کو اتنا اچھا جیون ساتھی ملے۔ ہم اپنے گھر سے تو نمٹ لیں گے مانی مگر ان لوگوں سے۔؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ لوگ یہ کہہ دیجئے گا کہ میں اسٹینو ٹائپسٹ ہوں۔ آٹھ سو روپے ماہوار آمدنی ہے۔ بہت غریب ہوں۔"

"ہوں۔ ایسے نہیں چلے گا۔ اس کی ممی آخر یہاں رہ کر دیکھ کر گئی ہیں۔ ساحرہ کے حالات کا اندازہ کر کے میرا خود بھی بہت جی چاہتا ہے کہ اسے اپنی دیورانی بنا کر لے آؤں۔ اس کے دل سے تمام محرومیاں مٹا دوں۔ پتا نہیں کیوں مجھے اس لڑکی سے اس قدر انسیت محسوس ہوتی ہے۔"

"مانی کیا سچ اس کے لیے تمہارے دل میں۔ یا پھر محض اس کی شکل دیکھ کر۔"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ بھابھی۔ یونیورسٹی میں ایک سے ایک حسین لڑکی تھی شاید ساحرہ سے بھی زیادہ خوبصورت"

وہ بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اور شہلا کے "اندازے" سن کر متفکر بھی۔ وہ خاموشی سے نٹنگ میں مصروف ہوگئی

"مانی! میری بیٹی کے اسکول شوز بالکل خراب ہوگئے ہیں۔ اب میں اس قدر مصروف ہوں۔ وہ سخت برے برے منہ بناتی ہے۔ کہ امی یہ شوز اچھے نہیں۔ اپنے باپ کی طرح ہر چیز میں نفاست چاہتی ہے۔"

مانی نے مسکرا کر اخبار تہہ کیا۔ شہلا کے پیچھے کھڑی ہستی کو دیکھا۔

"اور محترمہ ظل ہما کے والد صاحب آپ کے پیچھے کھڑے اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں۔"

وہ بڑی بے خبری کی کیفیت میں تھی۔ دو پھندوں اکٹھا بن کر ایک پھندا گرانا تھا۔ شاید پھندا گرایا نہیں تھا جب ہی شیپ نہیں بنی تھی۔ مانی کی بات پر بھی وہ پھندوں میں مگن تھی۔

"چیک کا کیا ہوا یار۔؟" حسن کی بھاری اور سنجیدہ آواز اس کی پشت سے ابھری۔ تو وہ چونک گئی۔ مگر اسی زاویے سے بیٹھی رہی۔

"چیک تو جمع کرا دیا تھا۔ لاہور برانچ سے ایشو ہونا تھا۔ لہذا۔ دو دن تین دن تو لگنا ہی تھے۔ تصدیق ہوگئی ہے۔ رقم آپ کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوگئی ہے۔ میں آپ کو بتانے ہی آ رہا تھا۔" مانی کی گرہ حسن کے سامنے ہی دبتی تھی حسن کی سنجیدگی اور مانی کی شوخی۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بھائی کے سامنے تو مانی بڑا سنجیدہ نظر آتا تھا۔ حالانکہ حسن اس کی فطرت سے بخوبی واقف تھے۔ کئی برجستہ جملے حسن کو آج بھی یاد تھے مانی کے جنہیں یاد کر کے بے ساختہ ہنسی آتی تھی۔ وہ حسن کا احترام کرتا تھا۔ اس خصوصیت کی بنا پر وہ حسن کو اور زیادہ عزیز تھا۔

اس نے بھی کبھی بھائیوں کے تعلقات کے درمیان آنے کی کوشش نہیں کی تھی جیسے کہ عموماً عورتیں سسرال میں داخل ہوتے ہی کرتی ہیں۔

حالانکہ حسن کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ کوئی ان کی چیزیں استعمال کرے مگر یونیورسٹی کے دور میں اس نے کئی بار حسن کی ٹائیاں۔ غیر ملکی نفیس شیپ کے جوتے، ٹائی پینس۔ کف لنکس استعمال کیے تھے۔ حالانکہ ان ہی چیزوں کا خود اس کے پاس بھی اسٹاک تھا۔

شہلا نے کبھی حسن کو ہوا بھی نہیں لگائی کہ صاحب آپ کی پسندیدہ چیزوں کی خوب قیمت وصول کی جا رہی ہے۔ وہ "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔" کی مکمل تفسیر تھی۔

وہ اپنی مصروفیات اور جفاکشی پر کسی میڈل کی طالب نہیں تھی۔ لیکن ایک آرزو بچے کی طرح اس کے دل میں ہمکتی تھی کہ اس کے محبت بھرے دل کی قدر کی جائے۔ اس کے خلوص پر کبھی شک نہ کیا جائے۔ اسے اپنی کسی چیز پر ناز نہیں تھا۔ ناز تھا تو صرف اس بات پر کہ خدا نے اسے ایسا دل عطا کیا ہے جو محبت اور امن کی فضا کا طالب ہے۔ اس کی محبت اور خلوص انسانوں کو خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتے۔

اس کا قلب۔ رفیق ہے۔ شفیق ہے۔

پر خلوص ہے۔ ہمدرد ہے۔

اسے کسی سے حسد نہیں ہے۔

اس کا دل کسی انتقام۔ کسی مقابلے کی آگ میں نہیں جلتا۔

اس کا دل کینے ونفرت کی دیمک سے محفوظ ہے۔

حسن تمہارا رویہ پھر میرے ساتھ سراسر ظلم ہے ناں۔

ہمدم۔ یا تو محبت کر۔ یا پھر ظلم۔ یہ ایک تلوار کی دو دھاریں کیوں بنائی ہیں۔

کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ۔ جو قدر دانوں کے بیچ رہتے ہیں۔ میں سوچتی ہوں حسن۔ تم تو کبھی بھی مجھے بلاؤ گے۔ میں۔ تمہیں۔ کیسے بلاؤں۔ سچ۔ یہ گھر تو مجھے اجنبی لگنے لگا ہے وہ اس کے پیچھے کھڑا ہو کر بھائی سے بات کر

کے چلا بھی گیا۔

وہ اس کی خوشبو سے باتیں کر رہی تھی۔

"مانی۔ دیکھو ثریا آ رہی ہے۔ گیٹ میں تالا ڈال دو۔"

اس نے برآمدے میں ثریا کی ہنسی کی گونجتی آواز سن کر مانی سے کہا۔

☆☆☆

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آ گئے۔

مانی کڑھ کر رہ گیا۔

"آئیں ثریا باجی میں آپ کی بات کرواتا ہوں۔" وہ اسے بازوؤں میں تھام کر اندر بڑھ گیا۔

ٹیلی فون کی وہ عادی تھی۔ وہ اسے انہی قدرتی چیزوں میں شامل سمجھتی تھی جو وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے دیکھ رہی تھی۔ بلکہ چار سال کے بعد سے اس نے ہوش سنبھالا ہی کہاں تھا۔ مانی اسے لے کر لابی میں گیا تھا۔ جہاں سے ثریا کی بے ربط باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

مانی نے اس کی بات کروا دی تھی۔ ثریا نے ایک ہی جملہ بار بار بولا تھا۔

"آپا گھر آ جاؤ۔"

مانی خدا معلوم کہاں چلا گیا۔ ثریا پھر اس کے قریب چلی آئی۔

حنا بیٹھی ہوئی کھلونوں سے کھیل رہی تھی لاؤنج میں ایک سناٹا سا طاری تھا۔ شہلا کے ایک دو بار کے اظہار خفگی کے بعد سے ثریا اس سے ڈرنے لگی تھی۔

اس نے پھولے پھولے رخساروں والی حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالتی حنا کو دیکھا۔

"دلہن۔!"

"تم سے کہا ہے ناں ثریا۔ دلہن مت کہا کرو۔ دلہن بھابھی کہہ لیا کرو۔"

"آپا بھی تو دلہن کہتی ہیں۔"

"لیکن تم دلہن بھابھی کہا کرو۔" وہ تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کرتے پل اور کو ناپنے لگی۔

"دلہن۔!"

"وہ خاموش رہی۔"

"دلہن بھابھی۔!"

"ہوں۔"

"میں۔ "یہ" لے لوں۔؟ اس نے حنا کی سمت اشارہ کیا۔

"اس کا نام حنا ہے ثریا۔"

"مجھے تو نہیں پتا۔"

"میں بتا رہی ہوں ناں۔ اس کا نام حنا ہے۔" اس نے گھٹنے کے نیچے سے اون کا گولا نکالتے ہوئے کہا۔

"میں حنا لے لوں۔"

"تم یہیں اس کے پاس بیٹھ کر اس کے ساتھ کھیلو۔ لے کر جاؤ گی تو یہ رونے لگی گی۔"

"میں اسے بھائی کے کمرے میں لے جاؤں گی۔"

"نہیں بھائی غصہ ہوں گے۔ وہ کام کر رہے ہیں۔"

ثریا نے حنا کو گود میں بھر لیا۔

اس سے پہلے کہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا۔ وہ دھم۔ دھم کرتی زینے چڑھ گئی۔

اس نے جلدی جلدی اون سلائیاں سمیٹیں اور خدا سے پناہ کی دعا کرتی زینے کی سمت چلی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اپنے کمرے میں جھانکا۔

وسیع و عریض بیڈ پر حسن ایک سمت نقشے و چارٹ پھیلائے بیٹھے تھے۔ دوسرے سرے پر ثریا اور حنا بیٹھی تھیں۔ ثریا بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔

"بھائی۔!"

"ہوں۔" حسن کا اپنا مصروف انداز تھا۔

"بھائی۔ یہ حنا بلی جیسی ہے ناں۔؟" وہ معصوم سے انداز میں گویا ہوئی۔

"تم پر گئی ہے۔ تم بھی تو بلی جیسی ہو۔" حسن نے مصروف لمحوں میں سے ایک لمحہ بہن پر قربان کیا۔

وہ اندر چلی آئی۔

"ثریا۔ آؤ نیچے چل کر بیٹھتے ہیں۔ ٹی وی دیکھتے ہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔ نہیں جاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

اس نے حنا کو اٹھانا چاہا تو ثریا نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"بھئی کیا مصیبت ہے ثریا۔ اس سارے گھر میں کیا میں ہی فالتو ہوں۔" اس کا ذہن جھنجھلا گیا۔

اس نے ثریا کو ایک طرف کیا اور حنا کو اٹھا لیا۔ "ایک طرف ہٹو۔ خبردار جو آئندہ حنا کو گود میں اٹھایا تم نے مجھے اگر سکون نہیں مل سکتا تو کم از کم میرے بچوں کو تو مل جائے۔" جانے کب کا بخار تھا جو اس کے ان جملوں میں بہہ نکلا تھا۔

اس نے ثریا کو جھٹکا دیا تھا۔ وہ سہم کر ایک کونے میں ٹک گئی تھی۔ ثریا آج تک اس خوبصورت لیکن اجنبی لڑکی کو ذہنی طور پر قبول نہ کر پائی تھی اس کا ذہن اسی کھوج میں لگا رہتا تھا کہ یہ لڑکی اس گھر میں کیوں آئی۔ ایک دم اجنبی۔ اور آ کر سب کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگی۔ کھانا کھانے لگی۔ گھر پر حکم چلانے لگی۔

وہ ٹکر ٹکر شہلا کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کی اپنائیت کے بعد یہ سرد رویہ اسے مار ڈالتا تھا۔

وہ حنا کو گود میں بھر کر باہر نکل گئی۔

حسن نے گردن موڑ کر جاتی ہوئی شہلا کو دیکھا۔

"کتنی۔ نئی عورت آئی تھی ابھی کمرے میں۔ یہاں۔ ادھر۔" اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

"ثریا۔" بری بات ہے۔ بچوں کو تنگ نہیں کرتے۔

"بھائی کیا لکھ رہے ہو۔؟" اس نے چارٹ اٹھا لیا۔

"کام کر رہا ہوں۔ دیکھو چیزیں ادھر ادھر نہ کر دینا میری۔" اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر مصروف ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ "نئی عورت" اسے بے حد ڈسٹرب کر گئی تھی۔

''ابا جی۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں ناں۔ میرے ساتھ چلیں۔ میں بہترین ڈاکٹر سے علاج کرواؤں گا۔ مگر آپ ہیں کہ۔''

''دیکھ پتر نواز۔ کڑی اٹھالی ہے میں نے چنگا بھلا ہوں اب۔ اب کیا کروں گا اتنی دور جا کر۔ جو ہم تجھے کہہ رہے ہیں وہ تو سن نہیں رہا۔''

''ابا جی۔ میں نے آپ سے ضد تو نہیں باندھی ہوئی۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش تو کریں۔''

''میرا ارادہ باہر۔ یورپ جانے کا ہے۔ میں وہاں ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی میرا شوق ہے۔''

''دیکھ پتر۔ اب تو ہمیں اپنے شوق کے پیچھے اور نہ بھگا۔ تھک گئے ہم تو تیری مان مان کر۔ پہلے کہتا تھا پڑھوں گا پڑھوں گا۔ چل بھائی پڑھ لے۔ پھر کہا۔ رسالے میں کام کر رہا ہوں۔ فرصت نہیں ہے۔ گھر کا انتظام نہیں ہے۔ ابھی عورت کو نہیں بلا سکتا۔ تیری یہ بھی مان لی۔ سب توں چھوٹا پتر ہے میرا۔ بہت مانی ہیں تیری۔ اب بس کر۔ دیکھ پیسے لے جا۔ مکان خرید لے۔ کیوں در بدر پھرنے کی قسم کھائی ہے۔ گھر بنا۔ گھر یہی عمر ہوتی ہے۔''

''گھر بیوی۔ بچے۔! ابا جی۔ مت مجھے مجبور کریں یہ لگی بندھی زندگی گزارنے پر۔ میں ابھی بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ جھلا گیا۔

''مثلاً کیا کرنا چاہتا ہے۔؟ ایک اور پاکستان بنائے گا۔ یا کسی پارٹی کا ٹکٹ خرید کر انتخاب لڑے گا۔ اوئے پریزیڈنٹ بن کر ملک وقوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔''

''سب کر رہے ہیں ابا جی یہ کام۔ کوئی نئے کام نہیں کر رہے ہیں اگر لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔''

''میری تو سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آخر وہ نیا نویلا کون سا کام ہے؟'' ملک شہباز کو واقعی تعجب ہوا۔

''ابا جی۔ یہ جو انسان کا ذہن ہے۔ وہ چیزیں دیکھتا ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آ رہی ہوتیں۔ ان کاموں کی ترغیب دیتا ہے جن کے سرے سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت ساری چیزیں۔ بالکل اسی طرح اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہوں جیسے۔ یہ پلنگ۔ یہ کتاب۔ یہ حقہ مجھے اپنے سامنے رکھا نظر آ رہا ہے۔ جو میرے ذہن میں ہے میں اسے مجسم دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

ملک شہباز کی آنکھیں حیرانی سے پھٹ سی گئی تھیں۔

''اوئے زیادہ پڑھنے سے بھی آدمی کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ سنا۔''

''شاید ابا جی!'' میں اپنی اس بے قراری کو تلاش حق کا نام بھی نہیں دے سکتا کہ میں بہر حال اپنے روائتی مرکز سے ہٹ کر نہیں سوچتا۔ نفسانی خواہشات میرے وجود میں ہلچل پیدا کرتی رہتی ہیں۔''

''جب ہی کہہ رہا ہوں پنو کو ساتھ لے جا۔ کچھ اور دن اکیلا رہ گیا تو'' ملک صاحب کو اس کی جانب سے مزید تشویش ہو چلی تھی۔

''لاحول ولا قوۃ۔ پھر وہیں آ کر تان ٹوٹی۔ پنو۔ ہونہہ

اب مجھے اجازت دیں ابا جی۔ میں جلدی جلدی آتا رہوں گا۔

''تیرے آگے ہم مٹی ہو جاتے ہیں نواز۔ تو اس کمزوری سے خوب فیدہ (فائدہ) اٹھاتا ہے۔ اب تو تو جا رہا ہے۔ یاد رکھ اب زیادہ ٹال مٹول نہیں ہوگی میں خود پنو کو لے کر کراچی آ جاؤں گا۔ بچ تو کہاں تک بچتا ہے۔'' وہ کھل کر ہنسے۔

''ابا جی۔ مجھے انسانوں سے پرہیز تو نہیں ہے۔ سمجھیں ابا جی۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

''اچھا۔ اچھا۔''

''اپنے باپ کو ہی بنا سکے تو بے وقوف۔ میں تیری باتوں میں نہیں آنے والی۔'' ملکانی نہ جانے کب وارد ہو گئی تھیں۔

''پنو۔ تیری عورت ہے۔ تیری ذمہ داری۔ ہم نے عمر بھر کا ٹھیکا لیا ہے ناں۔'' ملکانی سخت غصے میں تھیں۔

''تو۔ میں نے کب کہا تھا آپ لوگوں سے کہ میری شادی کر دیں۔''

''ہا۔ آ۔ ئے۔ ہائے۔'' ملکانی نے مارے تعجب کے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ''اپنے منہ سے تو کوئی نہیں کہتا کہ میری شادی کرو۔ یہ تو ماں باپ کا فرض ہوندا اے ہے۔ کملا جیا۔''

''اماں جی۔ آپ کے فرض پورے ہو گئے۔ بہت ہے۔ مجھ پر زبردستی نہ کریں پاگل ہو جاؤں گا۔''

''نیک بختے۔ نہ تنگ کر۔ اسے۔ جاہل نہیں ہے یہ۔''

''تنگ نہ کروں۔ وہ پنوں کے ماں پیو۔ روز ای (ہی) پوچھتے ہیں۔ دھی ہے ان کی۔ فکر تو ہو گی انہیں۔ تجھ سے ملے تھے رات؟'' ملکانی کو معاً یاد آیا۔

''ہوں۔!''

''کیا کہہ رہے تھے۔؟''

''وہی جو آپ لوگ کہہ رہے ہیں۔''

''وہ بھی سچے اور کوئی ہوتا کدی (کبھی) کا دھی کو واپس لے جاتا۔''

''تو لے جائیں۔'' ملک نواز کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

ملک شہباز کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔

''یہ عزت داروں کے ہاں نہیں ہوتا۔ آئندہ سوچ کے بولنا۔ ہمارے ہاں سات پشتوں میں عورت مڑ کے ماں پیو کے گھر نہیں گئی۔''

''تو سات پشتوں کے ہاں یہ وقت و حالات بھی نہیں ہوں گے۔ ہر پشت بلکہ ہر انسان کا اپنا اپنا جنم ہوتا ہے۔''

''گرمی نہ کھائیں ابا جی۔''

''چنگی گلاں کر دا اے۔'' ملکانی نے مارے غصے کے سر پر دوپٹہ جمایا۔ جما کر ہٹایا۔ پھر جمایا۔

''دو مہینے بعد کی تاریخ دے دی ہے ہم نے رضیہ کی۔'' ملک صاحب نے غصے پر قابو پا کر موضوع ہی بدل دیا۔ وہ بیٹے کو رخصت کرتے وقت بد مزگی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

''ابا جی۔!''

''ہاں پتر۔!''

''ابا جی۔ مجھے ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ پنو کو ضائع نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کوئی اور اسے وہ سب کچھ دے دے جو میں ساری عمر نہ دے پاؤں۔'' اس نے وہ آگ جو پانچ سال سے اپنے اندر دہکا رکھی تھی باہر نکال کر ملک شہباز کے گھر میں پھیلا دی۔

ملکانی کے سر پر گویا بیٹے نے گولہ سا دے مارا تھا۔

ملک شہباز نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے تیزی سے نمودار ہوئے تھے۔

"اباجی۔نواز گھبرا گیا تھا۔اس نے جھک کر باپ کے ہاتھ سہلائے۔"

"مم۔میرا مطلب یہ نہیں تھا اباجی۔!"

"پتر۔کیا اپنی اولاد سے اتنا پیار کرنا چاہئے جتنا ہم نے تجھ سے کیا ہے۔کیا بچے اپنے ماں باپوں کے ساتھ یہی کرتے ہیں۔" ان کی آواز بے حد پست تھی۔

"اے جی..... میں نے کہا....." ملکانی کی غصیلی آواز ابھری۔ملک صاحب نے ہاتھ اٹھا کر بیوی کو چپ کرا دیا۔

"اباجی جب آپ ٹھیک ہو جائیں تو امی کو لے کر آ جائیں۔میں آپ کی مرضی سے کوئی مکان یا بنگلہ خرید لوں گا۔پھر پنو کو بھی....."

"تو پھر پہلے وہ الٹی سیدھی کیا بول رہا تھا.....؟" ملکانی نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"وہی..... میرا کچھ شوق ہے۔بہت ساری آرزوئیں جنہیں میں پوری کرنا چاہتا ہوں۔بس اسی وجہ سے....." اس نے صحیح بات کہہ کر پھر غلط اور مزاج کے برخلاف بات کہی۔

"بے وقوف..... پنو کو نال لے کر آرزو پوری کر..... اب وہ تجھ سے اور تو اس سے پورا ہے سنا.....؟" ملکانی کا موڈ بحال ہوا۔

"کوئی پیسہ ٹکا چاہئے تو لے لے۔" ملک صاحب نے اپنے منفرد اور مضبوط بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔

"ابھی تو ہیں میرے پاس..... پرسوں ہی تنخواہ ملی تھی....."

"بھلا دو چار سو میں تیرا گزارا ہو سکتا ہے.....؟ اسی لیے میں کرم داد کے ہاتھ ہر پہلی کو تجھے پیسے بھیج دیتے ہیں۔" ملک نواز کا پروگرام فیل ہو گیا تھا..... وہ سخت اندرونی اضطراب کا شکار تھا..... اب جلد سے جلد گاؤں کی حدود سے باہر نکلنا چاہتا تھا۔

"اچھا اباجی.....!"

"رب راکھا پتر.....!" ملکانی نے نہال ہو کر کہا۔

ملک نواز باہر کھڑی جیپ میں جا کر بیٹھ گیا جسے ان کا پرانا ڈرائیور ڈرائیو کر رہا تھا۔

"رب..... راکھا..... اباجی..... اس وقت تک جب تک ہیں وہ تصویر آپ کے سامنے نہ لے آؤں جو میرے ذہن میں گہرے رنگوں کے ساتھ مقیم ہے۔" اس نے جھک کر سگریٹ سلگایا۔

حسن شدید فلو کا شکار ہو گیا تھا۔

وہ اب مزید پتھر نہ بن سکی۔سامنے والوں کے ہاں سے وہ ہما کے ساتھ سالگرہ سے ابھی ابھی لوٹی تھی کہ ملازم نے اسے حسن کے بارے میں بتایا کہ انہیں شدید بخار ہے..... ایسے میں اسے شدت سے چچی جان کی کمی کا احساس ہوا..... وہ جلدی سے ڈاکٹر کو رنگ کرنے لگی اور فوراً آنے کو کہا۔

وہ جانتی تھی حسن ان لوگوں میں سے ہے جو کبھی کبھار بیمار پڑتے ہیں لیکن جب پڑتے ہیں تو دوسروں کو اس حد تک پریشان کرتے ہیں کہ خود تو ٹھیک ہو جاتے ہیں اور تیمار دار پڑ جاتے ہیں۔وہ آہستگی سے اپنے بیڈروم میں آئی۔وہ سرخ کمبل تانے سو رہا تھا.....

وہ اس کے نزدیک چلی آئی۔

اور غور سے اسے دیکھنے لگی..... وہ اسے نڈھال اور بے حال دکھائی دیا۔

اسی دم حسن نے آنکھیں کھول دیں۔وہ گڑبڑا گئی..... جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی ہوئی۔فوراً سنبھل کر بولی.....

"کیسی طبیعت ہے.....؟"

وہ پھر اس طرح بولی تھی جیسے ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی.....

وہ معافی اور معذرت کے پہاڑ پھر پھلانگ گئی تھی..... حسن کو وہ انا کی بلندی پر کھڑی بالکل اچھی نہیں لگی۔اس نے کامدار شال ایک طرف رکھی۔فیروزی بنارسی ساڑھی اور نازک ساطلائی سیٹ پہنے تھی۔

کیا بے نیازی ہے۔میری ناراضگی کا احساس ہی نہیں..... باقاعدہ تقریبات اٹینڈ کی جاتی ہیں۔حسن کا جی جل کر خاک ہو گیا.....

"میں نے ڈاکٹر خان کو فون کر دیا ہے۔آتے ہی ہوں گے....."

"خواہ مخواہ تکلیف کی آپ نے.....؟" اس نے کروٹ بدل لی۔

"اب تو کر ہی دی....." وہ مسکرائی۔اس کی چیزیں اٹھا اٹھا کر ٹھکانے سے رکھنے لگی..... ڈاکٹر خان آ گئے تھے..... چیک اپ کے بعد اطمینان ظاہر کیا۔کچھ دوائیاں لکھ کر دیں..... وہ تو چلے ہی گئے۔

لیکن بہت خوش کن اور حسین لمحات اس کی جھولی میں ڈال گئے۔

وہ بے حد حساس تھی حسن کے خاموش مطالبات سمجھتی تھی۔

وہ ہر کام وقت پر کرنے کی عادی تھی..... اس نے بتا دیا کہ وہ اس سے خواہ مخواہ بدگمان ہوتا ہے۔وہ تو اسے حاصل کل سمجھتی ہے..... اس کے بنا زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی.....

صبح ہی صبح شدید سردی میں وہ بے حد مصروف تھی اور اس کے باوجود گنگنا رہی تھی۔

گھٹا گھنگھور..... گھنگھور..... مور مچاوے شور۔

مورے سجن آ جا.....

"آرام کرنے دیں بھابھی..... ابھی بخار نہیں اترا۔"

مانی جو شاید ناشتے کے لیے کچن ہی میں چلا آیا تھا۔شوخی سے بولا۔

وہ جھینپ سی گئی۔

"ویسے بھابھی..... سجن اور حسن..... ہم قافیہ ہیں۔آپ حسن کہہ رہی تھیں یا....."

"تم ہمیشہ اسی طرح میری پرائیویسی میں مخل ہوتے ہو....."

"مانی..... شام کو ایئرپورٹ ضرور پہنچ جانا..... ورنہ..... چچی جان۔"

"ایک تو ویسے ہی شدید سردی کا موسم ہے۔" اسے معاً ساس سسر کی آج شام کی متوقع آمد کا خیال آیا۔

"بھابھی.....!" مانی کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"ہوں.....!"

"کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اپنی بھی کیا زندگی ہے..... خدمت..... خدمت..... خدمت..... ایک حسن بھائی جیسے لگے بندے بھی ہوتے ہیں..... ذمہ داریوں سے آزاد..... جو چاہا پایا۔اتنی حسین اور پتی ورتا قسم کی بیوی۔پیار سے

پیارے بچے۔ ایک ہم ہیں۔''

''ارے نظر نہ لگا دینا...... تمہیں بھی اللہ سب کچھ دے گا۔ اتنی عجلت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''بھابھی...... روز ایک دھڑکا سا لگ جاتا ہے۔ ادھر سے کوئی خبر نہ آ جائے۔''

''اگر ایسا ہو گیا...... بھابھی...... تو مجھے سب سے تاحیات شکایت رہے گی۔''

''ارے...... ارے...... یہ صبح صبح...... میں نے تمہیں کہا نہیں کہ میں اپنی جانب سے کوئی کسر نہیں چھوڑوں گی۔ آگے یا مقدر یا نصیب۔ چلو اب بیٹھ جاؤ۔ ناشتہ کر لو۔''

''مجھے تو واقعی حیرانی ہو رہی ہے۔ بڑی غضب کی چیز ہے یہ ساحرہ...... اڑنے والے گھوڑے کے منہ میں لگام ڈالنا...... بہت بڑا کارنامہ ہے......''

اس نے ٹوسٹر سے ٹوسٹ نکال کر مانی کے سامنے پلیٹ میں رکھے۔

''آج ہی بات کر لیجیے گا بھابھی...... امی سے......''

''آج وہ کچھ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں گی بلکہ ایک ہفتے تک نہیں ہوں گی۔ آج تو آپ بس بہن بہنوئی اور بھانجے کی باتیں سنیے گا۔'' اس نے کیٹل کا پلگ لگایا اور سوئچ آن کر دیا۔

''بعض اوقات والدین اپنے تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہیں...... کس کام کی ایسی محبت جو بندے کی زندگی ہی تنگ کر دے۔''

''ایسے نہیں کہتے مانی...... ماں باپ کبھی ظلم نہیں کرتے۔ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں جو فیصلہ کرتے ہیں بعض اوقات وہ عمر اور تجربے کی کمی کے سبب سمجھ میں نہیں آتا۔''

''تم پہلے سے ہی اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو......؟''

اسے مانی کے گم صم سے انداز پر ترس سا آ گیا......

یہی پل صراط کی دھار تھی جس پر کبھی وہ بھی چلی تھی...... وہ جانتی تھی...... سردیوں کی سیاہ راتوں میں ایک تنہ عشق آشنا دل پر کیا گزرتی ہے......؟ جب کہ کمرے میں...... معشوق کا نقش بولتا محسوس ہوتا ہے۔

مانی نے بھابھی سے کچھ نہیں کہا تھا۔

لیکن اس کی سوچتی آنکھوں نے بتا دیا تھا کہ وہ رات گئے تک سو نہیں سکا۔

☆☆☆

''پہلی بات تو یہ کہ آخر اس نے باہر شادی کرنے کے بارے میں سوچا ہی کیوں......؟''

چچی جان تو پہلے سے ہی اکھڑ گئی تھیں۔

بیٹی اور نواسے کو وہ ہمراہ لائی تھیں۔ تین چار دن صبر کرنے کے بعد شہلا اور عالیہ نے مشورے کے بعد دھوم سینکتی چچی جان کے سر پر گویا ایٹم بم دے مارا تھا۔

''اور دلہن تم بس نام ہی کی بڑی ہو گیا...... آخر میں نے تم پر پہلے ہی جتا دیا تھا کہ خاندان سے باہر تو میں...... مانی کی شادی کرنی ہی نہیں......''

''تو چچی جان میں نے تو ساحرہ کا انتخاب نہیں کیا...... مانی کی پسند ہے......''

''ارے اب تک سب نے اپنی اپنی پسند ہی آگے رکھی ہے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ ممتاز کی بیٹی میں کب سے نظروں میں رکھی ہوئی ہے...... کس قدر خوبصورت......''

''مگر امی مانی بھائی صرف اور صرف ساحرہ سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''ارے...... عقل تو اسے پوری طرح آئی نہیں۔ لگا ہے لڑکیاں پسند کرنے......''

''امی...... لڑکیاں نہیں...... لڑکی......''

''بس کرو عالیہ...... بہت ہی زبان پکڑنے لگی ہو...... بیاہتا بیٹی ماں کی ماں نہیں بن جایا کرتی......'' انہوں نے طیش میں عالیہ کو بھی جھاڑ پلائی۔

''امی...... آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آتا...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔ مانی بھائی نے صاف کہہ دیا ہے وہ ساحرہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کریں گے۔''

''کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں ساحرہ میں۔ اس سے لاکھ درجے زیادہ حسین خاندان میں بھری پڑی ہیں۔ ارے اسے کیا پتا...... باہر شادی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نئے خاندان سے ناتہ جوڑنا...... ماشاء اللہ اپنا خاندان تو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ اب جو بچوں کو باہر بیاہ دوں تو اتنا ہی بڑا ایک اور خاندان میرے سر پر۔ یہ دلہن کا بہنوئی۔ یہ دلہن کا چچا یہ دلہن کے باپ کا چچا...... نا بابا نا...... خاندان میں شادی ہو تو سب اپنے بس میں ہو جاتا ہے...... دلہن کا ننھیال تو دولہا کا ددھیال...... دلہن کا ددھیال تو دولہا کا ننھیال...... باہر شادی کرنا کھیل سمجھ لیا ہے...... ہونہہ......''

شہلا اور عالیہ چچی جان کی دور اندیشی کی قائل ہو گئیں۔

''ارے وہ تو لڑکی نے کر ایک طرف ہو جائے گا...... نئے خاندان کی جوتا سلامی کو میں رہ جاؤں گی۔''

''پھر کیا کہوں مانی بھائی سے......؟'' عالیہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تم نے کیا کہنا ہے میں خود ہی نپٹ لوں گی......'' چچی جان کے لہجے میں خان خاناں چنگیز خان کا اعتماد تھا۔ دونوں جانتی تھیں...... مانی بھی ان ہی کا بیٹا ہے۔

شام کی چائے پر مانی نے دونوں کے تاثرات ان کے چہروں سے جاننا چاہے۔ مگر دونوں کے چہرے بے تاثر تھے...... غالباً دونوں پوری طرح ناامید نہیں تھیں ابھی۔

عالیہ نے اشارے کنایوں میں جتا دیا کہ کمانڈر انچیف شاید آج ہی رات کو ہنگامی اجلاس طلب فرمائیں گے...... اس کا اندازہ اس نے ماں کے چہرے سے بھی کر لیا تھا۔

یہی ہوا۔ اس نے اور عالیہ نے دیکھا کہ رات کو دس بجے مانی کو چچی جان نے کمرے میں بلوا بھیجا ہے۔

وہ دونوں ڈرپوک ننھے بچوں کی طرح دروازے کے پیچھے آ کھڑی ہوئیں۔

یہ آپ نے آدھی رات کو مجھ سے کون سے نئے کھاتوں کا حساب کرانا ہے......؟ مانی نے ذرا اداکاری کی۔

''کھاتے تو خیر کھلیں گے...... پہلے یہ بتاؤ یہ تم نے اپنی بھابھی سے کیا کہلوایا ہے......؟''

''جو کہلوانا تھا وہ یقیناً بھابھی نے آپ سے کہہ دیا ہوگا......'' وہ ذرا سا بہادر ہو گیا۔

''لڑکے...... عمر آگے سرکتی ہے تو عقل بھی کچھ بڑھتی ہے۔ ساری عمر ننھے بن کر کام نہیں چلتے......''

''ابو کہاں ہیں......؟'' مانی نے ایک دم غیر متعلقہ بات کی۔

''لائبریری میں بیٹھے علم حاصل کر رہے ہیں...... اس لیے تو مجھے یہ موقع ملا کہ تجھے سمجھاؤں ورنہ وہ بولنے دیتے مجھے۔ میں جو کہوں گی وہ اس کا الٹ کریں گے۔ انہی کی شہہ کا نتیجہ تو ہے کہ بچے میرے منہ کو آ رہے ہیں......''

انہیں معاشرہ کی زیادتیاں یاد آ گئیں۔

"دیکھو بیٹے...... خاندان میں ایک سے ایک لڑکی موجود ہے جس کا نام لو گے وہیں سوال ڈال دوں گی۔ مگر خاندان سے باہر ہرگز نہیں......"

چچی جان بھی مانی سے واقف تھیں اس لیے مزاج کے خلاف نرمی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"ایسی تو خاص حسین بھی نہیں ساحرہ...... لڑکیوں جیسی لڑکی ہے......" انہوں نے بیٹے کا چہرہ بھی ساتھ ساتھ ٹٹولا۔

"میں نے کب کہا کہ وہ بے حد حسین ہے۔ میں اس وجہ سے تو اس سے شادی نہیں کر رہا۔"

"اے تو کیا جائیداد بہت ہے......؟" وہ بدستور تجاہل برت رہی تھیں۔

"بالکل نہیں......"

"پھر......"

"امی...... میں نہایت سنجیدگی سے بس آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے بھابھی سے کہلوایا ہے۔ وہ درست ہے...... بس

"پھر میری بھی آخری بات سن لو...... ہرگز غیر خاندان کی لڑکی نہیں لاؤں گی......" وہ زیادہ دیر طبیعت پر ج نہ کر سکیں۔ "لیکن مجھے اسی غیر خاندان کی لڑکی کو اپنانا ہے...... غیر خاندان ہونا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔"

"تو پھر جا کر بیاہ لاؤ...... ہم تو کبھی بیاہنے نہیں جائیں گے......" انہوں نے وزنی لہجے میں دھمکی دی۔

"میں نے سوچ لیا تھا امی۔ اگر آپ نہیں مانیں تو میں باہر چلا جاؤں گا...... ساری زندگی صورت نہ دکھاؤں گا...... میں نے کوئی ناجائز آرزو نہیں کی کوئی غلط کام نہیں کیا...... میری سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگ محبت کی آڑ م اپنے بچوں پر اس قدر ظلم کیوں کرتے ہیں......" مانی کا لہجہ آزردہ سا تھا۔

"میرے بیٹے...... بات یہ ہے کہ بچوں کو سمجھ نہیں ہوتی اچھے برے کی۔ یہ تو بڑوں کا کام ہوتا ہے کہ بچو صحیح راہ دکھائیں......" وہ ایک مرتبہ پھر نرم پڑ گئیں۔

"آپ مجھے اس کی کوئی بھی برائی بتا دیں۔ یقین کریں میں ضد نہیں کروں گا پھر......" مانی کے سادہ اندا ان کا کلیجہ پگھلنے لگا۔

"سب سے بڑی برائی تو یہ بیٹا...... ہم ان کے خاندان کو نہیں جانتے...... بعد میں نئی نئی باتیں سامنے آ تو کیسی پریشانی ہوتی ہے۔"

"کیسی نئی نئی باتیں......؟"

"مثلاً...... ذات پات...... حیثیت و امارت کی۔"

"امی میں ان باتوں کو خاطر میں نہیں لاتا......"

"تو نہیں لاتا...... ہم تو لاتے ہیں...... اوڑھنی کی طرح سر پر رکھنا پڑتا ہے خاندان کو۔ تو بیوی کو لے کر بھی چلا جائے گا تو کیا ہوا۔ بیوی کا خاندان تو ہمارے سر پر ہوگا۔ رشتہ داریاں نبھانا آسان نہیں ہوتیں۔ تو خاندان ہی سے کوئی لڑکی بتا۔ اپنے لوگ ہوتے ہیں...... دیکھے بھالے...... نہ کچھ چھپانے کا خوف نہ سامنے رکھنے کا ارمان۔ نہ تکلفات، نہ رسم و رواج کے اختلافات...... اب ہم نے حسن کی شادی کی، عالیہ کی، کی محسوس ہی نہیں ہوا کہ بچے بیا دیے۔ بلکہ اس طرح رشتے اور زیادہ مضبوط ہی ہوئے ہیں۔"

مانی اٹھ کھڑا ہوا......

"آپ کتنی دلیلیں دے دیں امی...... فیصلہ تو ہو ہی چکا...... آپ لوگوں کی مرضی نہیں تو نہ سہی...... شادی میں نے ساحرہ ہی سے کرنا تھی...... بس...... ورنہ کسی سے بھی نہیں۔"

"آپ نے اب تک مجھ پر جتنی بڑی محبت کی چادر پھیلائی تھی ایک دم سر سے کھینچ لی ہے۔ کمال کی محبت تھی آپ کی...... آپ نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے محروم کیا ہے؟"

وہ تیزی سے باہر کی سمت بڑھا تھا۔ شہلا اور عالیہ راہداری کے موڑ کی اوٹ میں ہو گئیں۔ مانی کے تیز تیز بڑھنے کی آواز آئی...... عالیہ نے شہلا کا ہاتھ دبایا۔

اپنے نام کے ایک ہی ہیں مانی بھائی...... ان کی تو فکر ہی نہ کریں...... جس طرح جادوگر کی جان مینا میں ہوتی تھی کہانی میں اسی طرح امی کی جان ان میں ہے...... دیکھ لیجئے گا...... دن نہیں گزریں گے کہ امی ہتھیار ڈال دیں گی۔

مال ہے مانی بھائی کی اتنی مستحکم پوزیشن ہے۔ پھر بھی اتنا ڈرتے ہیں۔" اس نے تعجب سے کہا۔

وقت کتنی تیزی سے گزر رہا تھا۔ کہ پتا نہیں چلا......

ملک نواز پانچ سال بعد وطن واپس لوٹا تھا...... اس کا ہر انداز پہلا سا تھا...... پانچ سال قبل جو اس نے چھوٹا سا یس خریدا تھا...... وہ سیدھا وہیں آیا تھا...... ایک ماہنامے کی سلور جوبلی میں وہ بطور خاص مدعو تھا...... ماہنامے کے مالک ے اس کے گہرے مراسم تھے۔

تقریب ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں تھی...... گزرے وقت نے اس کی پیشانی کی چند افقی لکیریں گہری کی تھیں۔ اقی سب کچھ اسی طرح تھا۔

مہمانان گرامی ماہنامے کی شان میں قصیدہ خوانی کر رہے تھے کہ بغلی دروازے سے ملک نواز کی "وجہ فراز" اخل ہوئی۔ چاکلیٹی کلر کی ساڑھی، ہمرنگ بلاؤز...... پرس سینڈل...... اس پر گزرتے ماہ و سال کا ہلکا سا عکس نہیں پڑا تھا...... لوگ گھیرے اس کی سمت متوجہ ہوئے...... فلیشز کی جھلملاہٹ میں ایک لمحے تو وہ گویا روشنی میں نہا گئی۔ میزبان نے آگے ڑھ کر استقبال کیا۔

کئی خواتین سیٹوں سے اٹھ کر گرمجوشی سے ملیں۔

خوبصورت لبوں پر پڑی پراخلاق مسکراہٹ تھی۔

کئی لوگ اٹھ اٹھ کر اس کے پاس آ رہے تھے۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ بھی آہستگی سے اٹھا۔ بینکویٹ ہال ں انسانوں کا ایک سیلاب تھا...... وہ اس سیلاب سے گزرتا ہوا اس کے پاس چلا آیا۔

"السلام علیکم...... مادام......!"

اس نے بے ساختہ چونک کر چہرہ اونچا کیا۔

"اوہ...... ملک صاحب...... وعلیکم السلام...... بھئی کہاں ہوتے ہیں آپ......؟" اس نے مسکرا کر اس کی انب دیکھا۔ "آپ نے کوشش تو کی ہوتی یہ جاننے کی کہ ہم کہاں ہوتے ہیں......؟" اس کی بھاری اور خوبصورت آواز ں تیزی ہو گئی۔

"واہ صاحب...... یہ خوب کہی...... ہم نے تو کبھی بھی یہ کوشش نہیں کی...... آپ اپنا پتا دیا کرتے تھے...... بہت عرصے سے خاموشی ہے۔ (خدا کا شکر ہے) ناصر صاحب ہی سے معلوم ہوا تھا کہ آپ میگزین چھوڑ کر باہر چلے گئے ہیں۔"

ملک نواز نے اس کے بے تکلف انداز کو حیرانی کے ساتھ دیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو بڑی ریزرو نظر آتی تھی۔

''اور کیا حال ہیں آپ کے......؟'' وہ مسکرا رہا تھا۔ پُر مسرت انداز میں۔

اسی دم کسی پریس فوٹو گرافر نے دونوں کو اپنے کیمرے میں مقید کر لیا۔

''بہت اچھے حال ہیں...... بچیاں ذرا بڑی ہو گئی ہیں تو کچھ ہوش آیا ہے۔ تین سال بعد کراچی آئی ہوں کل نائٹ کوچ سے واپسی ہے۔'' اس نے ساتھ کھڑی ایک خاتون کو تھکے تھکے انداز میں دیکھا!

''تشریف رکھیے۔'' ملک نواز نے سیٹ کی سمت اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ گئی...... وہ محفل کی مقبول ترین ''حاضر'' تھی...... تقریباً سب ہی لوگ اس کی سمت متوجہ ہوئے تھے وہ سب سے اخلاق سے ملی تھی۔

کافی دیر بعد جب سب ریفریشمنٹ کے لیے ہال میں آئے تو اسے پہلو میں خوبصورت سی مہک کا احـ ہوا۔ اس نے سرسری سے انداز میں گردن موڑ کر دیکھا۔

جعفری صاحب (فوٹو گرافر) کے ہمراہ ملک نواز ایک پلیٹ اٹھائے کھڑا تھا۔

''مسز حسن ملک صاحب اور آپ دونوں ہی مہمانان خصوصی ہیں...... ایسا کیجئے آپ ان کا خیال رکھـ آپ کا...... ملک صاحب...... یہ کریم رول لیجئے ناں۔'' جعفری صاحب نے کریم رول اٹھا کر ملک نواز کی پلیٹ میں

''شکریہ......!'' اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا۔

''آپ بھی تو کچھ لیجئے ناں مادام......''

''لے رہی ہوں۔ آپ فکر نہ کیجئے......'' اس نے لاپروائی کے سے انداز میں کہا۔

''ناصر صاحب ہیوسٹن میں باقاعدہ پرچہ بھیجتے ہیں...... آپ کی فنی ترقی کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ مجھے خوشی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ آپ اپنے مخصوص معیار سے کم نظر نہیں آتیں...... بلکہ زیادہ ہی نظر آتی ہیں......''

''شکریہ......'' اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

''اچھا تو آپ ہیوسٹن میں مقیم ہیں...... میرے دیور امان زید بھی وہیں مقیم ہیں۔''

''کیا کرتے ہیں......؟'' اس کی سیاہ گھوڑا آنکھیں اس کی گھنیری پلکوں پر ٹھہر گئیں۔

''ٹیلی گراف میں ہیں......''

''ہاں...... بہت عرصہ ہو گیا ہے......'' اس کے تصور میں برسوں پہلے کے واقعات زندہ تصویر آزردہ کر گئے۔ ''آپ کے صاحب کیسے ہیں؟'' (وہ تو سکندر ہے ناں خوشی اس کے گھر میں برسات کی پھوار برستی ہو گی)

''بہت اچھے ہیں......'' اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر سامنے ایک شناسا سا خاتون کی سمت مسکر ہوئے کہا......

''جی......؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ملک نواز کی سمت دیکھا۔

''کچھ نہیں......'' وہ سر جھکا کر نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہی تھی۔ کانوں میں پڑے ہیرے کے جگمگاہٹ ملک نواز کی آنکھوں میں منعکس ہو رہی تھی۔

''مسز شہلا حسن......!'' پیچھے سے ایک لڑکی جو بڑی چٹاخ پٹاخ سی نظر آ رہی تھی اس کے سامنے

''فرمائیے......''

''انٹرویو چاہیے آپ کا......''

''ارے بھئی ایسا کیا کر دیا ہے میں نے۔'' وہ شگفتگی سے ہنسی۔

''بہت انتظار کے بعد آپ ہاتھ لگی ہیں...... دیکھیے...... نہ کوئی بہانہ نہ کوئی کسر نفسی۔''

''بھئی، یہ کیا انداز ہے۔ کوئٹہ آیئے۔ میری مہمان بنیے۔ پھر جو دیکھیے لکھیے۔ اب دیکھیے۔ میں اپنے انٹرویو مبالغہ بھی کر سکتی ہوں۔'' وہ اس غنچہ دہن کی شوخی کو مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ موتیوں جیسے دانت جن سے گویا کرنیں ٹ رہی تھیں...... اس نے محبت سے لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

''آپ کا نام......؟''

''فرح حمید......''

''دیکھیں فرح...... سچ اسے بہانہ نہ سمجھیے...... کل میں اپنی کزن کے ہاں مدعو ہوں...... شام کو اپنی بہن کے پھر رات کو واپسی ہے...... بچیوں کے پیپرز ہو رہے تھے اس کے باوجود دو دن کے لیے آنا پڑا۔ ناصر صاحب میرے فراخ اور مشفق سے انسان ہیں۔ بہت اصرار سے انہوں نے بلایا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں کراچی آنا ہو گا پھر سہی۔ خیال نہ کیجئے گا۔'' اس نے بڑے پیار سے سمجھایا...... اسے اس بات کا بہت خوف رہتا تھا کہ کوئی بد دماغ مغرور وغیرہ دے۔ فرح تو اس کی محبت سے پگھل سی گئی۔

اس نے وینٹی پرس سے کارڈ نکالا۔

''اس میں میرا فون نمبر ہے...... کبھی کبھی دفتر کے خرچ پر فون کر لیا کرنا......''

فرح ہنس پڑی...... ''اف کتنی کیوٹ ہیں یہ شہلا حسن...... انہیں تو ادب کے بجائے شو بزنس میں ہونا چاہیے......'' اس نے اس کے سراپے کو رشک آمیز نظروں سے دیکھا۔

پھر اس کی ایک اور پرستار اسے گھیر کر کھڑی ہو گئی...... اب وہ مطلق ملک نواز سے غافل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

وہ باہر آ کر میزبانوں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ صبور بھائی کو نظروں ہی نظروں میں تلاش کر رہی تھی۔

''ارے ملک صاحب! آپ کدھر چلے...... ایسے نہیں جناب...... برسوں تڑپایا ہے......'' ناصر صاحب نے واز کو بازو زور سے پکڑ کر کھینچا...... بڑا پیارا بے تکلفانہ انداز تھا۔

''بہت تھک گیا ہوں......'' اس کے لبوں پر تھکی تھکی مسکراہٹ عود کر آئی۔

''اجی چھوڑو...... یار...... اسفند صاحب سے ملے۔ بہت پوچھ رہے تھے......''

''ہوں......! ابھی ہوئی تھی ملاقات......''

''اچھا...... یہ بتاؤ تقریب کیسی رہی......؟''

شہلا مڑی...... اس کی ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ سے ایک جگنو آزاد ہوا اور ملک نواز کی نظر میں جذب ملک نواز نے یکدم اسے دیکھا تھا۔ شاید وہ اس کی موجودگی سے لاعلم تھا۔

''کہاں کھو گئے۔ میں پوچھ رہا ہوں تقریب کیسی رہی......''

''بہت اچھی......''

قسمت بری نہ ہو تو یہ دنیائے رنگ و بو
بے حد حسین ہے میرے خیالات کی طرح

اس نے ترچھی نظر سے شہلا کے چہرے کو دیکھا۔
شہلا کی نظریں صبور بھائی کو ڈھونڈ رہی تھیں...... لیکن اس نے ملک نواز کا شعر سن لیا تھا۔ اب وہ لڑکپن
حدود میں نہیں تھی کہ عام سی بات بھی معنی خیز معلوم ہو...... وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کے ذہن میں ہلکا سا شائبہ تک
نہیں ہوا کہ یہ شعر بڑے اہتمام سے پڑھا...... یا...... کہا گیا ہے۔
اسی دم صبور بھائی سامنے سے آتے دکھائی دیے...... ناصر صاحب ملک نواز کو لے کر ملحق ریسٹورنٹ میں
گئے تھے۔ اس نے شکر کیا کہ صبور بھائی کی مڈبھیڑ اس کو شاید آدھ گھنٹے مزید تھکانے کا باعث بنتی۔
گھر آ کر اس نے بمشکل لباس تبدیل کیا...... امی اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں......
''دودھ میں اوولٹین ملا لاؤں......''
''نہیں امی......''
''لو دودھ ویسے ہی پی لو...... وہاں کون تمہیں اس طرح پوچھتا ہوگا...... کس قدر دبلی ہو رہی ہے۔ سا
ہی سر پر ہے تمہارے تو...... بچوں کا ساتھ ہے شہلا ذرا اپنا دھیان رکھا کرو۔''
''کہاں دبلی ہو رہی ہوں امی...... حنا کے بعد تو میرا جسم بہت ہی پھول گیا تھا۔ چچی جان اور میں ایک
کے دو پلڑے ہو گئے تھے۔''
''بے احتیاطی سے ایسا ہو جاتا ہے...... بدن پھولنا یا موٹاپا تو خود ایک بیماری ہے...... تمہاری ساس تو
چار بیماریاں خود پر سوار کیے رہتی ہیں۔ تمہارا کیا خیال کرتی ہوں گی۔''
''ارے نہیں امی...... چچی جان تو میرا بے حد خیال رکھتی ہیں...... اچھی خاصی اسمارٹ ہو رہی ہوں
نہیں آپ کو کیوں وہم ہو گیا ہے......''
''تو اتنی جلدی نڈھال سی جو نظر آنے لگتی ہے...... یہ کمزوری ہی تو ہے اور کیا ہے۔ پھولوں کی طر
میں نے تجھے۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔
''ہاں امی...... بارہا مجھے آپ کی محبتیں یاد آتی ہیں۔'' شہلا نے ماں کے زانو پر سر رکھ دیا۔
''امی...... میں بھی ہما حنا کی ایسی ہی ماں بننے کی کوشش کرتی ہوں۔ جیسی آپ ہیں......''
''کل تو چلی جائے گی شہلا......؟'' ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''بہت پچھتاتی ہوں تجھے ا
پر...... میری تو آنکھیں ترس گئی ہیں کہ تجھے سیر ہو کر دیکھوں......'' انہوں نے جھک کر شہلا کی پیشانی چوم لی۔
''خوش تو ہو نا اپنے گھر میں......؟ کوئی پریشانی تو نہیں......؟''
''سچ امی بہت خوش ہوں۔ حسن اور چچا جان تو مجھے کسی شے کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے
برابر میرے ساتھ لگی رہتی ہیں۔''
بیٹی میکے میں ماں کے دل کی مہمان ہوتی ہے۔ اسے تو ماں کی محبت پر بے حد ناز تھا۔ بہت ہی جلد
جانے والی اور بچوں کی معمولی سی بھی تکلیف پر رو دینے والی تھیں اس کی امی۔
وہ ان کی گود میں سر رکھے آنکھیں موندے لیٹی تھی۔ وہ اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہی

کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے جلتے ریگزاروں کے سفر کے بعد خوبصورت مرغزاروں میں آ گئی ہو......
''مانی تین سال میں ایک مرتبہ بھی نہیں آیا...... شادی وادی تو نہیں کر بیٹھا......''
''تمہاری چچی نے کم از کم میری نظر میں اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے......''
''سچ امی، مانی کے بغیر تو مجھے وہ گھر ویرانہ لگتا ہے...... میرا اتنا پیارا بھائی...... دن میں سینکڑوں بار یاد آتا
ہے۔'' اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔
''بس یہی ''آن'' ہے جس نے تمہاری چچی کو بڑے بڑے سبق دیے مگر بھیا یہ نہ سنبھلیں۔''
''آن'' تو ان کے مزاج میں اتنی ہے کہ ضد باندھے ہوئے نہ بچہ دیکھتی ہیں نہ بڑا...... ایک دن نہیں بنی ان
کی تمہاری دادی سے...... بہت ہی تیکھا مزاج ہے۔ دلہن بنی تھیں اس وقت نئی نئی کہ تمہاری پھوپھی نے ان کی کامدانی کی
شال اوڑھ لی...... لو اتنی بات پر ایسی تپیں کہ شال اٹھا کر مہترانی کو دے ڈالی۔
تمہاری دادی نے جلد ہی ان کا ہانڈی چولہا علیحدہ کر دیا تھا...... اور بھیا یہ تھیں بھی اسی کی تمنائی...... ساری
زندگی تمہاری دادی میرے پاس ہی رہیں...... ان کے سب دکھ سکھ میں نے ہی اٹھائے۔
آئے...... ہائے...... اللہ بخشے...... جھولی پھیلا پھیلا کر دعائیں دیتی تھیں۔
اب یہی دیکھ لو...... ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے خدا نے مجھے نیک اور سعادت مند بہو دی ہے۔ خدا اس کے
ماں باپ کا کلیجہ بھی ٹھنڈا رکھے۔
ارے کہاں اتنے لاڈ اٹھاتی تھیں مانی کے دیکھو کیسا کلیجہ پتھر کیے بیٹھی ہیں اور یہ مانی بھی ضد میں ماں پر ہی گیا ہے
...... آخر سیر کو سوا سیر کبھی کبھی ٹکر ہی جاتا ہے...... لو بھلا تین سال ہونے کو آئے۔''
وہ جیسے خود کلامی کے انداز میں بول رہی تھیں۔
''امی! مجھے تو بہت یاد آتا ہے...... گھر بھر کی رونق تھا۔ کیسے کیسے طریقے سے میں نے اسے سمجھایا...... خدا چچی
جان کا دل ہی نرم کر دے...... چچا جان اور حسن تو کل بارات لے کر چلے جائیں، مگر چچی جان...... اور خدا معلوم اب تک تو
ساحرہ کی شادی بھی ہو گئی ہوگی۔''
''بہت خوبصورت تھی لڑکی......؟''
''جی امی...... بہت ہی پیاری...... جب سے ہماری ہمسائی نجمہ کی شادی ہوئی ہے مجھے تو اس کے بارے
میں پتا ہی نہیں چلا...... خدا معلوم کہاں ہے اور کیسی ہے۔
دیکھ لیجیے امی...... کوئی چیز ہی ہوگی جو مانی جیسا لاابالی بندہ بھی اس حد تک سنجیدہ ہو گیا......''
''سب نصیب کے کھیل ہیں...... جو مقدر میں ہوتا ہے وہ ہی ملتا ہے۔''
''خدا تمہیں بھی ایک بیٹا دے دے...... بیٹیاں تو آخر کار پرایا دھن ہوتی ہیں۔''
دونوں کافی دیر باتوں میں مصروف رہیں...... تقریباً آدھی رات کے بعد امی اپنے کمرے میں گئیں۔
زندگی کتنے خوبصورت ڈھب سے گزر رہی تھی۔ ایک مانی کی کسک کے سوائے ہر خوشی ہی اس کے دامن میں تھی۔
''ان دنوں اس کی طبیعت ''پھر'' خراب ہو گئی تھی۔ ہما اور حنا ابھی خاصی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔ حنا نو سال کی
تھی اور ہما گیارہ برس کی...... دونوں ہی بے حد حسین تھیں...... حسن کو بے حد پیار تھا بیٹیوں سے...... اتنی ذہین، حسین اور
مودب بچیاں گھر بھر کی عزیز تھیں۔

حسن کے دیر سے آنے پر اس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جلدی آجایا کریں ویسے بھی میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی......"

"تو چیک اپ کرالیا ہوتا......" اس نے صبح کی طرح تر و تازہ بیوی کو دیکھا جو کہیں سے بھی بیمار نظر نہیں آرہی تھی......"کرالیا ہے میں نے چیک اپ......"

"پھر کیا کہا ڈاکٹر نے......؟"

"وہی جو ہما اور حنا کی دفعہ میں کہا تھا" اس نے رخ موڑ لیا۔

"ارے رے......" اس کے تحیر میں خوشی کا عکس تھا۔

"ارے بھئی، اب تو ہماری دونوں بیٹیاں کافی سمجھدار ہو گئی ہیں۔ اب تو ملکی فلاح و بہبود والوں کو کوئی اعتراض۔؟"

"چھوڑیں بھی......" وہ بری طرح جھینپ گئی۔

چچی جان نے تو سنتے کے ساتھ ہی اولاد نرینہ کا ایک وظیفہ بھی عنایت کر دیا۔

چچی جان میں اب وہ کروفر نہیں رہا تھا۔ بہت جھنکی جھنکی سی نظر آتی تھیں...... مانی کی پانچ سالہ فرقت نے ان کا سارا کروفر و تہہ خاک میں ملا دیا تھا۔

ابھی ابھی وہ لائبریری سے نکل کر باہر آئی تھی۔ آج انسے لائبریری میں بہت دیر ہو گئی تھی...... اس نے سامنے برآمدے میں ایک سایہ دیکھا...... مارے خوف کے اس کا برا حال ہو گیا تھا۔ وہ نزدیک آئی...... اوہ چچی جان کیا کر رہی ہیں...... وہ حیران ہوئی۔ دبے پاؤں مزید آگے آئی...... چچی جان سجدے میں تھی۔ ان کا وجود ہچکولے کھارہا تھا......

"میرے رب...... میں نے اپنی کوکھ سے پیدا کیا تھا ناں بیٹا...... تیرے حکم سے...... مجھ سے کب گا...... میں گریہ یعقوب کے قریب ہو چلی...... رو رو کر میری آنکھوں کا نور ختم ہو گیا۔ میرے رب مجھے میرا بیٹا دے...... میں...... اپنی خطاؤں پر نادم ہوں۔ میرے آقا میرے کلیجے کی ٹھنڈک لوٹا دے...... میرا مانی......"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ وہ بھی ماں تھی۔ ایک ماں کے گریہ نے گویا اسے بجلی کی ننگی تاروں پر کھڑا دیا۔ سجدے میں گری ماں کے آنسو قطرہ قطرہ بن کر دل پر ٹپک پڑے۔

اف...... ایک ماں میں بھی اتنی انا ہوتی۔ یہ بظاہر پتھر دل عورت۔

"چچی جان......" اس نے آہستگی سے آواز دی۔

اور چچی جان تو ایسی ہو گئیں گویا دم ہی نہیں۔

ستارالعیوب نے ان کا پردہ کہاں آکر ہٹایا تھا۔

"چچی جان...... کوئی اپنی زندگی اس طرح بھی تنگ کرتا ہے......؟ یہ کیسے سبق پڑھا رہی ہیں آپ مجھے......؟ یہ ممتا کے نئے قوانین ہیں...... خالص رشتوں میں یہ تصنع۔ خدا کے لیے اٹھیے...... خود کو سنبھالیے۔ ویسے ہی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی......"

"دلہن......!"

"جی چچی جان......؟"

"آج تو راز دار ہو گئی ہو......"

"میں تو سدا سے ایک بیٹی کی طرح آپ کے ساتھ ہوں......؟" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"دلہن......!"

"جی چچی جان......!

"دلہن جن بچوں کو ہم اتنے ارمانوں سے پالتے ہیں وہ ہمیں ہمارے حقوق کیوں نہیں دیتے۔ دلہن کیا میں یا کوئی اور ماں اپنے بچے کا برا چاہ سکتی ہے۔"

"ہرگز نہیں چچی جان......" اس نے آنکھیں صاف کیں۔

"یہ بچے ماں کی محبت کو اس کی کمزوری کیوں بنانا چاہتے ہیں......؟'

"بچے جو ہوتے ہیں چچی......!"

"دلہن...... میں نے ضد نہیں باندھی۔ آخر کوئی میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتا۔"

"چچی جان...... وہ جذبے جو ایک خاص عمر کا خاصہ ہوتے ہیں انہیں آپ نے ابھی بھی فراموش نہیں کیا ہو گا...... دیکھئے ناں کتنی تاویلوں کی زنجیر سے ان جذبوں کو قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ دوئم بعض انسان اپنی پسند ناپسند کے معاملے میں حساس ہوتے ہیں...... یہ دو باتیں ظاہری وجہ دکھائی دیتی ہیں لیکن اور زیادہ گہرائی میں جائیں...... تو پتا چلتا ہے کہ ہم مقدر کے ہاتھ کا ایک مہرہ ہیں...... یہ جو بھگتا ہے آپ نے، مانی نے، یہ بھی نصیب ہو سکتا ہے...... بعض اوقات دھچکے اور ٹھوکریں آگہی کے دروا کر دیتی ہیں اور آگہی کا راستہ خدا کی سمت جاتا ہے نا...... بس جن لوگوں کو خدا نے اپنی جھلک دکھانا ہوتی ہے وہ شاید انہیں صبر آزما اندرونی اضطراب دیتا ہے۔ یہی تو مقصد خلق انسان ہے۔ کیوں......؟ اپنے آپ کو ان نفسیاتی بیماریوں یعنی انا پرستی...... حسد انتقام میں مبتلا کر کے ہم اپنے ہی ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔"

چچی جان کے سر پر وہ نیلا آسمان بن کر چھا گئی تھی۔ انہوں نے بے ساختہ انہیں سینے سے لگا لیا۔

"بعض اوقات تمہارے ساتھ بھی زیادتی ہو جاتی ہے۔"

"ارے چچی جان میں نے تو کبھی محسوس نہیں کیا...... مانی کو بلوا لیں ناں......"

"کتنی بار لکھا ہے" ان کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔

"اب یہ لکھ دیں کہ ہم تمہاری شادی ساحرہ سے کر رہے ہیں۔"

"اب کہاں ساحرہ...... میرا تو بیٹا گیا......" وہ پھر سر جھکا کر رونے لگیں...... ویسے آج کل وہ مانی کو کچھ زیادہ ہی یاد کر رہی تھیں...... کتنا خیال رکھتا تھا ان کی بیماری میں...... ثریا کا دکھ کیا کم تھا؟

"کیسا ہیرا تھا بچہ میرا...... ارے میں تو سمجھ رہی تھی کہ چار دن کا جوش ہے...... ارے مانی تو تو بہت گہرا نکلا۔"

"چچی جان...... آپ فکر نہ کریں...... وہ ضرور آئے گا...... آپ آئندہ اس طرح مت روئیے گا" وہ انہیں تھام کر ان کے بیڈروم میں لے آئی۔

اور چچی جان نے دل میں سوچا تھا...... کتنا بڑا جگرا ہے دلہن کا...... سب کے لیے چھپر سایہ بنی رہتی ہیں......!

اس دن وہ شام کو سو کر اٹھی تو چچی جان گھر پر نہیں تھیں۔ ثریا باہر لان میں جھولا جھول رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی چچی جان بغیر بتائے کہاں چلی گئیں۔ نوکر سے پوچھا۔ ہما سے معلوم کیا۔ مگر دونوں نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔ وہ منہ ہاتھ دھو

کر کچن میں چلی گئی اور چائے بنانے لگی۔

اسی وقت چچی جان کی آواز آئی۔

''ہما...... تمہاری امی اٹھ گئیں......؟''

''جی دادی جان...... امی کچن میں ہیں۔''

چند لمحوں کے بعد چچی جان کچن میں چلی آئیں۔

''دلہن چائے بنالو تو میرے کمرے میں آنا۔''

وہ چائے بنا کر سوچتی ہوئی ان کے کمرے میں چلی آئی۔

''جی چچی جان......!'' وہ ان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔

''دلہن...... میں نجمہ کی ماں کے پاس گئی تھی۔''

''خیریت۔!'' وہ حیران ہوئی۔

''ساحرہ کے بارے میں معلوم کرنے گئی تھی......''

''پھر......؟''

''کہہ رہی تھیں اس کی تو شادی نہیں ہوئی۔ البتہ اس کی چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔''

''اچھا......'' شہلا کو بے حد خوشی کا احساس ہوا۔

''میں ان کو لے کر ہفتے کو...... پشاور جا رہی ہوں۔'' ان کی آواز آہستہ ہوگئی۔ ''کمال ہے کہ ساحرہ کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔ بھلا اتنی شاندار لڑکی...... چچی جان میرا اندازہ بالکل درست ہی تھا۔

چچی جان...... ہم لوگ اندازوں سے کھیلتے ہیں...... قسمت کتنا بھاری لیور ہے گھما کر رکھ دیتا ہے انسان کو کسی کو...... نہ مانی نہ میں اور نہ شاید کوئی اور تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پانچ سال کے عذاب کے بعد...... اور ابھی بھی کیا معلوم......''

''بس دلہن اب تو نیک فال ہی نکالو......

تم بھی چلو دلہن تمہاری تو ساحرہ کی سوتیلی ماں سے اچھی خاصی صاحب سلامت رہی ہے۔''

''کیا معلوم چچی جان۔ اب تو شاید وہ بھول بھال بھی چکی ہوں گی...... ایک مرتبہ یا شاید دو مرتبہ ہی ان سے ملنا ہوا تھا...... دو سال قبل جب میں کراچی گئی ہوئی تھی اس وقت کوئٹہ آئی تھیں۔ مجھے تو خود ان کی شکل بھول گئی ہے آپ ہی چلی جائیے اس وقت تو نجمہ کی امی کے ساتھ۔ اب تو خیر آنا جانا لگا ہی رہے گا...... انشاء اللہ......''

''ویسے بڑی حیران تھیں نجمہ کی ماں کی ہم ادھر ادھر کی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس عذاب ناک سردی میں ساحرہ کا رشتہ مانگنے پشاور جا رہے ہیں۔''

خوش تو بالکل نہیں لگتیں۔ وہ تو بیٹی بیاہ دی ہے ورنہ تو حامی ہی نہ بھرتیں پشاور جانے کی بولیں...... بہن اتنی سردی میں......؟''

''میں نے کہا لو یہاں کی برف باری سے نکل کر پشاور کر سردی کھانے جائیں گے تو وہاں کی سردی سردی محسوس ہوگی۔؟ سردی تو دونوں ہی جگہ ہے۔ یہاں ذرا زیادہ وہاں ذرا کم۔ یعنی وہی مثل ہوئی آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔

سردی کا بہانہ کراچی والے کریں تو ان پر کھپ بھی جائے۔ خیر میں نے ایک نہیں چلنے دی...... بلکہ مزاج کے خلاف ایک طرح سے ان کے پاؤں چھو کر ہی آ رہی ہوں۔

حالانکہ خون کا رشتہ ہے ساحرہ سے۔ اس پر بھی یہ حال ہے کہ پوچھو مت۔ انہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ الٹا یہ بولیں۔

ساحرہ کی تو عمر ڈھل رہی ہے۔ آپ اپنے خاندان میں کسی کم عمر لڑکی کو لے آیئے۔

توبہ توبہ کیا زمانہ آ گیا ہے۔ خونی رشتوں کو راحت نہیں۔

میں نے کہا پانچ سال پہلے بیس کی ہوگی۔ اب پچیس کی ہوگئی ہوگی۔ اس عمر میں تو ہو ہی رہی ہیں آج کل شادیاں چپ ہوگئیں۔ پھر کچھ نہیں بولیں۔

دلہن کیا ساحرہ واقعی بہت اچھی ہے...... میں نے تو دراصل باہر کی لڑکیوں کو اس نیت سے دیکھا ہی نہیں۔ خواہ کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں۔''

''میرا دل کہتا ہے چچی جان آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔''

''بس آپ مانی کو بتا دیجیے...... اور یہ بھی کہہ دیجیے گا کہ انسان عجلت پسند ہے لیکن وقت خدا کا محکوم ہے...... دیکھو جب کسی کام کا وقت آتا ہے تو راستے کتنے روشن ہو جاتے ہیں۔'' وہ باہر جاتے جاتے مڑ کر گویا ہوئی تھی۔

''جیتی رہو دلہن۔ سچ کہا تم نے......''

از ہیوسٹن U.S.A

پیاری اماں جی......!

السلام علیکم

بخیریت ہوں اور آپ کی جانب سے خیریت کا طالب۔ آپ نے مجھے خط نہ لکھنے کی قسم کھائی تھی کہ آپ مجھے کبھی خط نہیں بھیجیں گی۔

اماں جی۔ بعض لوگ محبت کا جر طاقت سے زیادہ کیوں چاہتے ہیں۔

میں آپ سے کوئی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ بھائی کا خط تو مجھے ملتا ہی رہتا ہے جس سے آپ کے بارے میں بھی خبر مل جاتی ہے...... بھائی نے مجھے کتنی مرتبہ لکھا کہ اباجی کی موت کے بعد سے آپ مستقل بیمار رہتی ہیں...... اماں جی...... میں آپ کا بیٹا ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ پنو اپنے نئے گھر میں خوش ہے۔ اس سے بڑھ کر سب کے لیے خوشی کیا ہو سکتی ہے......؟ میں تو اس خبر سے بے حد خوش ہوں۔ میرے سینے سے ایک بوجھ سا سرک گیا ہے...... اسے اس دنیا سے خوشیاں سمیٹنے کا پورا پورا حق ہے...... میں اسے حق سے کیوں محروم رکھتا۔ آپ دعا کیا کریں بس......!

دو سال پہلے جب میں اباجی کے انتقال پر پاکستان گیا تھا تو آپ نے مجھ سے بات تک نہیں کی تھی۔ آپ کی ناراضگی بجا تھی۔ اب تو پنو بس چکی ہے خوش ہے۔ آپ بھی قہر کی چادر سمیٹ لیں۔ میں فروری کے شروع میں پاکستان آؤں گا...... کراچی والے گھر میں لا کر رکھوں گا آپ کو اور علاج کراؤں گا...... اماں جی میں اپنے فرض سے غافل نہیں۔ آپ ناراضگی ختم کر کے مجھ سے ملیں تو...... شاید برسوں بعد مجھے سکون مل جائے۔

جانے کیوں نیند نہیں آتی۔ ایک وحشت سی دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے۔ سب کو سلام۔

آپ کا گنہگار

نواز

☆☆☆

''چچا جان ...... بات سنیں ...... عالیہ پھوپھو تو اب بہت ہی بڑی ہوگئی ہیں۔ ایسا کرتے ہیں۔ میں اور حنا آپ کی بہنیں بن جاتے آپ ہمیں ہی دے دیجیے گا نیگ وغیرہ۔

''امی نیگ ہی کہتے ہیں ناں......؟'' ہما نے پلٹ کر ماں سے تصدیق چاہی۔

''ہاں بھئی......!''

''ارے واہ مطلب کے لیے تم رشتے ہی بدلنے پر آمادہ ہوگئیں۔ کہیں یہ جبری ٹرانسفر تم اپنی امی جان کے کہنے پر تو نہیں......شاید کچھ کمیشن تم نے انہیں بھی دینے کا وعدہ کیا ہو۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''لو مجھے کیا پڑی ہے اتنی لمبی راہ چلنے کی میں خود ہی تمہاری بہن نہ بن جاتی۔''

وہ وارڈ روب میں سر دیے جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی مڑ کر بناوٹی سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا بہن ہیں نہیں آپ......''

''کیوں نہیں......''

اسی وقت گڈو کے رونے کی آواز آئی۔

''ہما...... جاؤ بیٹا ذرا بھائی کو دیکھو میں ابھی اس کی فیڈر تیار کرتی ہوں...... ہما فوراً باہر نکل گئی۔

''چچی جان بری میں چار سیٹ رکھنے کو کہہ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تین ٹھیک رہیں گے۔ ذرا وزنی ہو جائیں گے۔''

''جو آپ لوگوں کے جی میں آئے کیجیے۔ مجھے اس جہیز بری سے کوئی غرض نہیں۔

بس جس چیز سے غرض ہے۔'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر شرارت سے مسکرایا۔

''بھئی تمہاری مطلوبہ شے بھی تمہیں جلد ہی ملے گی۔ آخر اسی کی خاطر تو تم نے ہمیں دور رہ کر سالوں اذیت دی ہے۔'' وہ محبت آمیز نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

''حد تو یہ ہے ثریا تمہیں بے تحاشا یاد کرتی تھی......رات دن چچی جان کے کان کھاتی تھی......اب دیکھو کس قدر خوش ہے۔''

''دلہن...... درزی کے ہاں سے کپڑے آئے ہیں...... ذرا چل کر دیکھ لو۔'' چچی جان نے اچانک کمرے میں داخل ہو کر قطع کلامی کی اور اس کا ذہن فیڈر کی جانب سے ہٹ کر درزی اور کپڑوں کی سمت ہو گیا۔

''آپ چلیے چچی جان آتی ہوں میں...... ذرا یہ زیورات کی رسیدیں سنبھال کر رکھ دوں۔''

''سب آگئے ہیں کپڑے۔؟''

''نہیں، شاید چار سوٹ ہیں......''

مال گاڑی کے انجن کی چھک چھک بدستور تھی۔

وہ پہلے حیران ہو ہو کر ہر ڈبے میں جھانکتی رہی۔ ایک ڈبے میں خشک میوے کی بوریاں بھری ہوئی تھیں۔ مہک پورے ڈبے میں پھیل رہی تھی۔ وہ اندر چلی گئی۔ اسی وقت ایک زور کا جھٹکا اسے محسوس ہوا۔ وہ ایک بوری پر الٹ پڑی۔

اسے محسوس ہوا جیسے کوئی اسے جھولا دے رہا ہو۔ اسے بے حد لطف آیا...... پھر اس نے محسوس کیا جیسے باہر کی چیزوں کو پر لگ گئے ہوں۔ ہر چیز تیزی سے گردش کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا...... بجلی کے کھمبے، تاریں، درخت گھاس چرتی بھیڑ بکریاں، گویا ہر شئے گردش کر رہی تھی۔ منظر تیزی سے بدلنے لگے۔ وہ کھڑی ہوئی

پھر گر پڑی۔

''آپا...... آپا......!'' وہ گھبرا کر چیخی......مگر اس کی چیخ مال گاڑی کی چھک چھک میں دب کر رہ گئی۔ گرنے کی وجہ سے اس کے گھٹنے چھل گئے تھے۔ وہ دودھیا ٹانگوں پر سے پائینچے سمیٹ کر بیٹھنے لگی...... اور چھلی ہوئی جگہ پر خون کی بوندیں چمکتی دیکھ کر اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''آپا...... خون...... خون نکل رہا ہے...... پٹی باندھ دو......'' آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ آدھے گھنٹے کی مسلسل گردش سے وہ بے حد ہراساں ہو گئی تھی۔ شام کے سائے تیزی سے پھیل گئے تھے۔ ڈبے میں بوریاں بھری ہوئی تھیں جس سے اور بھی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ دروازے کی سمت آئی مگر کودنے کا ارادہ کرنے کے باوجود کود نہ سکی۔

اسی دم ایک پسنجر ٹرین برابر سے پوری رفتار سے گزری؟ ایک کے بعد ایک ڈبہ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اس پسنجر ٹرین ایک طوفان کی طرح محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ پسنجر ٹرین کی رفتار مال گاڑی سے کافی زیادہ تھی۔ آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

وہ حیران پریشان ایک کونے میں بوری سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

اسے اندھیرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بہت زور زور سے رو رہی تھی۔

روتے روتے وہ بوری سے سر ٹیک کر سو گئی تھی۔

''ارے لڑکی......'' مزدور نے حیران ہو کر اس کا کندھا چھوا۔

''خانہ خراب...... یہ لڑکی اندر کیسے سویا اے۔ کیسا کافر اے یہ آج کل کا لوگ......ٹکٹ کے پیسے بچانے واسطے مال گاڑی میں سفر کرتا اے......''

''خان کیا بولتا ہے......؟'' نیچے پلیٹ فارم پر ''بوری'' کے منتظر مزدور نے حیران ہو کر اندر جھانکا۔

''اندر ایک لڑکی سویا اے۔''

''لڑکی......؟'' وہ اچھل کر اندر آ گیا۔

اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے دو قوی ہیکل آدمیوں کو دیکھتے ہی چیخنے لگی۔

''ام تجھے کچھ بولا......؟ بابا کاہے کو چیختا ہے۔'' مزدور گڑبڑا کر رہ گئے۔

وہ دونوں کو دونوں ہاتھوں سے دھکیلتی نیچے اتر گئی۔

''چوڑ دو...... خانہ خراب...... ٹھیکدار آتا ہو...... شب ہو رہی ہے۔''

اس نے کافی رقبے پر ریل کی پٹریوں کا جال بچھا دیکھا...... اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کدھر جائے۔ وہ سیدھی چلتی گئی۔

چند ایک راہگیروں نے بے حد خوبصورت دخوش قامت لڑکی کو پلٹ پلٹ کر دیکھا...... جو شلوار قمیض پر بغیر دوپٹے کے تھی۔ وہ راہگیر جو ''بورژوا'' کی ہوا سے قطعی محروم تھے انہوں نے اس ''بے حیا'' لڑکی کو ''ظاہری ناگواری'' سے دیکھا۔

وہ سیدھی چلی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف چلے گی تو گھر آئے گا۔ وہ کینٹ کی حدود سے نکل چکی تھی بھوک اور خوف سے اس کا بُرا حال تھا۔

وہ ایک نئی آبادی کی سمت نکل آئی تھی۔

بائیں جانب سفید کوٹھی سے ایک السیشین کتا بھونکتا باہر آیا۔ وہ چیخ مار کر سامنے کھلے گیٹ میں داخل ہو گئی۔

اور لان میں ایک جامن کے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی۔

گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

''آپا...... وہ نجمہ کا کتا مجھے کاٹ رہا تھا......'' اس کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔

رات کافی بڑھ آئی تھی۔ بادل جو شام سے برسنے کو بیتاب تھے ٹوٹ کر برسنے لگے۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ادھر ادھر دیکھتی راہداری میں چلی آئی۔ کچن سے برتنوں کی کھڑ پڑ سنائی دے رہی تھی۔ اس دم ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کچن سے باہر آرہا ہو۔ وہ جس دروازے سے ٹیک لگائے ہوئے تھی اسی کو کھول کر اندر گھس گئی۔

بے حد سادہ سا بیڈ روم تھا۔ سامنے ہی ڈریسنگ روم کا گھنیرا پردہ تھا۔ وہ پردے کے پیچھے جا کر بیٹھ گئی......

اسے سخت خوف محسوس ہو رہا تھا۔

کھانا لگاؤں صاحب......''

''نہیں یار بالکل بھوک نہیں ہے...... بس اب میں آرام کروں گا۔ تم دروازے وغیرہ بند کر دو اور جا کر آرام کرو۔ اور دیکھو صبح ذرا مجھے جلدی اٹھا دینا۔ سیٹ کنفرم کرانی ہے اور بہت سے دوسرے کام ہیں۔''

''بہتر صاحب...... چائے بھی نہیں پیئں گے۔''

''نہیں......'' لہجے میں اکتاہٹ تھی۔

ملازم باہر چلا گیا۔ اس نے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پردے سرکائے۔ باہر بجلی کوند رہی تھی۔ ہر دوسرے منٹ کھڑکی کا شیشہ روشن ہو رہا تھا۔

اس نے بریف کیس کھولا۔ چند کاغذات نکالے اور غور سے دیکھنے لگا۔

''منزل تو تو کبھی بھی نہیں ہوسکتی...... تھکا کے مار ڈالا ہے۔ میں نے دیکھا ہے جو تیرا دمساز ہے کتنا بے قدر ہے۔ تو مجھے ملتی میں تجھے پھولوں کی طرح سجا کر رکھتا۔''

اس نے تصاویر میز پر ڈال دیں یہ تصاویر تھیں جو میگزین کی سلور جوبلی کے موقع پر اتری تھیں اور وہ آج ناصر صاحب سے لایا تھا۔

اس نے اٹھ کر وارڈ روب کا خانہ...... کھولا اور ایک بوتل نکالی اور ایک چھوٹا سا شیشے کا پیمانہ۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے پیمانہ بھرنے لگا۔ میرے خوابوں میں میرا بیڈ روم تجھ سے آباد ہے۔ دلوں کی ''کہتی'' ہے اور دلوں سے بے خبر رہتی ہے میں نے تجھے کل خط لکھا ہے۔ کیوں جلوں اس آگ میں...... ٹھیک ہے تو کچھ نہیں کر سکتی۔ آگاہ ہونے کے بعد تو سوچے گی تو مجھ سے قریب تو ہوگی ناں......؟ مجھے تو دیر بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں کیوں محروم رہا......؟

میرا تخیل اب تجھے مجسم مانگتا ہے...... میں تجھے چھونا چاہتا ہوں...... ان ہاتھوں سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔

میرا محروم دل آج بھی ایک ہی بات سوچتا ہے۔

کاش...... اے کاش...... میرا گھر اتنا سنسان نہ ہوتا...... میرے گھر میں معصوم بچوں کی ہنسی گونجتی اور تو ان ہنستے بچوں کی ماں ہوتی۔

میرے بستر کا یہ دوسرا کنارا صحرا کی دھول بن کر میری آنکھوں میں نہ چبھتا۔

عشق آخر کار بے حجابی کا تمنائی ہوتا ہے۔

عشق کا عروج معبود کو طور پر جلوہ افروز ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔

آگہی کے بعد قربت کی ضد ہوتی ہے۔

عشق کا اصرار کہ وہ مجسم معبود کو سامنے لا کر قدموں میں پیشانی ٹیکے۔

مجھے جوالاکھی کے بھونچال آنے لگے ہیں...... میں نے دنیا گھوم کر دیکھ لی۔ قرار نہ فرانک میں ہے نہ ڈالر میں۔ دلوں کی کہنے والی بے خبر کاش تو مر جائے۔ یا میں دیوانہ ہو جاؤں......'' اس نے پیمانہ پر پیمانہ اپنے معدے میں انڈیل لیا۔

اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔

''آپا...... آپا...... میں ریل گاڑی میں سوگئی تھی۔ وہ مجھے مار رہے تھے۔

آپا...... مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے چائے بھی نہیں پی۔

...... یہاں بہت اندھیرا ہو رہا ہے...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے...... وہ ڈرتے ڈرتے پردے کے پیچھے سے نکل آئی۔

سامنے بیڈ پر ایک لمبا چوڑا سرخ و سفید مرد خونی نظروں سے جانے بوتل میں کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ خوف سے چیخنے لگی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ سہم کر دیوار سے جا لگی۔

''مجھے پتا تھا۔ تو آئے گی ضرور...... الاؤ جلتا ہے تو گرمی دور دور تک جاتی ہے۔'' اس نے ثریا کی کلائی تھام لی۔

وہ جلدی سے ہاتھ چھڑا کر ایک طرف ہوگئی۔

''خدا کی قسم میں نے تو تجھے سات پردوں کے پیچھے رہ کر جانا ہے...... مگر جب بھی تیرا سراپا دیکھا مجھے حیوانیت کے تقاضوں نے مجبور کیا کہ میں تجھے...... جب آ ہی گئی ہے تو ڈرتی کیوں ہے......؟''

اس نے بوتل نیچے قالین پر رکھ دی۔

''اس نے تجھے روکا تو ہوگا...... شکل سے ظالم لگتا ہے...... مگر تو چلی آئی...... کتنی بہادر ہے...... میں تیری ہمت پر بہت خوش ہوں۔''

''میری آپا کہاں ہیں......؟'' ثریا کے منہ سے کانپتی آواز نکلی۔

''مجھے اپنا پتا نہیں کہ میں کہاں ہوں......''

''آج تو معراج کی رات ہے...... تو پردوں سے نکل کر سامنے آئی ہے۔

کوئی بات نہیں...... فکر کی کیا ضرورت......؟ میں تجھے سب کچھ دوں گا۔''

اس نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا۔

ثریا کے منہ سے بڑی بھیانک کراہ نکلی تھی۔

☆☆☆

رات بادل ٹوٹ کے برسا تھا...... لیکن صبح بڑی چمکیلی تھی۔

سورج کی شعاعیں کھڑکی کے شیشے سے منعکس ہو کر اس کے چہرے پر پڑیں تو اس کی آنکھ خود بخود کھل گئی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر سائیڈ ٹیبل سے رسٹ واچ اٹھا کر نیند بھری آنکھوں سے ٹائم دیکھا۔ آٹھ بج رہے تھے۔ اس نے رسٹ واچ واپس رکھ دی اور دوبارہ کروٹ بدل لی۔ اس نے نرم کمبل خود پر کھینچنا چاہا تو اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا ہے...... اور جس چیز سے ٹکرانے کا احساس ہوا اس نے گویا اس کی نیند ہی اڑا دی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

اس کے نزدیک ایک حسین مہ پارہ بدحال گہری نیند میں تھی بے ہوش تھی۔ یا دنیا ہی سے۔ وہ ایک دم بیڈ سے اتر آیا۔

خوابیدہ حسن پرخزن...... پر اس کی خوف زدہ نظریں ٹھہر گئی تھیں۔

کمرے کی صورت حال، ٹیبل پر رکھا ہوا پیمانہ۔

یہ...... یہ کون ہے......

یہ کیا...... کیا...... کیا ہو گیا۔

کون ہے یہ راہزن؟ کون ہے یہ جس نے میری ساری حیات پر پانی پھیر دیا ہے

میرے تمام ترکشٹ ایک پل میں عذاب کی تصویر ہو گئے۔

یہ کون ہے......

یہ کیا ہو گیا......

یہ یہاں کیسے آ گئی......؟

وہ نیم پاگل سا ہو گیا تھا......!

اس کا جی چاہا...... اسے جھنجھوڑ ڈالے۔

''اے لڑکی......!'' اس نے کاندھا ہلایا۔

وہ چیخ کر اٹھ بیٹھی۔

''نہیں...... نہیں......'' وہ ایک طرف سرک گئی۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

''آپا...... یہ آدمی مجھے مار رہا ہے۔''

''کون ہو تم......؟''

وہ ہونٹ کاٹ کر بولا۔

''ہیں......؟'' اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''کہاں سے آئی ہو...... یہ روپ دھار کر...... میں تمہارا گلا دبا دوں گا......'' اب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔

''کہاں سے آئی ہو......؟''

''گھر سے...... تم مجھے کیوں مار رہے ہو۔ تم نے مجھے رات کو بہت مارا تھا......''

ملک نواز کا جی چاہا وہ کنپٹی پر ریوالور رکھ کر خود کو ختم کر لے

''کیا تم خورشید (ملازم) کی جاننے والی ہو......''

جواب میں بس ثریا نے ٹکر ٹکر صورت دیکھی۔

''کہاں سے آئی ہو تم......؟''

''اپنے گھر سے...... میں آپا کے پاس جاؤں گی......''

اس کا لہجہ...... اس کی حرکتیں...... اس کا انداز...... ملک نواز کا بھیجہ اڑ گیا تھا۔

وہ سمجھ کر بھی انجان ہو رہا تھا۔

اس نے سرمئی کمبل ثریا کی گردن تک ڈال دیا۔

''خورشید......!'' اس کی بھاری آواز کمرے میں گونجی۔

''خورشید......!'' وہ مزید بلند آواز سے بولا۔

''جی صاحب!''

''ادھر آؤ......!''

''جی......؟''

''یہ کون ہے......؟''

خورشید نے سنہری بالوں والی حسینہ کو دیکھا جو...... بستر پر لیٹی ٹکر ٹکر کبھی خورشید کو اور کبھی صاحب کو دیکھ رہی تھی......

''میں پوچھ رہا ہوں کون ہے یہ......؟''

خورشید نے...... پیمانہ دیکھا...... پھر ثریا کو بغور دیکھا...... اور ملک نواز کی سمت دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرایا

''صاحب میں نے آج سے پہلے انہیں نہیں دیکھا۔''

''یہ گھر میں کیسے داخل ہوئی......؟''

(یہی تو میں سوچ رہا ہوں یہ گھر میں داخل ہوئے بغیر بیڈروم میں کیسے آ گئی......؟)

''صاحب یہ کوئی بدروح یا چڑیل......''

''بکومت......'' وہ جھلا اٹھا۔

''کس طرح رہتے ہو تم گھر میں......؟ کسی آئے گئے کا پتا نہیں چلتا......؟''

''صاحب! میں تو کل شام سے باہر ہی نہیں نکلا......''

''اچھا دفعان ہو جاؤ اب...... نکمے باہر کہیں گپیں لڑانے بیٹھ جاتے ہو...... یہ لڑکی ہے کوئی جادوگرنی نہیں جو ...ن کر اس کمرے میں آ گئی...... تم سے زیادہ ایکٹو تو تمہارا باپ تھا...... جاؤ جا کر کام کرو۔''

خورشید نے باہر نکلتے نکلتے ثریا کی سمت دیکھا۔

(ہونہہ...... صاحب کو تو پردہ ڈالنا بھی نہیں آتا......؟'')

ملک نواز کا ذہنی توازن بگڑنے لگا...... وہ جان گیا تھا کہ یہ ابنارمل لڑکی ہے...... ایک ندامت کا بحر بیکراں تھا ...سر تک ڈوب چکا تھا۔

اس نے پلٹ کر ثریا کی سمت دیکھا۔

اسکے ذہن میں برسوں پہلے بارش میں نہاتی اندھیری رات زندہ تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس گھر کے گیٹ پہنچتے پہنچتے اس نے خوشی سے دھڑکتے دل کو سنبھلنے کی تنبیہہ کی تھی۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ سبز کپڑوں میں چھتری تانے زندگی گیٹ تک آئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے اسے آراستہ کمرے میں ٹھہرایا تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا اس رات اس نے بہترین کافی پی تھی۔

اس کے حافظے میں وہ منظر آج تک مقیم تھا کہ وہ کافی پی رہا تھا اور وہ سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی۔

وہ اس سے جتنے مشاعروں میں ملا تھا۔ اسے یاد تھے۔

وہ اس کے گھر کتنی مرتبہ گیا۔؟ اسے یاد تھے۔

یاد نہیں تھا تو یہ رات جب وہ بارش میں بھیگتا اس کے آشیانے پر پہنچا تھا تو اس نے کس کے کپڑے پہنے تھے؟

اسے یہ منظر کہ وہ کافی پی رہا تھا اور وہ بیٹھی تھی۔ محض اس کے حوالے سے یاد تھا مگر یہ بھول گیا تھا کہ کمرے میں اس نے اس کے سسر کے ساتھ کافی پی تھی۔

اسے وہ حسین صبح یاد تھی کہ وہ ناشتے کے وقت کتنی نکھری سامنے بیٹھی تھی ناشتے کے وقت میز پر کون کون موجود تھا اسے یاد نہیں تھا۔

وہ آج تک فراموش نہیں کر سکا تھا کہ ناشتے کے بعد اس کے ذہن میں کتنے ہنگامے جاگے تھے۔ وہ کمرے میں کتنا گم صم بیٹھا تھا۔

لیکن اسے یہ یاد نہیں تھا کہ جب وہ کمرے میں گم صم بیٹھا تھا تو ایک حسین و جمیل ذہنی مریضہ نے اسے آ چونکا دیا تھا۔

اپنے مطلب کو تو دیوانہ ہشیار ہوتا ہی ہے۔ اسے بھی صرف وہی چیزیں وہی مناظر یاد تھے جس میں ا کی ''روح'' تھرکتی تھی۔

اسکی نظریں ثریا پر تھیں ذہن کہیں دور کی سوچ رہا تھا۔

طوق ندامت اسے مارے ڈال رہا تھا۔ یہ طوق اس کی گردن توڑے دے رہا تھا۔

اس کے ذہن کے ہر کونے سے ایک یہی سوال اٹھ رہا تھا۔ اب کیا کرے۔؟ اس کے متعلقین کا کہاں کھوج لگائے۔

اسے کسی بے آسرا عورتوں کے لیے بنائے گئے مرکز میں ڈال آئے۔؟

کسی پاگل خانے میں چھوڑ آئے۔؟

لیکن یہ اس قدر شدید پاگل تو نہیں لگتی۔؟

تو پھر نفسیاتی اسپتال کا رخ کرے۔؟

یا پھر اخبار میں اشتہار دے دے اور تب تک اسے بھگتے۔

لیکن......؟

ان تمام راستوں میں سے ایک راہ بھی منتخب نہیں کر پا رہا تھا۔

اس لیے کہ وہ اس کا کھلا مجرم تھا۔

اس کے قدم کبھی نہیں بہکے تھے۔ اس کے ضمیر میں ایک عرصے تک صرف ''پنو'' ہی بوجھ بن کر رہی تھی۔

اب تو وہ اس بوجھ سے بھی آزاد تھا۔

گمان غالب یہی ہے کہ اس کے متعلقین مل جائیں گے۔

''پھر......؟''

''پھر وہ ان کے حوالے کر دے گا۔''

''پھر......؟''

پھر کیا۔ پھر وہ ہلا پھلکا ہو کر ہیوسٹن واپس چلا جائے گا۔''

''ہلکا۔ پھلکا۔'' ضمیر نے قہقہہ لگایا کہ اس کا وجود ہل کر رہ گیا۔

ہونہہ۔ ان لوگوں کو سزا ملنی ہی چاہیے جو اتنی جوان اور خوبصورت لڑکی سے غفلت برت گئے۔

''ہر کھیل کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے۔ ہار یا جیت۔ بعض اوقات فیصلہ برابر بھی ہو جاتا ہے۔''

''مگر برابر کبھی کبھار ہوتا ہے۔؟''

نتیجہ لازمی نکل سکتا ہے۔

''تو کسی کو کیا پتا کہ۔ ظاہر ہے گھر سے گمشدہ ابنارمل لڑکی کے ساتھ کوئی بھی۔

''ذرا آئینہ دیکھو ملک نواز۔ تمہاری آنکھیں بھوری ہیں تمہاری ٹھوڑی پر ننھا سا گڑھا ہے۔ اگر نتیجے کی صورت'' ایسی ہوئی۔؟''

''ہونہہ تو ہوتی رہے۔''

''اس کے متعلقین میں سے جو بھی اسے ''وصول'' کرنے آئے گا۔ خاص کر اس کی ''ماں'' وہ مارے تشکر کے ہاری صورت ساری زندگی یاد رکھے گی ملک نواز۔

نتیجہ اس لڑکی صورت میں ہوا تو۔ جیت ہو گی۔

نتیجہ تمہاری ''صورت'' میں نکلا تو ہار۔

اور کھیل ''برابر'' رہنے کے امکانات کم ہیں۔

''تو مجھے کیا۔ میں ہوش میں نہیں تھا۔ میں مجرم نہیں ہوں۔''

''تم نے اپنے ہوش خود اڑائے تھے۔ قدرت نے تو نہیں۔ جیسے ایک جھوٹ کے بعد دوسرا جھوٹ۔ اس ہائے گویا ایک گناہ کے بعد دوسرا۔''

''میں اپنے اعمال و افعال کا خود ذمہ دار ہوں۔ جو میرے جی میں آئے کر سکتا ہوں۔ میں نے سلگتے کوئلے پال تک زندگی گزاری مگر کبھی ہاتھ تک نہیں تاپے۔

میں نے تو اپنے گھر میں اسے نہیں بلایا تھا۔

یہ تو ان لوگوں کی سزا ہونی چاہیے جو ابنارمل بچوں سے غفلت برتتے ہیں۔'' ضمیر کو سمجھانا منانا بے حد کٹھن مرحلہ یہ دلیلوں سے نہیں مانتا۔ یہ جرح کے قابو میں نہیں آتا۔ یہ آنکھیں دکھاتا ہے۔ مگر کوئی اس کی آنکھیں نہیں پھڑ سکتا۔

یہ خوشامد سے نہیں مانتا یہ منت نہیں سنتا۔

جس عمل سے ناراض ہوتا ہے۔

اس کا تدراک مانگتا ہے۔

اس کا تاوان طلب کرتا ہے۔

اندرونی جنگ سے اس کے اعصاب شل ہو گئے۔

اس نے اپنا رخ موڑ لیا تھا۔

''صاحب ناشتہ لگا دوں۔؟''

خورشید دروازے کے باہر ہی سے بولا تھا۔

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ آپا نے ناشتا بھی نہیں دیا۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔'' مجھے ناشتا دے دو۔''

وہ بچوں کی طرح بسور کر بولی۔

وہ ایک دم چونک اٹھا۔

"اوہ۔ خدا معلوم کب سے یہ بھوکی ہوگی۔" اس نے اپنی بوجھل نظروں سے اسے غور سے دیکھا۔

"خورشید۔ ناشتا لے آؤ۔" اس نے بلند آواز سے خورشید سے کہا اور خود باتھ روم میں چلا گیا جلدی جلدی منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا اور کمرے کے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔

خورشید ٹرالی دھکیلتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے دروازے ہی پر اسے روک لیا۔

"تم جاؤ اب۔" اس نے جھک کر ٹرالی تھام لی۔ اور اندر لے آیا۔

"لو ناشتا کرلو۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ملک نواز نے اپنی نظریں جھکا لیں۔ وہ اس کی بے حمیتی اور سنگ دلی کا عنوان بنی بیٹھی تھی وہ اس کے حلیے سے خوفزدہ تھا۔

اس نے اس بے نیاز کے سامنے چیزیں رکھنا شروع کیں۔

"لو یہ سلائس لو۔ مکھن لگا دوں" وہ اسے ایک ماں کے انداز میں ناشتا کرا رہا تھا۔

"میں یہ صابن نہیں کھاتی۔" اس نے پلیٹ سے مکھن کی ٹکیہ اٹھا کر دیوار پر دے ماری۔ وہ سمجھا تھا وہ اس منہ پر دے مارے گی وہ فوراً نیچے جھک گیا تھا۔

"میں دودھ پیوں گی۔" وہ نچلا ہونٹ نکال کر بچوں کے انداز میں بولی تھی۔

"تم دودھ پیتی ہو ناشتے میں۔؟"

اس نے گردن اوپر نیچے کر کے اثبات میں جواب دیا۔

اس نے کپ میں دودھ ڈال کر اس کے سامنے رکھا۔

"اتنا سا۔؟" وہ بسوری۔

"یہ پی لو۔ پھر اور لے لینا۔" وہ زچ سا ہو گیا تھا۔

اس نے خود برائے نام ناشتا کیا تھا۔ البتہ ثریا نے خوب ڈٹ کر کھایا پیا تھا۔

"اگر یہی لڑکی ہوش میں ہوتی تو بجائے ناشتے کے زہر پھانکنے کا سوچتی۔" ملک نواز کے حساس ذہن دکھ بھرے انداز میں سر مزید جھکا لیا۔

ثریا نے ناشتا کر کے پاؤں کمبل میں سمیٹ لیے۔ اور مسکرا کر ملک نواز کو دیکھنے لگی۔

"اب تم اچھے لگ رہے ہو۔ رات کو تم سے ڈر لگتا ہے۔؟

سنو۔ تم بھائی جان ہو ناں۔؟" (اتنا تو اس لڑکی کو ہوش ہے کہ مجھے گالی دے۔ نشتر چبھوئے۔)

"نہیں۔ میں تمہارا بھائی جان نہیں ہوں۔" قطعی انداز میں کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ٹرالی دھکیل کر راہداری میں لے گیا۔

"میں آپا کے پاس جاؤں گی۔" وہ پھر پینترا بدل گئی۔

وہ یکدم چونک اٹھا۔

"تمہاری آپا کہاں رہتی ہیں۔؟"

"پتا نہیں۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔ روح ہی جل کر خاک ہو گئی۔

"جب تمہیں معلوم ہی نہیں کہ آپا کہاں رہتی ہیں تو ہم ان کے پاس کیسے جا سکتے ہیں۔؟"

"بس میں تو جاؤں گی۔ میں۔ ناں؟ اب تو میں نے دودھ بھی پی لیا ہے۔"

"ہیں۔؟۔ ہاں۔ نہیں نہیں ابھی تم یہیں رہو۔ میں تمہیں لے چلوں گا......"

اس نے وارڈ روب سے اپنی شلوار قمیض نکالی اور احتیاط دروازہ بند کر دیا اندر سے۔ پھر باتھ روم میں جا کر کپڑے بدلے۔

باہر آیا تو وہ تصویریں لیے بیٹھی تھی۔

"یہ تم ہو۔" اس نے تصویر پر انگلی رکھ کر سر اٹھایا۔

"ہوں......!" اس نے سوچوں میں گھرے ذہن کو زبردستی اس کی جانب مائل کیا۔

"اور یہ "دلہن" ہے۔؟" اس نے چاکلیٹی ساڑھی میں مسکراتی شہلا پر انگلی رکھی۔ اس نے ترچھی نظر سے شہلا کی تصویر کو دیکھا اور ڈریسنگ ٹیبل کی جانب روح موڑتے ہوئے سلگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اجی۔ کہاں دلہن۔ کسی اور کی دلہن ہے یہ۔"

"نہیں مجھے معلوم ہے۔ یہ دلہن ہے۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"بڑی نیک فالیں نکال رہی ہو۔ مگر بے کار ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر سلگتی ہوئی مسکراہٹ در آئی۔

وہ اس کے سراپے سے برابر نظریں چرا رہا تھا۔

کالر ٹھیک کرتا ہوا وہ باہر آ گیا اور باہر سے دروازے کو لاک کر دیا۔

"خورشید۔ خورشید۔!"

"جی صاحب۔!" وہ دوسری تیز آواز پر بھاگو چلا آیا۔

"ساتھ والوں کے ہاں کوئی بڑی عمر کی عورت کام کرنے آتی ہے......"

"ساتھ والوں کے ہاں تو پتا نہیں صاحب ان کا تو جب دیکھو گیٹ بند۔ سامنے والوں کے ہاں ایک عورت آتی ہے مگر وہ زیادہ عمر کی نہیں ہے۔

کیوں صاحب۔ مجھے نکال رہے ہیں کیا۔؟" اس نے خوفزدہ ہو کر اس کی شکل دیکھی۔ "مم۔ میں واپس گاؤں نہیں جاؤں گا۔ میرا دل نہیں لگتا وہاں۔ صاحب اس کوٹھی کی میں سال بھر سے حفاظت کر رہا ہوں۔ آپ کو کبھی شکایت بھی نہیں ہوئی۔ جب آپ جاتے ہیں واپس تو سارے کمروں کو لاک کر جاتے ہیں واپس آتے ہیں تو ہر چیز اسی طرح۔ ابا نے مجھے کہا۔"

"اوہ بندہ خدا۔ خاموش رہو۔ تو میں بھی کچھ کہوں۔؟" وہ جھلا دیا (میں۔ پاگل ہوں جو "اب" تمہیں گاؤں بھیجوں گا) "سامنے والی نوکرانی کو ذرا پانچ منٹ کے لیے بلا لانا۔"

"میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ اور سنو سامنے والے میرے کمرے کا دروازہ نہ کھولنا چاہے کچھ ہو۔ سن رہے ہو۔؟"

"جی صاحب۔!"

(اوہ شکر خدا کا میں تو سمجھ رہا تھا صاحب اب مجھے نکال دیں گے۔ اس نے فلم میں دیکھا تھا۔ جب کوئی شخص نوکروں کے راز سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ اسے گولی مار دیتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید صاحب بھی۔ میں کوئی پاگل

ہوں۔ بیٹھے بٹھائے ہزار روپیہ مل جاتا ہے۔ سامنے والوں کے وی سی آر اپر مزیدار فلمیں۔ مجھے کیا پڑی ہے۔ کرے صاحب۔ جوان کا جی چاہے۔ اس کے فلم خوردہ ذہن نے اس صورت حال کو بھی ڈرامائی انداز میں لیا تھا۔)

''پتا نہیں صاحب کو عورت سے کیا کام کرانا ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ اس نے باہر موٹر اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔

دبے پاؤں وہ صاحب کے بیڈ روم تک آیا۔ ہینڈل گھمایا لیکن دروازہ نہ کھلا۔

''ہونہہ تالا تو لگا گئے ہیں۔ دروازہ کیا جادو کے زور سے کھولوں گا۔ ملکانی جی۔ خوش ہونے کے دن آ گئے آپ کے۔ لگتا ہے صاحب۔''

وہ گنگناتا ہوا برآمدے میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

مالی ساحرہ کو لینے پشاور گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد تقریباً تین گھنٹے بعد ہی ثریا لاپتا ہو گئی تھی۔

کیوں کہ کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ نزدیک بازار میں مل جاتی تھی اس لیے چچی جان بڑے ضبط و تحمل سے اس کی راہ دیکھ رہی تھیں حسن آفس سے نہیں لوٹا تھا۔ مالی پشاور جا چکا تھا۔ چچا جان، مالی اور ملازم لڑکا اسے ڈھونڈنے گئے ہوئے تھے۔

جیسے ہی شام کے سائے گہرے ہونے لگے۔ چچی جان کو گویا دل بیٹھنے لگا۔

وہ کانپتے قدموں سے کچن میں چلی آئیں۔

''دلہن۔ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے۔''

شہلا کو ان پر بے حد ترس آ گیا وہ خود بھی پریشان تھی مگر خود پر قابو رکھے ہوئے تھی۔

''چچی جان۔ خدا کے لیے اس طرح ہاتھ پاؤں نہ چھوڑیں۔ آتی ہی ہو گی۔''

''ارے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے ہونے کو آئے۔ ارے کیا کروں میں۔''

''بھلا کہاں جائے گی۔؟ کہیں دور نکل گئی ہو گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔''

''ارے میں پریشان نہ ہوں گی تو کیا دیواریں پریشان ہوں گی۔''

''امی۔ غلام رسول (ملازم لڑکا) آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے ثریا پھوپھو بازار میں کہیں نہیں ہیں۔'' ہما تیزی سے اندر آئی تھی۔

''ہیں۔؟ ارے ہما کیا تمہارے دادا بھی آ گئے۔؟'' چچی جان ہول کر بولیں۔

''نہیں، دادا جان تو نہیں آئے۔''

''ارے خدا معلوم کہاں ٹکریں مار رہے ہوں گے۔ الٰہی ہماری آبرو رکھنا۔ اے میرے رب ہم پر رحم''

وہ تقریباً رونے کو ہو گئی تھیں۔ ادھر شہلا کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب ساس کی تسلی کس طور کرے۔

وہ ان کے ساتھ باہر آ گئی۔

اس دم پورچ میں حسن کی گاڑی آ کر رکی۔

اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے حیران نظروں سے ماں، بیوی، بیٹی کے پریشان چہروں کو دیکھا اور سے زینے طے کر کے برآمدے میں پہنچا اور شہلا کر سمت غور سے دیکھ کر بولا۔

''کیا بات ہے۔ ایسے کیوں کھڑے ہیں؟''

چچی جان تو بیٹے کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگیں۔

وہ ایک دم پریشان ہو گیا۔ ''کیا بات ہے ہما......؟'' اس نے بیٹی کو تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

''پپا! وہ ثریا پھوپھو۔''

''اوہ۔ جب آپ لوگوں کو پتا ہے پھر بھی آپ لوگ۔'' اس کا تھکا ہارا ذہن تھا۔ وہ بری طرح جھلا گیا۔

''ارے تو کیا گلے میں تعویذ بنا کر لٹکا لوں۔ بلکہ اب تک تعویذ بنا کر ہی لٹکا رکھا تھا۔ شادی کے ہنگاموں تک میں ناک کا بال بنائے رہی۔

دلہن کا بچوں کا ساتھ ہے۔ وہ مالی کے جانے کا غلغلہ ہو رہا تھا۔ بس اسی وقت کہیں نکل گئی۔ ارے خدا معلوم کہاں ہو گی میری بچی۔؟''

''بس اب یہ رونا دھونا بند کریں۔ کوئی گیا تھا ڈھونڈنے۔؟'' اس نے پھر بیوی کی سمت دیکھا۔

''تمہارے باپ تو ابھی تک نہیں لوٹے۔ دو گھنٹے ہونے کو آئے۔'' شہلا کے بجائے پھر چچی جان بولیں۔ وہ الٹے پاؤں پھر چاروں زینے اتر کر پورچ میں چلا گیا۔

اس لمحے شہلا کو بے حد خیال آیا۔ کتنے تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ مگر اب کریں بھی کیا۔ جب انسان گھریلو سکون آشنا ہو تو وہ سارے ہنگاموں سے تھک کر صرف اور صرف گھر جانا چاہتا ہے اور جب گھر میں۔

اب اس میں قصور بھی کس کا ہے۔؟ چچی جان تو بے چاری خود اس کی اس قدر دیکھ بھال کرتی ہیں۔

وہ انہیں خواب گاہ میں لے آئی۔

''وہ مل جائے گی آپ حوصلہ رکھیں۔ خدا اپنا کرم کرے گا۔'' اس نے انہیں لٹا دیا۔

''ہما بیٹے......!''

''جی امی......؟''

''بیٹے دادی جان کے لیے پانی میں گلوکوز ملا کر لاؤ۔ اور دیکھو حنا نے ہوم ورک کر لیا۔ گڈو جاگ گیا ہو تو لیتی آنا۔''

پھر اسے ایک دم خیال آیا۔ اتنی چھوٹی سی بچی پانی اور گڈو ایک ساتھ لائے گی۔

''پہلے پانی دے جاؤ۔'' اس نے فوراً کہا۔

ہما باہر نکل گئی۔

رات گئے پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

سب دیوانوں کی طرح باہر دوڑے۔

گاڑی کے اگلے دروازوں سے چچا جان اور حسن باہر نکلے اور پچھلے دروازے سے مالی۔ کھٹاک۔ کھٹاک۔ کھٹاک تینوں دروازے بند ہو گئے۔

شکستہ قدموں نے گویا چچی جان کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ تو وہیں کھڑی کھڑی جھول گئیں۔ شہلا نے بمشکل انہیں سنبھالا۔ حسن نے فوراً آگے بڑھ کر شہلا کی مدد کی۔

''امی۔ امی۔!'' حسن نے ماں کو بازوؤں میں سنبھالا۔

دونوں باپ بیٹا انہیں سنبھال کر خواب گاہ میں لے گئے۔ اور انہیں ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

اس وقت شہلا کے فولادی اعصاب کا کڑا امتحان تھا۔ اس نے فوراً ڈاکٹر کو فون کر دیا۔

''بھئی حسن۔ ڈاکٹر کو فون کر دو۔'' ابا جان کی آواز بے حد شکستہ تھی۔

''میں نے ڈاکٹر خان کو فون کر دیا ہے۔ آتے ہی ہوں گے۔'' شہلا نے کہا تو انہوں نے دل ہی دل میں مشکل صورت حال میں شہلا کے حوصلے کو سراہا۔ اور سوچا اس گھر میں شہلا کتنی اہم ضرورت ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر خان آ گئے۔ اچھی طرح چیک اپ کیا۔

''ڈاکٹر خان۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا آپ انہیں کوئی ایسا انجکشن دے دیں کہ صبح تک غافل رہیں۔؟'' چچا نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

''ہو تو سکتا ہے زید صاحب لیکن بیہوش مریض کے لیے یہ خطرناک ہو سکتا ہے۔ آپ ایسا کیوں ہیں۔؟'' انہوں نے روئی میں دوا انڈیلی اور اور پھر اسے چچی جان کی ناک کے قریب لا کر دائیں بائیں گردش دینے۔

تھوڑی دیر کے بعد چچی جان کے پپوٹوں میں لرزش ہوئی۔

انہوں نے سسکی بھری۔ ''ہائے۔''

آنسوؤں سے گیلی 'ہائے'۔ جگر چیر گئی۔ شہلا کا رواں رواں سسک اٹھا۔

''کہاں گئی میری بچی۔؟'' انہوں نے آنکھیں کھول کر خود پر جھکے ہوئے لوگوں سے سوال کیا۔

''کہاں جائے گی۔؟ کہیں نہیں جائے گی۔ خود کو سنبھالو۔ بچوں کی طرف ہی دیکھو۔''

چچا جان۔ کتنے حوصلے سے صورت حال سے نمٹ رہے تھے۔

''ارے میری ثریا۔!'' وہ دوپٹہ منہ پر رکھ کر پھر رونے لگیں۔

''ارے۔ عالیہ کو فون کر دو۔ مانی کو کہلا دو۔ میرے بچو آ کر مل جاؤ۔ کیسے جیوں گی میں۔ اپنے ہاتھ میں اتار دیتی تو رو دھو کر چین آ ہی جاتا۔ ارے اب چین کیسے آئے گا۔؟

میں کہہ رہی ہوں سن رہے ہو۔؟'' انہوں نے چچا جان کا ہاتھ پکڑا۔

''میری بچی ناشتا بھی میرے ہاتھ سے کرتی ہے۔ اس کی کنگھی چوٹی میں کرتی ہوں، کپڑے میں بنا ہوں۔ کوئی کر سکتا ہے اس کے یہ کام۔ ارے کہاں چلی گئی کون رکھے گا دیوانی کو اپنے گھر۔؟ سڑکوں پر پھر رہی ہوگی بچی۔ ارے وہ تو سڑکوں پر ہی مل جاتی آپ کو۔''

''دیکھ کر تو آ رہا ہوں۔ خدا سے بھلائی کی امید رکھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔'' انہوں نے رسانیت سے شانہ تھپتھپایا۔

شہلا نے رخ موڑ کر اشک پونچھے۔ چچی کی گریہ زاری اس کی برداشت سے باہر تھی۔ ڈاکٹر خان نے جان کو ایک انجکشن دیا چند منٹوں ہی میں وہ غافل تھیں۔

''آپ کو پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کرا دینی چاہیے۔'' ڈاکٹر خان نے اپنے سامان سمیٹا۔

''وہیں سے آ رہے ہیں۔ ریڈیو سے بھی نشر کرا دیا ہے۔'' حسن نے ڈاکٹر خان کا دواؤں کا بکس اٹھایا

''دیکھو حسن۔ اخبار میں ضرور دینا تصویر کے ساتھ۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' ڈاکٹر خان نے کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر شفقت سے کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں خدا اپنا کرم کرے گا۔'' انہوں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دوبارہ تسلی دی

ڈاکٹر خان سے پرانے مراسم تھے۔ کافی بے تکلفی تھی۔

''میں جلدی میں ہوں ہاسپٹل پہنچنا ہے۔''

''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

حسن نے آہستگی سے کہا اور اندر قدم بڑھا دیے۔

ساحرہ کے جانے کے چار دن بعد مانی اسے لینے گیا تھا۔ عالیہ تو ویسے کے اگلے روز ہی روانہ ہو گئی تھی۔

مانی وہاں تک کر مہمان نوزی کا لطف بھی نہ اٹھا پایا تھا کہ ساحرہ نے فوراً اطلاع دے دی تھی۔

''گھر سے فون آیا ہے۔ آپ کو فوراً بلایا ہے۔ پاپا کے آفس میں فون آیا تھا۔ ابھی ابھی پاپا آئے ہیں۔''

مانی فوراً پریشان ہو گیا۔ ''اچھا تو تم بھی فوراً تیاری کرو۔'' اس کا ذہن ایک دم متفکر ہو گیا۔ ''ایرپورٹ جا کر دیکھتا ہوں اگر جلدی۔ سیٹیں مل گئیں۔'' وہ ذہنی طور پر اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس نے ایک نظر بجی سجائی اور مہکتی ساحرہ کو بھی نہ دیکھا۔

جب سے وہ آیا تھا ساحرہ کی محض 'جھلکیاں' ہی دیکھنے کو مل رہی تھیں۔ اس وقت کتنے موڈ میں بیٹھا ساحرہ کا منتظر تھا۔ سسر اس کے اپنے غم ہائے روزگار سے گلے ملنے چلے گئے تھے۔ ساحرہ کی دو بہنیں تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئی تھیں۔ ساحرہ تو پہلے ہی اپنے گھر میں سہمی سہمی رہتی تھی اور مہمانوں کی موجودگی تو پھر ویسے ہی۔

بس سلام کر کے ایسی غائب ہوئی تھی کہ کافی دیر تک نظر ہی نہیں آئی۔

مانی کو جب اس کی بہنوں کا پروگرام معلوم ہوا تو ساحرہ کی چھوٹی سی بھانجی سے کہلا بھیجا۔

''بیٹے! اپنی خالہ سے کہو میں کاٹنے والا جانور نہیں ہوں۔''

اور اب ساحرہ آئی بھی تو کیا خبر لے کر۔

''اور کچھ نہیں بتایا پاپا نے۔؟'' اس نے ریسٹ واچ کلائی میں ڈالتے ہوئے چہرہ موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔

''نہیں۔ پاپا بتا رہے تھے کہ حسن بھائی نے فون پر کہا ہے کہ مانی۔ میرا مطلب ہے آپ کو فوراً آنے کا کہیں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔'' وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

''یہاں کہیں نزدیک کوئی فون ہے۔؟ میں پہلے گھر فون کر کے معلوم تو کروں۔'' (ساحرہ کے ہاں فون نہیں تھا۔)

''کئی گھروں میں ہیں۔ لیکن وہ لوگ لوکل کال بھی مشکل سے کرنے دیتے ہیں۔''

''خیر چھوڑو۔ میں ایئرپورٹ تو جا ہی رہا ہوں۔ وہیں کہیں ٹرائی کر لوں گا۔'' اس نے پرس اٹھا کر پینٹ کی پچھلی پاکٹ میں ٹھونسا۔

''امی کہاں ہیں۔؟'' وہ کچھ سوچ کر رکا۔

اپنی ساس کو بتا کر وہ بہت عجلت میں باہر نکلا تھا۔

سب سے پہلے اس نے پبلک ٹیلی فون بوتھ پتا کیا اور گھر فون کیا۔ فون حنا نے اٹھایا۔

''ہیلو۔!'' حنا کی مہین سی آواز ابھری۔

''ہیلو۔ حنا بیٹے میں مانی بول رہا ہوں۔'' اس نے فوراً حنا کی آواز پہچان کر کہا۔

''السلام علیکم چچا جان!''

"وعلیکم السلام بیٹا۔ یہ بتایئے گھر میں سب خیریت سے ہے ناں۔"

"وادی جان کی طبیعت سخت خراب ہے ثریا پھوپھو کل سے گھر ہی نہیں آئیں۔"

اوہ۔ بات واقعی سنگین تھی۔ اسی کی نظروں کے سامنے ثریا کی شکل گھوم گئی۔ اس نے اپنے وجود میں عجیب اذیت محسوس کی۔

اسے ایسا لگا جیسے کوئی فون کے پاس آیا ہو۔ حنا کی آواز آئی "مانی چچا ہیں۔" پھر ریسیور سے شہلا کی آواز ابھری

"ہیلو۔"

"اوہ بھابی۔ یہ حنا کیا کہہ رہی تھی۔"

"ٹھیک کہہ رہی تھی جتنی جلد ہو سکے تم آجاؤ۔ امی کی طبیعت۔"

مانی نے فون بند کر دیا۔ ادائیگی کی اور ائیر پورٹ کی سمت مڑ گیا۔ شاید مجھے خوشیاں راس ہی نہیں ہیں۔ اس نے کرب سے سوچا۔

☆

اتنی صبح تو بازار بھی نہیں کھلتے وہ بائیک بے مقصد ادھر ادھر دوڑاتا رہا۔ ایک شاپنگ سینٹر کا رخ کیا وہاں اکا دکا ہی دکانیں کھلی ہوئی تھیں وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان پر چلا آیا موسم کے لحاظ سے زنانا شلوار سوٹ خریدا مع دوپٹے اور واپس ہولیا۔

خورشید برآمدے کے دروازے پر کپڑا مارتا ہوا "محمد رفیع" بنا کوئی راگ الاپ رہا تھا ملک نواز کو دیکھ کر دم چپ ہو گیا۔

"وہ جی۔ میرا خیال ہے وہ دروازہ توڑ دیں گی۔ بہت دیر سے دروازہ پیٹ رہی ہیں۔ میں نے کہا صاحب منع کر گئے ہیں۔"

وہ اس کی بات سنتے ہی اندر لپکا تھا۔

جیب سے چابی نکال کر اس نے لاک کھولا۔

وہ بھوکی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ "تم نے مجھے اندر کیوں بند کیا میں تمہیں مار دوں گی۔" وہ اچانک افتاد سے بوکھلا گیا۔

بمشکل اسے قابو میں کیا۔ وہ بری طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"بھئی۔ میری بات تو سنو۔" وہ اسے قابو کیے کیسے زچ سا ہو کر بولا۔

"دیکھو۔ اگر دروازہ کھلا رکھا جائے تو ڈاکو آجاتے ہیں بہت بری طرح مارتے ہیں۔"

"ہوں۔ تم بھی تو ڈاکو ہو۔ تم نے بھی تو مجھے مارا تھا۔"

اس کے اندھیرے اور غفلت میں چلائے تیر ملک نواز کے جگر میں ترازو ہو گئے۔

"نہیں بھئی میں ڈاکو نہیں ہوں۔ دیکھو میں تمہارے لیے بہت اچھے کپڑے لایا ہوں۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے منہ صاف کر کے ملک نواز کے ہاتھوں میں جھولتے شاپنگ بیگ کو غور سے دیکھنے لگی۔

"میں دلہن جیسے ستاروں والے کپڑے پہنوں گی۔" وہ بچوں کی طرح بسوری۔

"وہ شام کو درزی لائے گا۔ (دلہن جیسے۔ ہونہہ۔ کل شب جب اندھیرے کی بارات اتری تھی تو۔ تو دلہن

تھی۔ اس روئے زمیں کی ایک اور حوا اپنے حقیقی انجام۔) ملک نواز نے نچلا ہونٹ کاٹ ڈالا۔

"کیا تم کپڑے بدل سکتی ہو۔؟"

"ہاں لیکن پہلے تم آپا کو لاؤ۔ ورنہ میں سب کو مار دوں گی۔" وہ پھر خونخوار شیرنی بننے لگی۔

"اچھا۔ اچھا۔" وہ گھبرا گیا۔ "آپا کو بھی لے آئیں گے۔ دیکھو تم کپڑے بدل لو تمہاری آستین پھٹ ہوئی ہے۔" وہ نظر چرا کر بولا۔

"پھر۔؟" وہ دھم سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"پھٹے پرانے کپڑے نہیں پہنتے۔" وہ عاجز آ گیا۔

"تم نے خود۔" اور ملک نواز نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"خدا کر لیے۔" وہ مدھم لہجے میں بولا "خدا کے لیے۔ دیکھو تم کپڑے بدل لو۔"

"کیسے بدلوں۔؟" ملک نواز کا بھیجہ اڑ گیا۔ اس کے معصوم انداز پر۔

"آپا کو تو لاؤ۔ ناں۔"

"تم کپڑے بدل لو۔ پھر آپا کے پاس لے چلوں گا۔ (خدا معلوم کون ہیں یہ آپا محترمہ؟) لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی کپڑوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔

اب اسے کچھ کہنا بے کار ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ پھر دروازہ بند کر کے باہر بلا گیا۔ خورشید وہ سامنے والوں کی ملازمہ کو تھوڑی دیر کے لیے بلا لاؤ۔ اس کی مالکن سے اجازت کے لینا۔" اس نے خورشید کو مخاطب کیا۔

"کس لیے صاحب۔؟"

ملک نواز نے اس کی سمت کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ خورشید کا تو خون ہی خشک ہو گیا ہو باہر کی سمت ہولیا۔

دس منٹ بعد وہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو ساتھ لیے داخل ہوا۔

"اماں صغراں۔ یہ ہیں میرے صاحب۔"

"سلام صاحب۔!" اس نے ملک نواز کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔ خورشید جاؤ۔ تم بازار سے مرغی بنوا لاؤ۔ جلدی۔" خورشید نے معنی خیز انداز میں اماں صغراں کو دیکھا اور پلٹ گیا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ صغراں کو پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی خواب گاہ کی سمت چلا۔ اماں صغراں تعجب سے منہ پر ہاتھ رکھ کر ملک نواز کو گھورتی پیچھے پیچھے ہولی ملک نواز نے دروازہ کھولا۔

اماں صغراں کو تو جیسے کرنٹ لگ گیا...... انتہائی خوبصورت و بہترین اٹھان والی لڑکی بستر پر آلتی پالتی مارے انگلش میگزین میں رنگین تصاویر دیکھ رہی تھی۔ ملک نواز دیکھ کر اس نے میگزین اس پر کھینچ مارا۔ وہ فوراً ایک طرف ہو گیا۔

"اب اگر تم نے دروازہ بند کیا تو میں دروازہ توڑ دوں گی۔" وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔ اماں صغراں خوفزدہ ہو کر ملک نواز کے پیچھے ہو گئی۔

"ڈرنے کی بات نہیں اماں۔ کچھ نہیں کہے گی۔" اس نے تسلی دی۔

"اماں یہ ذرا تھوڑی سی پاگل ہے۔" اس نے پست آواز میں سمجھایا۔

"تھوڑی سی۔" وہ حیران ہوئی۔

"یہ کپڑے اسے بدلوا دو۔محنت تو تمہیں کرنی ہوگی۔لیکن جو تم کہو گی دے دوں گا۔اب دیکھو۔اس کے کپڑے ایسے ہو رہے ہیں میں اسے ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جا سکتا یہ میری کزن۔میرا مطلب ہے میری رشتہ دار ہیں۔علاج کے لیے یہاں لایا ہوں......"

"آپ کی رشتہ دار؟ ان کے ماں باپ کہاں ہیں۔؟" وہ متعجب ہوئی۔

"نہیں ہیں۔یہ ہمارے پاس ہی بچپن سے۔"

"یہ تو جی بڑے ثواب کا کام ہے۔اور جی یہ آپ لوگوں کی ہمت ہی ہے کہ۔" وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہوگئی۔

"میں تو سمجھی تھی یہ مالکن ہیں۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔"لیکن جب ان کا حلیہ دیکھا تو۔"

"سنو۔کیا نام ہے تمہارا۔؟" ملک نواز نے ثریا کو پکارا۔

"ہیں صاحب۔؟ آپ کو ان کا نام نہیں پتا۔؟" نوکرانی کو شدید حیرت ہوئی اسی اجنبی انداز پر۔

ملک نواز گڑ بڑا گیا۔"یہ تو میری عادت ہے ایک دم نام منہ سے نہیں نکلتا۔" وہ سنبھل کر بولا۔

"دیکھو۔آپا آج شام تک آئیں گی جہاز میں بیٹھ کر۔وہ دور گئی ہوئی ہیں۔تم ایسا کرو کپڑے بدل لو۔اماں صغراں ہیں۔تمہاری مدد کر دیں گی۔پھر آپا کو لینے چلیں گے۔

اماں۔دیکھو ہمت نہ ہارنا۔پلیز۔" وہ باہر نکلتے نکلتے پھر گویا ہوا۔

پیچھے اماں صغراں نے دروازہ بند کر لیا۔

ثریا کے چیخ چیخ کر بولنے کی آوازیں آتی رہیں۔وہ گیٹ پر کھڑا ہو کر سیاہ بختی کی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا۔اپنے کردہ ناکردہ گناہ یاد آئے کوتاہی حقوق العباد یاد آئی۔ثریا سورج بنی ہوئی تھی اور ضمیری آئینہ انعکاس کا عمل جاری تھا۔جھلمل جھلمل روشنیاں اس کا وجود جھلسا رہی تھیں۔

اس دم ہانپتی کانپتی اماں صغراں باہر نکل آئی۔

"بڑی مشکل سے قابو میں آئیں بی بی۔!" وہ سانس درست کرنے لگی۔

"میں نے تو جی ان کا منہ ہاتھ بھی دھلا دیا۔کپڑے بھی بدلوا دیے۔بال بھی بنا دیے۔بال کیا ہیں صاحب ریشم کے لچھے ہیں کنگھا چلاتے بھی دل دکھتا ہے۔صاحب آج تک بی بی کا کام کون کرتا رہا۔؟"

ملک نواز اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔اس علاقے میں امراء وشرفاء آباد تھے اسے یہ فکری تھی کہ کہیں نام پر حرف نہ آجائے۔

"گھر والے ہی کرتے ہیں۔مگر اب یہاں تو نوکرانی کا انتظام کرنا ہی پڑے گا۔" اپنی دانست میں اس نے نوکرانی کو ٹالا تھا اور پچاس کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

تیس منٹ کے اس "صلے" نے اس کی چلتی زبان کو روک دیا۔

"صاحب! اگر آپ کہیں تو میں کر دیا کروں بی بی کے کام جب تک وہ یہاں ہیں۔" وہ خوشامدانہ انداز میں بولی۔

"ہوں۔دیکھیں گے۔شاید انہیں ہاسپٹل میں داخل کرانا پڑ جائے۔"

خورشید بھی آ گیا وہ باسکٹ اٹھائے ہوئے تھا۔اس نے اماں صغراں کو دیکھا جو بڑی "خوش نظر" آ رہی تھی کندھے اچکا کر اندر چلا گیا۔

اس نے صغراں کو رخصت کر کے گیٹ بند کر دیا۔وہ ذہنی طور پر سخت پریشان تھا۔

اس کے سارے پروگرامز گڑ بڑ ہو گئے تھے۔

اس دم اسے پیچھے کسی کے وجود کا احساس ہوا۔اس نے پلٹ کر دیکھا۔

وہ بائیک پر چڑھی بیٹھی تھی۔

کاہی سبز ہاف آستینوں کے اسٹائلش سوٹ میں اس کا سفید رنگ کھلا پڑ رہا تھا۔رگڑ رگڑ کر منہ دھونے کی وجہ سے ناک اور رخسار سرخ انگارہ ہو رہے تھے اس نے ملک نواز کی سمت مسکرا کر دیکھا۔کپڑوں کا رنگ اس کی سبز آنکھوں …ل رہا تھا۔اس کی معصومیت نے ملک نواز کے پپوٹوں پر منوں بوجھ لاد دیا۔

"مالی کے پاس بھی ایسی سائیکل ہے۔بڑی تیز چلاتا ہے وہ۔اس میں سے زور کی آواز آتی ہے۔ہے۔؟ تم مجھے اس والی سائیکل پر باہر لے چلو۔" وہ بچوں کے سے انداز میں منت سے دیکھ کر بولی۔

"باہر۔ہاں۔آں۔ہاں۔چلیں گے باہر۔"

"تم کہہ رہے ہو آپا شام کو آجائیں گی۔؟"

"ہاں۔!" وہ گیٹ کو تالا لگانے کی غرض سے بڑھا۔

"پھر میں اس سے کہوں گی مجھے یہاں جھولا ڈال دیں۔" وہ اچھل کر بائیک سے اتر کر جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوگئی۔

"میں اور خنزہ (مالی کی چترالی بیوی) بڑی زور سے جھولا جھولتے ہیں۔"

وہ بچوں کے سے انداز میں گردن ہلا مسکرائی۔

وہ تالا ڈال کر اپنی خواب گاہ میں چلا آیا یہ سوچنے کہ اب اسے کونسا قدم اٹھانا چاہیے۔

سہ پہر کو وہ ضروری کام سے جانے کے لیے نکلا تو خورشید کو تاکید کی کہ وہ گیٹ میں تالا ڈال کر رکھے اور اس کا خیال رکھے۔آج اس کے کان ریڈیو پر لگے ہوئے تھے۔اور نظروں نے اخبار کے صفحات ٹٹولے تھے۔مگر کچھ نظر نہیں آیا۔کچھ سنائی نہیں دیا۔ذہنی اضطراب پر قابو پانے کے بعد اب مسلسل وہ مسئلے کا حل سوچ رہا تھا۔ہزار بار اس کے دماغ نے اسے بلا سر سے اتار پھینکنے کا مشورہ دیا۔

اس کی معصومیت اور بے خبری کا عالم دیکھ کر جرم کا احساس شدید تر ہو گیا تھا۔اگر اس کی جگہ کوئی ہوشمند لڑکی ہوتی اس کا وجود یہ سوچ کر لرزنے لگتا۔مشرق کی لڑکیاں تو ویسے ہی شیشہ ہوتی ہیں۔اور شیشے کو خواہ نرمی ہی سے تھامو۔"فنگر پرنٹ" تو آ ہی جاتا ہے شیشے پر۔اور ایک بچوں سے بڑھ کر معصوم لڑکی۔حالات و واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ اسے اس کے گھر والوں نے بڑی حفاظت سے پرورش کیا ہے۔موتی موتی پرو کر جو مالا پروئی گئی تھی۔اس نے اس مالا کا موتی موتی بکھیر دیا ہے۔

اگر اس کے لواحقین مل گئے۔؟

بہت اچھا ہو گا۔

ہاں میں ضمیر کی مسلسل خلش سہہ لوں گا لیکن اس "عذاب مسلسل نہیں بناؤں گا۔اس نے پختہ فیصلہ کر لیا۔

پہلے وہ ائیر پورٹ پر گیا پھر ناصر صاحب کے پاس۔اپنے کچھ کام ان کے ذمے کیے۔واپسی پر ایک دیرینہ رفیق سے ملاقات ہو گئی وہ کھینچ کر اپنے گھر لے گیا۔اس کا ذہن تفکرات میں گھرا ہوا تھا مگر اسے دنیا سے نباہنا پڑ رہا تھا۔

واپسی پر شام ہو گئی تھی۔معاً اسے ٹیلر کو دیے کپڑے یاد آ گئے اس نے بائیک کا رخ صدر کی سمت کر لیا۔

''اسٹائل ہاؤس'' کے کاؤنٹر بے حد مصروف تھے۔اس نے پرس سے رسید نکالی اور ایک کاؤنٹر پر جگہ بنتی دیکھ کر تیزی سے قدم بڑھائے اس کے برابر ایک صاحب کپڑے چیک کر رہے تھے انہوں نے سفری بیگ کھولا اخبار کے تہہ شدہ صفحات باہر نکال کر بے نیازی سے کاؤنٹر پر ڈال دیے۔

اخبار کا ادبی ایڈیشن تھا۔شہلا کی تصویر کے نیچے ہی اسکی ایک ''غزل'' چھپی ہوئی تھی اس کا دل پھر دیوانہ ہونے لگا۔

''کیا میں یہ لے سکتا ہوں۔؟''اس نے پرشوق انداز میں اخبار کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''ضرور۔ضرور۔میں جہاز میں پورا چاٹ چکا ہوں۔''وہ صاحب بڑی شگفتگی سے بولے۔پھر سامنے متوجہ ہو کر کہنے لگے۔

''یار میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ میری بیس کی فلائٹ ہے۔اور تم نے ابھی تک۔''

''سر یقین کیجیے۔آپ کو صبح باقی کپڑے مل جائیں گے۔''

وہ صاحب چہرے پر پریشانی کے تاثرات گہرے کیسے پلٹ گئے تو اس نے بھی رسید آگے بڑھائی۔وہاں سے فارغ ہو کر اس نے سیدھا گھر کا رخ کیا۔

پہلی گھنٹی پر ہی خورشید نے گیٹ کھولا تھا۔

اس نے خورشید کے چہرے پر نظریں دوڑا کر صورت حال کا انداز کرنا چاہا۔

''بی بی نے پریشان تو نہیں کیا۔؟''اس نے اس طرح پوچھا گویا''بی بی''اس کی سگی رشتہ دار ہو۔

''نہیں صاحب۔شام کو بہت شور کر رہی تھیں۔پتا نہیں۔آپا۔آپا۔کیا کر رہی تھیں۔میرے سر ہو گئیں کہ جھولا ڈال دوں۔بڑی مشکل سے رسی ڈھونڈ کر۔صاحب۔جھولا ڈالا۔پھر دیر تک جھولا جھولتی رہیں۔میں نے انہیں کھانا کھلا دیا تھا۔کھانے کھاتے ہی سو گئیں۔''

خورشید نے تفصیل سے بتایا۔اس نے بھی بڑے غور سے سنا۔

''کھانا کھائیں گے صاحب۔؟''

''ہوں۔لگاؤ......''

وہ سامان سمیت آہستگی سے خواب گاہ میں داخل ہوا۔کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی اور وہ بے خبر سو رہی تھی۔بے سدھ۔

اس نے اس کے سراپے پر اچٹتی نظروں ڈال کر رخ موڑ لیا۔قیامت خیز حسن۔اور عورت تو مرد کا سب سے کڑا امتحان ہوتی ہے۔

اس نے سرمئی کمبل اس کے پورے وجود پر پھیلا دیا۔اس کی معصومیت اور اپنی معصیت پر غور کرتا کمرے کے کمرے میں آ گیا۔

بڑی مشکل سے دو چار نوالے زہر مار کیے اور جلد ہی کرسی گھسیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''صاحب جی۔!''پیچھے سے خورشید نے پکارا۔

اس نے رک کر بغیر مڑے خورشید کی بات کا انتظار کیا۔

''صاحب۔ایک بات پوچھوں۔ڈانٹیں گے تو نہیں۔؟''وہ گھگھیایا۔

''ہوں۔؟''وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

''صاحب صبح تو آپ مجھے ڈانٹ رہے تھے کہ یہ لڑکی کون ہے۔اور اب آپ اس کا اتنا خیال رکھ رہے ہیں۔آپ اسے نکال دیتے یہ [illegible] نا چلی جاتی اپنا۔''

''یہ میری جاننے والی ہے۔میرے دوست کی بہن ہے خورشید۔اسے علاج کے لیے ہاسپٹل میں داخل کرنا ہے۔''

اس کا لہجہ انتہائی محتاط تھا۔اناڑی گھڑ سوار جیسا انداز تھا۔اسے معمولی ملازم کے سامنے اپنا بھرم رکھنا دشوار لگ رہا تھا مصیبت تو یہ تھی کہ وہ اس کے اپنے گاؤں کا لڑکا تھا۔پہلے اس بنگلے میں اس کا باپ نگران تھا اب اس کی موت کے بعد خورشید اس کی جگہ پر تھا۔

وہ خورشید کی چھٹی بھی نہیں کر سکتا تھا اور سچ بات بھی نہیں بتا سکتا تھا۔اگر وہ گاؤں میں جا کر بتا دے۔؟ ملکانی تو......پھر یہیں آ کر سوچ ٹھہری تھی۔اور اسے مزید پستی میں اترنا پڑا۔

''صاحب آپ تو صبح کہہ رہے تھے۔''خورشید ہکا بکا اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

''میں صبح نشے میں تھا خورشید۔''(وہ جانتا تھا صاحب''پیتے''ہیں)

''نشے میں۔؟صبح کے وقت۔؟''وہ حیران پریشان نظر آنے لگا تھا۔(گناہ کا کوئی وقت نہیں ہوتا خورشید اس نے سوچا۔پھر خورشید کی سمت خشمگیں نظروں سے دیکھ کر بولا۔

''مرضی ہے میری۔جاؤ اب تم اپنے کر وارڈ روب کا نچلا خانہ کھولا اور ایک کمبل نکالا۔جاتی سردیاں ختم نہیں۔پھر اس کے برابر سے دوسرا تکیہ آہستگی سے اٹھایا۔

پھر ایک دم [illegible] سوچ کر باہر جاتے جاتے پلٹ پڑا۔

اور صوفے پر تکیہ ڈال دیا اور کمبل بھی۔لائٹ بجھا کر اس نے ہلکی روشنی کی۔پھر وارڈ روب کی طرف آیا اور مخصوص خانہ کھول کر بوتل نکالی پھر شیشے کا پیانہ۔بوتل اٹھا کر روشنی کی طرف کی اور مقدار کا اندازہ لگایا۔

اور صوفے پر آ گیا۔کارک ہٹاتے ہی ایک مخصوص مہک اس کے اعصاب میں ہیجان برپا کرنے لگی۔پیانہ بھرتے ہوئے اس کی نظر۔''ضمیر کے پھندے''پر پڑی اس کے ہاتھ رک گئے۔

وہ پھر ہوش وخرد سے بے گانہ ہونے جا رہا تھا۔جبکہ پچھلے''قرض''بدستور اپنی جگہ تھے۔

ٹھیک ہے وہ اس شے کا عادی ہو چکا ہے۔کیا یقین ہے آج پھر وہ اپنے ضمیر کی ہلاکت کا سامان نہیں کرے گا۔؟

وہ دیر تک ایک ہی زاویے سے بیٹھا رہا پھر اٹھا اور بوتل اور پیانہ واپس رکھ کر لاک لگا دیا۔اسے خود پر بھروسا نہیں رہا تھا۔وہ دیر تک صوفے پر لیٹا خالی الذہن چھت کو گھورتا رہا۔نیند جیسے راہ بھول گئی تھی۔

گردن موڑ کر اس نے خوابیدہ دیوانہ حسن دیکھا۔

دن میں تمام باتیں اسے سرسری سی لگی تھیں۔لیکن رات۔نہیں بخشتی۔

ایک پاکھنڈی عورت کی طرح۔جو لڑواتی ہے اور انجان بن جاتی ہے۔بہت سارے حادثے اس کی گود میں۔پرورش پاتے ہیں۔

رات کے ساتھ۔تنہائی اور سناٹے کا تصور ایک ساتھ بنتا ہے۔تنہائی اور سناٹا۔سناٹے کی تو اس کائنات کو عادت نہیں ہے۔

باہر کے شور تھمتے ہیں تو''اندر''ہنگامے برپا ہونے لگتے ہیں۔

دن میں ''اندر'' کا شور باہر کے شور میں دب جاتا ہے یا دبا دیا جاتا ہے باہر کے شور اور ہنگامے مصنوعی
ہیں۔ لیکن اندر سے سچی دہائیاں بولتی ہیں۔ حق پر مبنی واویلے اٹھتے ہیں۔ جب تک انسان اس شور سے اچھی طرح
لے سونہیں سکتا۔

صبح تھوڑی دیر کے لیے اس نے انتہائی شدید اذیت محسوس کی تھی لیکن اس کے بعد اسے یہ سب
جذباتیت محسوس ہوا تھا۔ اور وہ سارے الزام اس کے لواحقین پر فٹ کر کے مطمئن سا ہو گیا تھا۔

لیکن اب پھر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بات چھوٹی نہیں۔

جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ اسے معمولی جھوٹ بھی بے چین کر دیتا ہے۔

جو عادی چور نہ ہو اس کی حالت پہلی چوری پر بہت بری ہوتی ہے۔

انسان کو انسان کا احترام نہ رہا تو کائنات ہچکولے کھانے لگے۔ کہ یہ کائنات خدا نے انسان کے لیے
خداشناسی کے لیے بنائی۔ خدا کو جاننے سے پہلے اپنے آپ کو جاننا ضروری ہے۔ اپنی حقیقت پر غور کرنا ضروری ہوتا
یہ ضمیر نام کی ''ترازو'' انسان کے اندر بے مقصد نہیں لٹکائی گئی۔

واقعات کی ترتیب۔ قسمت کہلاتی ہے۔ واقعات کہلاتی ہے۔ واقعات انسان مرتب کر سکتا ہے۔ اگر
کو جان جائے مگر آج کے انسان کو اتنی فرصت کہاں۔؟

آج کے باشعور انسان۔ انسان نہیں۔ مشین ہیں۔ مشین سوچتی نہیں صرف اپنا مخصوص کام انجام دیتی۔
بڑے اچھے اچھے کام خدا نے انسان کے لیے منتخب کیے تھے۔ کاش وہ ''انسان'' کو خودکار مشین نہ بناتا
کے ''بٹن'' اپنے ہاتھ رکھ لیتا۔

لیکن اس نے مشین کی خرابی چیک کرنے والا آلہ ''ضمیر'' بھی اسی میں فٹ کر رکھا ہے۔ بعض ''مشینو
غلط استعمال ہو تو یہ ''آلہ'' بھی خراب ہو جاتا ہے۔

اس کا آلہ خراب نہیں تھا۔ ٹھیک ٹھاک مشین تھی۔ اسی لیے ''چیکنگ'' سخت ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر
دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ پھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

ہلکی سبز روشنی میں ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں وہ ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا وہ آگے بڑھ آیا اور
بالوں میں برش چلانے لگا۔

اس کا مضبوط سراپا۔ سیاہ نائٹ سوٹ میں مقید تھا۔ اس کی اصلی جلد سیاہ ملبوس میں بے حد کشش لگ
تھی۔ کیتھرائن براؤن جو اس کے لیے دیوانی ہو رہی تھی ایک مرتبہ اس نے کتنے جذباتی انداز میں کہا تھا تم کتنے
مرد ہو میں تمہارے لیے جان بھی قربان کر سکتی ہوں۔''

وہ مسکرا دیا تھا یہ سب اس کی ''طلب'' نہیں تھا۔ لہٰذا ایسی باتوں سے بھی اس کا جی خوش نہیں ہوتا تھا۔

آئینے میں اس کے پیچھے آبنوسی بیڈ کا پورا منظر تھا۔ اس کا ذہن پھر اس کی جانب مڑ گیا۔ اس نے
سوچا کاش یہ لڑکی حادثاتی طور پر مر جائے کم از کم میری ''تصویر'' تو۔ منظر عام پر آنے کا دھڑکا نہیں ہوگا۔

ساری زندگی اس نے آزادی سے گزاری تھی۔ مگر قدرت نے اب اسے بری طرح پابہ زنجیر کیا تھا۔

ایک نامانوس سا خوف اسے باز رکھ رہا تھا کہ وہ لڑکی کو اس کے اپنوں میں چھوڑ آئے اس سے بہتر
آسرا عورتوں کے مرکز میں چھوڑ آئے پھر وہ جانیں ان کا کام۔ دوسرے ایک نئی بات دماغ نے اور بتائی تھی۔

اگر لوگوں کو شک ہو گیا کہ اس گھر میں......

تھانہ...... پولیس...... اور رسوائی۔

اف۔ وہ لرز اٹھا۔ میں نے پہلے یہ کیوں نہیں سوچا۔ الٹا اماں صغراں کو بلا کر۔ مگر یہ بھی ضروری تھا۔ معاً اس
کے ذہن نے ایک پختہ فیصلہ کر ہی لیا۔

☆☆☆

یہ دوسری رات تھی۔ چچی جان کی حالت بے حد ابتر تھی۔ حسن بھی آج دفتر نہیں گیا تھا۔ مانی اور ساحرہ ابھی
ابھی پہنچے تھے۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چچا جان کو شام سے بخار تھا وہ ان کے لیے چائے لے کر اندر گئی تو وہ جائے نماز
پر بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے تھے۔

بیٹی تو بیٹی ہوتی ہے۔ دیوانی ہو یا ہوشمند۔ دیوانہ۔ اگر دوسرے دیوانہ سمجھ کر اور فائدہ اٹھا جائیں؟ دیوانگی تو
اپنی ذات، اپنی قسمت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ لڑکیاں تو شیشے جیسی ہوتی ہیں دیوانی بیٹی بھی۔ شیشہ ہوتی ہے۔ اور اس شیشے
پر دیوانگی کی دھول اتنی بری نہیں لگتی جتنی بال برابر لکیر۔

لکیریں شیشے کا عیب ہوتی ہیں۔ خواہ دھول چڑھے شیشے پر ہوں یا شفاف چمکتے شیشے پر۔

وہ اس بوڑھے سرنگوں باپ کی اذیت محسوس کر رہی تھی۔

وہ آگے بڑھی تو دعا مانگتی ہتھیلیوں پر گرے آنسو اس نے دیکھ لیے۔

شہلا کے کلیجے میں جیسے برچھی سی اڑ گئی۔ باپ سمان چچا۔ حقیقی چچا کے دکھ کے اظہار پر اس کا دل چاہ رہا تھا وہ
خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔

''چچا جان یہ چائے رکھ رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

مبادا۔ اسے خود پر قابو نہ رہے۔

وہ کچن بند کرنے آئی تھی۔ برتن وغیرہ رکھ کر وہ پلٹی تو گلابی سوٹ میں گلابی سی ساحرہ کھڑی تھی۔

''ارے ساحرہ۔ تم یہاں کیوں آ گئیں۔ تھک گئی ہو گی۔'' اس نے زبردستی اپنا لہجہ نارمل کیا۔

''بھابی۔!'' وہ شہلا کے شانے سے چہرہ ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''کیا بات ہے ساحرہ......؟ خدا کے لیے اس طرح رووٗ مت۔'' شہلا متردد ہوئی۔

''بھابی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''کس سے۔؟ کس سے ڈر لگ رہا ہے۔؟'' اس نے ساحرہ کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''بھابی۔ کہیں آپ لوگ مجھے منحوس نہ سمجھ لیں۔ میرے نانا نانی۔ اور بہت سے لوگوں کی طرح۔''

''اچھا! پاگل ہیں ہم گویا۔ بھئی اس حادثے میں تمہارا کیا قصور۔؟ بے وقوف لڑکی۔''

''مجھے خوشیاں راس نہیں ہیں بھابی۔''

''بڑی آئیں کہیں کی جوتشی۔ آئندہ ایسی بات سوچنا بھی مت۔'' اس نے پیار سے سمجھایا۔

''بھابی۔ انہوں نے۔ تو مجھ سے شام سے اب تک ایک بات بھی نہیں کی۔''

''اچھا تو اس وجہ سے رونا آ رہا ہے۔''

''نہیں۔ نہیں۔'' وہ بری طرح گھبرا گئی۔ ''بس مجھے ایسے ہی الٹے سیدھے وہم آ رہے تھے۔''

"ساحرہ۔ ثریا۔ مانی کی بہن ہے۔ بے حد پیار کرتی ہے مانی سے۔ کیا مانی پریشان نہیں ہوگا۔؟ وہ اس وقت بے حد پریشان ہے۔ تمہیں اس کا بے حد خیال رکھنا چاہیے۔

آؤ چلو۔ میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ دوں۔" اس نے محبت سے ساحرہ کی کمر میں بازو حمائل کر دیا۔

"تمہیں بجائے پریشانی کے اظہار کرنے کے خود مانی کی پریشانی دور کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ اتنے بھرے پرے گھر میں بہو بن کر آئی ہو۔ بہت ذمہ داریاں ہوتی ہیں بہوؤں پر۔ اگر وہ اپنی زندگی میں سکون چاہیں تو یہ ذمہ داریاں انہیں ہنس کر قبول کرنا چاہئیں۔ اپنے آپ کو مضبوط بنا کر رکھنا ہوگا ساحرہ۔ معمولی معمولی باتوں پر پریشان ہوگی تو بڑے مسائل سے کیسے نمٹو گی۔؟"

"خدا نے چاہا تو ضرور ثریا گھر واپس آ جائے گی۔ خدا کرے وہ خیریت سے ہو۔ ساحرہ نے دل ہی دل میں آمین کہا۔

وہ صبح لان میں بیٹھا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔

ثریا جھولا جھولنے میں مصروف تھی۔

"تم بہت چھٹیاں کرتی ہو۔ کل مجھے سارے گھر کی جھاڑو لگانا پڑی تھی۔"

خورشید گیٹ پر کھڑا۔ جمعدارنی سے الجھ رہا تھا۔

ملک نواز کو اس کی آواز جھنجھناہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"خورشید۔ رہنے دو۔"

"صاحب۔ آپ نہیں جانتے۔"

"اچھا۔ بس۔ بس۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر خورشید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"جاؤ۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔" اس نے جمعدارنی سے مخاطب ہو کر کہا۔

جمعدارنی اندر چلی گئی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد باہر آ گئی۔

"صاحب۔ یہ ہار آپ کے کمرے میں پڑا ہوا تھا اس کی زنجیر ٹوٹی ہوئی ہے شاید 'بی بی' کے گلے سے ٹوٹ کر گر گیا ہے۔" اس نے دور جھولا جھولتی ثریا کو دیکھا۔ ملک نواز نے "ہار اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتے کی شکل کا لاکٹ تھا جس پر کچھ کندہ تھا۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر نقش ونگار نہیں۔ ایڈریس کندہ تھا۔

"دارالسلام کوئٹہ۔ شہلا کے گھر کا ایڈریس۔ اس کا ذہن بھک سے اڑ گیا تھا۔ اس نے ثریا کو بغور دیکھا۔ وہ اب اس کی یادداشت کی سطح پر مسکرا رہی تھی۔

اسے محسوس ہوا پہاڑ گزشتہ رات کو نہیں ابھی ٹوٹا ہے۔ اس کے ذہن میں تمام نہیں مگر کچھ یادداشتیں کروٹ بدل چکی تھیں۔

اسے محسوس ہوا گویا وہ جہنم کے سب سے نچلے درجے میں پہنچ چکا ہے۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ قدرت اسے اس طرح شکنجے میں کسے گی۔

اسے یاد آ گیا کہ وہ اس دیوانی سے کوئٹہ مل چکا ہے۔ اس کے بے سروپا سوالات کے دوران جو اس کی حالت ہوئی تھی۔ اسے یاد آ گئی۔

صبح کو جب وہ بڑی سادگی سے پوچھ رہی تھی۔ سنو تم کیا بھائی جان ہو۔؟" تب اسے یہ طرز تخاطب اور الفاظ

مانوس سے محسوس ہوئے تھے۔ جیسے پہلے بھی کبھی سنے ہوں۔ اسے شہلا کے سر کی شکستہ حالت یاد آئی جو اس کے استفسار پر ہوئی تھی۔ اب تو وہ کسی طور پر منظر پر نہیں آئے گا۔

پچھلے دنوں اس نے اس پر اپنی خالص اور شدید محبت و دیوانگی آشکارا کی ہے۔ وہ اسے خط کے ذریعے مطلع کر چکا ہے کہ وہ اس کے نام کا سنیاسی ہے۔

یہی اس کے ساتھ زیادتی کافی ہے۔ اور پھر یہ پگلی ان کے کس کام کی؟ لہٰذا وہ کسی صورت بھی "دارالسلام" نہیں جائے گا۔

اس کے ذہن نے قطعی فیصلہ کر لیا۔ وہ اسے یہیں کسی ہاسپٹل میں ڈال کر ہیوسٹن چلا جائے گا اور وہاں سے ایک گمنام یا فرضی نام سے خط لکھ کر انہیں بتا دے گا کہ ان کی دیوانی بیٹی فلاں فلاں ہسپتال میں ہے کراچی جا کر لے آئیں۔ اور یوں اس نے آخر کار اپنی اذیتوں کا حل ڈھونڈ لیا۔

"ارے میری مالا......!" اس نے ملک نواز کے ہاتھ میں اپنا لاکٹ جھولتا دیکھا تو لپک کر آئی۔

"تم نے کیوں میری "مالا" لی۔؟" وہ خفگی سے بولی۔ "آپا کہتی ہیں۔ اگر تم نے یہ اتاری تو میں موٹے ڈنڈے سے پٹائی کروں۔ گی۔ بہت زور سے مارتی ہیں۔" اس نے آنکھیں پھیلا کر ملک نواز پر بھی آپا کا ڈر بٹھانا چاہا۔

"تم نے کبھی مالا دیکھی ہے؟" خورشید چائے لیے ملک نواز کے سر پر کھڑا تھا۔ استہزائیہ ہنس کر بولا۔

"تم مت ہنسو۔ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے اچھے اچھے لوگ پیارے لگتے ہیں۔ جیسے تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔" اس نے ملک نواز کے شیو بڑھے چہرے کو ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ اس کی اس بے ساختہ حرکت پر بری طرح گڑبڑا کر رہ گیا اس کے ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے وہ خورشید پر برس پڑا۔

"یہ کیا تم ہر وقت سر پر کھڑے رہتے ہو۔ کام وام کرو جا کر۔" خورشید بظاہر ڈر کر دبک گیا۔ مگر کچن سے اس کی شرارت بھری آواز گنگناہٹ کی صورت میں برابر آ رہی تھی۔

دنیا والوں سے دور — جلنے والوں سے
آ جا آ جا چلیں کہیں دور — کہیں دور

وہ اپنے بیڈروم میں چلا آیا۔ وہ ناصر صاحب کا نمبر ڈائل کر رہا تھا۔

"ہیلو ناصر صاحب! بھئی ایک ایمرجنسی ہے۔ بات یہ ہے پچھلے دنوں آپ نے بتایا تھا کہ ڈاکٹر باقر نے اپنا ایک نفسیاتی کلینک کھولا ہے۔" ڈاکٹر باقر، ناصر صاحب کے بڑے بھائی تھے۔

"نہیں بھئی خدا نہ کرے صاحب۔ مریض کوئی اور ہے۔ دراصل ڈاکٹر صاحب نے دو سال پہلے کینیڈا میں مجھے بتایا تھا کہ وہ وطن واپس جا رہے ہیں اور اپنا ہاسپٹل یا کلینک کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پھر آپ نے بھی بتایا تھا...... یہ بتائیے ان کا کلینک کہاں ہے؟"

"اچھا......اچھا......بہت شکریہ......جی بس ایک ہفتے بعد روانگی ہے۔ چھوڑیے۔ جس جگہ دل ہی نہ لگے۔ وہاں رہ کر کیا فائدہ......"

"آپ کا کہنا بجا......اپنا وطن پھر اپنا ہے......لیکن بعض اوقات اپنے......خیر جانے دیجیے......نہیں صاحب ملے بغیر تو نہیں جاؤں گا......آؤں گا۔ لیکن آپ یہ تو بتائیے میرے ہاں آنے کا ویزا کب ایشو کر رہے ہیں؟"

"نہیں خیر، گاؤں اگر جاتا تو آپ کو بغیر اطلاع دیے تو نہیں جاتا...... گھر۔؟ چھوڑیے صاحب۔ کچھ گزر گئی......اور گزر جائے گی۔"

"جی۔؟ ہاہا۔ ہا۔ ہاہا" اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔ مگر ایک دم چپ ہو گیا جیسے غلطی سے ہنس دیا ہو۔

"خدا حافظ ناصر صاحب!" اس نے فون کریڈل پر ڈال دیا۔

ڈاک کا دھیان تو آج بھی نہ آتا اگر پرانے اخباروں کے بیچ جمع شدہ خطوط نظر نہ آ جاتے۔ اف توبہ! اتنے دنوں سے ڈاک بھی نہیں بعض خطوط بہت اہم بھی ہوتے ہیں۔ اسے یاد آیا مانی کی مہندی والے روز بھی کچھ خطوط آئے تھے جو اس نے وارڈ روب میں تولیوں کے خانے میں اٹھا کر رکھ دیے تھے۔ اس نے وارڈ روب کا مطلوبہ پٹ کھول کر خطوط بھی نکال لیے۔

ذہن گھر کی پریشانیوں میں بدستور الجھا ہوا تھا۔ وہ جلدی جلدی لفافے چاک کر کے سرسری سی نظر ڈال رہی تھی۔ ایک چکنا سفید لفافہ جس پر ایک غیر ملکی ہوائی کمپنی کا مونوگرام بنا ہوا تھا اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے لفافے پر درج ایڈریس پر نظر کی اور لفافہ ایک طرف رکھ دیا۔

یہ تحریر خواہ مخواہ میرا بلڈ پریشر بڑھا دیتی ہے۔ اسے آخر میں ہی دیکھنا چاہیے۔

"دلہن بیگم! پہلے برتن دھوؤں یا دال بین لوں کھچڑی کے لیے......؟" گھر کی پرانی بوڑھی خادمہ دروازے پر نمودار ہوئی۔

"برتن دھولو اماں! دال وغیرہ میں آ کر دیکھتی ہوں۔ اس نے ایک خط پر نظر دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

حسن بھی آج گھر پر ہی تھے۔ بلکہ تین دن سے ماں کی وجہ سے چھٹی رہی تھے۔ اس لیے اسے یہ فکر تھی کہ کمرے میں واپس آنے تک بیڈ روم بھی درست کر لے۔ بیڈ شیٹ وغیرہ بدل دے۔ اگر وہ کمرے میں آ جاتے کمرے کی کوئی جگہ جھاڑنا پونچھنا بڑی معرکہ ہو جاتی تھی۔ انہیں بالکل پسند نہیں تھا کہ وہ کمرے میں ہوں اور کمرے کی جھاڑ پونچھ شروع کر دی جائے۔ اس نے وہی سفید لفافہ اٹھا لیا اور عجلت میں کھولا۔ عجیب سی مبہم سی تحریر تھی۔ وہ تیز تیز نظریں دوڑانے لگی۔ "واہیات"...... اس نے تیز تیز تنفس پر قابو پا کر عجیب سی کیفیت میں کہا تھا۔

"حسن...... حسن۔ کیا ہنر ہے آپ کے پاس۔ میری حساس سی نظر یہاں کتنی آسانی سے دیکھ سکتی تھی۔ آپ کی برہمی۔ آپ کی ذات کی شان میں...... مجھے "کمی" محسوس ہوتی تھی...... میرے رفیق میں نے کئی بار بے ساختہ آپ کو حاسد، تنگ نظر جانا۔ یہ دعویٰ تو میں نے کبھی نہیں کیا میں دانا ہوں، عالم ہوں۔ لیکن مجھے اپنی شدید حساس نظر پر بہت بھروسہ تھا۔ واقعی عورت کتنی جذباتی ہوتی ہے۔ بہت کم عقل کی سنتی ہے۔ میں نے آپ کی پہلی بات پر غور کیوں نہیں کیا تھا۔ جب آپ نے مجھے پہلی بار احساس دلایا تھا۔ میں تو فرعون ہی بن گئی تھی۔ بیان کے جواب میں معجزوں...... کے ثبوت چاہیے تھے۔ آخر آپ کی بات پر مجھے کیوں یقین نہیں آیا؟ حد سے زیادہ خود اعتمادی وانا...... نہیں یہ خود اعتمادی تو نہیں۔ مروت اور اپنی ذات و کردار کی پختگی پر اٹوٹ یقین تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے گا حسن...... محض اس لیے کہ میں نے آپ کی تنبیہ اور رکاوٹ کو آپ کی کوتاہ ذہنیت سمجھ کر لائق اعتنا نہیں جانا تھا۔ شکر ہے ملک! تم نے یہ بم اس وقت میرے سر پر مارا ہے جب میں حسن کی رفاقت میں محبتوں کا، رفاقتوں کا ایک خاصا معتبر عرصہ گزار چکی ہوں۔ اتنے سارے پیار کرنے والے لوگ میرے اردگرد ہمیشہ رہے ہیں۔ اسی لیے تو ملک! میں نے تمہیں بھی ان ہی سب لوگوں جیسا سمجھا تھا۔ ایک احمق اور پاگل ہو تم ملک۔ بے وقوف انسان......"

اس نے سارے خط سمیٹ کر میز پر ڈالے اور ملک نواز کے خط کی چند بغیر پڑھی لائنوں پر سرسری نظر دوڑانے لگی۔ نام تو اس کا دستخط کے انداز میں لکھا تھا۔ البتہ صفحہ جس پر خط لکھا تھا پرنیڈ پیڈ سے متعلق تھا۔ اس پر ملک نواز کا نام اور ہیوسٹن میں اس کے آفس کا ایڈریس بہت خوبصورت انداز میں پرنٹ تھا۔ خط کا انداز بے حد بے ساختہ تھا۔

اے صبح ازل کے پہلے تصور......

اے خالق کے اچھوتے تفکر......

میں تجھے سلام و آداب نہیں لکھوں گا کہ دیوانہ آداب نہیں جانتا۔ میرے اندر کا اٹوٹ یقین بولتا ہے۔ لوحِ محفوظ پہلے ڈھلی......اور سورج بعد میں خلق ہوا۔

اگر سورج لوحِ محفوظ سے پہلے بنا دیا جاتا خالق حدت اور آتش سے بے نیاز ہو کر لوحِ محفوظ پر مقدر رقم نہ کرتا۔ میں تجھے بتاؤں۔

لوحِ محفوظ پر تین لکیریں کھینچ کر فرق بنایا گیا۔ (میری روح کہتی ہے۔ یہ تمثیل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوئی۔)

ان تین خانوں میں سے پہلے خانہ ان کا تھا جو دیکھیں اور پالیں پھر وہ جو بے نیاز اور غنی ہوں۔

دوسرے خانے میں ان کے نام درج تھے جو دیکھیں دوڑ پڑیں۔ گریں۔ اٹھیں...... گریں...... اور آخر کار لیں۔ تیسرے خانے میں ان کے نام رقم ہوئے جو دیکھیں تڑپیں...... دیکھیں سلگیں...... دیکھیں دیوانے بنیں اور محروم رہیں۔

جس کا نام کسی فہرست میں آخر میں آئے اسے مراعات بہت کم ملتی ہیں۔ میرے حسین خواب! یقیناً تجھے اس سے اتفاق ہوگا۔

یہ باتیں...... یہ جلنا سلگنا...... آج کا نہیں ہے...... اے ریشم و حریر میں سونے والی تجھے کیا معلوم کانٹوں کی چبھن کیا ہوتی ہے۔ پندرہ برس ایک عرصہ ہوتا ہے۔ میں محبت کرتا رہا اور محتاط رہا۔ لیکن عشق اندھا اور غیر محتاط ہوتا ہے۔ عشق بے ادب ہے اور عقل محو تماشا...... (تیری) میں نے تو تجھے کھونے کے بعد حیران ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔

تو ایک باضابطہ نفس ہے۔ تو عشق قلم سے لکھ سکتی ہے۔ دیکھ نہیں سکتی۔ عشق اکتساب نہیں ہوتا...... تیرا سارا علم اکتسابی ہے۔ محبت و مروت کو عشق کہہ کر عشق کو ذلیل نہ کر...... اپنے شعروں میں عشق کو بے دھڑک نہ لکھا کر۔ ادب سے لکھا کر۔ تو سلیقہ مند معاشرت کا ایک حصہ ہے۔ انجان اور محروم ہے۔ تو مجھ تک کبھی پہنچ بھی نہیں سکتی۔ میرا عشق تیری شاعری کی فکر انگیزی سے باہر نکل گیا ہے۔ اب میں تیری شاعری نہیں پڑھتا بلکہ تجھے کتاب بنا کر اپنے...... دل میں رکھتا ہوں...... تیرا پہلا تصور وضو میں نے زیادہ نہیں پی۔ میرے ہوش ابھی ٹھکانے ہیں۔ اتنی سی شراب مجھے نہیں بہکا سکتی......"

"لاحول ولا قوۃ۔" شہلا نے گہری سوچ کے بعد بڑبڑانے کے انداز میں کہا۔ اس نے خط پر نظریں دوڑائی۔ تاریخ غائب تھی۔ اور لفافے پر لگی مہر دیکھی۔ یہ خط اس روز کوئٹہ کے جنرل پوسٹ آفس سے باہر آیا تھا۔ جس دن مانی کی مہندی تھی اس نے تاریخ کا خود ہی اندازہ کر لیا۔

لیکن ایک بات ضرور تھی۔ خط کی بے ساختگی اور شدت نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔ محض رقیق قلبی کی بنا پر کہ اتنا اچھا انسان خواہ مخواہ تباہ ہو رہا ہے۔ ملک نواز۔ کیوں اپنے والدین کی آہ میرے سر لگا رہے ہو۔

"بھئی، کیا مصیبت ہے۔ ایک تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلتا۔ وہ ساحرہ وہاں تمہیں تلاش کر رہی ہے۔ گڈو نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا ہے۔ امی کی حالت ویسے ہی بہت خراب ہو رہی ہے۔"

وہ ایک دم چونک کر بلکہ کچھ گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ یہ عمل اس سے بے ساختہ سرزد ہوا تھا۔ جیسے سخت گیر باپ کے سامنے اچھا بھلا بچہ بھی گڑبڑا کر رہ جاتا ہے۔

پھر اپنی کیفیت پر قابو پاتی ہوئی وارڈ روب کی سمت رخ کرتے ہوئے بولی۔

"گڈو تو ملازمہ کے پاس تھا......"

"جی ہاں' لیکن شاید آپ بھول گئی ہیں' بچوں کو دودھ آپ بنا کر دیتی ہیں۔ ملازمہ کو مفت کی تنخواہ دیتی ہیں۔" حسن نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ ادھر وہ امی جان تمہیں بلا بلا کر تھک گئی ہیں۔"

"توبہ ہے حسن۔ اب بھی نہ کہتے۔ بیس منٹ میں گویا زمین و آسمان ایک ہوگئے ہیں۔"

وہ حسن کی پھٹکار پر وہ بھی بلاوجہ...... تپ سی گئی تھی۔

"اچھا ذرا میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں معاملہ کچھ آگے بڑھا یا نہیں۔ مانی ڈاکٹر خان کے ہاسپٹل گیا ہوا ہے۔ وہ آئے تو پوچھنا کہ وہ ثریا کی تصویر دے آیا یا نہیں......؟"

"لیکن تصویر تو پہلے بھی دی تھی؟" وہ باہر جاتے جاتے رک کر بولی۔

وہ صحیح پرنٹ نہیں ہوئی۔ بہت غیر واضح ہے۔ ہاں وہ گاڑی کی چابی کدھر ہے۔؟"

"آپ کے تکیے کے نیچے رکھی ہے۔"

"شہلا!" وہ حسن کی آواز پر جاتے جاتے پھر رک گئی۔" ابا جان کا دھیان رکھنا۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہے ہیں۔ ان کو ذرا باتوں میں لگا کر رکھا کرو۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

شہلا نے حسن کی سمت بے حد محبت سے دیکھا۔ جو آج کل صحیح معنوں میں اس کا غمگسار بنا ہوا تھا۔ اور بے تعاون کر رہا تھا۔

"خورشید!"

"جی صاحب۔"

"بات سنو...... وہ دیکھو ذرا الکرم اسکوٹر کے لیے ایک ٹیکسی لے آؤ...... ذرا جلدی۔"

وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر صاحب کا خشک سا انداز دیکھ کر فوراً گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں آیا اس وقت اس کا ذہن متضاد سوچوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے وارڈ روب سے اپنے کپڑے نکالے اور تبدیل کرنے چلا گیا۔

جب واپس آیا تو ثریا ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی "برل کریم" منہ پر مل رہی تھی۔ وہ طرح جھلا کر رہ گیا وہ تو پینٹ کی بیلٹ کسنے کا پروگرام بنا کر بڑی عجلت میں باتھ روم سے باہر آیا تھا۔

"بھئی کیا مصیبت ہے؟" اس نے برل کریم کا پیک اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ مصیبت نہیں ہے کریم ہے۔" وہ بدستور چہرہ رگڑ رہی تھی۔ بڑی معصومیت سے بولی۔

"جی...... یہ کریم ہے مگر بالوں میں لگانے والی۔" اس نے ڈھکن کس کر پیک ڈریسنگ ٹیبل پر دے مارا۔

ثریا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اتنی مسحور کن ہنسی تھی پگلی کی کہ اس کی ساری جھلاہٹ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

"کریم بالوں میں نہیں لگاتے منہ "میں" لگاتے ہیں۔" اس نے بڑے انداز سے کہا۔

"منہ میں" سن کر تو ملک نواز اپنی بے ساختہ مسکراہٹ نہ روک سکا۔ پینٹ میں اٹکی بیلٹ ابھی تک بکری کے

کانوں کی طرح دائیں بائیں جھول رہی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" ثریا نے بیلٹ کا ایک جھولتا سرا تھام کر تعجب سے پوچھا۔

"سر ہے میرا۔" اس نے جھٹکے سے بیلٹ کا سرا ثریا کے ہاتھوں سے آزاد کرا لیا۔ اور اپنی بدیسی قیمتی اور "چینی" بیلٹ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر کسنے لگا۔ ثریا اسے آئینے میں نظر آ رہی تھی۔

"چلو تمہیں آپا کے پاس لے کر جا رہے ہیں۔" اس نے بوجھل سی نظر ثریا پر ڈالی۔

"ہیں؟ جہاز آ گیا۔؟" وہ خوشی سے ناچنے لگی۔

اس نے دراز کھول کر کف لنکس نکالے اور کفوں میں اٹکائے پھر ثریا کی سمت مڑا۔

"چلو...... آؤ...... خورشید ٹیکسی لے کر آ رہا ہوگا۔"

وہ تیز تیز آگے چلنے لگی۔

"بات سنو۔ ایسے نہیں۔ وہ تمہارا دوپٹہ کہاں ہیں جو اس سوٹ کے ساتھ ہی تھا؟"

"میں نہیں لگاؤں گی دوپٹہ...... گر جاتا ہے۔ پھر آپا غصہ ہوتی ہیں۔"

اس نے دوپٹے کے ساتھ "لگانے" کی اصطلاح پہلی مرتبہ سنی تھی۔ خاصا محظوظ ہوا۔

"نہیں بری بات۔ تم بڑی لڑکی ہو۔ اور بڑی لڑکیاں دوپٹہ اوڑھتی ہیں۔" ملک نواز کو پاس ہی کرسی پر دوپٹہ پڑا ہوا نظر آ گیا۔

"یہ لو۔" اس نے ثریا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

اس نے دوپٹہ بغیر اچھی طرح کھولے گلے میں گلوبند کی طرح اٹکا لیا۔

"صاحب ٹیکسی آ گئی ہے۔" خورشید کی آواز قریب ہی سے آئی۔

اس نے ثریا کے گلے سے دوپٹہ نکال کر اسے اچھی طرح...... کھولا اور ثریا کے سر پر پھیلا دیا۔ اور اردگرد چادر کی طرح لپیٹ دیا۔ دوپٹہ اڑھاتے ہوئے اس نے ثریا کے وجود میں ایک مقناطیسیت محسوس کی تھی۔ اس نے سوچا۔ اب سمجھ میں آیا۔ پرسوں رات شراب دو آتشہ کیوں تھی۔ اس نے اپنے آلودہ ہاتھ اس کے شانے پر جما کر باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس لمحے وہ اتنی پاک معصوم اور بے نیاز لگی تھی کہ ملک نواز کے خاندانی نجیب قلب پر "نادم آنسو" انگاروں کی طرح گرے تھے۔

"خورشید! گھر سے باہر نہ جانا۔ مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جائیں گے۔" ملک نواز نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھول کر ثریا کو بٹھایا۔

"آپا! دور ہیں کیا......؟" وہ ٹیکسی کے دروازے میں اڑ کر بولی۔

"ہوں۔" اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور خود اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھوں پر سیاہ گلاسز چڑھا لیے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی شخصیت سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔

پیچھے ثریا کی ہڈی کو چین نہیں تھا۔ کبھی داہنی کھڑکی سے باہر جھانکتی کبھی بائیں جانب کی کھڑکی کے شیشے سے ناک لگا کر دیکھنے لگی۔

اس کے چہرے سے ظاہر تھا۔ وہ بہت لطف اندوز ہو رہی ہے۔

پیچھے اس نے اس قدر اچھل کود مائی کہ ملک نواز کو گردن موڑ کر کہنا پڑا۔

''آرام سے بیٹھو۔ ورنہ گاڑی خراب ہو جائے گی۔ پھر آپا کے پاس کیسے جائیں گے؟''

وہ ایک دم، دم سادھ کر بیٹھ گئی مگر کب تک۔ اگلی دونوں سیٹوں کے بیچ سے اپنا چہرہ نکال کر پوچھنے لگی۔

''یہ آدمی کون ہے؟'' اس نے ڈرائیور کی سمت اشارہ کیا۔

''پتا نہیں...... خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔'' وہ عاجز آ گیا۔

خدا خدا کر کے ڈاکٹر باقر کا عظیم الشان کلینک آیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ وہ ٹیکسی پورٹیکو تک لے چلے۔ ٹیکسی اندر تک چلی گئی۔ اس نے پہلے کرایہ ادا کیا پھر ثریا کو اتارا۔

''آؤ۔'' اس نے ثریا کا ہاتھ تھام لیا۔ نرم گلابی اور بھرپور ہاتھ۔

وہ ویٹنگ روم میں چلا آیا۔ اور اپنا کارڈ اندر بھجوایا۔ چند ہی منٹوں میں بلاوا آ گیا۔

''آپا اندر ہیں؟'' ثریا نے آنکھیں پھیلا کر حیرانی سے پوچھا۔

وہ خاموش رہا اور اسے اندر لیے چلا آیا۔

ڈاکٹر باقر اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اور ساتھ ہی ایک بے[illegible] حسین لڑکی کی سمت جانچنے والی نظروں سے دیکھا۔

''یہ ہیں وہ مریضہ۔''

''گویا ناصر صاحب نے آپ کو فون کر دیا تھا۔'' ملک نواز کو اطمینان سا ہوا۔

''ہاں تمہارا کام تو وہ کبھی نہیں بھولتا ملک!'' وہ نرمی سے مسکرائے۔

''بات یہ ہے باقر بھائی کہ یہ لڑکی جانے کیسے یہاں کراچی پہنچ گئی۔ ''اسلام آباد'' اس نے کوئٹہ کا نام مصلحتاً نہیں لیا۔ ایک دن تو اسی شش و پنج میں کٹ گیا کہ اسے کہاں پہنچایا جائے۔ بہت اچھے گھر کی لگتی ہے اس لیے پولیس اسٹیشن کی سمت...... نہیں گیا کہ شاید اس کا کوئی اتا پتا مل جائے ورنہ تھانے پولیس کے چکر میں...... اس کے گلے سے ہار ملا تھا اس پر ایڈریس کندہ تھا۔ میں نے اس کے گھر والوں کو مطلع کر دیا ہے۔ وہ آپ کے پاس پہنچ جائیں گے پھر ان کی مرضی کہ وہ اس کا علاج آپ سے کرائیں نہ کرائیں۔ میں چاہتا ہوں اس کے گھر والے آپ کے جدید مشینوں اور سہولتوں سے آراستہ کلینک کو دیکھ لیں اور علاج کرانے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کی زندگی بن جائے گی۔ بہت دکھ ہوا مجھے اس لڑکی سے مل کر۔'' ملک نواز نے تاسف سے کہا۔

''ملک! میں تمہارے جذبۂ ہمدردی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ تم ایک شریف انسان تو تھے ہی مگر آج ثابت......''

''چھوڑیں باقر بھائی!'' اسے ڈاکٹر باقر کے جملے نیزے کی انی کی طرح چبھے۔

خوبصورت چہرے کافی ''مراعات'' کے ساتھ دنیا میں آتے ہیں۔ ڈاکٹر باقر جیسے پروفیشنل آدمی نے ثریا کے حسن پر کئی بار ایسی نظر ڈالی جس میں اس کے بے پناہ حسن کا اعتراف تھا۔

''ملک! دیکھو؟ ابھی تو محض مریضہ کو ایڈمٹ ہی کیا جائے گا۔ جب اس لڑکی کے لواحقین ملیں گے تب ہی حتمی فیصلہ کیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس سے بیشتر بھی علاج معالجے کی کوشش کی ہوں۔ پھر پرانی رپورٹس دیکھ کر ہی درست علاج تجویز ہو سکے گا۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں تو تین دن بعد ہیوسٹن چلا جاؤں گا مگر آپ بے فکر رہیے۔ اس کے گھر والے جلد ہی آپ سے رابطہ قائم کریں گے۔''

ثریا بڑی خاموشی سے ٹکر ٹکر دونوں کی صورتیں دیکھ رہی تھی۔

ملک نواز نے پینٹ کی پچھلی پاکٹ سے پرس نکالا اور ایک ''گرین شیڈ'' چیک نکال کر ڈاکٹر باقر کے سامنے رکھ دیا۔

''ارے بھئی ...... یہ کیا ہے...... بھئی تم اس کے ذمہ دار نہیں ہو۔ تم نے اس کو یہاں پہنچا دیا۔ تمہاری ذمہ داری ختم...... اب اس کے گھر والے جانیں اور ہم......'' ڈاکٹر باقر نے چیک کھسکا کر ملک نواز کی سمت کیا۔

''ویسے ملک یہ بات میرا ذہن بہت دیر سے سوچ رہا ہے کہ اس کے والدین اسلام آباد میں۔ تم یہی تو کہہ رہے تھے ناں کہ اس کے گلے میں جو ہار تھا اس پر اسلام آباد کا ایڈریس تھا۔''

ملک نواز کے پورے وجود میں نئے سرے سے اذیت کی لہر اٹھی۔

''جی... ممکن ہے وہ لوگ اسے کراچی علاج ہی کی غرض سے لائے ہوں۔'' اس نے مدھم آواز میں غالب گمان ظاہر کیا۔

ڈاکٹر باقر نے گھنٹی بجا کر نرس کو بلایا۔

''دیکھو تھریسا! اپنی مدد کے لیے ایک اور نرس کو بلا لو اور مریضہ کو روم نمبر سات دوسری منزل پر لے جاؤ۔''

انہوں نے ثریا کی سمت اشارہ کیا جو شیشے کے پیپر ویٹ میں نظر آنے والے سرخ اور سبز پتوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

دونوں نرسیں جب اس کی سمت آئیں۔ تو اس نے ڈر کر ملک نواز کا بازو پکڑ لیا۔

آپا کہاں ہیں......؟''

''یہ تمہیں آپا سے ملوانے آئی ہیں ناں...... یہ تمہیں اچھے سے کمرے میں لے کر جا رہی ہیں۔ وہیں آپا آ کر تمہیں مل جائیں گی۔''

''کم آن...... گولڈن گرل۔'' چمکتے ہوئے سیاہ چہرے والی تھریسا نے اسے پیار سے اٹھایا۔

نسبتاً کم عمر اور مسلمان نرس نے اسے دوسری جانب سے آ کر تھام لیا۔

وہ چلتے چلتے پھر پلٹ پڑی۔

''وہاں آپا آئیں گی ناں......؟''

''ہوں۔'' اس نے اس کی سمت دیکھے بنا ہنکارا بھر کر جواب دیا۔ وہ خود بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو ملک!''

''نہیں باقر بھائی! بہت دیر ہو گئی ہے...... ذرا ایمبیسی بھی جانا ہے۔ پھر گاؤں جا کر گھر والوں سے مل کر آنا ہے...... اور یہ پلیز......'' اس نے چیک پیپر ویٹ کے دبا دیا۔ اور ڈاکٹر باقر سے بڑی عجلت و غائب دماغی سے ہاتھ ملا کر کلینک سے یا اس چھوٹے سے ہاسپٹل سے باہر آیا تھا۔ ذہن کے پہلے مقابلے میں آزاد سا محسوس ہو رہا تھا۔ ''میرے جذبوں کی صداقت دیکھو شہلا حسن...... اور بدقسمتی کا عروج بھی۔ میرے گلے میں پھندا کسنے تمہارے ہی گھر کا ایک فرد آ کر ٹکرایا۔''

وہ اپنی کم نصیبی پر خود ہی ہنسا۔

گھر پہنچ کر معاً اسے اپنی ایک بہت بڑی غلطی یاد آئی۔ وہ فوراً فون کی سمت لپکا۔

ہیلو...... ہیلو...... جی ملک نواز بول رہا ہوں...... اوہ شکر ہے آپ مل گئے باقر بھائی!...... پلیز ایک درخواست

ہے۔وہ یہ کہ اس ذہنی مریضہ کے گھر والوں کو میرا اپتا اور ایڈریس نہ بتایا جائے۔"

"نہیں خیر...... نیکی تو...... نہیں سمجھتا میں...... فرض تھا میرا انسان ہونے کے ناتے...... پلیز...... جی...... بے حد شکریہ۔

خورشید......!"

"جی صاحب!" وہ جیسے آواز کا منتظر ہی تھا۔

"ذرا اچھی سی کافی بنا لاؤ۔" وہ اخبار لے کر ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

یہ وہی اخبار تھا جو وہ "اسٹائل ہاؤس" کے کاونٹر پر کھڑے ایک حیران پریشان سے صاحب سے لایا تھا۔ یہ کوئٹہ سے نکلنے والا "جنگ" تھا اس کے رنگین ادبی صفحے پر شہلا حسن کی بے حد خوبصورت تصویر تھی اور "انتخاب کلام" کے عنوان سے اس کی غزل و نظم کے کئی قطعات واشعار لگے ہوئے تھے۔

اس کا درد احساس محرومی پھر شدید ہونے لگا۔اس نے صفحہ دوسری طرف ڈال دیا اور خبروں والا صفحہ اٹھالیا۔ صفحات الٹتے پلٹتے اس کی نظروں کے سامنے اشتہار آ گیا جس میں ثریا کی تصویر چسپاں تھی۔ نیچے وہی ایڈریس تھا جو ثریا کے گلے میں پڑے ہار میں کندہ تھا جس پر اس کے سینکڑوں خطوط روانہ ہوئے تھے۔

"یہ کراچی کس طرح پہنچ گئی......؟ کون لایا اسے کراچی......؟ کوئٹہ کی برفیلی ہواؤں کو کراچی آنا بہت آسان ہے۔مگر ایک دیوانی لڑکی "ہوا" نہیں ہوتی۔کیا عذاب ہے۔" اس نے سر جھکا...... اور اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

خورشید کافی بنا کر لے آیا۔اور سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔

"جورشید! صبح مجھے جلدی اٹھا دینا۔میرا خیال ہے میں رات کو ہی واپس آ جاؤں گا گاؤں سے۔تین دن رہ گئے ہیں میری روانگی میں۔"

"ملکانی تو آپ کو رات کو نہیں آنے دیں گی۔دیکھ لیجیے گا۔"

"مگر میں آ جاؤں گا گاؤں سے۔" اس نے تلخی سے کہا۔کیسے ہوشیار لوگ ہوتے ہیں خورشید! دور رہتے ہیں اور روح میں نیچے گاڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

"کھانا نہیں کھائیں گے صاحب......!"

"ابھی تو سات ہی بجے ہیں۔" اس کا لہجہ بے حد شکستہ سا ہو رہا تھا۔" دروازے بند رکھا کرو خورشید! چاہے دن ہو یا رات۔بعض اوقات ہولناک بدنصیبی آسمان سے نہیں...... کھلے دروازوں سے آ جاتی ہے۔"

خورشید بغیر کچھ بولے چلا گیا پھر اسے کافی دیر تک گرل اور دروازے بند ہونے کی کھڑ پڑ سنائی دیتی رہی۔

ثریا کا ہار ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا نظر آیا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر اٹھالیا اور کندہ ایڈریس پر نظر جمادی۔

"ورالسلام...... درالسلام...... یہ تمہارے گھر کا نام ہے شہلا حسن؟ تمہارے "دل کا نام......؟ اس نے رشک سے سوچا۔

وہ دوپہر تک گاؤں پہنچ چکا تھا۔

اسے دیکھتے ہی گویا ہلچل سی مچ گئی۔

بھائی رب نواز اسے گلے سے لگالیا۔

"خط بڑی جلدی مل گیا۔کل ہی تو ڈالا تھا۔"

"خط۔!" ملک نواز نے حیرانی سے رب نواز کو دیکھا۔" مجھے تو کوئی خط نہیں ملا۔خیریت تو ہے ناں؟"

"اماں کی حالت بہت خراب ہے۔" رب نواز نے آہستگی سے بتایا۔

"تو گویا تم خود ہی چلے آئے۔بہت یاد کر رہی ہیں اماں جی۔" وہ اسے لے کر ماں کے کمرے میں چلا آیا۔

اماں جی دیکھو کون آیا ہے۔؟" وہ ملکانی پر جھک گیا۔

"السلام علیکم...... اماں جی!"

ملکانی نے اس کے سر پر اپنا لرزتا ہاتھ پھیر دیا۔

"ہن ای آیا پتر۔؟" ملکانی کی آواز کانپ رہی تھی...... (ابھی آیا ہے بیٹے)

"جی اماں جی...... ابھی آیا ہوں......" وہ پٹی سے ٹک کر بیٹھ گیا۔

"کیا۔پتھر "جیوڑا" ہے تیرا...... پتر...... ماں پے فیر نئیں ملدے۔" (کیسا پتھر دل ہے تیرا بیٹا...... ماں باپ پھر نہیں ملتے) ملکانی کے آنسو دائیں بائیں تکیے پر ٹپک گئے۔

ایک حقیقی رشتے کے سامنے دیکھ کر ملک نواز کا دل بھی بھر آیا تھا۔اس نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"پتا ہے میں نوں۔تو فیر جان واسطے آیا ہے۔" (مجھے معلوم ہے تو پھر جانے کے لیے آیا ہے)

"ملک نواز کا سر جھک گیا۔

"اماں جی! کیا کروں...... میرا دل نہیں لگتا۔"

"کیا ہو گیا ہے اس دل نوں...... ماں دے کولوں وی نئیں لگدا اے۔" (کیا ہو گیا ہے اس دل کو ماں کے پاس بھی نہیں لگتا ہے۔)

"سوہنے پتر...... میرے سر دا سائیں وی مینوں چھڈ چلا...... پتر......! امڑی کول رہ جا۔" ملکانی ملک شہباز کے بعد کیسی بھربھری مٹی ہو گئی تھی۔

"اماں جی! میں آپ کے پاس ہی ہوں۔" اس نے ماں کے اشک اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کیے۔

ملکانی نے اپنے لاڈلے کے ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کرلیں۔گویا انہیں قرار آ گیا ہو۔

وہ واقعی ماں کی حالت کے پیش نظر رات کو واپس نہ ہو سکا تھا۔ بلکہ اگلے دن بھی نہ پروگرام بن سکا...... ملکانی کی حالت بہت خراب تھی۔

اس نے ملک رب نواز کو بتایا کہ اسے کل امریکہ روانہ ہونا ہے۔

ماں کو اس حال میں چھوڑ کر تو امریکہ چلا جاتے گا؟" رب نواز نے اس کی بے حسی پر تاسف کیا۔

"لیکن سیٹ کل کی بک ہے میری" (بھائی تم نہیں جانتے کتنی مصیبتیں خون آشام بلاؤں کی طرح میری رگ جان سے چمٹی ہوئی ہیں...... ابھی تک "درالسلام گمنام خط بھی سپرد ڈاک نہیں کیا۔ڈاکٹر باقر کتنی پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔) میں مجبور ہوں بھائی...... ورنہ اتنا سخت دل نہیں ہوں کہ......"

"نواز! تیری وجہ ہی سے ماں ان حالوں کو پہنچ گئی ہے...... ابا جی تیری راہ دیکھتے دیکھتے رو پڑے تھے۔ ماں باپ کا دکھا دل...... بدعا ہوتا ہے نواز! تیرے جی کو ملال نہیں کہ تو باپ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔باپ کی قبر پر مٹی نہ ڈال سکا۔

"بہت سے ملال ہیں بھائی میرے جی پر...... اس کائنات میں سب سے زیادہ فالتو اور فارغ میری ہی جان تو ہے۔سارے ملال...... سارے عذاب اسی جان پر تو ہیں۔" وہ تلخی سے کہہ کر ڈیوڑھی پار کر گیا۔

رب نواز کو اپنا یہ ہنر منداور لائق بھائی بے حد مظلوم سا نظر آیا۔ اس کے سارے دکھ۔ خونی رشتے کے تقرب کی وجہ سے شاید آپ ہی اس کے دل میں منتقل ہو گئے تھے۔

''نواز...... تیری سمجھ نہیں آئی۔''

وہ ماں کے کمرے میں چلا آیا۔ رب نواز کی بیوی ساس کو کینو کا رس چمچ سے پلا رہی تھی اور ساتھ ساتھ تسلی آمیز کلمات بھی ادا کر رہی تھی۔

''دھئے......! میں دل معاف کریں......'' ملکانی نے بہو کے ہاتھ تھام لیے۔

''ہائے...... ہائے اماں جی! تسی کی کیتا اے...... اللہ کرے تسی چھیتی چنگے ہو۔'' بہاول پور کی سرائیکی آمیز پنجابی میں بات کرتے ہوئے رب نواز کو اپنی بیوی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنی بیوی کی خدمات کا بے حد معترف تھا۔ دوسری طرف پنو کو دیکھ کر اسے بھائی بہت یاد آیا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکی اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ ملکانی سے ملنے آتی تھی۔ حالانکہ اس کے والدین اس گھرانے کی صورتوں سے نفرت کرتے تھے۔ ملک نواز کی موجودگی میں ہی وہ اپنے گود کے بچے کو لے کر ملکانی کو دیکھنے آئی تھی...... اپنے سابقہ شوہر کو دیکھ کر ایک لمحے کو جھجکی پھر بڑی بردباری سے ملکانی کے پاس چلی آئی اور سلام کیا۔

''کیا حال ہے اماں جی......؟ بہت سی محرومیاں پنو کی آواز میں برق کی طرح لرز رہی تھیں اور ملک نواز کے قلب پر عفریت بن کر جھپٹ پڑی تھیں۔

پنو نے اپنے بیٹا گود سے اتار دیا اور ملکانی سے باتیں کرنے لگی۔ ملک نواز کھڑا ہو گیا۔ پنو کا دیہاتی سا بچہ اسے پکڑ بیٹھا۔ گول مول گلابی سا بچہ۔

''شیرے!'' اس نے بچے کو بلایا۔ پھر خود ہی اٹھ کر بچے کے ہاتھ سے ملک نواز کے کپڑے آزاد کرائے۔

''بچہ ہے صاحب جی۔ معاف کریں۔'' پنو نے پھنکارتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ اور بچے کو گود میں بھر لیا۔ صاحب کے کپڑے گندے کر دیے پتر! او دی عبادت قبول نہیں ہووے گی۔'' پنو نے برسوں کا غبار منہ در منہ نکال دیا تھا۔

وہ ایک عورت کی اولیں محبت تھا۔ اولین محبت...... یادداشت کے خانے میں ہمیشہ چمکتی ہے۔

(اماں...... تم کہتی تھیں پنو خوش ہے؟)

''تیرا آدمی ٹھیک ہے پنو......؟''

''ہاں...... اماں جی...... ٹھیک ہی ہونا اے اس نے۔ زمیناں ہیں...... باغ بگیچے ہیں...... بیٹے ہیں...... ہور کی چاہی دا۔'' (اور کیا چاہیے۔)

''اللہ تجھے سکھی رکھے پنو!''

ملک نواز نے نکلتے نکلتے یہ جملے سن لیے تھے۔

''اماں جی! رب نواز بھائی! مجھے بددعاؤں کے آسیبوں کے درمیان مت روکو مجھے جانے دو۔''

سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔ مجھ پر جو گزرتی ہے...... کوئی کوشش بھی کرتا ہے جاننے کی؟ میں محض فرائض کے لیے ہوں...... حق کوئی نہیں میرا...... تم سب کے پاس کتنے بہلاوے ہیں زندگی گزارنے کے۔ پھر بھی تم لوگ ناخوش ہو۔ اور ایک میں کوئی جھوٹا بہلاوا بھی نہیں...... اور جی رہا ہوں...... وہ آہستہ آہستہ زینے چڑھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔

ثریا کی گمشدگی ''دارالسلام'' کا عظیم سانحہ تھی۔ در و دیوار ویران نظر آتے تھے۔ بچے علیحدہ سہمے سہمے۔ چچی جان پندرہ دن سے ہاسپٹل میں تھیں۔ وہاں ان کے پاس ساحرہ تھی۔ شہلا کا تو بچہ ہی اتنا چھوٹا تھا کہ وہ ان کے ساتھ رات مشکل سے گزار پاتی۔ البتہ روز انہیں دیکھنے ضرور چلی جاتی۔ ان کے لیے یخنی تیار کرتی۔ پھلوں کا جوس نکالتی۔ جوان کے لیے کر سکتی تھی کر رہی تھی۔ عالیہ کو اطلاع دیر سے بھجوائی تھی۔ اس لیے وہ کل ہی اپنی ساس کے ہمراہ پہنچی تھی۔ اس پر سے ہمدردی کے لیے آنے جانے والوں کا سلسلہ...... چچی جان کے لیے ڈاکٹروں کا مشورہ تھا۔ ان سے ہمدردی کرنے والوں کو دور ہی رکھا جائے۔ ہمدردی کرنے والے اس طرح ہمدردی کرتے گویا خدانخواستہ کسی کی مرگ پر آئے ہوں۔

دنیاداری بھی نبھانا پڑتی ہے...... ہر شخص اپنی سوچ کے مطابق ڈھال لیا جاتا تو دنیا میں کس قدر امن ہوتا۔

ساحرہ حالانکہ دل و جان سے ساس کی خدمت کر رہی تھی۔ مگر چچی جان کو شہلا کے بغیر قرار نہ تھا۔

بعض اوقات وہ بے حد مضمحل ہو جاتی اور تھک کر اپنے بیٹے کو برابر میں لٹا کر تھپکتی ہوئی بے تکان سوچتی چلی جاتی۔ اپنے گھر میں اس قدر پریشانیاں اتری ہوئی تھیں کہ اس نے ملک نواز کے خط کے بارے میں دوبارہ سوچا تک نہیں تھا۔ افسوس البتہ اسے بہت ہوا تھا۔ وہ اسے ایک بے ضرر، سادہ سا انسان سمجھتی تھی اور وہ لوگ بھی کتنے بھیس بدل کر ملتے ہیں۔ کتنی عجب ہے یہ دنیا...... اس نے تھک کر سوچا۔

ہما، حنا مانی کے ساتھ دادی سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ وہ گڈو کو پہلو میں لیے لیٹی تھی۔

''چچی جان کو تو بس ہاتھ پیر بہلانا ہی آتے ہیں۔ انسان تھوڑا سا تو حوصلہ رکھے۔ اب تو برداشت تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ جانے کیسے کیسے وقت دیکھتا ہے انسان...... اب یہ روز ہاسپٹل کی ڈیوٹی بھی لگ گئی...... ''صاحب'' کے غمزے ہی ہیں۔ آخر میں بھی تو انسان ہی ہوں...... ان لوگوں کو میرا ذرا خیال نہیں آتا۔ بس ایک دن چھوڑ کر جایا کروں گی۔ میں کون سا ان کے حلق میں آب حیات ٹپکاتی ہوں جا کر......'' اس نے اپنے پھوڑے کی طرح دکھتے بدن کا زاویہ بدلا...... ''انسان کو دعا کرنا چاہیے نہ کہ ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جانا چاہیے۔''

اسی وقت حنا پردہ اٹھا کر کمرے میں آئی۔

بیٹی کو دیکھ کر شہلا کی آنکھوں میں چاہت امڈ کر آئی۔

''آ گئے بیٹا آپ لوگ؟ مانی چچا بھی آ گئے۔ ہما کہاں ہے؟''

''جی امی!'' حنا اچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ شہلا نے ہاتھ بڑھا کر بیٹی کو بازو میں بھر لیا۔

''کیسی ہیں دادی جان؟ ساحرہ چچی کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''ساحرہ چچی کہہ رہی تھیں۔ امی کیوں نہیں آئیں؟ امی دادی جان کیوں روتی ہیں؟'' حنا نے معصومیت سے ماں کی طرف دیکھا۔

''آپ کی ثریا پھوپھو گم ہو گئی ہیں۔'' اس نے حنا کی پیشانی چوم کر کہا۔

''ثریا پھوپھو گم ہو گئی ہیں...... مگر دادی جان کیوں روتی ہیں......؟'' حنا شاید ماں کی بات سمجھ نہ سکی۔

''بیٹے...... ثریا پھوپھو دادی جان کی بیٹی جو ہیں۔'' اس نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

''جیسے میں آپ کی بیٹی ہوں......؟'' اس نے ماں کا چہرہ چھو کر پوچھا۔

''ہاں، میری جان۔ جیسے تم میری بیٹی ہو۔''

''امی! اگر میں گم ہو جاؤں تو آپ بھی دادی جان کی طرح روئیں گی......؟'' حنا نے شہلا کے سینے پر سر رکھ کر

بھولپن سے پوچھا۔

شہلا کے دل کو دھکا سا لگا...... "خدانہ کرے...... خدانہ کرے......" اس نے حنا کو زور سے لپٹا لیا۔ "ایسی باتیں نہیں...... کرتے بیٹے...... امی کا دل بیٹھ جائے گا...... جان۔" (شہلا؟ محض سن کر ہی یہ حالت؟ اور جس پر گزر رہی ہے؟) وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ضمیر نے تاک کر نشانہ لگایا تھا۔

"بہت رو رہی تھیں دادی جان...... حنا؟" اس نے کانپتی آواز میں گویا یقین چاہا۔

"بہت......" حنا نے گڈو کا رخسا چوم کر بے نیازی سے جواب دیا۔

وہ بستر سے اتر آئی اور ہاسپٹل جانے کے خیال سے چکن کارن سوپ بنانے لگی۔ صرف گڈو کو گود میں اٹھا کر وہ ہاسپٹل چلی آئی تھی۔ ایک ہاتھ میں چیزوں کی باسکٹ تھی۔ ہاسپٹل زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

حسن تو روز ہی آفس سے واپسی پر ہاسپٹل ہوتے ہوئے آتے تھے۔ اس نے سوچا۔ وہ ان کے ساتھ واپس آ جائے گی۔

ساحرہ اسے دیکھتے ہی آگے بڑھی اور اس کی گود سے گڈو کو لے لیا۔ وہ چچی جان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"یہ کیا حالت بنالی ہے چچی جان آپ نے......؟" اس نے ان کا بوڑھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"دلہن!" وہ رقت کی وجہ بول نہ سکیں۔ بس دل کی سمت اشارہ کر کے رہ گئیں۔

ان کی حالت پر شہلا کا دل بھر آیا۔

"آپ خدا کی ذات سے ناامید کیوں ہوتی ہیں۔ آپ اتنا تڑپ رہی ہیں تو کیا اللہ آپ سے بے نیاز ہوگا۔ انشاءاللہ وہ جلد ہی مل جائے گی...... چچا جان کو دیکھیے...... کتنے حوصلے سے کام لے رہے ہیں۔"

"عالیہ کہاں ہے دلہن......"

"صبح ہی تو ہو کر گئی ہے وہ آپ کے پاس سے۔ اس کے بچے کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ خالہ جان کہہ رہی تھیں ساحرہ کو آج گھر بلا لو۔ وہ کہہ رہی تھیں وہ رہ لیں گی۔ آپ کے پاس......" شہلا نے اسٹول پر بیٹھی خاموش اور تھکی تھکی ساحرہ کو دیکھا۔

"حسن بھی آتے ہوں گے...... میں اور ساحرہ چلے جائیں گے خالہ جان آ جائیں گی آپ کے پاس...... کچھ بہن کی وجہ سے بھی آپ کو ڈھارس رہے گی۔ ہے ناں......؟ ہماری بات اور ہے اور خالہ جان کی اور...... وہ آپ کی حقیقی بہن ہیں......"

"وہ تو بہن ہیں تم تو بیٹیاں ہو...... بیٹی......! بہن سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔" انہوں نے شہلا کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔

شہلا اپنی ان سوچوں پر شرمندہ ہو گئی جو عالم بیزاری میں اس کے ذہن سے چمٹ جاتی تھیں۔

"اور بچی...... ارے اس کا تو دلہنا پا ہے۔" انہوں نے ساحرہ کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دو دن...... بچی نے سر میں کنگھا نہیں لگایا۔ میں تم سب کی گنہگار ہوں......" وہ گلوگیر لہجے میں بولیں۔ "دلہن...... بہت سمجھاتی ہوں دل کو...... خدا گواہ ہے...... بہت بہلاتی ہوں دل کو...... لیکن جب اس کی شکل نظروں کے سامنے آتی ہے تو کلیجہ خون ہونے لگتا ہے کہ ...معلوم میری بچی کہاں کہاں ٹھوکریں کھا رہی ہوگی۔ ارے نہ معلوم اس نے کچھ کھایا بھی ہوگا یا نہیں۔ ارے کہیں بچے ...لی کو پتھر مار بیٹھے ہوں۔ ارے میری بچی کو چوٹ نہ لگ گئی ہو۔ ارے میری ثریا...... آپا کرتی تھی...... ارے کہاں چلی گئی۔

آپا کے پاس سے" وہ منہ پر دوپٹہ رکھ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"ارے تمہارے چاچا کی کاہلی ہے کب سے کہہ رہی تھی کہ لے چلو کراچی۔ ان کا ڈاکٹر ہی آگے نہیں دیتا تھا۔ بچپن میں لاکھ روپیہ لگایا تھا دلہن جواب اتنے ہوش میں بھی تھی۔ ورنہ "مستوں" سے بھی بدتر تھی آنکھیں ڈھمی رہتی تھیں...... رال ٹپکتی رہتی تھی اور ریڑھ کی ہڈی تو گویا تھی ہی نہیں۔ بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔

حسن کب سے کہہ رہا تھا کہ باہر لے جائیں مگر ڈاکٹر نے کہا اس کی ضرورت نہیں خود جا کر باہر بیٹھ گیا۔ تمہارے چچا کو جو ٹکرا انہیں جیسا۔ ہائے میری قسمت یہ دن بھی دیکھنے تھے۔" وہ روتی جاتی تھیں بولتی جاتی تھیں۔

دونوں بے بسی سے دیکھ رہی تھیں۔ خدارا کس طور اس ماں کے دکھ کا مداوا کریں۔

☆☆☆

وہ ریٹرن ٹکٹ پر لاہور آیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تین گھنٹوں کے بعد واپس آ جائے گا اور پروگرام کے مطابق امریکہ روانہ ہو جائے گا۔ مگر ملکانی کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اس کا دل کہتا تھا۔ واقعتاً اس نے ماں باپ کی محبت کو آزمائش میں ڈال کر بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ ملکانی کو ایک روگ تھوڑا ہی تھا۔ دل کے عارضے میں وہ مبتلا تھیں۔ آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ بلڈ پریشر اتنا بڑھا ہوا تھا کہ پورے جسم پر ورم ہی ورم نظر آتا تھا۔ سب سے بڑا دکھ یہ کہ بیٹے کی صورت برسوں اوجھل رہتی تھی۔

وہ نزدیکی شہر کے ہاسپٹل میں داخل ہو گئی تھیں۔ ملک نواز کی چھوٹی بہن رضیہ بھی سسرال سے آئی ہوئی تھی۔ بعض اوقات تو ملکانی کی حالت اتنی بگڑ جاتی کہ رضیہ اور رب نواز کی بیوی قرآنی آیتیں پڑھنے لگتیں۔

رب نواز نے منشی کے ذریعے ہی سیٹ کینسل کروادی تھی۔ تب اسے مجبوراً ناصر صاحب کو ٹیلی گرام دینا پڑا کہ وہ اس کی امریکہ کی بکنگ آگے بڑھوا دیں۔ اب اس نے وہ خط خود دارلسلام لکھا تھا تحریر بدل کر...... جان بوجھ کر پوسٹ بکس میں نہیں ڈالا تھا۔ کیونکہ اس کا پروگرام یہ تھا کہ یہ خط ان لوگوں کو اس وقت ملے جب وہ یہ سرزمیں چھوڑ چکا ہو۔

ثریا کی طرف سے اطمینان تھا کہ ڈاکٹر باقر اسے باہر نہیں نکال پھینکیں گے جب کہ ناصر صاحب انہیں بتا چکے ہوں گے کہ میں ابھی پاکستان ہی میں ہوں۔ وہ انسان ضرور تھا "ماں" نہیں تھا اس لیے ان احساسات تک پہنچنے سے قاصر تھا کہ اولاد کی گمشدگی ایک ماں کے لیے کتنی بڑی قیامت ہوتی ہے۔

گاؤں تو ویسے ہی اس کو ہمیشہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا تھا۔ اس کی زندگی گاؤں میں بے حد اذیت ناک ہو گئی تھی۔ اوپر سے "ناغہ" ہو رہا تھا۔ دن تو اس کا ہمیشہ ہی کٹ جاتا تھا مگر رات کو وہ برداشت کی حدوں سے گزر جاتا تھا۔ ہر تعلق ہر رشتہ اسے بوجھ محسوس ہونے لگتا۔

اسے احساس تھا اگر اس نے بیزاری ظاہر کی تو ماں کی حالت اور بگڑ جائے گی اور اس کی "قید" کی میعاد اور بڑھ جائے گی۔

ناچار وقت کاٹ ہی رہا تھا۔ رات کو وہ مارے وحشت کے کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ تیز اچھالیں مارتی ندیا کی منڈیر پر ٹک کر پاؤں پانی میں ڈالے بیٹھا رہتا۔ زندگی نے اسے ایک نیا سبق اور پڑھایا کہ تعلق اذیت ناک بھی ہوتے ہیں۔ اور اب پورے ایک ماہ پانچ دن بعد جب ملکانی کی صحت یابی کی طرف سے یقین ہو گیا تو وہ بھی بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

ماں کے پاؤں چھو لیے۔ کہ خدارا اب مجھے جانے دیں میں جلد ہی آؤں گا۔ اس کے چہرے پر جانے کیسی بے چارگی تھی کہ ماں ہمیشہ کی طرح مجبور ہو گئی۔

''پتر...... گھر وسا لے۔ گھر وچ عورت ہوندی اے تے جنڈڑی ایڈی وکھری نئیں لگدی اے...... مرضی ای کی کر لے پتر! نکے۔ نکے ''جیو'' گھر وچ کھیڈ دے نیں...... تے......''

''چھوڑیں اماں جی......! نہیں کرنی میں نے شادی وادی......'' اس کے لہجے میں مخصوص سرکشی اور جھلاہٹ عود کر آئی۔

''پتر...... مرضی ہی کی کر لے۔'' ملکانی نے دوبارہ کہا۔ وہ سمجھیں اس نے پہلے سنا نہیں۔

''کرنی ہوتی تو کر بھی لیتا۔ جب کہہ دیا میں نے نہیں کرنی شادی۔''

ملکانی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ تو سمجھ رہی تھیں کہ اس نے مرضی کی شادی کرنے کی خاطر ہی بیوی کو طلاق دی تھی۔ ان کا اندازہ درست نہیں نکلا تھا۔ وہ تعجب سے کچھ سوچتی رہ گئیں اور وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔

گاؤں آ کر ہمیشہ ہی اس کا موڈ خراب ہوا تھا۔

ائیر پورٹ کی سمت جاتے ہوئے اس نے بے حد سکون محسوس کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا نئی زندگی ملی ہو۔ وہ طبعاً شخصی آزادی اور مکمل آزادی پسند تھا۔ یہ تمام خونی رشتے تلوار کی طرح اسے اپنی شہ رگ پر رکھے محسوس ہوتے تھے ایک مخصوص دائرے میں چکر لگاتے ہوئے۔

ذہن اپنے ڈھیروں پروگرامز فیل ہونے پر بری طرح الجھا ہوا تھا۔ اس بے خیالی میں اس نے جہاز میں سگریٹ سلگائی تھی۔ برابر والے صاحب کو کافی پیش کرتے ہوئی حساس ائیر ہوسٹس نے بڑی دلنشیں ادا کے ساتھ انگلیوں سے سگریٹ چھڑایا۔

وہ بے ساختہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا کہ یہ اس نے کیا حرکت کی۔ اس نے ایک پرچ میں سگریٹ مسل دیا۔ اور اشارے سے منع کیا کہ سگریٹ نہیں سلگانی۔

وہ خفیف سا ہو گیا۔

''آپ جہاز میں پہلی مرتبہ نہیں بیٹھے...... اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ آپ نظر آئے ہیں۔

اس نے بخشا نہیں تھا۔ حالانکہ وہ محسوس کر چکی تھی۔ یہ شاندار سا مرد جب سے اس سیٹ پر آیا ہے تب سے غائب دماغی کے کھلے مظاہرے کر رہا ہے۔ یہ بھی سمجھ گئی تھی وہ اس وقت شدید پریشانی کا شکار ہے۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کو ایک میگزین لے کر بیٹھ گیا تھا۔

صبح چار بجے وہ خورشید کے کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

خورشید حواس باختہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ ملک نواز کو منہ اندھیرے دیکھ کر وہ ہونق سا ہو گیا۔

''صاحب...... آپ......؟''

''چابی دو یار...... اور گیٹ کھولو...... تھکن سے برا حال ہے۔ مہینے بھر سے سویا نہیں ڈھنگ سے۔'' اس نے بیزار کن انداز میں کہا۔

خورشید کی گویا گل دب گئی فٹافٹ گیٹ کھول دروازے کھول کر کھڑ کھڑ کرتا روبوٹ ہی بن گیا۔

ملک نواز نے بمشکل لباس تبدیل کیا۔ پھر مکروہ سیال شئے کافی مقدار میں اپنے معدے میں انڈیل کر وہ غافل ہو گیا تھا۔ اتنا سکون اتنی خوشی اتنی راحت اسے نصیب ہوئی کہ کمرے پر جنت کا گمان ہوا تھا۔

جب وہ خورشید نے اسے جگایا تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔

اس نے اٹھ کر غسل کیا اور باہر آ گیا۔

''صاحب! کسی ڈاکٹر باقر کا فون کئی مرتبہ آ چکا ہے۔ پوچھ رہے تھے۔ آپ کب تک واپس آئیں گے۔ ...ا نے یہ بھی کہا تھا جیسے ہی آپ آئیں انہیں بتاؤں کہ آپ فوراً ان سے ملیں۔

اس نے سر جھکا کر خاموشی سے خورشید کی بات سنی۔

''خورشید! میری بائیک صاف کر دو۔ میں ڈاکٹر باقر کے پاس جا رہا ہوں۔'' اس نے صرف ایک کپ چائے ...اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جب ڈاکٹر باقر کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ چونک کر کھڑے ہو گئے۔

''حد ہو گئی ملک...... تمہارا تو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کہاں ہو۔'' انہوں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔

ملک نواز نے ان سے ہاتھ ملایا اور ساتھ ساتھ ان کے چہرے کے تاثرات کا بھی جائزہ لیا۔

''ملک!...... اس لڑکی کی خبر لینے تو ابھی تک کوئی نہیں آیا۔'' انہوں نے کرسی کی پشت سے خود کو ٹکا کر ملک نواز ...غور دیکھا۔

''اچھا......؟'' (آتا بھی کیسے......؟)

''میں نے اس کے ابتدائی ٹیسٹ تو لے لیے تھے۔''

''پھر......؟''

''ناقابل علاج نہیں ہے۔'' انہوں نے خوش خبری سنائی۔

''مگر ملک ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔''

ملک نواز ان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا۔

''یہ لڑکی......'' وہ رک گئے...... پھر ہویا ہوئے'' بہت زیادتی ہوئی ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ...... یہ ماں بننے ...ا ہے۔''

ملک نواز کو کرنٹ سا لگ گیا۔

''باقر بھائی......!'' وہ گھبرا گیا۔

''یہ سچ ہے ملک...... ملک...... یہ کیسے ہوا......؟'' ڈاکٹر باقر کا سر جھکا ہوا تھا۔

''جی......؟ م...... مجھے کیا معلوم......؟''

''ملک......! تم نے اسے رات کیوں ٹھہرا لیا تھا۔ اسی وقت کلینک کیوں نہیں لے آئے تھے؟''

''جی میں...... اسی وقت کیسے لا سکتا تھا۔ رات ہو گئی تھی۔'' وہ ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

''وہ ہوشمند نہیں ہے۔ مگر اس کے ساتھ زیادتی کرنے والا یقیناً ہوشمند ہو گا...... ملک!'' ملک نواز ....موش رہا۔

''ہم اس مصیبت سے اس کا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ ہوش میں نہیں ہے...... آنے والا...... بے حد بدنصیب ...ہو...... ملک! تمہارے دل میں رحم نہیں آیا۔

ملک نواز نے سٹپٹا کر ڈاکٹر باقر کا چہرہ دیکھا۔

''ہم...... میں کیا کر سکتا ہوں؟ آپ ہی بتائیے......؟''

"ہاں...... تم اسے اپنے گھر میں ٹھہرا سکتے ہو...... اس کے لیے ہزاروں روپے خرچ کر سکتے ہو۔ اس سے زیادہ کیا کر سکتے ہو بچے کو یقیناً یتیم خانے میں ڈالنا پڑے گا۔ کتنے بے رحم ہوتے ہیں وہ باپ ملک! جن کے ہوتے ہوئے بھی ان کے بچے یتیم کہلاتے ہیں...... کتنے ظالم ہوتے ہیں وہ لوگ جو دیوانوں کو بھی نہیں بخشتے۔ تم تو کہہ رہے تھے کہ تم ان کے گھر والوں کو مطلع کر چکے ہو......

ملک......! کیا سوچ رہے ہو؟ بعض دل کے بوجھ جان لے لیتے ہیں۔"

ملک نواز نے بوکھلا کر ڈاکٹر باقر کی سمت دیکھا وہ بڑے غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"یار ملک برا نہ مانو ایک بات پوچھوں۔؟"

"جی......"

"تم نے ایک بڑی رقم کا چیک ایک انجان اور دیوانی لڑکی کے لیے ایک دم کیسے دے دیا تھا۔ یہ مانا کہ تم ایک مالدار شخص ہو......"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں باقر بھائی!" اس کا دل بیٹھنے لگا۔

"تم خوب سمجھ رہے ہو ملک...... معذرت کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔"

مسلسل اذیتوں کے بعد اب ملک نواز بالکل بے دم ہو چلا تھا۔ اس پر سے ڈاکٹر باقر کے تابڑ توڑ سوالات نے اسے مزید نڈھال کر دیا تھا۔

اس نے سر جھکا کر بڑی آہستگی سے اقرار جرم کیا۔ اس لیے کہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بُری طرح پھنس چکا ہے۔ اس کا دل اسے جھنجوڑ کر کہہ رہا تھا کہ اب ملک شہباز کی اولاد یتیم خانوں میں پلے گی۔

"میں نفسیات کا ڈاکٹر بھی ہوں ملک......! میں سمجھ چکا تھا...... تم نے بہت ساری باتیں ایسی کر دی تھیں کہ رنگ تمہارے ہاتھوں پر نظر آ رہا تھا۔

تم پیتے بھی ہو ملک......؟ کس نے تمہیں تباہیوں کے غار میں دھکیل دیا ہے۔" انہوں نے تاسف سے پوچھا

وہ خاموش رہا۔ اس کے دل سے ایک بوجھ سا ضرور سرک گیا تھا۔

اس نے تمام بات دھیمے دھیمے گوش گزار کر دی۔ ڈاکٹر باقر نے بے حد انہماک سے سن رہے تھے۔

☆☆☆

چچی جان ابھی تک ہاسپٹل ہی میں تھیں۔ خالہ جان کی اور ساحرہ کی ڈیوٹی بدل بدل کر لگ رہی تھی۔ حالت بدستور تھے۔

وہ جلدی جلدی ہاسپٹل جانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ گڈو کو وہ ہما کے پاس چھوڑ کر صرف حنا کو لے کر حسن کے ساتھ جا رہی تھی۔

وہ پورچ میں آئی تو حسن نے ابھی تک گاڑی باہر نہیں نکالی تھی۔

وہ بڑی تیزی سے اپنے کمرے کی سمت آئی تھی۔ لیکن کمرے کے دروازے پر پہنچ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی تھی گویا...... حسن کے ہاتھ میں ملک نواز کا اقرار محبت لرز رہا تھا...... قدموں کی چاپ پر انہوں نے سر اٹھا کر جن نظروں سے شہلا کو دیکھا تھا۔ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔

حسن نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر دوبارہ خط پر مرکوز کر دیں۔

شہلا...... زمین اپنے پاؤں تلے ہلتی محسوس کر رہی تھی...... وہ چاہتی تھی کہ بہادری سے اس صورت حال کا ...ے۔ لیکن حسن کی نظریں اس کا وجود جھلسا گئی تھیں۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔

حسن نے خط کی چار تہیں آرام سے بنائیں اور خط کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اوپر سے جیب ...ئی۔ گویا خط کی موجودگی کا یقین کرنا چاہا۔

وہ اسی زاویے سے کھڑی تھی...... وہ اس کے پاس سے گزر کر باہر نکل گیا تو وہ چونکی اور اس کے پیچھے لپکی ...ما پورچ ہی میں گیا تھا۔ حنا پچھلی نشست پر ماں باپ کے انتظار میں کوفت بھرے منہ بنا رہی تھی۔

شہلا نے اگلا دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی حسن بھی ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ حسن نے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا اور نہایت تیزی سے گاڑی بیک... نظریں بدستور اس کا جائزہ لے رہی تھیں...... نظریں واپس ونڈ اسکرین کی طرف موڑتے ہوئے ...ئیں۔ اتنا اجنبی حسن کبھی دکھائی نہیں دیا تھا...... اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ الٰہی کیسا عذاب ہے۔ کیوں چاہتے ہیں... مجرم نظر آئے...... کن نظروں سے دیکھتے ہیں کہ بڑی شدت سے یقین آنے لگتا ہے کہ ہم مجرم ہیں...... پہلے پریشانی تھی اس پر یہ دوسری افتاد...... اور میری بھی غلطی ہے کہ میں نے اس حماقت نامے کو نذر آتش کیوں نہ کر دیا قضا ...ں پاس پکارتی رہی پھرتی ہے کہیں۔

"آپ واقعی ٹھیک کہتے تھے حسن! یہ شخص تو نہایت ہی احمق نکلا۔" آخر وہ بولنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

حسن کے خون چھلکاتے لب گھنی مونچھوں تلے سختی سے بھچے ہوئے تھے اور نظریں مستقل سامنے دیکھ رہی تھیں۔

"بھلا بتایئے اسے احمقانہ پن نہیں کہیں گے تو کیا کہ ایک گرہستن عورت کو اس قسم کے خط لکھے جائیں......"

...نے پھر حسن کی طرف دیکھا...... اس کے چہرے پر اسی طرح کا تناؤ تھا۔

"آپ کو ایسی احمقانہ باتوں کا نوٹس نہیں لینا چاہیے۔ کیچڑ میں پتھر پھینکو تو چھینٹیں خود ہی پر پڑتی ہیں۔"

وہاں ایک مستقل خاموشی۔

اسی وقت گاڑی دھچکے سے رک گئی۔ ہاسپٹل اور گھر میں زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

حسن نے فوراً دروازہ کھولا اور خود اتر کر پیچھے سے بیٹی کو اتارا اور تیزی سے زینے کی طرف لپکا۔ حنا ماں کے ...نے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے اترتے ہی اس نے شہلا کی انگلی تھام لی۔

"امی......"

"جی بیٹے......؟"

"امی...... پپا آپ سے ناراض ہیں......؟" اس نے شہلا کو دیکھا۔

وہ بری طرح چونک گئی۔ "کیوں بیٹے......؟"

"آپ بولے جا رہی تھیں۔ پپا جواب ہی نہیں دے رہے تھے...... پھر میں نے مرر میں بھی دیکھا تھا...... پپا ...غصے والا ہو رہا تھا۔" حنا کے اس انداز پر شہلا کا دل چاہا بیٹی کو دل میں چھپا لے...... کتنی حساس ہے یہ حنا...... اور اس ...اہدہ کتنا گہرا ہے...... اتنی چھوٹی سی ہے میری بیٹی......

"پپا کی ٹائی گم ہو گئی ہے ناں...... اس لیے ان کا موڈ آف ہے...... ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ باتیں کرتی ہوئی ساس کے کمرے تک آ گئی تھی۔

''دلہن بھی آئی ہیں...... ارے کیا چکر پڑا ہے اس کے پاؤں میں...... اے اللہ مجھے ایک طرف کر دے ادھر یا ادھر۔''

''السلام علیکم چچی جان......'' شہلا نے سلام کیا۔

''جیتی رہو......!'' انہوں نے پوتی کا ہاتھ پکڑ کر خود سے نزدیک کیا۔

''ارے میری ''بلی'' بھی دعا نہیں کرتی کہ پھو پھول جائیں......''

''میں روزانہ دعا کرتی ہوں دادی جان کہ اللہ کرے پھو پھول جائیں...... دادی جان ٹھیک ہو جائیں اور پھر ہمارے گھر میں کوئی نہ روئے۔'' حنا نے معصوم انداز میں بتایا تو چچی جان نے اس کی پیشانی چوم لی بے قرار ہو کر

''آخر شہلا کی بیٹی ہے...... حساس اور ہمدرد...... ورنہ اتنی عمر کے بچوں کو تو ٹھیک طرح ہوش بھی نہیں آ

انہوں نے ایک بار پھر جھک کر حنا کی پیشانی چومی۔

''کچھ خبر خبر ملی......؟'' انہوں نے آس بھری نظریں بیٹے کے چہرے پر جما دیں۔

''بتایا ہے ناں امی آپ کو...... کہ انشاء اللہ جلد پتا چل جائے گا۔ بس آپ جلدی ٹھیک ہو جایئے۔''

اپنے خیالوں سے نکل کر ماں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''ارے کیسے ٹھیک ہو جاؤں۔ میرا علاج تو میری بچی ہے...... ارے کب سناؤ گے مجھے یہ خبر کہ ثریا مل گئی۔

''دیکھیں امی...... پریشان تو سب ہی ہیں ناں؟ ایسے میں آپ کو چاہیے آپ خود کو سنبھالیں تاکہ ہمیں کچھ تو کمی محسوس ہو۔

حسن نے اپنے مخصوص دوٹوک والے انداز میں ماں کی دلجوئی کی۔

''ارے میرے بچے! تو میرے دل کا حال کیا سمجھے گا۔''

''مجھے احساس ہے امی...... مگر دیکھیے ناں۔ جینا تو ہے ناں...... خود پر قابو پا کر ہی ہم مشکلات سے نمٹ سکتے ہیں۔ اب وہ دیکھیے مانی کی چھٹی ختم ہو گئی ہے مگر وہ آپ کی وجہ سے نہیں جا رہا...... حالانکہ اسے چلے جانا چاہیے۔

''ارے کیوں چلے جانا چاہیے...... پل پل تڑپی ہوں اس کے لیے......'' وہ تڑپ کر بولیں۔

''آپ کے جذبات اپنی جگہ امی...... ٹھیک ہے وہ وہاں ملازمت نہ کرے لیکن ملازمت چھوڑنے کے بہانے ہوتے ہیں۔ اگر وہ باضابطہ ملازمت نہیں چھوڑے گا تو پاکستان میں اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ ٹھنڈے دماغ سے سوچیے...... مشکل کے بعد دوسری مشکل جینا حرام کر دیتی ہے۔ کوشش کیجیے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں۔ ثریا کی تلاش جاری ہے۔ انشاء اللہ آپ اچھی خبر سنیں گی۔'' حسن نے ماں کے ہاتھ تھام کر اپنے مخصوص انداز سے ہٹ کر ماں کو سمجھایا۔

''حسن...... میرے بیٹے؟''

''جی...... امی......!''

''خدا کے لیے مانی کو اب دور نہ جانے دو...... اسے منع کر دو......''

''وہ جلد واپس آ جائے گا امی...... اس کی قسمت پر روگ نہ لگایئے...... اس گھر کا کوئی فرد تو اس تکلیف دہ ماحول سے دور رہے...... اور امی...... اس کے بڑے موجود ہیں اس کے حصے کی مشکلات جھیلنے کے لیے۔''

شہلا نے حسن کی سمت حیرت سے دیکھا۔ آج سے پیشتر اس نے اتنے کھلے انداز میں بہن بھائی کے جذبوں کا اظہار نہیں کیا تھا...... عالیہ اور مانی اس سے بہت فاصلے پر نظر آتے تھے۔ کچھ فرسٹریشن کا بھی معاملہ تھا۔

''دلہن...... ہما کو کیوں چھوڑ آئیں...... لے آتیں اسے بھی۔''

''کل ہی تو وہ ہو کر گئی ہے...... پھر آج ملازمہ بھی نہیں آئی تھی۔ میں نے سوچا۔ ساحرہ بے چاری کیا کیا کرے گی۔ گڈو روتا بھی بہت ہے اس لیے گھر پر چھوڑا ہے ہما کو۔''

''نظرا'' گیا ہو گا بچہ...... ماشاء اللہ صحت مند اور خوبصورت ہے۔ باپ پر پڑا ہے...... حسن بھی بالکل ایسا ہی تھا۔ سات مرچیں لے کر ''معوذتین'' پڑھ کر پھونک دیا کرو۔ ہر بری بلا دور رہتی ہے۔''

''جی......''

''حسن! دلہن کا خیال رکھا کرو۔ اپنی بساط سے بڑھ کر کام کرتی ہے یہ......''

''ارے نہیں چچی جان...... سب مل جل کر ہی کرتے ہیں...... آپ میری فکر نہ کریں۔ اپنا خیال کریں۔''

اور چلتے وقت اس کا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رو دے حسن نے بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''چلو بیٹے......!'' اور اس نے محسوس کر لیا تھا...... یہ طوفان سے پہلے کا سکوت ہے۔

''اب تمہارا کیا خیال ہے ملک......؟''

''باقر بھائی میں بہت ڈپریسڈ ہوں...... آپ بتایئے ہیں کیا کر سکتا ہوں۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''ملک...... یہ طے ہے کہ بچہ ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں تو کچھ نہیں کیا جا سکتا اور اس بچے کے ذمے دار تم ہو گے اس کی تمام تر ذمے داری تمہاری ہو گی۔

میرا خیال ہے کہ تم اب ثریا کے ذمے دار بھی بن جاؤ۔ ثریا...... یہی نام لے رہے تھے ناں تم۔''

''جی ہار پر یہی نام نقش ہے۔'' وہ نظریں اٹھانے سے قاصر تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے...... ہم نے اس کے ابتدائی ٹیسٹ لیے ہیں۔ بلڈ ٹیسٹ سے یہ آشکار ہوئی ہے کہ اس کا باقاعدہ کافی عرصہ علاج ہوا۔ اس کے خون میں ابھی تک میڈیسن افیکٹ موجود ہے۔

اس کی صحت یابی کے بعد تم اس سے نکاح کر لینا...... بچے کو علیحدہ تحفظ مل جائے گا اور تم اس غلطی کا ازالہ کر کے ہلکے پھلکے ہو جاؤ گے...... ورنہ تم جیسے حساس آدمی کو یہ اندرونی جنگ مار ڈالے گی...... یہ بوجھ ہے جو اعتراف سے کم ہو گا۔

ورنہ دوسری صورت میں دو زندگیاں تباہی کے دہانے پر ہیں۔''

ملک نواز خاموش بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر باقر اسے نظروں سے تول رہے تھے۔

''ہمارے ملک کے قانون کے مطابق یہ وہ جرم ہے جس کی سزا رسوا کن اور اذیت ناک ہے۔''

''مجھ پر شک نہ کرو ملک...... میں سب کا بھلا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں تو تمہیں یہ بتا رہا تھا...... کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

''میں غور کروں گا باقر بھائی...... براہ کرم آپ اس کا علاج جاری رکھیے۔ اور پلیز ناصر صاحب کے لیے......''

''کیسی باتیں کر رہے ہو ملک...... حد کرتے ہو......''

''اچھا۔ میں چلتا ہوں۔''

''ملک...... مریضہ کو دیکھتے چلو...... تمہیں اس کی خبر گیری کرتے رہنا چاہیے۔''

ڈاکٹر باقر کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ وہ پلٹ کر ان کی سمت دیکھ نہ سکا۔

''روم نمبر سات ہے۔''

''شکریہ۔۔۔۔۔۔'' اس نے قدم باہر بڑھا دیے۔

روم نمبر سات پر متعین نرس نے اس کی رہنمائی کی۔

اس نے دروازہ پش کیا۔ سامنے سیاہ کپڑوں میں ثریا کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ اس کے سرخ و سفید چہ زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی تروتازہ جلد اسے خشک سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے ریشمی بال سرخ کلپ میں مقید

''یہ سو رہی ہے سسٹر یا کسی انجکشن کا اثر ہے۔۔۔۔۔۔؟'' اس نے پلٹ کر نرس سے پوچھا۔

''شی از سلیپنگ سر'' (یہ سو رہی ہے) مارتھا پیٹر نے ادب سے کہا۔

''کب سوئی تھیں۔۔۔۔۔۔؟''

اس سے قبل سسٹر کوئی جواب دیتی۔۔۔۔۔۔ ثریا نے سوتی جاگتی گڑیا کی طرح پٹ سے آنکھیں کھول دیں لمحے ملک نواز کو گھورتی رہی پھر عجیب سی چیخ مار کر بستر سے کود پڑی اور ملک نواز کو بری طرح جھنجھوڑنے لگی۔

''آپا نہیں آئیں۔۔۔۔۔۔ آپا کیوں نہیں آئیں۔۔۔۔۔۔ تم کہہ رہے تھے آپا یہاں آئیں گی۔۔۔۔۔۔''

وہ اس اچانک حملے سے بوکھلا سا گیا۔ بمشکل اسے قابو کیا۔۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے اب اس کے سینے سے لگی بچوں کی طرح سسک رہی تھی۔

اس نے رومال نکالا اور اس کے رخسار پونچھ ڈالے۔۔۔۔۔۔ پگلی کا نصیب مسکرا اٹھا۔

''ثریا۔۔۔۔۔۔ میں آپا ہی کی تلاش میں گیا تھا۔ میں نے نہیں بہت ڈھونڈا۔۔۔۔۔۔ جب ہی تو اتنی دیر میں آیا

''وہ کیوں نہیں ملتیں۔۔۔۔۔۔؟'' اس نے چہرہ اٹھا کر ملک نواز کو دیکھا۔ وہ کسی ''حق'' کی طرح اس کے تھی۔ اس نے اس کے اشک پونچھ کر ''ذمے داری'' کی قبولیت کا اظہار کر دیا تھا۔

''ہو سکتا ہے مل جائیں۔۔۔۔۔۔''

''ہیں۔۔۔۔۔۔؟'' اس نے ملک نواز کو بے یقینی سے دیکھا۔۔۔۔۔۔ اس کی خوبصورت پلکوں پر اشک موتیوں کی چمک رہے تھے۔۔۔۔۔۔ بچوں جیسی حیران آنکھیں دیکھ کر ملک کا جی چاہا اس ستم رسیدہ کی پلکوں پر سجے موتی اپنے لبوں چن لیے۔

اس نے سر موڑ کر نرس کی سمت دیکھا۔ وہ کمرے سے باہر جا چکی تھی۔

اسے تھامے ہوئے بستر تک لایا اور بٹھایا اور خود اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے اسے بہلا رہا تھا۔۔۔۔۔۔ ثریا سے اس کے دوہرے رشتے ہو گئے تھے۔ اذیت'' کا رشتہ ایک شہلا کا رشتہ۔

کافی دیر بعد جب وہ کمرے سے باہر آیا تو نرس سامنے بنے آفس سے فوراً باہر نکل آئی تھی اور ثریا جیب سے نکالے سگریٹ لائٹر سے کھیل رہی تھی۔

آج وہ گھر میں داخل ہوا تو باہمت کھلاڑی کی طرح تھا جو ہار سے عاقلانہ سمجھوتا آخر کر ہی لیتا ہے وقار کے ساتھ قبول کر لیتا ہے۔

''خورشید۔۔۔۔۔۔!''

''جی صاحب۔۔۔۔۔۔!'' وہ آس پاس ہی کہیں تھا۔ فوراً حاضر ہو گیا۔

''جی صاحب۔۔۔۔۔۔؟'' وہ حیرت سے بولا۔ جب سے وہ ملازم ہوا تھا ملک نواز نے کبھی کھانے پینے سے متعلق اس کو رائے نہیں دی تھی۔۔۔۔۔۔ جو اس نے پکا لیا ملک نے خاموشی سے کھا لیا۔

اسے یاد تھا شروع شروع میں اس نے خود ہی اس سے کھانا پکانے کے بارے میں پوچھا تا تو ملک نواز جھلا کر جواب دیا تھا۔

''گھاس بھی پکا لو گے کھا لوں گا۔ سخت کوفت محسوس ہوتی ہے مجھے ان باتوں سے۔ پابندی پسند نہیں ہوں۔ چیزوں کے سامنے محتاج۔۔۔۔۔۔ ہر چیز میرے بعد ہے۔۔۔۔۔۔ میں کسی چیز کو مسلط نہیں کرتا کہ میری راہ اور ہے۔''

خورشید جواباً خاموش ہو گیا تھا۔ ورنہ جی تو چاہا تھا پوچھے۔ ''صاحب وہ کون سی راہ ہے۔۔۔۔۔۔؟''

''صاحب میں نے مچھلی فرائی کی ہے۔ آپ کہیں تو کچھ اور۔۔۔۔۔۔ بنا لوں۔''

''چھوڑو۔۔۔۔۔۔ مچھلی ہی چلے گی۔۔۔۔۔۔ کھانے پینے میں نخرے تو بیویوں والوں کو ہی سوٹ کرتے ہیں تم کھانا لگاؤ ابھی آتا ہوں۔ کپڑے بدل کر۔''

وہ کپڑے تبدیل کر کے آیا تو گیٹ بج اٹھا۔ جانے کون ہے جو جال بیل بجائے گیٹ توڑ رہا ہے۔ شام کے ڑھے سات ہو رہے تھے۔

خورشید کچن میں تھا۔ وہ حیران ہو کر پلٹتے ہی کو تھا اپنی ٹانگ جتنا بچہ نظر آ گیا جو گیٹ سے چپکا ہوا کھڑا تھا۔

صحت مند اور خوبصورت بچہ اسے ڈری ڈری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''جی بیٹا۔۔۔۔۔۔!'' اس نے جھجک کر بچے کی ٹھوڑی چھوئی۔

''انکل۔۔۔۔۔۔ وہ شٹل کاک۔۔۔۔۔۔'' وہ ہکلایا۔

''ارے بیٹا۔۔۔۔۔۔ اندھیرے میں کھیلتے ہیں آپ۔۔۔۔۔۔''

میں تو نہیں کھیلتا انکل۔۔۔۔۔۔ وہ زارا آنٹی کی ثوبیہ ہے ناں وہ کھیل رہی تھی آپ کے لان میں شٹل کاک پھینک دی ہے۔ اب میں صبح کو کیسے کھیلوں گا۔۔۔۔۔۔؟''

''آؤ میرے دور اندیش شہزادے۔۔۔۔۔۔ میں دوسری لائٹ بھی آن کرتا ہوں۔ ڈھونڈتے ہیں شٹل کاک۔''

بچہ جھجکتا ہوا اس کے پیچھے چلا آیا۔۔۔۔۔۔ ملک نواز نے پہلے برآمدے میں جا کر لان کی تمام لائٹس آن کیں پھر کاک بمشکل ڈھونڈی جو رات کی رانی کے پودے کے پاس پڑی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ بچے کی آنکھوں میں خوشی روشنی بن کر اس نے فوراً شٹل کاک اٹھا لی۔

''انکل۔۔۔۔۔۔ یہ رات کی رانی ہے۔۔۔۔۔۔''

''ہاں بیٹا۔ یہ رات کی رانی نہیں لگانا چاہیے۔''

''کیوں بیٹے۔۔۔۔۔۔؟''

''ممی کہتی ہیں جہاں رات کی رانی ہوتی ہے وہاں سانپ آ جاتے ہیں۔''

''ہاہا۔۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔۔'' ملک نواز نے مخصوص انداز میں بہت دنوں بعد بھرپور قہقہہ لگایا۔ ''آپ نے یہ نہیں پوچھا کے۔ پودے تو ہزاروں ہوتے ہیں لیکن سانپ رات کی رانی ہی کے پاس کیوں آتا ہے۔۔۔۔۔۔؟''

''مجھے یاد نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔۔ اب پوچھ لوں گا۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

ملک نواز نے بے ساختہ بچے کا رخسار چوم لیا۔ بچے نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"مجھے آدمیوں کا پیار کرنا بالکل اچھا نہیں لگتا۔"

"ہائیں......؟" ملک نواز کچھ سمجھ نہ سکا۔

"آدمیوں کو مونچھیں اتنی سخت ہوتی ہیں بڑے زور سے چبھتی ہیں۔ میں پپا سے اسی لیے پیار نہیں لیتا۔ سے لیتا ہوں۔"

ملک نواز کا جی چاہا اس معصوم کو ایک مرتبہ اور چوم لے مگر...... اسے بچے کی ناگواری یاد آئی۔

"اچھا بھئی......" اس نے اپنی مونچھوں پر انگلیاں چلائیں...... "......"

بچہ اچھلتا کودتا باہر نکل گیا۔ لیکن ملک نواز کو ایک عجیب سے احساس سے دوچار کر گیا۔ اسے یاد نہیں کہ اس نے کبھی بچوں میں دلچسپی لی ہو۔ لیکن آج اسے اپنے اندر ایک تبدیلی سی محسوس ہو رہی تھی...... ایک نیا انگ جو اس کا سب سے قریبی رشتہ بننے والی تھی...... وہ اس روح کا منتظر ہو گیا تھا...... رشتے قرطاس پر اتر کر ہی امر ہوتے۔ رشتے خون میں دوڑتے بھاگتے ہیں۔ اور ایک باضمیر باحساس شخص...... کتنا ہی بچنا چاہے...... رشتے آ کر ان کی جان سے چپکے رہتے ہیں۔

ثریا کا اس سے کیا تعلق ہے۔؟ کچھ نہیں...... لیکن اب وہی اس کی سب سے بڑی متعلق ہے...... داری ہے ثریا سے؟...... کوئی نہیں...... اور وہی اس کا سب سے بڑا رشتہ...... ایک بڑے خزانے جیسا۔ اپنے وجود کو میں لیے بیٹھی ہے۔

حالانکہ یہ خزانہ طلسمی ہے۔ فریب ہے...... ظلم ہے...... تاریکی ہے...... زیادتی ہے۔ اسے لا کھلکھلاہٹیں وہ کلکاریاں سنائی دینے لگیں۔

"اچھا ہی تھا مانی اگر تم ساحرہ کو بھی ساتھ لے جاتے...... جس دن سے شادی ہو کر آئی ہے کوئی خو دیکھی۔ اس نے...... ذرا اس ماحول سے نکلے گی تو اچھا اثر پڑے گا......"

"میرا وہاں رہنے کا اب بالکل ارادہ نہیں ہے بھابی۔ ضروری معاملات سے نمٹ کر میں تیسرے واپس آ جاؤں گا۔ یہاں اتنی پریشانی ہے۔ میں وہاں کیسے رہ سکتا ہوں۔"

سب کھانے کی میز پر کافی دنوں بعد جمع ہوئے تھے۔ زرد کپڑوں میں نہائی دھوئی خاموش سی ساحرہ ایک چھنا کا سا ہوا تھا۔

وہ عام روایتی انداز میں سسرال سے علیحدہ ہو کر رہنا نہیں چاہتی تھی لیکن ایک خواہش اس کے دل میں لیتی رہی تھی کہ وہ اپنے شریک سفر کے ساتھ امریکہ کی سیر کرتی جب کہ تمام تر سہولت میسر بھی تھی۔ اس نے خاموشی کا فیصلہ سنا اور سر جھکا لیا۔

"مانی بھائی...... بڑی بھابی ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ آپ چھوٹی بھابی کو ضرور ساتھ لے جائیں۔ کم ٹینشن تو کم ہوگا رہی ثریا باجی کی بات تو دیکھیے کوشش تو ہو رہی ہے ناں...... انشاء اللہ کچھ نہ کچھ تو سامنے آئے گا۔ وہ خیریت سے ہوں۔ زندگی تو گزارنا ہے۔ یہ حادثہ ہم سب کیلئے بہت بڑا ہے۔ مگر زندگی تو گزارنا ہی ہے۔ سانحہ ایک پھانس کی طرح دل میں اٹکا رہے گا...... امی کو بھی آخر کچھ قرار آ رہی جائے گا۔ حقیقت کو حقیقی انداز مانی بھائی۔" عالیہ نے اپنے بیٹے کو چمچ سے سوپ ملاتے ہوئے بردباری سے سمجھایا۔

"گھر خالی نہیں ہونا چاہیے عالیہ...... ابو بھی عمرے پر جانا چاہتے ہیں۔ مقصد دعا کرنا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہو ہے وہاں دل کو کچھ سکون مل جائے...... میں چاہتا ہوں ان کی خواہش پوری ہو جائے...... ان کی حالت امی سے کم نہیں بہت حوصلے سے کام لے رہے ہیں۔ تمام تر راستے اختیار کر چکے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا اتنے سے شہر میں ثریا باجی ن چھپ گئی ہیں...... ایک ہفتے بعد دو مہینے ہو جائیں گے پورے۔"

"تم اپنا کام نمٹاؤ مانی...... میں یہاں ہوں...... اطلاع ہی تو اصول کرنی ہے جو کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہے۔ اور بھی وصول کر سکتا ہے......" حسن نے نیپکن سے ہاتھ پونچھے اور کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

"میں ابو کے کمرے میں ہوں۔ عالیہ ایک کپ چائے بھجوا دینا۔" وہ بہن سے کہہ کر باہر نکل گئے تھے۔

وہ اور...... ساحرہ...... مہمانوں کی طرح لگ رہی تھیں...... اور مہمان بھی نووارد...... جیسے اس گھر میں عالیہ اور مانی ہی ہیں...... اور یہ باہر سے آئی ہوئی اجنبی عورتیں۔ عالیہ بیٹے کو کرسی پر بٹھا کر برتن سمیٹنے لگی تھی...... تو گم صم سی رہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رہنے دو عالیہ...... اپنے بیٹے کو سنبھالو...... میں صاف کر لیتی ہوں ٹیبل۔"

"سارا دن آپ ہی دونوں تو لگی رہتی ہیں...... میں کیا کرتی ہوں...... صمد کہتے ہیں کہ جب بھی کوئٹہ سے آتی ہو ایسا لگتا ہے پہلوانی کے مقابلے کی تیاری کر کے آئی ہو۔ میں کہتی ہوں میں کیا کروں۔ میری بھابیاں مجھے ہل پانی نہیں پینے دیتیں......"

ویسے بھابی...... ابو نے ہم لوگوں سے تو کوئی ذکر نہیں کیا؟ عمرہ کے بارے میں......؟"

"نہیں کیا تھا...... پرسوں جب میں انہیں چائے دینے گئی تھی...... کہہ رہے تھے کہ تمہاری چچی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے تو عمرہ کرنے جاؤں گا......" شہلا نے شیشے کے صاف گلاس اٹھا کر دیوار میں نصب شیشے کی خوبصورت الماری میں لگاتے ہوئے کہا۔

ساحرہ کھلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں لپیٹتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کے اس انداز پر عالیہ کو پیار سا آ گیا۔

"چھوٹی بھابی......!"

"ہوں۔" وہ چونک پڑی۔

"آپ مانی بھائی سے ضد کر کے ان کے ساتھ چلی جائیں۔ ورنہ اکیلے میں تو وہ زیادہ ہی پریشان ہو جائیں اور آپ کے ذہن کو بھی کچھ ریسٹ ملے گا۔"

"ضد کر کے......؟ میں ضد نہیں کر سکتی......" وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

"لیجیے...... ایک آپ ہی تو ان سے ضد کر سکتی ہیں۔"

"عالیہ...... میں ان سے جانے کے سلسلے میں کیسے بات کر سکتی ہوں......؟ جب کہ گھر میں اتنی پریشانی ہے آنٹی جان بدستور بیمار ہیں...... میرا جانا ان حالت میں بالکل مناسب نہیں۔"

"میں تو اس خیال سے کہہ رہی ہوں کہ...... وہ تنہائی میں...... مجھے ڈر لگ رہا ہے وہ بہت پریشان ہیں...... پتا نہیں کس کی نظر کھا گئی ہمارے ہنستے بستے گھر کو۔" کئی آنسو عالیہ کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

ہاتھ دھوتی ہوئی شہلا اس کی سمت پلٹی اور اسے گلے سے لگا لیا۔

"دوسروں کی ہمت بندھاتی ہو اور خود روتی ہو۔"

عالیہ کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''بھابی...... آپ نے سوچا تھا مانی بھائی کبھی ایسے ہو جائیں گے......؟ ان کی اتری صورت دیکھ روتا ہے۔'' شہلا کی آنکھیں بھر آئیں۔

''چندا...... تجھے بھائیوں کی فکر ہے...... اپنی نہیں......؟ تیرا بھی تو ایک گھر ہے ناں۔ اپنے آپ عالیہ...... ایسے نہیں کرتے...... کڑھنے سے جی کو ہزاروں روگ لگ جاتے ہیں...... جو قسمت میں تھا پورا ہوا والا خدا ہے۔

حادثے انسان کی قوت برداشت سے بڑھ کر ہوتے تو انسان صدیوں پہلے ختم ہو چکا ہوتا۔''

اس نے سسکتی عالیہ کی پشت پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دیا...... ''مایوسی اچھی بات نہیں۔''

''اتنے دن تو ہو گئے بھابی...... امی کی طرف دیکھتی ہوں تو مرجانے کو جی چاہتا ہے۔''

شہلا کچھ نہ بول پائی...... جیسے تمام الفاظ اپنی حقیقت کھو بیٹھے تھے۔

☆☆☆

وہ اس کے آنے سے پہلے ہی سو چکا ہوتا تھا یا پھر سوتا بن جاتا تھا۔ اب وہ بھی ان اداؤں کی عادی ہو کچھ گھر میں پریشانی بھی الگ نوعیت کی رونما ہوئی تھی۔ دماغ بیک وقت کئی جگہ مصروف رہتا تھا...... خط...... محبت نا ...... بلکہ ''عشق نامہ'' ایک پہاڑ کی طرح اس کے سر پر ٹوٹا تھا لیکن تین دن بخیریت گزرنے کے بعد یہی بات انتہا ہو کر رہ گئی تھی......

رات دو بجے کا عالم تھا جب اُسے محسوس ہوا کہ کوئی دروازہ بجا رہا ہے۔

اس نے بائیں پہلو کی سمت دیکھا۔ حسن کی نیند گہری تھی۔

''کون ہے۔؟''

''میں ہوں بھابی......''

''ہائیں......'' مانی کی آواز سن کر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

وہ بمشکل دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولا۔ سامنے مانی تھا۔

''بھائی جان کو اٹھا دیں بھابی......!''

''مانی......؟'' شہلا کی آواز کانپ گئی۔

''خیریت تو ہے ناں......؟''

حسن کی آنکھ باتوں کی آواز پر کھل گئی تھی۔

''کیا بات ہے مانی......؟'' اس نے سوئے سوئے انداز میں پوچھا۔

''ہاسپٹل جانا ہے بھائی جان۔ نیچے آ جائیے۔''

''خیریت۔؟''

''ڈاکٹر خان کا فون آیا تھا ابھی...... امی کا...... ڈاکٹر خان کہہ رہے تھے۔ قلب کی حرکت اچانک

فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا...... ''ابو کہاں ہیں......؟''

''میں نے ابھی انہیں نہیں جگایا......''

اور شہلا کے پاؤں تلے سے گویا تختہ کھینچ لیا گیا تھا۔

دونوں بھائی آگے پیچھے چلتے ہوئے اس کے سامنے سے گزر کر چلے گئے۔ وہ وہیں دروازہ تھامے کھڑے رہ گئی۔ عالیہ کے کہرام نے ایسی وحشت بڑھائی کہ اس کا جی چاہا وہ بال نوچتی ہوئی جنگلوں میں نکل جائے۔ جہاں یہ کہرام کی اذیت ناک آوازیں سنائی نہ دیں۔

حسن، مانی اور چچا جان ہاسپٹل جا چکے تھے...... وہ عالیہ کو سنبھالنے میں لگ گئی۔

''بھابی...... میری امی......؟''

''ہوش کرو عالیہ...... خدا کے لیے۔ گھر کے دوسرے لوگوں کی طرف دیکھو......''

''بھابی...... اللہ کا عذاب اترا تھا ثریا باجی کی صورت میں......'' وہ اس کے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ کر رو رہی تھی......

''کفر مت نکالو منہ سے...... عالیہ...... ایسے نہیں کرتے۔''

''بھابی...... ثریا باجی پیدا ہوتے ہی مر جاتیں تو کتنا اچھا تھا۔''

ساحرہ ایک کونے میں بیٹھی عالیہ کے نوحے سن کر آنسو صاف کر رہی تھی۔ اٹھ کر دونوں کے قریب آ گئی۔

''عالیہ صبر کرو...... خود کو سنبھالو۔ ابو ہی کا خیال کرو۔''

''چھوٹی بھابی کہنا کتنا آسان ہے۔ کیسے سنبھالوں خود کو...... ہائے میری امی......'' شہلا اور ساحرہ عالیہ کو لنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

''امی۔ میری پیاری امی اگر مجھے معلوم ہوتا یہ سب ہونے والا ہے، میں آپ کے پاس سے نہ ہلتی...... ہائے ماں...... کوئی بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ پتا نہیں ان کا کیا حال ہو گا۔''

عالیہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی...... ساحرہ کے تو ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے۔ سارے بوجھ شہلا کے سر، عالیہ کا بیٹا، شہلا کا اپنا بیٹا چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ ہما اور حنا الگ رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔

ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی اور گھر میں ایسے لگ رہا تھا کبھی رات ہی نہیں ہوئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد جنازہ آ گیا...... اور عالیہ ماں کو دیکھ کر وہیں گر پڑی...... حسن بمشکل اسے اٹھا کر اندر لایا تھا مانی سنبھال رہا تھا۔

''مانی......!''

''جی ابو......؟''

''تمہاری ماں اتنی خاموشی سے چلی گئی......؟ اسے مجھ سے بہت سی شکایتیں تھیں...... میں تو اس سے معافی نہ مانگ سکا۔'' ان کی آواز بھرا گئی۔

''ابو......!'' مانی نے ضبط سے ہونٹ کاٹے۔

''ذرا ذرا سی بات پر وہ ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی...... اتنے بڑے سفر پر نکلی اور اتنی خاموشی سے بغیر پریشان کیے...... میں اسے بولنے کے طعنے دیا کرتا تھا...... برا مان گئی...... مانی تمہاری ماں......''

''خود کو سنبھالئے ابو......'' مانی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''سنبھال تو رہا ہوں...... مانی تجھے خبر نہیں تمام عمر میں رفیق سفر کی ضرورت اسی وقت شدت سے محسوس ہوتی

ہے مانی تیرے تو وہ بہت لاڈ اٹھاتی تھی۔ بیٹے تیرے دل میں کیا خیال آ رہا ہے۔ جب تو امریکہ چلا گیا تھا......راز بے چین پھرتی تھی۔

میں نے اسے سمجھایا کہ دنیا کی اولاد باہر جاتی ہے......تو کہنے لگی......زخم لگا گیا ہے......وہاں بیٹھا تو بہت پیار کرتی تھی تجھ سے۔"

مانی رو پڑا۔

"میں نے انہیں بہت پریشان کیا ابو۔"

باپ نے اسے سینے سے لگا لیا۔" پریشان رہنے کی تو اس کی عادت تھی۔ پریشانی مول بک رہی ہوتی خرید لاتی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر ہاتھ پاؤں پھلا لیتی تھی۔

ثریا......تیری ماں مر گئی بیٹی......کہاں ہے تو......وہ رو رہے تھے۔ مانی اپنے مضبوط باپ کی شکستگی دیکھ ہوا جا رہا تھا۔

سب جگہ اطلاع کرا دی تھی اس لیے جنازہ شام تک روک لیا گیا تھا۔

پنڈی سے خالہ خالو صمد وغیرہ آ گئے تھے۔ کراچی سے شہلا کے امی، ابو......صبور بھائی آ گئے تھے۔ پشاور ساحرہ کے والد آئے تھے۔

شام پانچ بجے جنازہ اٹھا۔ تب شہلا ضبط نہ کر سکی تھی۔ وہ دیوار سے ٹک کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

دوہرے حادثے کے بعد تو گویا در و دیوار سے وحشت ٹوٹ کر بکھرنے لگی تھی......گھر میں مہمان بھ ہوئے تھے۔ روز ختم قرآن ہو رہا تھا۔

لیکن اتنے سنگین حادثے کے بعد بھی حسن کے انداز نہ بدلے تھے......وہ اپنے ضروری کام ساحرہ سے کروا ایسے میں شہلا کا جی چاہا وہ امی کے ساتھ کراچی چلی جائے پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے۔ اس کے روبے مزید اذیت محسوس ہوتی تھی۔......حالانکہ ہمیشہ کی طرح اس نے اسے بلانے میں پہلی کی تھی مگر اس نے بری طرح انداز کر دیا تھا......تب اسے محسوس ہوا تھا وہ بالکل تنہا ہے۔

اس نے اسی دوران ملک نواز کا خط تلاش کرنے اور تلف کرنے کی بھی امکان بھر کوشش کی تھی۔ لیکن ا خط نہیں مل سکا تھا۔

اس نے سوچا چند دنوں بعد......وہ اس سے اس موضوع پر بات کرے گی۔ اور کہے گی کہ مجھ سے یہ عذاب نہیں سہے جاتے۔

ایمبیسی سے واپسی پر وہ ڈاکٹر باقر کے پاس چلا آیا تھا۔

"کیسے ہو ملک......؟" انہوں نے فطری خوش اخلاقی سے ہاتھ ملایا۔

"گزار رہا ہوں......باقر بھائی......" وہ مسکرا دیا۔

"مایوسی کی باتیں نہ کرو ملک......اب تو انشاءاللہ گھر بنے گا۔" وہ فائل بند کر کے مسکرائے وہ خاموش رہا

"میں تم سے یہ کہنا چاہ رہا تھا......ڈلیوری میں ابھی تقریباً سات ماہ باقی ہیں۔ تم امریکہ جا رہے ہو۔ میر دیکھو تمہیں جانے دے رہا ہوں۔"

"شکریہ......!"

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ میں مریضہ کو اسٹیٹ بھجوانے کی تیاری کروں گا اور تم وہاں کا انتظام کر لو۔"

"اس سلسلے میں دشواری تو بہت ہوگی باقر بھائی......!"

"ہو تو سکتی ہے لیکن میں امریکن نیشنیلٹی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ میں دوسروں کے اس قسم کے ہل بلجھانے کا یقین تو نہیں دلا سکتا ہوں۔ لیکن چند لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا بوجھ بانٹنے کو میں ہر وقت تیار ہوں اور ذمے داری سمجھتا ہوں۔ اگر مریضہ ہوش مند ہوتی تو سرے سے یہ مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ لیکن اس مریضہ کو ہم اگر اپنے ے کی خاطر ٹریٹ منٹ دے بھی دیں تو اس کی جان جانے کا خطرہ ہے۔ اگر چہ یہ فی الوقت ایک ناکارہ وجود ہے لیکن خون ناحق اپنی گردن پر کر کے تمام عمر ضمیر کی عدالت میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور تم جیسے انسان کا تزکیہ نفس بھی ضروری ہے۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی صحت مند انسان حالات کی زد میں آ کر خودکشی کا مرتکب ہو......تمہیں اپنے......اور ریضہ کے لیے ہر وقت تعاون کرنا ہوگا تاکہ تم ایک پرسکون زندگی گزار سکو۔"

"میں آپ کو یقین دلا چکا ہوں باقر بھائی......" وہ نظریں اٹھائے بغیر بولا۔

"تم سمجھدار انسان ہو......مریضہ کے صحت یاب ہونے کے بعد تم اس سے اپنی صلاحیت کے مطابق ڈیل کر لینا۔ کم از کم اس معاشرے کے ایک بچے کو تو تاریک راستے نہ ملیں۔

"اپنا گھر۔" نام سنا ہے......؟"

"جی نہیں......میں سمجھا نہیں......" ملک نواز گڑبڑا گیا۔

"یہ ایدھی ٹرسٹ کا کارنامہ ہے۔"

"ایدھی ٹرسٹ......؟" ملک نواز نے الجھ کر پوچھا۔

"تم کافی عرصے سے باہر ہو لیکن تم نے ممتاز سماجی کارکن "عبدالستار ایدھی" کا نام ضرور سنا ہوگا......یہ انہی کا کردہ ادارہ ہے۔ اس میں بے گھر لوگوں کو پناہ دی جاتی ہے......اور ایسے بچوں کو جن کے شقی القلب والدین لاپتا ے ہیں پرورش کیا جاتا ہے......بے اولاد لوگ ایدھی ٹرسٹ سے رابطہ قائم کر کے ان بچوں کو گود بھی لیتے ہیں......ملک ے ذہن میں بار بار سوال اٹھتا ہے۔ جب بچوں کو بڑے ہو کر یہ معلوم ہوگا کہ ان کے حقیقی والدین نہیں ہیں تو ان کی ذہنی حالت کیا ہوگی......؟ بالغ ذہن کھوجی ہو جائے گا......کھوج لگا کر اپنی زندگی پر شرمندہ ہوگا۔ چٹکی بھر پوائزن یا ایک اور کا تمنائی ہوگا......ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھنے والے کا......امکانی انجام......بچوں کا قصور نہیں ہوتا؟ سزا ان تی ہے۔ تمہارا بیٹا یا بیٹی......تمہاری چھت کے نیچے پینا چاہیے ملک۔"

"آپ کے خیال میں مجھے پاکستان کب تک آ جانا چاہیے......؟" ملک نواز کی آواز بے حد مدھم تھی۔

"اکتوبر کے آخر تک۔" ڈاکٹر باقر نے جواب دیا۔

"یہ میرے اپارٹمنٹ کا ایڈریس ہے۔ اور یہ آفس کا......" ملک نواز نے دو کارڈ ڈاکٹر باقر کی سمت بڑھائے۔

"آپ بے فکر رہیے میں رابطہ رکھوں گا۔"

"تم نہیں رکھو گے تو میں تو بہت حال رکھوں گا......" انہوں نے کارڈز اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

"اب میں چلتا ہوں؟!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں۔؟ ڈاکٹر باقر کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"روم نمبر سات میں......" وہ خفت آمیز انداز میں مسکرایا۔

''وہ پاگل نہیں ہے ملک...... معمولی دماغی مریضہ ہے۔ اسے کپڑے پہننے، بننے سنورنے کا بہت شوق ہے۔ میں ابھی راؤنڈ پر تھا تو دیکھا مارتھا اسے تیار کر رہی تھیں۔ وہ بہت خوشی سے کپڑے تبدیل کرتی ہے۔ لپ اسٹک لگانے کا اسے بہت شوق ہے۔ جاؤ دیکھو...... مارتھا نے کمرے میں لپ اسٹک کی دکان سجا رکھی ہے۔ اسے مریض کی معمولی سے معمولی خوشی کو بھی اولیت دینا پڑتی ہے......''

وہ روم نمبر سات میں چلا آیا۔

''گڈ ایوننگ سر......!'' مارتھا نے مودبانہ کہا۔ ڈاکٹر باقر کے عزیز کی حیثیت سے اسے عملے سے بہت عزت ملتی تھی۔ ثریا بستر پر بیٹھی رنگین تصاویر دیکھ رہی تھی۔ آتشی گلابی کڑھے ہوئے سوٹ میں وہ شعلہ بن کر دہک رہی تھی۔ مارتھا نے اس کی دو خوبصورت چوٹیاں بنائی تھیں۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے اور ہونٹوں پر خوش رنگ لپ اسٹک کی تہہ تھی۔ ملک نواز کو دیکھ کر اس کی سبز آنکھوں کی چمک بڑھ گئی جو مبہوت سا دیکھ رہا تھا۔

''میں نے لال کپڑے پہنے ہیں۔ میں دلہن ہوں نا......؟''

وہ بستر سے چھلانگ مار کر اتر آئی۔

''او گاڈ...... سلو ثریا...... (آہستہ ثریا) مارتھا گھبرا کر آگے بڑھی۔

''میں دلہن ہوں۔ میں ہار بھی پہنوں گی۔'' وہ ٹھنکی۔

''یس سر...... شی از لکنگ برائڈ (یہ دلہن لگ رہی ہے)'' مارتھا نے خوش ہو کر کہا۔

وہ آئینے کے سامنے لہرا لہرا کر خود کو دیکھ رہی تھی۔ واقعی مارتھا نے لپ اسٹک کا ڈھیر لگا کر لگا رکھا تھا۔

''یہ کہہ رہی تھی ہار دو دکان سے لاتے۔ مجھے دکان سے ہار لا دو ناں۔'' اس نے ملک نواز کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا۔

''اچھا کل آؤں گا تو لے کر آؤں گا۔ تم بیٹھو۔''

''میں نہیں بیٹھوں گی۔ میں اس لڑکی کے ساتھ تتلی پکڑنے باہر جاؤں گی۔''

ملک نواز گرنے کے انداز میں بستر پر بیٹھ گیا...... وہ مارتھا سے کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔''

☆☆☆

وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد بدستور مصروف تھا۔ کاغذوں کا تصویروں کا ڈھیر لگائے جانے کس تاریخی شے کی تلاش میں تھا۔ خورشید کام وغیرہ سے نمٹ کر اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا...... اس نے ایک ڈھیر اخباروں رسالوں کو اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

لوہے کا ڈسٹ بن برآمدے سے اٹھا کر بیچ لان میں رکھا اور اندر سے ماچس لایا۔ سارا ڈھیر ڈسٹ بن میں ڈال کر آگ لگا دی...... تھوڑی دیر میں شعلے اونچے ہو گئے۔ وہ ہونٹ بھینچے شعلوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''میں فریب کی گنگا نہا رہا ہوں ثریا...... مجھے پتا ہے قدرت نے مجھے دھوکے دیے ہیں اور میں تمہیں دھوکا دیتا رہوں گا...... ثریا...... وہ غیر نہیں ہے تمہاری بھابی ہی ہے...... اسی کی وجہ سے...... میں اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں۔ ورنہ رشتے تو مجھے اذیت ہی دیتے ہیں...... اژدہے کی پھنکاریں لگتی ہیں مجھے تعلقات کی کڑیاں...... کیسا موڑ آیا ہے میری زندگی میں، میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا...... تین نقطوں کا طلسم مجھے تاحیات جکڑ کے رکھے گا۔ ث اور ش کے نقطے۔''

وہ ایک ٹک دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ شعلے ختم ہو گئے...... اور دھواں اٹھنے لگا۔

''آج پہلے سفر کی انتہا کی ہے میں نے...... نیا سفر...... ہو سکتا ہے اس سے بڑھ کر میری روح پر زخم لگائے۔

ہے اب تو مشکلیں آسان ہو جانا چاہئیں......'' وہ تمسخرانہ انداز میں مسکرایا تھا...... اپنا ہی تمسخر اڑا رہا تھا۔

اور......

آج...... آخر کار وہ ہیوسٹن روانہ ہو رہا تھا...... جانے سے پہلے وہ ڈاکٹر باقر سے ملا تھا...... مارتھا کو کچھ رقم دی ثریا کے لیے ہار وغیرہ لے آئے۔

مارتھا نے معنی خیزی سے پوچھا تھا کہ وہ ہار خود کیوں نہیں لایا...... اس نے چونک کر مارتھا کی شکل دیکھی تھی۔

(باقر بھائی۔ بھید نہ کھلے...... ورنہ ساری زندگی معاف نہیں کروں گا آپ کو...... رذیل مکر بھی جایا کرتے مجھے رذیل نہ بنا دیجیے گا۔)

''میں نے کبھی اس قسم کی چیز نہیں خریدی۔ اور نہ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' اس نے خشک انداز میں جواب دیا تھا۔

ثریا آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک رگڑ رہی تھی۔ لپک کر ملک نواز کے پاس آئی تھی۔ ''تمہارے سرخی ......؟

آپا کہتی ہیں آدمی سرخی نہیں لگاتے...... اونہہ کیوں نہیں لگاتے؟ تم بھی لگاؤ۔ بڑی اچھی ہے۔؟؟ اس نے ہلائی۔

''نہیں...... آدمی سرخی نہیں لگاتے۔......'' اس نے ناگواری سے ثریا کا ہاتھ ایک طرف کیا تھا۔

''آدمی کیا لگاتے ہیں پھر......؟'' ثریا نے تعجب سے سوال کیا تھا۔

''شاید...... داغ...... یا پھر روگ...... تو خیر عورتیں بھی لگا دیتی ہیں......'' وہ تلخی سے مسکرا دیا تھا۔

وہ خدا حافظ کہہ کر ائیر پورٹ چلا آیا تھا۔ ایک بریف کیس اور ایک چھوٹا سا سوٹ کیس اس کے ہمراہ ناصر صاحب اور اس کے کئی دوست ائیر پورٹ پر اس سے ملنے آئے ہوئے تھے۔

''اب کتنے سال بعد دیدار کراؤ گے......؟'' ایک دوست اس کے ہاتھ گرمجوشی سے دبا کر بولا۔

''چند مہینوں بعد ہی۔''

''ارے خیریت......؟'' ناصر صاحب کو تعجب ہوا۔

''ساتھ خیریت کے جانے دیں۔ سوالوں کی مار مت ماریں......''

وہ خفیف سا ہو کر ہاتھ ملاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ ناصر صاحب نے مخصوص قہقہہ لگا کر اسے گلے سے لگا لیا ہمیشہ ہی سے اس کے عاشق تھے...... اس کے منفرد سے انداز...... انہیں بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ بھی ان کا بے حد ادب کرتا تھا۔ ان کی معنی خیز باتوں پر لطیف چوٹوں پر وہ شرمندہ سا ہو کر مسکرا دیتا تو انہیں بے حد اچھا لگتا تھا۔ تین چار ماہ تک وہ میگزین میں ان کی معاونت کرتا رہا تھا۔ یوں اور بھی قریب ہو گیا تھا۔

جس طرح طوفان کی توڑ پھوڑ کے بعد ایک خاموشی سی چھا جاتی ہے...... ٹھہراؤ سا آ جاتا ہے...... دارالسلام میں آ گیا تھا...... لیکن......

اس دن ہلچل مچ گئی جس دن ہیوسٹن سے رجسٹری آئی...... امریکی قانون فلاں فلاں کے تحت...... امان زید غیر ذمہ دارانہ روش پر وارننگ لیٹر تھا...... کہ اسے ہفتے کے اندر اندر ٹیلی گراف کے مرکز میں حاضری دے کر صفائی پیش کرنی ہے۔ وجوہات کی تحریری شکل گونا چاہیے۔ ورنہ گورنمنٹ آف پاکستان کے تھرو ایکشن لیا جائے گا...... ایک ذمہ دار رکن کی غیر ذمہ دارانہ حرکت پر بھاری جرمانہ لگایا جا سکتا ہے جب کہ اہم دستاویزات بھی متعلقہ آفیسر کے قبضے میں

ہیں...... یہ لیٹر پاکستان کی ٹیلی گراف کی معرفت تھا جس پر متعلقہ محکمے کے اعلیٰ آفیسر کے ریمارکس ثبت تھے۔

''ایک پاکستانی کی غیر ذمہ دارنہ حرکت خارجہ پالیسی پر گہرا اثر ڈال سکتی ہے......اور ملک کا وقار...... مجروح ہوتا ہے......مسٹر اماں زید کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ غلطی کی تلافی فی الفور کریں۔''

ایک کھلبلی سی مچ گئی۔

حسن نے ناراضگی سے پوچھا تھا...... ''تم نے درخواست کیوں نہیں بھجوائی تھی......؟''

''مجھے دھیان نہیں رہا تھا......'' اس نے بڑے احترام سے کہہ دیا تھا۔

''مانی...... لائف بہت پریکٹیکل ہونی چاہیے۔ زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزرتی۔ اگر سخت ایکشن لے لیا گیا تو جانتے ہو کیا ہوگا......؟''

''پتا ہے مجھے۔''

''مجھے تم سے اس قدر حماقت کی توقع نہیں تھی۔ میں یوسف کو فون کر کے سیٹ بک کراتا ہوں۔ جو جلے معاملہ نبٹاتا......''

ساحرہ نے جلدی جلدی اس کا سامان تیار کر دیا تھا۔ اس کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی۔ اس کو روتا دیکھ جھلا گیا تھا۔

''ابھی سے رو رہی ہو مجھے......''

ساحرہ نے سہم کر آنکھیں پونچھ ڈالیں......اسے مانی کا لہجہ اجنبی سا لگا تھا۔

شدید محبت کے بعد ہلکی سی بے رخی بھی جان کو آجاتی ہے۔ کہیں یہ بھی اوروں کی طرح مجھے۔

''امان......!'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''آپ ناراض ہیں......؟''

''دماغ خراب ہے میرا......؟''

اس ترش روئی پر تو ساحرہ کا گویا ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

وہ خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔

جب پورٹیکو میں سب کھڑے ہوئے مانی کو رخصت کر رہے تھے۔۔ مانی کی نظروں نے ساحرہ کو تلاش کیا وہ اسے کہیں نظر نہ آئی۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔

وہ سر جھکائے بیڈ کے کونے پر ٹکی ہوئی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔

''ارے بھئی خدا حافظ نہیں کہوگی......؟''

ساحرہ نے روئی روئی آنکھیں اس کی سمت کیں۔

وہ اس کے قریب چلا آیا...... ''یہ کیا بات ہوئی ساحرہ......؟ ایسے نہیں کرتے......کیا ہو گیا ہے......؟''

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

مانی پریشان سا اس کے قریب بیٹھ گیا...... ''ساحرہ...... جان...... زندگی کے ساتھی کو مزاج کے موسموں کا بھی ساتھی ہونا چاہیے......اب آدمی ہر وقت تو خود رومان طاری نہیں رکھ سکتا کچھ حادثے بھی اس تسلسل سے آئے ہیں ذہن پریشان ہو گیا ہے۔

تمہیں دعا کرنا چاہیے کہ میں جن پریشانیوں سے نبرد آزما ہونے جا رہا ہوں وہ جلد نمٹ جائیں۔''

''آپ مجھ سے اکھڑے اکھڑے کیوں رہتے ہیں......؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''اوہ......شدید حساسیت بھی انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی۔ میں تم سے اکھڑا اکھڑا کیوں رہوگا۔ دماغ خراب ہے میرا۔؟''

''آپ نے مجھے ڈانٹا کیوں تھا؟''

''شامت نے دھکا دیا تھا میری......بھئی ایسی ڈانٹ ڈپٹ تو چلتی رہتی ہے۔ پروا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جو ہماری بھابھی ہیں ناں؟ بھائی جان کے چھینکنے پر چونک اٹھتی ہیں اور بھائی جان ان کی ذرا سی غلطی پر سخت سست سنا دیتے ہیں تمہیں تو پتا ہے بھائی جان کا مزاج...... وہ بھائی جان کے مزاج ہی میں نہیں اس گھر کے در و دیوار میں بھی رچ بس گئی ہیں۔ پروا بھی نہیں کرتیں۔ بس اپنے فرائض کی انجام دہی میں لگی رہتی ہیں...... بھائی جان جتنے دشوار ہیں میں تو ان کا سایہ بھی نہیں ہوں۔ پھر بھی تمہارا یہ حال ہے بھئی تلخی ترشی تو زندگی میں آتی رہتی ہے۔ رشتے اتنے کمزور بھی نہیں ہوتے کہ ان معمولی باتوں سے ان میں دراڑیں پڑ جائیں......کیا تمہیں میری پریشانیوں کا ذرا بھی ادراک نہیں......؟ چلو مجھے ہنستے مسکراتے رخصت کرو......اگر میں جلد نہ آسکا تو بلوالوں گا تمہیں......گھر والوں کا خیال رکھنا۔ میری غیر موجودگی میں تمہیں مسٹر امان اور مسز امان دونوں کی ذمہ داریاں نبھانی ہیں......آیا سمجھ میں......؟''

ساحرہ آنکھیں پونچھ کر کھڑی ہوگئی۔

''کچھ ہو تو نہیں جائے گا امان......؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

''یہ تم ہی بہتر بتا سکتی ہو......'' اس کی آنکھوں میں گم گشتہ شرارت لہرائی۔ ساحرہ نے جھینپ کر رخ موڑ لیا۔

''اچھا دوست......خدا حافظ......'' مانی نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

ساحرہ نے اپنا لرزتا ہوا نازک سا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے امان نے پورے جذبوں سے دبا دیا تھا......اور باہر نکل آیا تھا۔

صبور بھائی...... تمہیں کراچی ائیر پورٹ پر ملیں گے۔ سب کو سلام کہہ دینا۔'' شہلا نے گاڑی کا پٹ تھام کر اندر جھانکا۔

حسن اسے کوئٹہ ائیر پورٹ لے کر جا رہا تھا۔

''بس اماں اب تم برتن دھو کر چلی جاؤ......''

''صاحب چائے کو کہہ گئے تھے بی بی......''

''حسن......؟''

''جی......!''

''اچھا تو......پھر پہلے انہیں چائے دے آؤ۔'' شہلا نے چائے بنانا شروع کر دی...... چائے بنا کر نوکرانی کو دی۔ وہ چائے دے کے آئی تو شہلا بچیوں کے کمرے کا رخ کرنے لگی تھی۔

''بی بی......صاحب آپ کو بلا رہے ہیں......''

''مجھے......؟'' شہلا کو شدید حیرانی ہوئی...... تین ماہ بعد آخر کار حضور کا موڈ خود بخود ٹھیک ہو ہی گیا۔ وہ رخ بدل کر زینے طے کرنے لگی۔

آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر آئی۔ سرمئی شلوار قمیض میں حسن رائیٹنگ ٹیبل کے ساتھ ہی کھڑا ہوا تھا۔

شہلا کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ میاں بیوی کی صلح چھاؤنی۔ ''بستر پر اچھی لگتی ہے اور محفوظ لگتی ہے۔

اسے حسن کا کھڑے ہو کر انتظار کرنا عجیب سا لگا تھا۔

وہ اس کے متوجہ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

حسن نے پلٹ کر اسے گہری نظروں سے دیکھا۔

وہ نزدیک چلی آئی......

''خیریت......؟''

''جو انگاروں پر چلتے ہیں ان کے ہاں خیریت نہیں ہوتی۔'' اس کے لہجے میں گرمی تھی۔

''یہ اس ملک کا قانون ہے محترمہ...... کہ لڑکیاں ماں کو ملتی ہیں اور لڑکے باپ کو......''

حسن......!'' شہلا کا دل دھڑکنا بھول گیا۔

''مگر میں تینوں بچے تمہیں دے رہا ہوں تاکہ مجھے قانون کی زنجیر میں الجھاتی نہ پھرو......''

''میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں......'' وہ بیڈ کی لرزتی ہوئی قریب پڑی کرسی پر ڈھے گئی۔

''حالانکہ یہ بات آسان ہے......

ہماری شادی کو کتنے سال ہوئے شہلا......؟''

''تت...... تیرہ سال......''

حسن تیزی سے اس کی سمت آیا تھا اور ملک نواز کا محبت نامہ اس کے سامنے پٹخ دیا......

''یہ اپنی عاشقی کے پندرہ سال کا ذکر کر رہا ہے۔''

''پاگل ہے یہ شخص...... سنا آپ نے...... دیوانہ ہے یہ......''

''ہاں جانتا ہوں یہ دیوانہ ہے...... تمہارا...... بزدل عورت...... تم نے اس کی زندگی بھی عذاب کی اور میری بھی۔''

''ہوش میں رہ کر بات کیجیے حسن......!'' وہ چیخ پڑی۔

''شہلا...... شادی کو تیرہ سال ہوئے...... منگنی کو چودہ......

دو سال کا حساب دو شہلا۔''

''میرے پاس آپ کی رکیک باتوں کا کوئی جواب نہیں......''

''تمہیں معزز بننے کا ایسا ہی شوق تھا تو اسے اس راہ پر کیوں لائی تھیں......

''میں آپ کی بیوی ہوں حسن۔ ہوش میں رہ کر بات کیجیے۔''

''تم نے بہت ڈرامے رچانے کی کوشش کی...... اپنی نام نہاد عزت کا بھرم رکھنا چاہا۔ بے روح جسم میرے سپرد کر کے تم نے میری مردانگی کا تیرہ سال مذاق اڑایا......''

''آپ کو انسانوں کی پرکھ بالکل نہیں ہے حسن...... میں نے اپنی ہستی خاک کر لی۔ لیکن بے سود...... میں نے اس گھر کے ہر فرد کو اولیت دی...... اپنی انا مٹا ڈالی۔ آپ کی خاطر بعض اوقات بہت کچھ سن کر بھی چپ رہی...... اور اور......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں...... شہلا تم نے سنا نہیں مجرم دگنا جھکتا ہے۔'' حسن کے لہجے میں تلخی تھی۔

اب تو حد ہو گئی تھی...... وہ آنکھیں پونچھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ہاں...... وہ میرا عاشق ہے...... میں نے اسے خطوط لکھے...... مجھے آپ سے نفرت اور اس سے محبت رہی ہے۔ میں نے اسے دعوت نامہ بھیج کر کوئٹہ بلوایا۔ اسے اپنے گھر ٹھہرایا...... سنا آپ نے...... میں نے اسے بلا کر مہمانداری کا لطف اٹھایا۔

حسن دانت پیس کر اس کی سمت بڑھا تھا...... وہ ایک طرف ہٹ گئی تھی۔

''کوئی حق نہیں ہے آپ کو کہ آپ میرے قریب بھی آئیں تنگ نظر اور وحشی انسان۔'' وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔

میں امی کی وجہ سے خاموش ہو رہا تھا۔ ورنہ اس خط کے بعد ایک منٹ تمہیں اس گھر میں نہ رکھتا۔

تمہارے پاس دو سال کا حساب نہیں۔ میرے پاس تمہیں بیوی کی حیثیت میں رکھنے کا جواز نہیں۔!''

''کہاں ہے طلاق نامہ۔؟'' وہ پھنکاری۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا...... میں تمہیں ''اس'' کے لیے آزاد نہیں کروں گا...... جو بیوی نیک نیت نہ ہو...... وفادار نہ ہو اسے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گزارنا چاہیے......'' حسن کے لہجے میں وحشت و سفاکی تھی...... شہلا کو اس کے وجیہہ چہرے سے کراہیت محسوس ہو رہی تھی

اس نے کبھی اس ذلت کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ جو شخص تیرہ سالوں میں اپنی بیوی کو نہ پہچان سکے اسکے ساتھ ایک پل رہنا بھی انسان کے اوپر ظلم ہے۔

''اس کے یہ ''محبت نامے'' ہتھوڑوں کی طرح تیرہ برس میرے سر پر برستے رہے ہیں۔

محترمہ...... اب حد ہو گئی ہے...... اور بات کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ تم نے بھی تنگ آ کر حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ میں وہ مرد نہیں ہوں جو محض بیوی کی صورت سگھڑاپے سے بہل جائے...... مجھے ہر چیز خالص چاہیے۔ جیسا میں خود ہوں۔ یہ فیصلہ تین ماہ قبل ہو چکا۔ اب اس میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

میں جب چاہوں بچوں سے مل سکتا ہوں۔ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے چلی جاؤ۔''

''تم ایک بے رحم انسان ہو۔'' وہ آپ سے تم پر آ گئی تھی۔

''تمہیں اپنے اندھے جذبات میں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ دوسرے لوگوں پر ان فیصلوں کا کیا اثر پڑے ...... کہ ایک بوڑھا باپ......''

''مت کرو میرے بوڑھے باپ کی فکر...... اور بند کرو یہ ڈائیلاگ......'' وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

یہ بات ایسی نہیں تھی کہ دبا لی جاتی۔

جب رو رو کر نیم جان ہو گئی تو چچا جان کے پاس چلی آئی تھی۔

''وہ ایسا نہیں کر سکتا۔'' ان کی آواز کانپ گئی تھی۔

''انہوں نے ایسا کر دیا ہے چچا جان...... اب وہ کچھ سننے پر آمادہ نہیں ہیں......''

''دماغ خراب ہے اس کا۔ ارے تمہارا تو کبھی جھگڑا بھی نہیں ہوا ہے۔''

''یہ میرا ہنر ہے چچا جان۔ ورنہ ان تیرہ سالوں میں بہت کچھ ہوا ہے۔''

"شہلا...... میری بیٹی...... تو میری سگی بھتیجی ہے۔ بھائی کی اولاد اپنی اولاد ہوتی ہے۔ تو نے مجھ سے ایک بار تو کہا ہوتا...... دکھ اندر ہی پلتے رہیں تو ناسور بن جاتے ہیں۔" انہوں نے لرزتا ہوا ہاتھ شہلا کے سر پر رکھ دیا۔ وہ ضبط نہ کر سکی ان کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"وہ تجھ سے معافی مانگے گا۔ میں دیکھ لوں گا اسے۔"

"وہ کچھ نہیں سنیں گے...... آپ دیکھ لیجیے گا...... اور سچ بات کہوں اب میں ایسا چاہوں گی بھی نہیں۔"

وہ چونک گئے۔

"ہمارے ہاں خاندان ہی میں شادیاں ہوتی ہیں۔ ہماری سات پشتوں میں یہ نہیں ہوا۔ ان باتوں کا ہمارے ہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... تمہیں نباہنا چاہیے شہلا۔"

"چچا جان...... تیرہ سالوں سے بناہ نہیں رہی تھی تو کیا کر رہی تھی......؟ کہ آپ کو بھی اپنے ہر دکھ سے لاعلم رکھا۔ اسے نباہنا نہیں کہتے تو پھر کسے کہتے ہیں۔"

"شہلا...... میری بیٹی...... ان باتوں کی بڑی ٹھوس وجہ ہوتی ہے۔ وہ یہ زیادتی کیوں کر رہا ہے۔ مجھے اندھیرے میں نہ رکھو۔"

"چچا جان......!" وہ جھجک کر رک گئی...... "انہیں میرے مورل کیریکٹر......" وہ شادی شدہ عورت تھی...... اور پھر وقت بھی کڑا تھا۔ اسے سچ منہ سے نکالنا پڑا۔ وہ طیش میں کھڑے ہو گئے۔

"میں اسے جان سے مار دوں گا...... اس کی اتنی ہمت کیسے ہوئی...... وہ ہے کہاں......؟" اس سے پہلے وہ کچھ سمجھتی وہ باہر نکل گئے تھے۔ وہ کسی متوقع حادثے کے خیال سے ان کے پیچھے بھاگی۔

وہ اندر کمرے میں بلند آواز سے دہاڑے تھے۔

"شرم نہیں آئی اسے آپ کو یہ بتاتے ہوئے...... اس کے لیے بہتر تھا وہ خاموشی سے چلی جاتی......"

وہ اس گھر سے کبھی نہیں جائے گی۔...... یہ گھر اسی کا ہے...... تمہیں شرم نہیں آتی یہ واہیات باتیں اس سے منسوب کرتے ہوئے۔ اتنے بڑے بچوں کے باپ ہو...... کوئی کھلنڈرے...... لڑکے ہو......؟ تم نے اس کی بے عزتی کی ہے۔ وہ ہمارے خاندان کی تمام بچیوں میں مثالی اور لائق احترام ہے۔ اس سے دگنی عمر کے لوگ اس کا احترام کرتے ہیں۔ اور تم......"

"اسی احترام نے تو اس کی جان عذاب میں کر رکھی ہے۔ وہ کوئی من پسند قدم اٹھانے سے اسی احترام کی وجہ سے تو مجبور رہی ہے۔"

"میرا ضبط نہ آزماؤ حسن......!"

"ابو...... یہ سراسر میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ کو تمام باتیں معلوم نہیں......"

"خوب جانتا ہوں میں...... پچھتاؤ گے...... یہ داغ صرف اس پر نہیں۔ ہم سب پر لگے گا۔ وہ اس گھر سے نہیں جائے گی۔"

"کیوں نہیں جائے گی۔؟"

"میں کہہ رہا ہوں اس لیے نہیں جائے گی...... تم اس وقت جذبات میں اندھے ہو رہے ہو...... جب یہ طوفان تھمے گا تب تمہیں احساس ہوگا...... تمہیں تو اس گھر پر گزرنے والے حادثوں کا بھی احساس نہیں۔"

"میں ان حادثوں کا سبب نہیں ہوں۔ آپ لوگوں کے لیے جو مجھ سے ہو سکا میں کروں گا۔"

"اگر تم اپنے الفاظ واپس لینے پر آمادہ نہیں...... تو میں تمہارے ہاتھ سے پانی پینا حرام سمجھتا ہوں۔" ان کی آواز غصے سے کانپ گئی۔

"آپ اس کے سحر سے آزاد نہیں ہیں اس لیے مجھ پر زیادتی کر رہے ہیں۔ میں آج تک اندھے راستوں پر چلا ہوں۔ اب سب کچھ میری برداشت سے باہر ہے۔ شوق سے آپ اسے اس گھر میں رکھیں۔ میں خود اپنا انتظام کر لوں گا۔"

"بہت شوق ہے۔ جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ۔ آخر لوٹ کر ادھر ہی آنا ہے۔"

"آپ حقیقت سے واقف نہیں ہیں اس لیے یہ طرز عمل۔"

"تم اپنی حقیقتوں سمیت یہ گھر چھوڑ دو۔"

"بہتر...... میں اپنے بچوں سے ملنے آتا رہوں گا۔ اسے میری کمزوری یا شکست نہ سمجھا جائے۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔"

"آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ میرا معاملہ بددیانت سے ہے بچوں سے نہیں۔"

وہ ہما اور حنا کے کمرے میں چلی آئی ٹوٹے ہوئے قدموں سے۔

دس بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

"ہما......!" حسن کی آواز تھی۔

وہ تیزی سے اٹھ کر ڈریسنگ روم میں چلی گئی...... وہ اندر آ گیا تھا۔

"ہما...... حنا...... بھئی ہم ٹرپ پر جا رہے ہیں۔ گڈو کو ہمارا پیار دے دینا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں پپا......؟" حنا نے بیڈ پر کھڑے ہو کر باپ کے گلے میں بازو ڈال دیا۔

"دیکھو بیٹا...... باتیں پھر...... او کے...... وش یو گڈ لک مائی ڈاٹرز......" وہ پتھر نہیں تھا۔ شوہر کا دل گھٹتا بڑھتا چاند ہو سکتا ہے۔ باپ کا دل آفتاب ہوتا ہے جس کی روشنی و حرارت ایک سی ہوتی ہے۔

اس کے بھاری بوٹوں کی آواز دور ہو گئی تھی۔

حنا نے جب دبے پاؤں اندر جھانک کر ماں کو روتے دیکھا تو فوراً ہما کو آواز دی۔

"ہما باجی...... امی رو رہی ہیں......"

وہ دونوں اندر چلی آئیں...... حنا نے اس کا شانہ چھوا۔

"امی...... پپا دور گئے ہیں آپ اس لیے رو رہی ہیں......؟" اس کی روہانسی صورت دیکھ کر شہلا نے اسے سینے سے لگا لیا اور بری طرح رو دی تھی۔

باہر شدید بارش ہو رہی تھی۔ وہ کافی دیر سے آملیٹ بنانے میں مصروف تھا...... کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فرائی پان نیچے اتار کر رکھا اور تیزی سے فون کی سمت آیا تھا۔

"ہیلو...... اوہ...... السلام علیکم......"

"بالکل خیریت ہے۔ شدید ٹھنڈ ہے...... جما جا رہا ہوں۔"

"ہاہا...... ہا...... نہیں نہیں...... اکڑ سکتا ہوں...... بوقت ضرورت...... موسم مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے...... موسم انسان کے اندر ہوتے ہیں...... اول تو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ......"

"آپ کے فون سے ہی میں سمجھ گیا تھا...... کہ آپ نے بلا وجہ اتنا خرچ برداشت نہیں کیا ہے۔ بلکہ سبب ہے

ضرور۔ جی......؟......اکتوبر میں کیسے آسکتا تھا۔ آپ سے رابطہ تو برابر رکھا ناں...... میں......؟ نام میں خود رکھوں گا ملک نواز کی آواز خود بخود مدھم ہوگئی تھی۔

"تو کب پہنچ رہے ہو......؟" ڈاکٹر باقر کی آواز ایرپیس میں ابھری۔

"جلدی ممکن نہیں ہے...... باقر بھائی! بات دراصل......"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم بچے کا نام جو رکھنا چاہو مجھے فون کر کے بتا دینے...... اور ذرا جلدی......"

"بے فکر ہیں باقر بھائی۔ اور ہاں وہ......" وہ جھجک کر رکا۔ پھر گویا ہوا۔ "وہ کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہے ملک! اس نے جس قدر تکلیف اٹھائی ہے تم تصور نہیں کر سکتے۔ بلکہ مجھے تو اس کے بچ جانے پر خیرت ہے۔ میں نے تمہارے بیٹے کی پیدائش سے پہلے اس کی کئی تصاویر اتاری ہیں کہ تم انہیں دیکھو اور اپنی غلطی کا تاوان کبھی ادا کرنا نہ بھولو۔ شاید تمہیں میری بات اچھی نہ لگی ہو۔ اس کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ وہ کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ بہر حال ایک خبر یہ بھی ہے کہ اس کا علاج شروع ہو چکا ہے۔ ادر بھئی باقی آیندہ فون پر...... نام اچھا سا رکھنا...... شاید اس کی ماں کو تم کچھ نہ دے سکو۔ کم از کم بیٹے کا اچھا سا نام ہی دے دو...... خدا حافظ......" فون رکھ دیا گیا۔

"خدا حافظ...... باقر بھائی! اپنا نام دے رہا ہوں دونوں کو یہ کیا کم ہے...... لوگ تو اسٹامپ پیپر پر لکھے معاہدوں سے پھر جاتے ہیں۔" اس کے کمزور نفس نے غرور سے سوچا۔

پھر وہ نام کے چکر میں پڑ گیا۔ اس کی زندگی ہمیشہ سے بے ترتیب تھی۔ کسی پروگرام اور سوچ نے اسے زچ نہیں کیا تھا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ بھی صاحب اولاد ہوگا۔ اس نے تمام واقعات سامنے رکھتے ہوئے بچے کا مستقبل تک پلان کر لیا۔ ایک تصوراتی مضبوط نوجوان کو سامنے بٹھا کر اس پر نام سجانے شروع کیے۔ اگر اسے خیال ہوتا کہ نام کے معرکے سے بھی گزرنا پڑے گا۔ تو بہت پہلے سوچ لیتا۔ وہ خانگی زندگی سے بے بہرہ۔ غافل انسان...... اسے کیا معلوم تھا۔ میاں بیوی کے رومان کا منتہٰی یہ خوبصورت سی الوہی سی مسرت ہوتی ہے۔ جب دونوں فرائض کے طوق اتار کر سکون کے ستر اوڑھ کر مستقبل کی باتیں کرتے ہیں تو اپنے بچوں کے بڑے خوبصورت نام بھی سوچ ڈالتے ہیں۔

اسے یہ کام تن تنہا کرنا پڑ رہا تھا۔

آخر جن بچوں کی مائیں مر جاتی ہیں ان کے نام بھی تو ان کے باپ ہی رکھتے ہوں گے۔ اسے ایک منفرد سے نام کی تلاش تھی۔ آخر وہ کامیاب ہو ہی گیا۔

صبح جلد بیدار ہو کر معمولات سے نمٹ کر اس نے اطمینان سے پاکستان فون کیا۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر باقر کی آواز ابھی تھی۔

جب مخصوص روایتی آداب وسلام سے فارغ ہوئے تو اس نے بڑے اہتمام سے بتایا۔

"میں اس کا نام شہپر تجویز کیا ہے۔"

"دیکھو بھئی، میں ادبی لحاظ سے بڑا نااہل قسم کا شخص ہوں...... یہ کیا نام ہوا......؟"

"اس کے معنی ہیں وہ بڑا پر جو پرندے کو اونچائی پر اڑنے کی طاقت اور ہمت دیتا ہے اور مخالف ہوا میں استقامت دیتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے ان چیزوں کی ضرورت آیندہ زندگی میں پیش آسکتی ہے۔" اس کا لہجہ گمبھیر اور سنجیدہ تھا۔

"گڈ...... بہت اچھا اور منفرد نام ہے۔"

"انشاء اللہ کل تک تمہارے بیٹے کا برتھ سرٹیفکیٹ تیار ہو جائے گا۔ ملک شہپر نواز؟"

"جی۔ آپ نے میری وجہ سے بے حد تکلیف اٹھائی۔ اس کا مجھے شدت سے احساس ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"یہ چیز میرے اپنے قلب کا اطمینان ہے۔ میں دنیا پر چھائے ظلم وزیادتی کے مہیب سائے نہیں دور کر سکتا مگر جو میرے اختیار میں ہے۔ میں اس سے چشم پوشی نہیں کر سکتا۔ ملک! گناہ پر ندامت اسے آدھا دھو دیتی ہے۔ اور کفارہ مکمل۔ ہر قدم پر امتحان کھڑے انتظار کر رہے ہیں۔ سکون نشے میں نہیں دل کے اطمینان میں ہے اور دل کے اطمینان سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ امید کرتا ہوں کہ جلد آنے کی کوشش کرو گے۔ جو باقی رہ گیا ہے اسے بھی دھو ڈالو گے۔ تم نے بچے کو بڑے ظرف کے ساتھ...... نام اور نسب میں شریک کر لیا ہے۔ یہی قدرت کا منشاء ہے۔ اور یہی خانگی زندگی کا مقصد...... تا کہ ہر انسان اپنی واضح شناخت کے ساتھ زندہ رہے۔"

"میری تمام تر کوشش ہے کہ میں وطن جلد پہنچوں۔"

"میں نے ثریا کی اور بچے کی تصاویر ارسال کی تھیں......"

"ابھی تک تو نہیں ملیں۔ آج کل میں شاید مل جائیں...... اچھا خدا حافظ۔" اس نے فون رکھ دیا۔

نام کے مرحلے سے گزر کر اسے سکون سا مل گیا تھا۔

وہ اپنے اپارٹمنٹ کے زینے طے کرتے واپس پلٹ آیا۔ اور سامنے بنی ایک عمارت کے سادہ سے اپارٹمنٹ کی بیل بجائی تھی۔

ایک نیگرو عورت نے پہلے کھڑکی سے باہر جھانکا پھر ملک نواز کو دیکھ کر جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

"اوہ...... مسٹر ملکھ!" وہ بڑے بھونڈے انداز میں مسکرائی اور اسے بیٹھنے کو کہا۔

"نہیں مادام! بیٹھوں گا نہیں۔ بس یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ میرا کوئی خط تو نہیں آیا رجسٹرڈ۔؟"

اس کے جواب میں مادام ماریہ نے تین لفافے اس کے سامنے ڈال دیے۔

"یہ لفافہ رجسٹرڈ تھا۔" اس نے انگلش میں کہا۔! اور وہ لفافہ نکال کر اس کے سامنے کیا۔ وہ شکریہ ادا کر تیزی سے اپنے اپارٹمنٹ میں آیا تھا۔

تیزی سے پہلے وہی لفافہ چاک کیا جو مادام ماریہ نے رجسٹرڈ بتایا تھا۔

کئی تصاویر پھسل کر نیچے گر پڑیں۔ اس نے جھک کر اٹھائیں اور صوفے پر اڑا تر چھا سا لیٹ گیا۔ بے حد خوبصورت اور صحت مند بچے کی تصویر اس کی انگلیوں کی پوروں میں لرز رہی تھی۔ بچے کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا بچے کی آنکھیں نیلی ہیں بالکل فارنر لگتا ہے۔ اس نے پرشوق انداز میں بچے کی ایک ایک تصویر دیکھی لیکن اس کی آنکھیں ہر تصویر میں بند تھیں۔ البتہ ٹھوڑی کا گڑھا نمایاں تھا۔ ملک نواز نے بے اختیار اپنا ہاتھ اپنی ٹھوڑی پر پھیرا۔

"گواہی لے ہی آئے یار۔"

ثریا کی تصاویر بھی تھیں۔ وہ مبہوت سا دیکھتا رہ گیا۔ گھاس پر پاؤں پھیلا کر بیٹھی ہوئی ثریا بڑی بھاری بھرکم سی لگ رہی تھی۔ ہاتھوں کو پیچھے کر کے گھاس پر جما رکھا تھا۔ یوں جیسے گرتے گرتے سنبھل رہی ہو...... عجیب تھکا تھکا سا انداز تھا۔ ایک تصویر میں سسٹر اس کے بال سلجھا رہی تھی۔ اور وہ غالباً کیمرے کی طرف بڑی توجہ سے دیکھ رہی تھی۔

ایک تصویر میں وہ اس قدر حسین دکھائی دی کہ وہ ٹھٹک سا گیا۔ حالانکہ سرخ کڑھی ہوئی چادر میں اس کا وجود چھپا ہوا تھا۔ اس نے اپنے پیر بھی سمیٹ کر صوفے میں دھنسا رکھے تھے۔ پورا سراپا سرخ چادر کے حصار میں تھا۔ گلابی

گلابی پاؤں اور گلابی چہرہ چادر کی حد سے باہر تھے۔ اس کی سبز آنکھوں نے تصویر کو شہکار بنا دیا تھا۔ اس بے تکلف پوز میں اس کا حسن غیر معمولی ہو گیا تھا۔

ایک تصویر کو دیکھ کر اس کی نظریں ٹھٹکا کر رہ گئی تھیں۔

وہ گیلے بالوں کے ہمراہ غالباً بالکنی میں کھڑی تھی۔ سسٹر تھریسا بھی اس کے ساتھ تھی۔ بغیر دوپٹہ کے فٹ کر قمیض پہنے ہوئے۔ اس کا سراپا بھاری اور بے ڈول ہو رہا تھا۔ اس نے تصویریں بار بار دیکھیں۔ اس نے تصویر اور بھی قالین پر پڑی بار بار دیکھیں۔

معاً اس کی نظر نیچے قالین پر پڑی۔ ایک تصویر اور بھی قالین پر پڑی ہوئی تھی۔

اس کے آگے جھک کر اٹھائی۔ اس میں ثریا کا صرف چہرہ تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں چہرے پر پانی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ غالباً......

تصویر کے پیچھے ڈاکٹر باقر کی تحریر تھی۔ جب ثریا کو موت کے پسینے آ رہے تھے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک شدید دکھ کی لہر اس کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی۔ اس کے نیچے مزید لکھا تھا۔

اس تصویر کو سنبھال کر رکھنا۔ ہوش میں لانے والی دوا کے طور پر۔"

"ابھی تک آپ کو مجھ پر شک ہے باقر بھائی۔ کمال ہے۔" اس نے تصویریں سائیڈ ٹیبل پر ڈال دیں۔ اور تلخی سے مسکرا دیا۔ باقی دو خطوط اسی طرح بند پڑے تھے۔

احساس شکستگی اسے دن میں ہزار بار توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا تھا۔

اسے کسی بات کا غم نہیں تھا۔ اسے ساری زندگی اسی بات کا تعجب ہوتا تھا کہ آخر مرد عورت کو شک کی نظر سے کیوں دیکھتا ہے۔ غم تھا تو یہی کہ اس سے کس قدر رکیک الزام منسوب کیا گیا۔

کیا عورت اتنی احمق اور اسفل ہوتی ہے کہ اس کے لیے اتنی گری ہوئی بات سوچی جا سکے۔ آج کی عورت تعلیم یافتہ اور آگاہ ہے۔ اور بے حد خوددار اور انا پرست۔

وہ سوچ ضرور لیتی ہو گی۔ کسی چہرے کے بارے میں......لیکن جذبوں کی تسکین کے لیے آج کی عورت مرد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے بجائے کسی فیکٹری میں مشین کا پہیہ چلانے کو ترجیح دیتی ہے۔

آج کی عورت فیشن زدہ ہے لیکن آبرو باختہ نہیں۔ اس نے آگہی حاصل کر لی۔ اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ وہ کمانے لگی ہے۔ اسے کمانا اور خود پر خرچ کرنا اچھا لگتا ہے کہ خرچ بار احسان سے بوجھل نہیں ہوتا۔ عورت جتنی آگاہ ہوئی ہے۔ اتنی ہی شدت سے پارسا اور معزز کہلانے کی شوقین ہوتی ہے۔

جہالت کے غلاف میں لپٹی عورت کا ذہن محدود ہوتا ہے۔ اس کی خواہشات ابتدائی زمانے کی خواہشات سے دور نہیں ہوتیں۔ اس کا ذہن......تنور......آٹا......مرد......اور بچوں سے باہر نہیں آ پاتا۔

یہ خواہشات متمدن اور مہذب عورت میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر عورت انا پرست بہت ہو گئی ہے۔ اسے نفس کے تقاضوں سے آنکھیں چرانا خود کو مضبوط سمجھنے کی ضمانت لگتا ہے۔ اس کے لیے یہ احساس ہی باعث افتخار ہے کہ لوگ اسے مضبوط سمجھیں......چھی۔ چھی......اسے تصور کر کے ہی جھرجھری آ گئی۔ وہ تو سمجھتی رہی کہ وہ انتہائی مضبوط اور معزز نظر آتی ہے۔ کوئی اس سے اتنی گراوٹ کی توقع نہیں کر سکتا۔ شوہر سے بڑھ کر بیوی کو پرکھنے کی کسوٹی کون ہو سکتا ہے؟

کاش حسن! تم یہ رکیک الزام منہ سے نکالے بغیر راہ لگ کر لیتے۔ کہ میں اب تمہارے سائے سے بھی بھاگتی ہوں......

ہزار بار سوچا ہے۔ لوگ عورتوں پر گھناؤنا الزام کس طرح لگا دیتے ہیں؟ کیا عورت کو وہ نفسانی خواہشات کا تابع جانور سمجھتے ہیں۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔ جو مرد عورتوں کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہوتے ہیں۔

تم میں کس چیز کی کمی ہے حسن!......تمہاری شدتیں آج تک ویسی ہی تھی جیسی تیرہ سال پہلے تھیں۔ میری ذمہ داریاں مجھے تھکا دیتی تھیں۔ مگر تم......؟ میں تھک کر ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح بستر پر گر کر آنکھیں موند لیتی تو تم کس قدر چڑ کر کہتے تھے۔

بہت بور ہو گئی ہو شہلی۔ اتنی دیر سے انتظار کر رہا تھا۔

سچ ایسے میں تمہاری شدتیں مجھے بعض اوقات وبال لگتی تھیں......تم خوبصورت ہو......صاحب جائیداد ہو۔ ایک معزز عہدے پر فائز ہو۔ میں نے کسی نہ کسی طور اپنی چاہت کا ہزار بار اعتراف کیا۔ تمہیں کیا احساس کمتری ہو سکتا ہے......میری سمجھ میں نہیں آتا۔

میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے......میں آزادی......پابندی کے احساس سے بے نیاز رہ کر اپنے بچوں کو پرورش کروں گی۔ میں ان پودوں کی پرداخت کروں گی۔ اس بات سے بے نیاز ہو کر انہیں درخت کی صورت دیکھنا چاہوں گی کہ مجھے ان کا سایہ یا پھل ملیں گے۔

بچے تو چھوٹے چھوٹے کھلونے ہوتے ہیں۔ ان میں جذب ہو کر ان سے اس طرح کھیلنا چاہیے کہ کھیل کھیل میں کارنامے سرزد ہو جائیں۔ میں فولاد سے نہیں ڈھلی ہوں حسن! تم نے تاک کر میری روح پر تازیانہ لگایا ہے۔ میں نے اپنا معاملہ خدا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لوگ پیغمبرؑ کی بیوی پر انگشت نمائی کر سکتے ہیں۔ میں کیا چیز ہوں......"

اس نے آنسو پونچھ کر حنا ہما کا یونیفارم وارڈ روب میں لٹکایا اور پلٹی تو یہ دیکھ کر چونک گئی کہ چچا جان دروازے میں کھڑے ہیں۔

"اندر آ جائیں چچا جان!"

"بیٹے......! میں یہ کہنے آیا ہوں کہ بھائی صاحب اور بھائی کو کچھ نہ لکھ بیٹھنا۔ میں ان سے تاحیات نظر نہ ملا سکوں گا۔"

"آپ بے فکر رہیے چچا جان میں نے انہیں کبھی کچھ نہیں......لکھا اور نہ اب لکھوں گی۔ انہوں نے مجھے پرورش کیا تعلیم دلائی۔ آئیڈیل گھریلو ماحول دیا تا کہ ہم اکتساب کر سکیں۔ اپنی دانست میں بہترین شخص چن کر میری شادی کی۔ میرا باطن گواہ ہے کہ میرے والدین نے اپنا ہر فرض بہ احسن خوبی ادا کیا۔ اب آگے کے تمام جھگڑے مسائل میری ذمہ داری ہیں۔ میں اب مزید بوجھ اور ذمہ داری سے ان کی کمر نہیں جھکاؤں گی۔ سب کچھ جھیل لوں گی۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر شہلا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میری بیٹی ہو تم......میں تمہارے صبر اور حوصلے سے طاقت پکڑتا ہوں۔ تم بہو کی حیثیت سے میرا انتخاب تھیں۔ تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ میں نے بارہا بھائی صاحب سے کہا ہے کہ آپ نے جس پودے کو پروان چڑھایا۔ اس کے پھل، میں اور میرا گھر کھا رہا ہے۔ وہ انتہائی احمق ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ ایک دن تمہارا صبر رنگ لائے گا۔ مجھے صدمہ بھی ہے اور حیرت بھی۔ حسن سے میں کبھی یہ امید نہیں کر سکتا تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ جو خدا پر توکل کرتے ہیں۔ حالات ان کی

گرفت میں رہتے ہیں۔

"ہونہہ۔ ابھی بھی گرفت میں ہیں حالات؟" اس کے ذہن نے استہزاء کیا۔

☆☆☆

اس نے ڈاکٹر باقر کے کہنے کے مطابق یہاں انتظامات کرنا شروع کر دیے تھے۔

ڈاکٹر باقر نے لکھا تھا۔ انہوں نے چند ضروری کوائف خود حل کر کے ضروری کاغذات کے ساتھ منسلک کر دیے ہیں اور میڈیکل رپورٹ ان کاغذات کے ہمراہ ہے۔ جس کے مطابق وہ بچپن ہی سے ذہنی مریضہ ہے۔ اس لیے اس کی شناخت کی گواہ کوئی سند تیار نہیں ہو سکتی۔

انہوں نے مزید لکھا تھا کہ انہیں اس سلسلے میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑا ہے اور یہ کہ وہ جلد پاکستان پہنچے لیکن وطن واپس پہنچنے سے پہلے وہاں انتظامات کرتا آئے۔

اس لیے کہ اس کی غیر موجودگی میں کام نامکمل رہے گا اور اپنے وہ تمام کاغذات جو امریکی اور پاکستانی سفارت خانے سے تصدیق شدہ ہوں۔

انہوں نے ڈاکٹر باقر کے کہنے پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا۔

ڈاکٹر باقر نے مزید لکھا تھا۔ بچے کے بارے وہ خود فیصلہ کرے ساتھ رکھنے کا یا کہیں اور رکھنے کا جو مناسب سمجھے کرے۔ اور اگر ساتھ ہی رکھے تو آئندہ کی کافی پریشانیوں سے بچ جائے گا۔

"یہ بھی مسئلہ ہے۔" اس نے سر کھجایا۔

"مسئلہ؟ یہی تو اصل مسئلہ ہے۔" کوئی اس کے اندر جھانک کر شرارت سے مسکرایا۔ کئی دن ادھڑ بن میں گزرے آخر کار اس نے ہر مسئلے کا حل نکال ہی لیا۔

بارہا اسے خود پر حیرت ہوئی تھی کہ آیا وہی ملک نواز ہے۔ خانہ بدوش۔ بنجارہ...... جو اک تنکا تنکا جمع کر کے آشیانہ بنا رہا ہے۔

"ملک نواز کتنا بدل گئے تم۔" وہ قمیض کے اوپری بٹن کھولتے ہوئے تلخی سے مسکرایا۔

میں برسوں سے اس اپارٹمنٹ میں تنہا ہوں۔ مگر کبھی احساس تنہائی نہیں ہوا اور اب ایسا محسوس ہونے لگا ہے۔ گھر والے کہیں گئے ہوئے تھے۔ اب واپس آنے والے ہیں۔ وہ غسل کی نیت سے باتھ روم میں گھس گیا۔

ابھی اسے پاکستان جانے کے لیے سیٹ کنفرم کرانی تھی۔ گھر پر خورشید کو فون کر کے اطلاع دینا تھی۔ اور شاپنگ سنٹر جا کر کچھ خرید وفروخت کرنا تھی۔

اس نے جلدی جلدی غسل کیا سب سے پہلے شاپنگ سینٹر کا رخ کیا۔ اپنے کچھ کپڑے وغیرہ لینے تھے اور کچھ روزمرہ کی ضروری چیزیں۔

خوبصورت قیمتی بچکانہ ملبوسات دیکھ کر وہ آگے بڑھا تھا پھر خود ہی رک گیا تھا۔

"یار...... کیا معلوم تمہارا سائز کیا ہے۔ اماں اور ابا تو تمہارے پہلوانوں سے ذرا ہی کچھ کم ہیں۔ اب تمہارا اپنا نہیں۔" اس نے "ویر ہاؤس" سے رخ موڑ کر دل ہی دل میں کہا تھا۔ "پتا نہیں اتنے سے بچے کو "کوکیز" اور کینڈیز (CANDIES) کھلاتے ہیں یا نہیں۔؟"

"معاف کر دینا یار اپنے باپ کو...... کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے لیے کیا لیا جائے؟" وہ

اپنی گاڑی کی سمت چلا آیا تھا۔

خورشید گیٹ کھولے اس کا منتظر ہی تھا۔

آف وہائٹ سوٹ مع نکٹائی آنکھوں پر گلاسز چڑھائے۔ صاحب کو دیکھ کر اس کی خوشی کی حد نہ رہی۔

ملک نواز ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے لگا۔ خورشید نے جھٹ پٹ سامان اندر رکھنا شروع کر دیا۔

وہ اندر چلا آیا۔ خورشید نے شاید اہتمام سے صفائی کا انتظام کیا تھا۔ اس لیے کہ گھر کچھ زیادہ چم چم کر رہا تھا۔ گیٹ بھی چمک رہا تھا۔ غالباً اس نے خود ہی گیٹ پر رنگ کیا تھا۔

"کیسے ہو خورشید۔؟"

"بالکل ٹھیک ہوں صاحب۔"

"ہاں بھئی پنجاب کب جا رہے ہو؟" اس نے ریسٹ واچ اتار کر کارنس پر رکھی۔

"بھئی وہ رب نواز بھائی نے خط لکھا تھا۔ کہ تمہاری ماں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہے۔" اس نے خورشید پر اچٹتی سی نظر ڈال کر نکٹائی سے گردن آزاد کی۔

"جی صاحب!" خورشید مارے شرم کے دوہرا ہو گیا۔

"بھائی نے لکھا تھا جب میں پاکستان پہنچوں تو خورشید کو فوراً پنجاب روانہ کر دوں۔ پھر......؟ کب روانہ ہو رہے ہو؟"

"صاحب! ابھی تو نہیں جاؤں گا۔ دن تو لگیں گے۔ اور شادی تو اگلے ماہ ہے ابھی تو نہیں۔" اس نے صاحب کے جوتے اٹھا کر وارڈروب کے نچلے خانے میں رکھنا چاہے تو ملک نواز نے ٹوک دیا۔

"بھئی، ابھی تو میں نے اتارے ہیں۔ ابھی انہیں ہوا لگنے دو...... اور بیگ میں ایک گلابی ڈبہ ہے، لوشن ہے اس میں۔" بس خورشید کو اتنا بتانا ہی کافی تھا۔ اسے معلوم تھا جوتوں میں اندر لوشن لگا کر پھر ٹھکانے پر رکھنا ہیں۔

وہ صاحب کی نفاست سے بے حد مرعوب تھا۔ خود بھی صاحب کی نقل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب صاحب کے آنے پر ہفتہ بھر کے لیے گاؤں جاتا۔ جب ملک نواز طویل عرصے تک وطن نہیں آیا تو اس کی ماں اپنے بھائی کو اس کے متبادل بنا کر بیٹے کو بلوا لیتی تھی۔ یہ اور بات کہ اس کا دل گاؤں میں نہیں لگتا تھا۔

گھر جا کر صبح شام غسل کرتا۔ صاحب کی بخشی ہوئی خوشبو بات بات چھڑکتا۔ مجال ہے جو بغیر ٹالکم پاؤڈر چھڑکے قمیض چڑھا لے۔ نہانا پسند نہیں کرتا تھا۔ کہاں یہ خورشید جو ذرا ذرا غوطے لگا آتا تھا۔ بالکل پانی کا جانور بن گیا تھا شہر جا کر......

"سوٹ کیس کھولو خورشید!" اس نے چابی اس کی طرف بڑھائی۔

اس نے دوزانو ہو کر۔ بڑی احتیاط سے سوٹ کیس کے لاک میں چابی گھمائی۔

"صاحب اس کے نمبر تو آپ ہی سیٹ کریں گے۔ لاک تو کھل گیا ہے۔"

"نمبر اس کے سیٹ ہی ہیں۔ دیکھو آٹھ صفر ہی نظر آ رہا ہے۔"

"جی۔" خورشید نے بٹن پش کیے اور کھٹاک کھٹاک سوٹ کیس کھول کر صاحب کے سامنے کر دیا۔

اوپر ہی سفید انڈے جیسی وولن شال رکھی تھی۔ ملک نواز نے تیزی سے اٹھا کر ایک طرف کر دی۔

"بہت خوبصورت شال ہے صاحب! ملکانی کے لیے لائے ہیں؟"

"ہوں،" اس نے بے خبری کے انداز میں ہنکارا بھرا۔

’’بہت پسند آئے گی انہیں۔‘‘

’’دیکھو خورشید۔ یہ تمہارے کچھ سوٹ ہیں۔ بیگ میں ٹیپ ریکارڈر ہے۔ نکال لینا۔ تمہیں گانوں کا بہت شوق ہے ناں۔‘‘ ملک نواز نے سگار کا پیکٹ نکال کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

خورشید کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ ملک نواز پاؤڈر کے ڈبے۔ برل کریم کا پیک اسپرے۔ لوشنز نکال کر نیچے رکھتا جا رہا تھا۔ خورشید دوڑ دوڑ کر سب چیزیں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتا جا رہا تھا۔

’’خورشید!‘‘

’’جی صاحب!‘‘

’’دیکھو کھانا وانا میں کھا چکا ہوں۔ چائے کافی اس لیے نہیں پیوں گا کہ پھر نیند اڑ جائے گی۔ بس نہا دھو کر سوؤں گا۔ صبح آٹھ بجے تک اٹھا دینا مجھے......ٹھیک......؟ میرے کپڑے پریس کر کے وارڈ روب میں لگا دینا۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں۔‘‘

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھ کر کچھ سوچ رہا تھا۔

’’آپ تو انتظار کر رہے ہوں گے باقر بھائی۔ مگر رات ہو چلی ہے اور پھر......دل کو بھی سنبھالنا ہے۔

’’بات سے بات نکل جاتی ہے ملک!‘‘ ڈاکٹر باقر نے سگریٹ سلگائی۔

’’تمہاری خواہش کے مطابق گورنس کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ میں نے عملے پر یہی ظاہر کیا ہے کہ حادثاتی طور پر مریضہ......ذہنی توازن کھو بیٹھی ہے۔ چند ماہ قبل......اس لیے کہ بچے کی پیدائش ایک ذہنی مریضہ کے ہاں......کوئی معمولی واقعہ نہیں پھر عورتیں تو بات بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے مواقع کی منتظر رہتی ہیں۔ اس لیے مجھے جلدی تھی۔ تمہارے آنے کا شدت سے انتظار تھا۔‘‘

’’آپ کا بے حد شکریہ باقر بھائی! آپ کے مخلصانہ طرز عمل نے مجھے سکون کی نیندیں دیں۔‘‘

’’اور ہاں ملک......اب ہاسپٹل کے عملے کو یہی معلوم ہے کہ تم اس ذہنی مریضہ کے شوہر ہو۔‘‘ ملک نواز نے چونک کر ڈاکٹر باقر کی شکل دیکھی۔ سسٹر مارتھا کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔ ایک خفیف سے احساس نے اسے آ گھیرا۔

’’بچہ ہم مریضہ کے سامنے نہیں لائے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر باقر نے برقی گھنٹی کا بٹن پش کیا۔ اسی دم ایک نمکین سے چہرے والی نرس نمودار ہوئی۔

سسٹر رخسانہ......! شہپر کی گورنس کو کہو بچہ لے کر آئے۔ شہپر کے والد آ گئے ہیں۔‘‘

’’اوہ!‘‘ رخسانہ نے پرشوق نگاہوں سے ملک نواز کو دیکھا۔

’’بہت کیوٹ ہے بے بی سر......کونگریچولیشن......‘‘ رخسانہ کے انداز میں بے ساختگی تھی۔

’’شکریہ!‘‘ ملک نواز کو ناچار کہنا پڑا۔

ملک نواز کے اس انداز پر ڈاکٹر باقر کو مسکراہٹ ضبط کرنا مشکل ہو رہی تھی۔

رخسانہ کے جانے کے بعد تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑا تھا۔

پانچ سات منٹ بعد ایک ادھیڑ عورت نیلے کپڑے میں لپٹی ذی روح کو سینے سے لگائے اندر داخل ہوئی۔ اور دونوں کو سلام کیا۔

’’مس آمنہ! یہ شہپر کے والد ہیں۔ مسٹر ملک نواز۔‘‘

’’یقیناً ہیں سر! بہت مل رہے ہیں۔ خاص طور پر پیشانی اور نقوش بالکل سیم ہیں۔‘‘ سسٹر آمنہ نے باپ بیٹے کی ست باری باری دیکھ کر کہا۔

ڈاکٹر باقر نے اشارہ کیا کہ وہ بچہ ملک نواز کے نزدیک لائے۔

سسٹر آمنہ بچے کو اس کے قریب لے آئی۔ بے تحاشا خوبصورت اور صحت مند۔ آئیڈیل سا بچہ۔ تیز تیز ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ گویا کسی کے بازوؤں میں نہ ہو جھولے میں ہو۔ بچے کی آنکھیں نیلی کانچ جیسی اور روشن تھیں۔ گوشت سے بھری ہوئی خوبصورت کلائیاں۔ پھولے پھولے ہاتھ......اس نے بے اختیار بچے کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اور اس کے رخسار چوم لیے۔ یہ اتنے خوبصورت اور حسین بچہ یہ اتنا صحت مند اور مسکراتا بچہ اس کا اپنا تھا۔ اسے یقین کرنا پڑا۔ اس کی نظریں سیر نہیں ہو رہی تھی۔

’’دیکھا ملک! کیسا شاندار تحفہ ہے۔ شکریہ ضرور ادا کرتے جانا اس کا۔‘‘

گویا ڈاکٹر باقر نے شگفتہ انداز میں جتا دیا تھا کہ وہ بچے ہی میں مگن نہ رہے۔ بچے کی ماں کو بھی دیکھتا جائے۔

’’باقر بھائی! میں اپنے ملازم کو پرسوں تک پنجاب بھیج رہا ہوں......تین دن بعد میں اسے لے جاؤں گا۔‘‘ اس نے بچہ، سسٹر آمنہ کی گود میں واپس دے دیا۔

’’دراصل ملازم میرے اپنے گاؤں کا ہے۔ اس کے سامنے لے کر جاؤں گا تو مسائل پیدا ہو جائیں گے۔‘‘

’’اوکے......جیسے تمہاری مرضی۔‘‘

سسٹر رخسانہ دو کافی کے مگ لیے اندر آ گئی۔

’’تمہارا بیٹا تمہارا نقش ہے ملک!......کیوں؟‘‘

جواباً اس کا سر جھکا رہا۔

’’تمام کارروائی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ بعض اہم کاغذات کے ہمراہ تمہارے کوائف منسلک ہوں گے۔ وہاں تو سارے انتظامات کرآئے ہوناں۔‘‘

’’جی......‘‘

’’اچھا بھئی، میری دعائیں نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔ میرے خیال میں ٹریٹ منٹ اور برین واشنگ میں تقریباً ڈیڑھ سال تو لگ جائے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ یہ بالکل ٹھیک جو جائے گی۔ مائیکل آرتھر......اپنے نام کے ایک ہی ہیں۔ اعلیٰ ترین سرجن اور ماہر نفسیات......میں نے ان کے ہمراہ سترہ سال کام کیا ہے۔ یہاں جو میرے کام کی دھوم ہے۔ سب انہی کی شاگردی کا نتیجہ ہے۔ وہ کیا چیز ہیں......میں ہی جانتا ہوں......‘‘

’’بلاشبہ باقر بھائی! باقر بھائی! مجھے تاحیات اس بات کی شرمندگی کی وجہ نکال لائے۔ ویسے ملک ایک بات بتاؤ یہ تمہیں شرمندہ رہنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟‘‘ وہ جھینپ کر رہ گیا۔

’’کافی ٹھنڈی ہو رہی ہے ملک!‘‘

وہ آہستہ قدموں سے اس کے کمرے میں آیا تھا۔

مارتھا۔ بڑے مگن انداز میں نٹنگ میں مصروف تھی۔ ملک نواز کو دیکھ کر چونک پڑی۔

’’گڈ نون......سر......!‘‘

گڈ نون......سسٹر!‘‘ وہ بھی مسکرا دیا۔

"اور سر......! کونگریچولیشن۔"

"تھینک یو......" اس کی نظریں سوئی ہوئی ثریا پر اٹک گئی تھیں۔

"یہ سو رہی ہیں؟"

"بس سر!......ٹیک یور سیٹ پلیز......" مارتھا نے کرسی کھسکائی۔

وہ اس سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔ مارتھا شاکی تھی کہ یہ بات کیوں چھپائی گئی کہ ثریا اس کی وائف ہے۔

"میں سمجھا تھا ڈاکٹر باقر نے آپ کو بتا دیا ہو گا۔"

مارتھا نے بطور خاص پوچھا تھا کہ یہ ٹریجڈی اس کے ساتھ کب ہوئی......؟

وہ مارتھا کے سوالات سے پریشان سا ہو گیا تھا کہ ثریا نے کروٹ بدلی۔ وہ سنبھل گیا کہ ہمیشہ کی طرح وہ چیخیں مار مار کر آپا آپا کرے گی۔

اس نے چور نظروں سے ثریا کی سمت دیکھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ جاگ چکی تھی۔ اور ٹکر ٹکر ملک نواز کو دیکھ رہی تھی۔

مارتھا نے اون سلائیاں سمیٹ لیں اور باہر چلی گئی۔

وہ متردد سا تھا کہ دیوانی سے کیا بات کرے۔ انداز مسیحائی اسے سمجھ نہیں آئیں گے۔ بخار اسے ہے نہیں کہ وہ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر فاقے کی خوش خبری سنائے۔ اسے ثریا کی خاموشی پر حیرت ہو رہی تھی۔

لہٰذا وہ خاموشی سے بیٹھا اپنے جوتے دیکھتا رہا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بیلے کے پھول تھے۔

"وہ کس نے دیے ہیں؟" اس نے اس کی سمت دیکھ کر مشفقانہ سے انداز میں پوچھا۔

"میں نے خود توڑے ہیں۔" اس نے پھول اٹھا کر ناک کے قریب کیے۔

"اچھے لگتے ہیں تمہیں؟"

اس نے گردن ہلا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ نائٹی نما گہرے گلے کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ خوبصورت بال پھیلے ہوئے تھے۔ پھول سونگھتے ہوئے وہ ایک اپسرا دکھائی دے رہی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آستینوں سے باہر اس کے دودھیا بازو بے حد دلکش لگ رہے تھے۔ ملک نواز نے محسوس کیا وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ تروتازہ اور صحت مند ہے۔ چہرے پر بھی خوبصورت سی چمک ہے۔

"تم دور کیوں چلے گئے تھے۔ میں روئی تھی۔" وہ اتنی معصومیت سے بولی کہ وہ بے ساختہ اس کے قریب چلا آیا۔

"تم کیوں روئی تھیں؟" وہ اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

"بس میں روئی تھی۔ اب دور مت جانا۔" اس نے بے نیازی سے اپنا سر ملک نواز کے شانے سے ٹکا دیا۔ کیا انداز اپنائیت تھا۔ اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"تمہیں میرا نام معلوم ہے۔ اس کے وجود سے اٹھتی مہک اس کا دماغ خراب کرنے لگی۔

"نام...... یہ کون ہے......؟" وہ متعجب ہوئی۔

"جیسے تمہارا نام ثریا ہے۔ تمہیں ثریا کہتے ہیں ناں......؟ یہ تمہارا نام ہے؟"

"اور تمہیں 'سر' کہتے ہیں...... یہ تمہارا نام ہے؟" اس نے بھولپن سے پوچھا۔

"سر......؟" اب حیران ہونے کی باری ملک نواز کی تھی۔

"وہ لڑکی تمہیں سر کہتی ہے ناں۔" اس کا اشارہ مارتھا کی جانب تھا۔

اس کا "سر" ہوں تمہارا نہیں۔" ملک نواز نے اسے خود سے الگ کرنا چاہا۔

"میرے کیا ہو پھر......؟" اس کا انداز بے نیازی قابل دید تھا۔

(تمہارا...... گنہگار ہوں...... خطاکار ہوں...... اور......)

"اب تو سب کچھ تمہارا ہی ہوں۔" اس نے گہرا سانس لے کر اس کی مہک اپنے وجود میں جذب کی۔

"تم گانے بھی سنتی ہو؟" معاً ملک نواز کی کیسٹ پلیئر پہ پڑی۔

"وہ لڑکی (مارتھا) سنتی ہے۔ گانے بہت اچھے ہوتے ہیں...... مجھے گانا سناؤ۔"

(ابھی سے "بے دام" بنا رہی ہو) اس نے اٹھ کر ایک کیسٹ لگا دی۔

رفیع کی آواز ابھری۔

لوٹ آئی صدا میری ٹکرا کے پہاڑوں سے
اجڑی ہوئی دنیا کے سنسان کناروں سے
کیا اپنی تمنا تھی...... کیا سامنے آیا ہے
ٹوٹے ہوئے خوابوں نے ہم کو یہ سکھایا ہے
دل نے جسے پایا تھا آنکھوں نے گنوایا ہے

وہ اس کے شانے سے لگی ہوئی بدستور بے خبر تھی۔

"تمہیں نیند آ رہی ہے ثریا......؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔ اس نے احتیاط سے اسے خود سے جدا کیا اور تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر ڈاکٹر باقر کے سامنے تھا۔

"میرے ذہن میں ایک خیال آیا ہے باقر بھائی!"

ڈاکٹر باقر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب تو وہ مسئلہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ بچہ میرے پاس ہے کیوں نہ ہم اسے اس کے گھر پہنچا دیں۔"

"بہت خوب ملک! بہت شاندار آئیڈیا ہے۔ یعنی وقت اور پیسہ دونوں کی بچت......" ملک نواز اس کے لہجے پر چونک اٹھا۔

"م...... میرا مطلب ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں ملک! تمہارا مطلب...... مجھے تم سے زیادہ اور ثریا سے زیادہ بچے سے ہی ہمدردی ہے۔ جب سے میں نے امریکہ میں اور یہاں بھی ماں باپ کے موجود ہوتے ہوئے بھی یتیم و یسیر بچے دیکھے۔ یقین جانو ملک! میرا جی چاہتا تھا کہ کہیں مجھے یہ شقی القلب والدین مل جائیں تو میں انہیں درندوں کے سامنے ڈال دوں۔" ان کے لہجے میں درشتگی عود کر آئی۔

"تمہیں ناصر نے بتایا ہو گا کہ ہمارے والدین بچپن ہی میں وفات پا گئے تھے۔ ہمارے حقیقی چچا نے ہم

تینوں بھائیوں کو پرورش کیا۔ ان اپنی بھی اولاد تھی۔ میں دیکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا۔ مجھے ان ساتھیوں پر رشک آتا تھا جو اپنے والدین کے زیر سایہ پرورش پا رہے تھے۔ جب شعور کی منزل پر قدم رکھا تو دیکھا...... اس دنیا میں ان بچوں کی بھی کمی نہیں جو والدین کے ہوتے ہوئے بھی یتیم و یسیر ہیں۔ میں حیرت سے سوچا کرتا ہوں۔ انسان! اتنا بے رحم بھی ہوسکتا ہے۔"

"باقر بھائی! آپ غیر معمولی ذہن رکھتے ہیں۔ یونیورسل مائنڈڈ انسان ہیں۔ میں ایک معمولی سا انسان ہوں۔ آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ باقر بھائی! میں نے بنجاروں کی طرح زندگی گزاری ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ میں یہ رشتہ بنا سکوں گا۔ اس لیے۔ آپ ہمہ گیر انداز میں سوچتے ہیں۔ میں ڈھنگ سے اپنے بارے میں نہیں سوچ پاتا۔"

"ملک! ثریا تمہارے بچے کی ماں ہے۔ تمہاری زیادتی کا داغ اپنے وجود پر لگائے ہوئے...... اب تمہارا خاندان بن جانا چاہیے۔ اور ثریا اس خاندان کا حقیقی فرد کہلانے کی حقدار ہوگئی ہے۔ خود بخود (دیکھو ملک! اگر مجھے رتی برابر بھی شبہ ہوتا کہ اس کے ٹھیک ہونے کے امکانات معدوم ہیں تو بھی میں تمہیں یہی مشورہ دیتا کہ عائلی زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ یہ دوسری بات کہ پھر میں ثریا سے نہیں کسی اور خاتون سے شادی کرنے کا مشورہ دیتا۔ گھر ہی بنانا ہے۔ تو کیوں نہ حقیقی رشتوں ہی کو یکجا کر کے گھر بنایا جائے۔ یہ شہپر کی خوش نصیبی ہوگی کہ وہ اپنے گھر میں...... اپنے حقیقی والدین کے زیر سایہ پرورش پائے۔"

"باقر بھائی! ایک اور مسئلے کے بارے میں بھی سوچا آپ نے؟" اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ مسلا۔

"کون سا مسئلہ؟" ڈاکٹر باقر الجھے۔

"ٹھیک ہے شہپر کو تو یقین دلایا جاسکے گا کہ ثریا اس کی ماں ہے لیکن ثریا کو کیسے باور کرایا جائے گا کہ شہپر اس کا بیٹا ہے؟" ملک نواز کی آواز مدھم تھی۔

"تو اسے بتایا ہی کیوں جائے کہ وہ بچپن ہی سے ذہنی مریضہ رہی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بچے کی پیدائش کے دوران اس کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوگئی تھی۔ اور کیوں کہ اس کی برین واشنگ ہوئی ہے۔ اس لیے وہ پچھلے واقعات یاد نہیں کرسکتی۔"

"آپ کے خیال میں اسے یقین آجائے گا۔

"اپنے اردگرد معالج اور مشینیں دیکھ کر بے اختیار یقین آجائے گا اسے۔"

انہوں نے ریوالونگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر ملک نواز کو غور سے دیکھا جو انہیں بے حد زچ کر رہا تھا۔

"نکاح کے بارے میں اسے یہ دلیل دینا۔ کیونکہ وہ تمام پچھلی باتیں بھول چکی ہے۔ اس لیے نکاح کی تجدید کرانی لازمی ہے۔ بس تمہیں اتنی احتیاط کرنا ہوگی کہ سے تنہا نہ رہنے دیا جائے۔ تمہاری ڈیلنگ اس کے ساتھ اعلا ہونی چاہیے اس کی تعلیم میں دلچسپی لینا۔ تم دیکھنا وہ بالکل نارمل ہوجائے گی۔ اگر تم انسانی دماغ کے بارے میں جاننا چاہو اور اس کے مدارج سے واقفیت کرنا چاہو تو مائیکل آرتھر تمہیں حیرت انگیز حقائق بتا سکتے ہیں یہ دماغ جو ہے ناں۔ یہ اسکل یعنی کھوپڑی میں تیر رہا ہے۔ کھوپڑی کا ایک عمیق حصہ پانی سے بھرا ہوا ہے اس پانی میں یہ آفت چیز یعنی دماغ تیر رہا ہے اس میں کھربوں خلیے کام کرتے ہیں۔ اور خلیے اکٹھے کام نہیں کرتے بلکہ بتدریج کام شروع کرتے ہیں۔ ثریا کے خلیے بچپن میں ایک حد تک متحرک ہوئے۔ پھر آگے چل کر گویا دروازہ لاکڈ ہوگیا۔ اب علاج دراصل اسی لاکڈ دروازے کو کھولنے کے لیے ہوگا۔ خلیے متحرک کیے جائیں گے۔ اور وہ نارمل ہوجائے گی۔ یہ تو میں نے سرسری تمہیں بتایا ہے۔ دماغ ایک قوت اور سب سے زیادہ جاندار شے ہے۔ سر مائیکل آرتھر نے اس پر نہایت گہری تحقیق کی ہے۔ تم ان سے کچھ معلوم کرنا چاہو گے۔ تو وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیں گے۔ بہت اعلیٰ چیز ہیں۔"

ڈاکٹر باقر کے لہجے میں عقیدت چھلک رہی تھی۔

ملک نواز اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے ہر طرح سے لاجواب کیا گیا تھا۔ اب وہ ڈاکٹر باقر کو مزید تنگ کرنہیں چاہتا ہازت لے کر باہر چلا آیا۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اس کا والہانہ استقبال کیا۔

"کیا دعوت کی ہے کسی کی۔" اس نے کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر خورشید کو مخاطب کیا۔

"جی صاحب...... دعوت ہے۔ آپ کی۔" اس نے نیپکن سے ہاتھ صاف کیے۔

"کس خوشی میں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ بہت بدل گئے ہیں صاحب۔!"

"کیا مطلب؟" وہ پھر حیران ہوا۔

"صاحب۔ اب آپ خوش رہنے لگے ہیں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا یعنی اپنے صاحب کا چہرہ دیکھا۔

"اچھا تو کیا پہلے روتا رہتا تھا۔، وہ واقعی ہنس پڑا۔

"نہیں صاحب پہلے آپ بہت بے چین اور پریشان نظر آتے تھے۔ ہر وقت......"

"ارے بھئی تم تو کوئی استاد قسم کی چیز ہو۔" وہ مسکرا دیا۔ "ایسا کرو کھانا جلدی سے لگا دو۔ دو تو بج ہی گئے ہیں اور رشید! میں نے تمہارا ٹکٹ منگوایا ہے۔ میرے خیال میں تم پرسوں تک چلے جاؤ گے۔ پھر ایک ماہ مکمل تمہارا ہے......"

"صاحب! آپ کو بہت پریشانی ہوجائے گی۔"

"نہیں...... نہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ مائی تو آتی ہی ہے پھر گورنس بھی ہوگی۔"

"گورنس......؟" خورشید حیران ہوا۔ آس پاس کوٹھیوں میں بہت سی گورنس کام کرتی تھیں۔ لیکن اس گھر ا کا کیا کام......؟"

"ہاں بھئی گورنس...... عورت ہی ہوتی ہے۔ ہر کام کرسکتی ہے۔" وہ جھلا گیا تو خورشید ڈر کر چپ ہوگیا۔ ملک انیت سے اپنے کمرے کی سمت بڑھ گیا۔

"ٹھیک ہی کہتے ہیں باقر بھائی! ہر چند کہ اس لڑکی کے پاس اب میری کسی زیادتی کی علامت باقی نہیں لیکن بچے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ثریا کی شہلا کے گھر والوں سے زیادہ...... ان ہمیں ضرورت کا کچھ پتا نہیں۔ اگر مجھے شادی کرنا ہی پڑی تو پھر...... کسی نہ کسی سبب تو بہتر یہی ہے کہ میرے سب بچوں کی ماں اور اس عمل کے نتیجے میں ہوسکتا ہے۔ مجھے میرے بیٹے سے معافی مل جائے...... وہ سدا چھوٹا سا بچہ تو نہیں رہے گا کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اس راہ میں تحفظ ہے ہم سب کا۔"

"خورشید! یہ سامنے والا کمرہ صاف کردینا۔ ضروری فرنیچر شام کو آجائے گا۔"

"آپ کے کوئی، دوست آرہے ہیں۔؟"

"اپنے کام سے کام رکھو تم۔"

"یہ کمرہ کچن کے نزدیک بھی ہے یہی مناسب رہے گا۔" وہ جیسے خود سے بولا۔

"اور ہاں شام کو کھانا مت بنانا۔ میں دیر سے آؤں گا۔ مجھے امریکی قونصل خانے جانا ہے ضروری کام سے۔ برادر بھی آئے گا۔ تمہارا ٹکٹ لے کر۔"

"صاحب!" وہ جھجک کر رک گیا۔

"ہوں؟"

"آپ میری شادی میں۔ ملکانی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"میں پوری کوشش کروں گا۔ خورشید! تم بے فکر رہو۔" وہ سیف میں چابی گھماتے ہوئے بے نیازی سے

"اگر تم نے شاپنگ وغیرہ کرنا ہو تو کل صبح کر لینا۔ یہ لو۔ کچھ پیسے ہیں۔" اس نے کچھ نوٹ اس کی طرف بڑھ

"پیسے ہیں صاحب!" وہ شرما کر بولا۔

"رکھ لو بھئی۔ ہماری طرف سے دلہن کے لیے کچھ خرید لینا۔ لو لے لو بھئی۔" خورشید نے جھجکتے ہو لے لیے۔"

"صاحب! آپ آئیں گے تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔"

"کوشش پوری کروں گا کہ تمہیں اس خوشی سے محروم نہ رکھوں۔" اس نے کھٹاک سے بریف کیس ہوئے عجلت بھرے انداز میں جواب دیا۔

☆☆☆

وہ چچا جان کے پاس ضروری کام سے آئی تھی۔ دونوں بچیاں اسکول جا چکی تھیں۔ ساحرہ اپنے کمرے میں

میرے اوپر بہت سے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ اس ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں میں نے بہت بڑے بڑے اٹھائے ہیں۔ لیکن یہ دکھ تمام دکھوں سے بُرا ہے۔

تماشا مت بنو حسن! اور نہ ہمیں تماشا بناؤ۔ تمہیں میرے بڑھاپے پر بھی رحم نہیں آتا۔" چچا جان کی آوا گئی تھی۔

"ساحرہ ہماری بہو ہے ہم نے ابھی اسے اس حادثے کے بارے میں نہیں بتایا۔ یہی کہا ہے۔ تم ضرو سے گئے ہو۔ وہ ہمارے گھر کی بچی ہے۔ اور ہمیں اس کے سامنے ان تمام جھگڑوں کا ذکر کرتے ہوئے شرم آرہی ہے باہر سر اٹھا کر کیسے چلیں گے...... میرا ضبط نہ آزماؤ بیٹے۔"

"کیا......؟ ٹھیک ہے جب تم میری بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو پھر تمہارے ساتھ میرا مرنا جینا مجھے بتا دو ناں وہ کون سی بات ہے جو تمہاری برداشت سے بڑھ کر ہو گئی ہے۔

تم اپنے مزاج اور زبان دونوں کو قابو میں رکھو۔ عرش بھی تھرا اٹھتا ہے بے بنیاد بہتان طرازی سے۔ تم رہے ہو۔ میرا اس سے سسر، بہو، چچا بھتیجی کا رشتہ نہیں باپ بیٹی کا رشتہ ہے۔ یاد رکھو والدین کو وہ اولاد بے حد عزیز ہوتی جوان کے سر بلند رکھتی ہے۔ تابعدار ہوتی ہے۔ بعد کا مان بڑھاتی ہے۔ حسن وہ میری بیٹی ہے۔ یاد رکھو تم سے بعد

انہوں نے فون رکھ دیا تھا۔ وہ بنا چاپ واپس چلی آئی تھی۔ کاش چچا جان یہ جنگ میں تنہا لڑتی۔ آپ جائیں گے۔

اس نے کمرے میں آویزاں حسن کے پورٹریٹ کو دیکھا۔

کاش حسن! آپ نارمل ہوتے۔ اتنے شدید، اتنے انتہا پسند نہ ہوتے۔

ایک روز برجوں کے بارے میں تفریحاً مطالعہ کر رہی تھی حسن شیو بنا رہا تھا۔ اس نے پڑھا تھا نومبر ہونے والے لوگ شدید انتہا پسند ہوتے ہیں۔ بطور شوہر وہ تنگ نظر اور حاسد ہوتے ہیں اور اگر کوئی ان کی بیوی کی

ڈال دے۔ تو اس کی جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

ب اس نے حسن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"حسن! آج کے تعلیم یافتہ دور میں کون ایسی احمقانہ حرکت کر سکتا ہے......؟"

"محترمہ! عاشق صادق جنونی ہوتے ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"اگر یہ عشق صادق ہے تو خدا سب کو ایسے عشق سے اپنی پناہ میں رکھے۔

"میرے خیال میں یہ بھی کوئی شیطانی حربہ ہے کہ عشق جیسی اعلیٰ چیز کو اتنی شدید اخلاقی برائیوں سے موسوم کیا جائے۔"

اپنا اپنا خیال ہے۔ یہ تشریح میرے اپنے ذہن سے بہت قریب ہے البتہ......" اس نے تولیے سے چہرہ ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھا تھا۔

"خدا نہ کرے۔" اس نے بے ساختہ کہا تھا۔ جس پر وہ ہنس دیا تھا۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تمہارے بنا میری زندگی کھوکھلی ہے حسن! کاش تمہیں اندازہ ہوتا لیکن اب میں خود ہر دروازہ بند کر دوں لیے کہ تمہارے ہاتھوں نے مجھ پر چھینٹے اڑائے ہیں۔ میں اب کبھی نہیں چاہوں گی کہ تمہارے آلودہ ہاتھ کبھی وجود چھوئیں۔"

"بھابی!" ساحرہ اچانک ہی اندر آ گئی۔

"ہوں۔"

"کیا بناؤں دوپہر کے لیے......؟"

جو تمہاری مرضی ہو۔ بنا لو۔ وہ اسی طرح رخ پھیرے کھڑی تھی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بھابی؟" وہ سامنے آ گئی۔

"ہاں کچھ ایسے ہی سر بھاری سا ہو رہا ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولی۔

"جب بھی بھائی جان دورے پر جاتے ہیں سر ایسے ہی بھاری ہوتا ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"سچ ساحرہ! کچھ عجیب سی طبیعت ہو رہی ہے۔" وہ ساحرہ کے مذاق پر رونے کو ہو گئی۔

"چائے بناؤں آپ کے لیے۔ آپ ٹیبلٹ لے لیجیے اور کچھ دیر آرام کر لیجے۔" وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر......

ساحرہ کے نکلنے کے بعد وہ بستر پر گر گئی۔ دوبارہ سوچوں کے جنگل میں بھٹکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ساحرہ کپ تھامے اندر چلی آئی۔

"یہ لیں بھابی!" اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

وہ آہستہ آہستہ چائے کپ کے گھونٹ بھر رہی تھی۔

"وہ بھابی! میں آپ کے پاس ضروری کام سے آئی تھی۔"

"کہو۔"

"وہ...... بھابی کچھ دنوں سے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہو گیا؟" وہ کھوئے کھوئے انداز میں پوچھنے لگی۔

''اسی کا تو ڈر ہے۔'' وہ نچلا ہونٹ دبا کر مسکرائی تھی۔

شہلا چونک پڑی۔

''ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ مانی کو بتایا تھا......؟''

''نہیں۔'' ساحرہ نے یوں کہا جیسے بہت اچنبھے کی بات ہو۔ ''انہیں تو میں کبھی نہ بتاؤں۔ بھابی! ویسے بہت تنگ کرتے ہیں۔''

''ارے۔ بہت بے وقوف ہو ساحرہ......! بھئی......ایسی اچھی خبر اس سے چھپانا ظلم ہے اس پر۔''

''کچھ بھی ہو۔ مم۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔'' وہ جھینپ کر بولی۔

''یہ لو......ابھی بھی شرم آتی ہے؟'' وہ مسکرا دی۔ جس پر ساحرہ اور بچی کٹ کر رہ گئی تھی۔

''آپ نے کیا بھائی جان کو بتا دیا تھا؟'' وہ سادگی سے بولی تو شہلا بے ساختہ ہنس دی۔

''اچھا تو اس بہانے تم میرے راز اگلوا رہی ہو۔''

''دیکھو......تم مانی کو اشارتاً لکھ دو۔ ویسے بھی ان پریشانیوں میں یہ خوشخبری اس کے لیے طاقت ور ثابت ہوگی۔

''آپ لکھ دیجیے۔''

شہلا بے ساختہ ہنس پڑی۔

''ارے ساحرہ! حد کر دی ہے تم نے بھی۔ یہ اٹھائیس برس کہاں گنوا دیے تم نے۔''

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

''مزے کی بات بتاؤں۔ اس لیے بتا رہی ہوں تا کہ تم ذرا واضح انداز میں شوہر کو خوشخبری سناؤ۔ حنا میں حسن تڑپ پڑتے۔ میں نے اشارتاً لکھ دیا تھا کہ آج کل میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اور دل بڑے زور سے ہے۔ وہاں سے فوراً فون آ گیا۔ نصیحتیں کچھ اس طرح تھیں۔

''تمہارا ویٹ بڑھ گیا۔ اور تم کھانے میں گھی زیادہ مقدار میں ڈالتی ہو۔ یہ دل کی شریانوں کو نقصان ہے۔ اور دل کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اپنا ویٹ کم کرو......صبح و شام ورزش کیا کرو۔ رسی کودنے سے بھی ویٹ کم ہے۔ اگر سب کے سامنے شرم آتی ہے تو بند کمرے میں رسی کود لیا کرو۔'' اپنا سر پیٹ کر رہ گئی تھی میں۔ تم ذرا سلیقے دینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہاں ویٹ لفٹنگ کا مشورہ آ جائے۔''

اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے بات مکمل کی۔

ساحرہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ جب وہ آئی تھی اس گھر میں شاید پہلی مرتبہ کھل کر ہنس رہی تھی۔ قدرتی جھنکار سے شہلا کو بھی طمانیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے میں وہ چچی جان کا ذکر کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر ساحرہ کا سرخ تمتماتا چہرہ دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔

انہیں کتنی شدید خواہش تھی کہ مانی کے ہنستے کھیلتے بچے دیکھیں۔ آہ جب کاشف پیدا ہوا تھا انہوں نے کی پیشانی چوم کر کہا تھا۔

''اللہ کا بڑا کرم ہے اس نے حسن کو بیٹا دیا۔ میری تو اب یہی آرزو ہے کہ مانی کے بچے بھی اپنی آنکھ ہنستے کھیلتے دیکھوں۔ ارے اس کی اولاد تو دیکھنا دلہن! اس سے بھی چار ہاتھ آگے ہوگی۔ اٹھائیس برس کا ہو گیا ہے۔

...بیمار پڑتا ہے۔ نہ گھڑی بھر کو زبان تالو سے چپکتی ہے۔'' ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

ان کی یاد اسے ملول کر گئی۔

ساحرہ کھانے کے انتظام کے لیے باہر جا چکی تھی وہ آنکھوں پر بازو رکھے پھر کچھ سوچ رہی تھی۔

''اچھا یار......خدا خافظ۔ اماں جی سے کہنا پریشان نہ ہوں۔ جلدی آؤں گا۔''

وہ لیٹا ہوا میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ خورشید خدا حافظ کہنے آ گیا تھا۔

''صاحب! میں فکر مند ہوں کہ آپ کو بہت پریشانی ہوگی۔''

''نہیں بھئی۔ وہاں امریکہ میں بھی تو سب کام خود ہی کرتا ہوں۔'' اس نے خورشید کے جذبے کو بے حد محسوس کیا تھا۔

''پھر وہاں تو آپ کی ذرا فرصت نہیں ہوتی ہوگی۔''

''کرنا بھی کیا ہے یار فرصت میں۔ اچھا ہی ہے کہ کام میں مصروف رہا جائے۔ ڈش واشر سے برتن صاف کر لیے۔ ویکیوم کلینر سے کارپٹ صاف کر لیے۔ ایک بندے کا کام ہی کتنا۔ چھٹی روز کپڑے اٹھائے۔ باہر مشین میں سکے ڈالے۔ کپڑے دھو لیے۔

''وہاں مشین باہر لگی ہوتی ہیں۔'' وہ متعجب ہوا۔

''باہر ہی سمجھ لو۔''

''وہاں سکوں سے کپڑے دھلتے ہیں صاحب؟'' خورشید کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

''بھئی...... سکے تو اس فائدے کا معاوضہ ہیں جو ہم مشین سے اٹھاتے ہیں۔ وہاں اکثر کام مشینیں ہی کرتی ہیں۔ وہاں اتنی فراغت کسی کو نہیں کہ کھڑا کرایے کے سکے......ہی وصول کرتا رہے۔

حیرت کی کوئی بات نہیں ہے خورشید! انسانی دماغ بڑی اعلیٰ ادر اشرف چیز ہے۔ آج کے دور میں چست بنا تا ست حیران ہوتا ہے۔ حالانکہ دماغ دونوں کے پاس ہے۔ ایک کام لیتا ہے۔ دوسرے کا دل نہیں چاہتا۔

خورشید نے اس طرح سر ہلایا گویا سب کچھ سمجھ گیا ہو۔

وہ خدا خافظ کہہ کر جیسے ہی نکلا۔ ملک نواز نے ڈاکٹر باقر کو رنگ کیا کہ آج شام وہ شہپر کو لینے آ رہا ہے۔

اور مغرب کی اذان سے کچھ پہلے وہ اس چھوٹے ہاسپٹل میں سسٹر آمنہ کے روبرو تھا۔ چار پانچ ماہ کے شہپر کو آمنہ نے تکیوں کے سہارے بٹھا رکھا تھا۔ وہ منہ سے بے ترتیب آوازیں نکال کر اپنے ہاتھوں سے کھیل رہا تھا۔

اس نے اپنی لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر ایک لمحے کو باپ کی طرف دیکھا۔ پھر دوبارہ اپنے ہاتھوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس بے نیازی پر وہ مر مٹا تھا۔ اس نے بے ساختہ اسے اٹھا کر سر سے اونچا کر دیا تھا۔ یہ اور بات کہ بعد میں اپنی حرکت پر خود ہی حیران ہوا تھا۔

''یار! تم تو گھاس ہی نہیں ڈالتے۔'' اس نے اسے دوبارہ اچھالا۔

''آپ ملے ہی کتنی مرتبہ ہیں سر......! فی الحال تو انجان ہی ہیں۔ اس کے لیے۔'' سسٹر آمنہ مسکرائیں۔

''کتنے دنوں میں جان پہچان ہونے کا امکان ہے؟'' وہ سسٹر آمنہ کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو آپ کے رویے پر منحصر ہے۔'' انہوں نے بیگ میں شہپر کا سامان ڈالتے ہوئے شائستگی سے جواب دیا۔

وہ اسے اٹھائے ہوئے سسٹر آمنہ کے ہمراہ باہر نکل آیا تھا۔ سامنے ایک نرس کو آتے دیکھ کر اس نے شہپر کو

جلدی سے سسٹر آمنہ کی گود میں دے دیا۔

''بعض لوگ جب پہلی مرتبہ باپ بنتے ہیں تو بچہ گود میں اٹھا کر چلتے ہوئے وہ بہت شرم محسوس کرتے ہیں
سسٹر آمنہ نے پیار سے شہپر کو اپنے بازوؤں میں سنبھالتے ہوئے کہا۔ تو ملک نواز کھسیا کر رہ گیا۔

وہ زینہ اتر ہی رہے تھے کہ سامنے سے مارتھا اور ثریا آتی دکھائی دیں۔ سسٹر آمنہ کو دیکھ کر ثریا تیزی سے
جھپٹی۔ وہ بمشکل سنبھلیں۔

''یہ منا میرا ہے۔ تم مجھے دے دو...... میں اس سے کھیلوں گی۔'' اس نے شہپر کو کھینچا۔ سسٹر آمنہ ہائے ہائے
ہائیں کرتی رہ گئیں۔ ثریا بیگم یہ جا وہ جا۔

ملک نواز اس کے پیچھے ہی چلا آیا تھا۔

نہیں دوں گی۔'' وہ پوری قوت سے چیخی۔

ثریا شہپر کو کھلونے کی طرح موڑ توڑ رہی تھی۔ ملک نواز کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ شہپر حلق پھاڑ پھاڑ کر
لگا تھا۔ جس سے ملک نواز کو اور کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اپنی دانست میں ثریا اسے بڑے پیار سے بہلا رہی تھی۔

''سسٹر آمنہ۔'' اس نے گردن موڑ کر آواز دی۔

شہپر کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ اپنے عرب عورتوں جیسے ڈریس میں وہ علیحدہ الجھی ہوئی تھی۔ خود بھی سنبھ
بیڈ پر بیٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ساتھ ہی شہپر کو بھی سنبھال رہی تھی۔ اس الجھن میں شہپر زمین پر آ رہا۔

اس نے لپک کر بچے کو سنبھالا۔ دوسرے ہاتھ سے ثریا کو زور سے جھٹکا دے کر بٹھایا۔

آرام سے بیٹھو۔ ورنہ۔''

ناں۔ نہ۔ نہ ارے ملک! غصہ نہ کرو۔'' ڈاکٹر باقر کی آواز پر وہ چونک کر پلٹا۔ ان کے دائیں بائیں
آمنہ...... اور مارتھا بھی کھڑی مسکرا رہی تھیں۔ مارتھا کے ہاتھ میں کیمرہ تھا۔

''سسٹر! تصویر بناؤ...... تم بھی بیٹھو ملک! یہ آئندہ تمہارے بے حد کام آئے گی۔'' اسے متردد دیکھ کر
نے اسے یقین سا دلایا۔ پھر محبت سے اسے تھام کر آگے بڑھے۔

''سسٹر مارتھا! دیکھو...... تصویر میں ثریا کی آنکھیں واضح طور پر نظر آنا چاہئیں تا کہ جب یہ نارمل ہو
تصویر دیکھے تو شک نہ کر سکے۔

ملک نواز ناچار بیٹھ گیا۔ وہ اس وقت زندگی سے بے زار ہو رہا ہے۔

سسٹر آمنہ نے آگے بڑھ کر ثریا کا ڈریس درست کیا۔ اور شہپر کو ٹھیک سے اس کی گود میں بٹھایا اور
انگوٹھا لیے سسکیاں لے رہا تھا۔ اس کی حسین پلکوں پر موتی سے جڑے ہوئے تھے۔ ملک نواز کے اپنے دل میں
سا شور سنائی دیا۔

''ملک......! تم بھی کسی طور ان دونوں سے اپنا تعلق ظاہر کرو۔''

''میں ٹھیک ہوں باقر بھائی!'' وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا سے خفا ہو۔

فلیش آن ہوئی۔ اور وہ خواب جیسے رشتوں کے ہمراہ سلولائیڈ نقش ہو گیا۔ اس دوران اس کی پیشانی
کے قطرے ابھر آئے تھے۔ اگر وہ ڈاکٹر باقر کو ذاتی طور پر نہ جانتا ہوتا تو کبھی بھی اس پر راضی نہ ہوتا۔ کیا ممکن...... کل
باتیں اس کے گرد جال بن دیں۔

مارتھا نے سسٹر آمنہ کے ہمراہ بھی تصویر بنائی۔

ثریا کو ماہرانہ تیکنیک کے ہمراہ انجکشن دے دیا گیا۔ ایک نرس نے اسکی پیشانی دبائی...... اور شہپر کو اس کے
بٹھا دیا تھا۔ پیشانی دبانے کے ساتھ ساتھ اس پر مختلف کلر کی روشنیاں ڈالی گئیں۔ دیوار میں نصب اسکرین روشن
جو گہرے نیلے رنگ کی تھی۔ ڈاکٹر باقر ثریا کے رخسار تھپتھپا کر برابر اسے مجبور کرتے رہے کہ وہ نیلی روشنی کی طرف
دیکھے۔ نرس برابر اس کی پیشانی سہلاتی رہی یہاں تک کہ ثریا نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بال برابر باریک سوئی سے
... کی گئی۔ تھوڑی دیر میں ثریا غافل تھی۔

سسٹر آمنہ نے شہپر کو اٹھا لیا۔

ملک نواز ابھی تک اسکرین کی طرف متوجہ تھا۔

''نیلی روشنی۔ ٹھنڈک اور سکون کا احساس دیتی ہے ملک! کیوں کہ ذہنی مریضوں میں شعوری قوت ارادی
... نہیں ہوتی۔ اس لیے ان پر اثرات جلدی مرتب ہو جاتے ہیں۔'' ڈاکٹر باقر نے اسے تفصیل سے بتایا۔

''یہ تو بچے کو جانتی ہے۔ باقر بھائی۔''

''ہاں ملک...... اس لیے کہ یہ واقعہ اس کے ہوش میں ہوا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹر ساجدہ نے آپریشن کی تیاری
اور پر کر رکھی تھی۔

اسی لیے میں نے تمہیں جلدی آنے کے لیے کہا تھا۔ تا کہ اس کا انتظام کیا جا سکے۔ سسٹر آمنہ اسے روزانہ ثریا
... ملاتی رہی ہیں۔ اسی وجہ سے الجھن پیدا ہو رہی تھی۔'' اس نے وہیں سے ہی ڈاکٹر باقر کو خدا حافظ کہہ دیا اور سسٹر
... لے کر گھر کی سمت ہو لیا۔

☆☆☆

بچے اور سسٹر آمنہ کو گھر پہنچا کر وہ کسی کام سے چلا گیا تھا۔ سسٹر آمنہ کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔

سسٹر آمنہ کو یہ شخص کچھ عجیب سا دکھائی دیا تھا۔ انہوں نے اسے شدید مضطرب اور بے قرار سا پایا تھا۔ ہر
... نہ کہیں جانے کو تیار......

''میرا خیال ہے کہ مسز ملک ان کی ابنارمل حرکتوں کی وجہ ہی سے ابنارمل ہو گئی ہیں۔'' سسٹر آمنہ نے کافی غور
کے بعد آخر کار یہ نتیجہ برآمد کیا تھا۔

مسٹر ملک۔ کتنی ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ آفت قسم کی ڈریسنگ کرتے ہیں۔ بولتے ہیں۔ تو چارمنگ
... خاموش ہوں تو گریس فل۔ جس عورت کا ایسا شاندار شوہر ہو۔ جو صاحب حیثیت بھی ہو وہ کیسے ذہنی مریضہ بن
گئے؟

میرے خیال میں مسٹر ملک نے مسز ملک کو وقت نہیں دیا۔ وہ تنہائی کا شکار ہو کر ابنارمل ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ
... کے پاس سب کچھ ہے۔ وقت نہیں ہے۔ جب سے میں آئی ہوں مسٹر ملک کو دو کاموں میں بڑی شد و مد کے
... لیتے پایا ہے۔ ایک تو باتھ روم میں پانی کا بے دریغ استعمال یا پھر ہر وقت کسی نہ کسی سفر کے لیے تیار۔ ہر وقت سفر
... ہے ان پر۔

وہ مائی کو کچن کی صفائی دھیان سے کرنے کی تلقین کرنے آئی تھیں۔ اور انہیں شہپر کی فیڈر بھی تیار کرنا تھی۔ کہ
... رونے کی آواز آنا شروع ہو گئی۔ ملک نواز آدھے گھنٹے ہی میں واپس آ گیا تھا۔

اس نے لباس تبدیل کرنے کا ارادہ کر کے ڈریسنگ روم کی جانب قدم بڑھائے تھے کہ شہپر کی شور
بلکتی آواز کانوں میں پڑی۔

''چچ ...... یہ گورنس تو بہت رلاتی ہے۔'' وہ گورنس سے بدگمان ہوا۔

شہپر کے کمرے میں آیا تو وہ ہاتھ پاؤں پٹخ پٹخ کر رو رہا تھا۔ وہ بے اختیار آگے بڑھ آیا۔ پہلے اسے
کھڑے بہلاتا رہا۔ مختلف آوازیں نکال کر...... چٹکیاں بجا کر...... لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

اس نے جھک کر بیٹے کو اٹھالیا۔

''مت تنگ کر یار۔!'' وہ منت سے بولا۔

مائی جو سسٹر آمنہ کے کہنے پر لپک کر آئی تھی۔ دونوں باپ بیٹے کو دیکھ کر واپس پلٹ گئی تھی۔ شہپر باپ
میں آکر بتدریج چپ ہو گیا۔

''واہ...... یار!...... یہ بات ہوئی ناں۔'' اس نے جھک کر شہپر کا رخسار چوما۔

اسے بچہ چپ کرانے کا انوکھا تجربہ ہوا تھا۔

وہ اسے واپس لٹانے لگا تو وہاں پھر زور و شور سے رونے کی تیاری شروع ہوئی۔

''یار ہم تمہارے پاس ہی ہیں۔'' اس نے دروازے کی سمت دیکھا کہ شاید گورنس آرہی ہو۔ اس
کے رخسار چھوتے لاشعوری طور پر اس نے اپنے حسین بچے کا باپ بننے پر تفاخر سا محسوس کیا تھا۔

شعوری طور پر تو وہ ''فخر'' نہیں کر سکتا تھا۔

''بچہ پھر چپ ہو گیا تھا۔

''بھئی تم تو اپنی ماں سے بھی زیادہ پریشان کرنے والی شے ہو۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''سسٹر آمنہ!'' اس نے گورنس کو آواز دی۔

شہپر نے منہ بسور لیا زوردار آواز سن کر۔

''ار۔رے۔رے بھئی تمہیں کچھ نہیں کہہ رہے۔ ویسے استاد قسم کی چیز ہو...... گود میں آتے ہی چپ
بیٹا! بات یہ ہے کہ ہم ہیں ہی محبت کے آدمی...... نفرت نہیں کرتے کسی سے...... نفرت دل کو سیاہ' چہرے کو مکروہ کرد
البتہ ایک شخص پر ہمیشہ رشک آیا ہے۔ یہ حسد کی ذرا صاف ستھری شکل ہے اور وہ واحد شخص تمہارا ماموں ہی ہے یار
گھر وہ دو عورتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر پہلے اسلام آباد گیا۔ وہاں امریکی سفارت خانے سے اہم
کی تصدیق کروا کر۔ وہ صرف ایک دن کے لیے گاؤں پہنچا تھا۔ خورشید کی شادی میں بھی شرکت ضروری تھی اور
ملاقات بھی اہم۔ کہ جب خورشید گاؤں پہنچا ہو گا تب سے وہ دن گن رہی ہو گی۔

خورشید واقعتاً اسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح وہ صا
قدموں میں بکھر جائے۔

اسے جانے کیوں صاحب سے اس قدر محبت تھی؟

حالانکہ۔ اس قدر رنگین اور خود غرض سا انسان۔

جس کا لہجہ اکثر تیکھا اور چتون پر عموماً بل ہوتے تھے۔

جو سیدھی سادھی بات کا جواب بھی پھاڑ کھانے والے انداز میں دیتا تھا۔

بے چین۔ مضطرب۔ لیکن بے پناہ حساس۔

شا کی۔ کڑوا۔ لیکن دردمند۔

بے حد پارسا۔ اور بے انتہا بڑا۔

کس قدر عجیب و غریب شخصیت تھی۔ عجیب سمجھ سے بالاتر انسان تھا۔ مگر لوگوں کو کتنا عزیز تھا۔ اور خود اسے
س قدر پیارا تھا۔

اس نے کبھی صاحب کی ڈانٹ پھٹکار پر برا نہیں مانا تھا۔ اس پر اسے حیرت بھی تو تھی۔ اب جو صاحب کو
یکھا تو خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

بے انتہا خاطر مدارت کی۔ جس پر وہ دل سے اس کی محبت کی قدر بھی محسوس کر رہا تھا۔ سب ہی لوگوں نے مجھ
بڑے انسان سے محبت کی ہے۔ کس قدر محبت ملی ہے۔ پھر بھی تشنگی ہے کہ 'وہ' ان میں شامل نہیں ہے۔

گرے شلوار قمیض میں ملبوس رنگین پایوں والے پلنگ جس پر خوش نما دری بچھی ہوئی تھی بیٹھا وہ سوچوں میں گم تھا۔

پھر خورشید کے گھر کے دالان میں بہت سے لوگ چلے آئے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مرتبے و مقام اور حیثیت
کے لحاظ سے اس سے مل رہا تھا۔

گاؤں کے لوگ اسے اپنی گمشدہ شے سمجھ کر جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ گاؤں کے پٹواری اور اس کے
بیٹے کے ماموں نے اسے زور سے بازوؤں میں لے کر بھینچا۔

''اوئے...... ملکوں کے آخری تاجدار۔ کہاں کھو جاتا ہے۔ ایک جھلک دکھا کر؟''

''ایسے تو نہ کہیں ماموں اسحٰق۔'' وہ مسکرایا۔ ''آخری تاجدار میں کہاں ہوں۔ بھائی رب نواز کے دو بیٹے
بھول گئے؟''

''اور تو نے تو اس سلسلے سے نام ہی کٹالیا۔ اوئے شادی وادی کر لے۔ عمر گنوادی تو نے تو'' وہ محبت سے اس
کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پلنگ پر بیٹھ گئے رب نواز؟ سامنے پلنگ پر بیٹھا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''نواز یار۔ تو گاؤں چھوڑ چکا ہے۔ رہتا نہیں ہے۔ پھر بھی لوگ تجھے کس قدر محبت سے یاد رکھے ہوئے
ہیں۔! ان کے دلوں میں رہتا ہے۔ انہی محبتوں نے تجھے سر چڑھا دیا ہے۔''

اس نے محبت سے ملک نواز کو دیکھا۔ جو اس قدر بھیڑ بھڑ کے میں بھی سب سے الگ اور منفرد نظر آرہا تھا۔
تھوڑا وقت خورشید کے ہاں گزار کر وہ ماں کے پاس چلا آیا۔

آتے ہی اس نے ماں کو بتادیا تھا کہ وہ رات ہی کو واپس چلا جائے گا۔

ماں کو بھی شاید صبر سا آ گیا تھا۔ وہ شاید سینے پر پتھر رکھ چکی تھی۔ بیٹھی روتی رہی۔ لیکن اسے روکا نہیں۔

ماں کی یہ خاموشی۔ اس کا دل تڑپا گئی۔ اس نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

''اماں جی۔ بس چند دنوں کی بات اور ہے میں آپ کو خود آ کر امریکہ لے جو جاؤں گا اپنا گھر بنانے کی
کوشش کر رہا ہوں۔ اماں جی۔ پھر آپ میرے گھر میں میرے گھر والوں کے ساتھ رہیں گی تو سب زیادتیاں معاف کر
دیں گی میری۔''

''تیرے گھر والے۔؟'' ملکانی چونک پڑیں۔

''آپ ہی تو کہتی ہیں گھر بنا۔ ایک جگہ ٹک کر بیٹھ۔ کوشش کر رہا ہوں آپ کی بات مان لو۔''

''کون ہے وہ۔؟'' ملکانی نے اسی کی چمکتی پیشانی پر نظریں جمادیں۔

''ابھی کہاں۔ ابھی تو کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن آپ یقین کریں۔ میں آپ کو جلدی لینے آؤں گا۔ میں آپ کی طرف سے غافل تو نہیں ہوں۔ بس میری مجبوریاں ہیں۔''

''ہاں پتر۔ ''مجبوریاں'' تو تیری بہت ہیں۔ تجھے کھانے پینے کی بہت تنگی ہے پیسہ ٹکہ تیرے پاس نہیں۔'' طنزیہ بولیں۔

''سارے دکھ کھانے پہننے۔ پیسے کے ہی نہیں ہوتے اماں جی۔'' اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اس نے کیونکہ گھر فون کر دیا تھا اپنی واپسی کے بارے میں اس لیے سسٹر آمنہ اس کا انتظار کر رہی تھیں گیٹ کھولنے کی ذمہ داری پوری کر کے وہ واپس اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔ اس نے پہلے ہی روز انہیں باور کرا دیا تھا کہ ''وہ رات دس بجے کے بعد کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔ کتنی ہی اہم بات کیوں نہ ہو اس کے کمرے میں دس بجے کے بعد آنے سے پرہیز کیا جائے۔

وہ پوچھنا تو چاہتی تھیں کہ کیا ''چلاکشی۔'' ہوتی ہے دس بجے کے بعد۔ مگر وہ خاموش ہو رہی تھیں۔ کہ یہ صاحب کا حکم تھا۔

ملک نواز کو بھی سسٹر آمنہ کی یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ وہ آنکھوں میں کھوج و تجسس لیے نہیں پھرتی تھیں۔ اور ایک بہترین منتظمہ کا کردار خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھیں۔

ملازمت ان کی اہم ضرورت تھی۔ کہ اس دنیا میں وہ بھائیوں کے ہوتے ہوئے بھی تنہا تھیں۔ پہلے جہیز جوڑنے کی نیت سے ملازمت کی تھی۔ جب تک جہیز تیار ہوا عمر دھوکا دے گئی تک چڑھی بھابیوں سے نجات کا واحد رستہ تھا کہ وہ نرسنگ کر لیں تا کہ رہائش کا مسئلہ بھی نہ ہو اور در بدری کا اندیشہ بھی نہ ہو۔ یہ ان کی قسمت کی مہربانی ہی تھی کہ انہیں ملک نواز جیسا ''آقا'' مل گیا تھا تنخواہ تو انہیں اتنی ہی مل رہی تھیں جتنی ڈاکٹر باقر کے ہاسپٹل میں طے ہوئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں تمام تر گھریلو سہولتیں حاصل تھیں۔ انہیں ملک نواز کے گھر میں چلتے پھرتے کبھی اپنے ملازمہ ہونے کا احساس نہیں ہوا۔ کہ خود تو ''سر'' گھر میں گم ہی نظر آتے تھے۔ اور وہ جز وقتی ملاز میں سے ضروری کام لیتے ہوئے خود کو گھر کی مالکن تصور کرتی تھیں۔ ابھی بھی گیٹ کھول کر انہوں نے سلام کیا تھا اور برآمدے تک آتے آتے اس کی ضروریات کے بارے میں پوچھا۔ نفی میں جواب پا کر اپنے کمرے میں واپس چلی آئی تھیں۔ ایک نظر کاٹ میں لیٹے ہوئے شہیر پر ڈالی اور بستر پر دراز ہو کر پرسکون سے انداز میں آنکھیں موند لی تھیں۔

صبح کو جب وہ کچن میں کھڑی شہیر کے لیے ''سیریلیک'' تیار کر رہی تھیں تو مائی نے آ کر کہا۔

''بی بی! صاحب۔ کہہ رہے ہیں ایک منٹ کے لیے بات سن لیں۔''

وہ اچھا کہہ کر باہر آئیں تو خیال آیا شہیر رونے نہ لگے اس لیے انہوں نے سوچا وہ اسے بھی ہمراہ لے لیں۔ سو انہوں نے پہلے شہیر کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا پھر ملک نواز کے کمرے کا دروازہ ''ناک'' کیا۔

''ہوں۔!'' اندر سے آواز آئی۔ گویا اس ہوں میں اجازت تھی۔

''السلام علیکم۔'' سسٹر آمنہ نے حسب توقع دھلے دھلائے سے ملک نواز کو دیکھ جو آسمانی باتھ گاؤن میں بال بکھرائے بیٹھا تھا۔ ''گویا ابھی بھی ''شغل'' فرما کر نکلے تھے سر۔''

دراصل ایک ضروری بات کرنا تھی آپ سے۔ تشریف رکھیے۔''

اس نے قریبی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ہلکے گلابی فینسی ڈریس میں شہیر اپنی گورنس کی گود میں بیٹھا تالیاں بجا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر باپ کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا دیا۔

ملک نواز اپنی بات بھول گیا۔

شہیر نے ہمکنا شروع کر دیا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

''جی سر۔؟'' سسٹر آمنہ نے ملک نواز کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

''ہاں۔! میں نے دراصل آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ سے پوچھوں کیا آپ ہمارے ساتھ امریکہ جا سکتی ہیں۔؟''

''جی۔!'' سسٹر آمنہ کو حیرت سی ہوئی۔

''بات یہ ہے سسٹر۔ بچے کو تو وہاں گورنس مل سکتی ہے۔ لیکن مسئلہ جو ہے وہ شہیر کی ''ممی'' کا ہے ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ علاج کے بعد کوئی مستقل ان کے ساتھ رہے۔ جو ہم زبان و ہم وطن ہو۔ دیکھیے ناں میرے لیے تو یہ مشکل ہو گا کہ میں ان کے ہمراہ ہر وقت رہوں۔ پھر ''جنیڈرڈ فرنس'' بھی ہے۔ آپ خاتون ہونے کی حیثیت سے ان کیلئے زیادہ مفید رہیں گی۔ مختصر یہ کہ آپ شہیر اور شہیر کی ممی دونوں کے کام آ سکتی ہیں بیک وقت اگر آپ کے اپنے مسائل ہوں جن کی بنا پر آپ ہمارے ساتھ نہ جا سکتی ہوں تو بھی کوئی بات نہیں۔ کر ہی لیں گے پھر کوئی نہ کوئی بندوبست۔''

''سر میں..... تنہا عورت ہوں۔ اگر میں آپ کے کام آ سکوں تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔''

انہوں نے بے تحاشا خوشی چھپا کر کہا۔ (اکثر خواب ٹوٹے ہیں۔ امریکہ دیکھنے کا ارمان ہی پورا ہو جائے گا)

''آپ مجھے آج ہی اپنے کوائف دے دیں تا کہ انتظام کیا جا سکے۔ کیوں کہ میری چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں اس لیے میں ثریا کو لے کر نیویارک جا رہا ہوں۔ انہیں وہاں ایڈمٹ کرا کر ہیوسٹن چلا جاؤں گا۔ آپ کو اور شہیر کو وہیں ریسیو کروں گا۔ بس یہی اہم بات تھی جو آپ سے کرنا تھی۔ اور کوئی مسئلہ تو نہیں۔؟'' اس نے ہمکتے شہیر کو اپنے بازو کے گھیرے میں سمیٹ کر گویا ملازمہ کے مسائل جاننا چاہے۔

''کوئی نہیں سر۔ تھنک یو۔'' وہ تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو گئیں۔

''سر۔! ایک بات پوچھوں آپ برا تو نہیں مانیں گے۔'' وہ جھجکیں۔

ملک نواز کا دل اندر دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ (پھر کوئی کھوج۔؟)

''ہاں۔ ہاں۔ پوچھیں۔'' اسے کہنا پڑا۔

''سر آپ وہاں امریکہ میں ملازمت کرتے ہیں۔؟''

''ہوں۔!''

''سر! میں نے تو سنا ہے آپ لوگ زمیں دار ہیں۔ کڑوروں کی اراضی کے مالک۔ پھر آپ کیوں ملازمت کرتے ہیں۔؟ میرے خیال میں تو۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ کروڑوں کی اراضی کے مالک ہیں ہم۔ بعض اوقات کام صرف پیسے ہی کے شوق میں نہیں کیے جاتے۔ میں آپ کو بتاؤں۔ میں نے ناصر صاحب جو ڈاکٹر باقر کے چھوٹے اور حقیقی بھائی ہیں۔ کے ساتھ ایک پرچے میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر ناصر صاحب نے اپنے پرچہ نکالا تو بطور ایڈیٹر وہاں کام کیا

جتنی میری تنخواہ تھی اس سے دوگنا میرے اخراجات تھے آخر وہ "زمیں داری" کے ہی مرہون منت تھے۔"

"تو سر آپ نے کیوں ملازمت کی تھی۔؟"

"میرا شوق۔ صرف شوق۔ شعر و ادب موسیقی۔ ان ہی چیزوں کے گرداب تک گھومتی رہی ہے میری زندگی۔ بہت خوار کیا ہے ان سب نے مل کر مجھے۔"

اس کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔

"اور جو امریکہ میں ملازمت کر رہے ہیں۔ یہ بھی شوق؟" وہ کھڑی ہوتی ہوئی بولیں۔

"نہیں۔ یہ مجبوری تھی۔ میں یہاں رہ نہیں سکتا۔ یہاں میری قوت برداشت جواب دے جاتی ہے۔" جیسے خود سے کہہ رہا تھا۔

اس کی اس عجیب و غریب کیفیت پر مسز آمنہ شہپر کو گود میں بھر کر کمرے سے باہر آ گئیں۔

اس نے چچا جان کو اپنے کالج میں تقرر کی خبر سنائی تو وہ سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔

"کیا سوچ رہے ہیں چچا جان۔؟" اسے ان کی خاموشی سے تشویش ہوئی۔

"کچھ نہیں بیٹی۔!" وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔

"آپ کو اعتراض تو نہیں۔؟"

"نہیں۔ مجھے کبھی بھی تمہاری کسی بات پر اعتراض نہیں ہوا۔ تم تو میرا مان ہو۔" ان کے لہجے میں آزردگی تھی۔ "اچھا ہے تم طوفان ٹھہرنے تک بہل جاؤ۔"

"کتنا یقین ہے آپ کو طوفان ٹھہرنے کا۔" اس نے تمسخر سے سوچا۔

"گاڑی دیکھنے کب چلو گی۔؟ آج ہی چلو تو بہتر ہے۔ ڈلیوری جلد مل جائے گی۔"

"آپ ناحق اتنے پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ کون ہے اب گاڑی چلانے والا۔ آپ کو تو ڈاکٹر نے ڈرائیونگ سے منع کر رکھا ہے۔"

وہ ان کے سامنے سے اخبار اٹھا کر تہہ کرنے لگی۔

"فی الحال تو ڈرائیور رکھ لیں گے۔ اس دوران تم ڈرائیونگ سیکھ لینا۔ یہ گاڑی تمہارے لیے ہی لے رہا ہوں۔ بچیوں کو بہت پریشانی ہوتی ہے۔ اسکول بس کافی دور اتارتی ہے انہیں۔ حسن۔ بیٹے تم نے اپنی بچیوں تک کا خیال نہیں کیا۔" ان کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

"پولیس اسٹیشن گئے تھے۔؟" اس نے پوچھا۔

"جاتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے۔ تمہاری چچی نے برحق جان دی ہے۔ اب ہمیں بھی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ثریا اس دنیا میں۔" ان کی آواز ابھر آگئی۔

"خدا نہ کرے چچا جان۔" اس نے ان کا دل رکھنا چاہا۔ حالانکہ یہی یقین اسے بھی ہو چلا تھا۔

"ویسے ایس۔ ایچ او سے معلوم ہوا کہ حسن ان سے ملتا رہتا ہے۔ چلو اسے کسی کا تو خیال ہے۔"

اور ہاں ساحرہ کہاں ہے۔ بھئی تمام تیاری ہو گئی ہے۔ ٹکٹ آج کل میں آ جائے گا۔ دراصل میں چاہتا ہوں وہ جلد از جلد مانی کے پاس چلی جائے۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"ابھی تک بھرم قائم ہے۔ وہ لاعلم ہی رہے تو بہتر ہے اس طرح مانی بھی اس طوفان سے بے خبر رہے گی۔

بچہ شاید یہ دکھ نہ جھیل سکے۔ بہت محبت ہے اسے تک سب سے! اور اس کی وطن آمد سے پہلے مجھے یقین ہے۔ سنبھل جائے گا۔ بات بن جائے گی بقول تمہاری چچی کے جوشیلا ہے سدا کا۔ تم فکر نہ کیا کرو۔ زیادہ دیر کا غصہ نہیں ہے اس کا۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔

"جی چچا جان۔ غصہ چولہے کی آگ ہوتا ہے۔ ٹھنڈا ہو جاتا ہے لیکن "انا" تو جہنم کی آگ ہوتی ہے جو سدا دہکتی رہتی ہے۔ آپ کا بیٹا بہت انا پرست ہے میرا دل نہیں بہلتا۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ کسی دلاسے کسی تسلی سے۔"

"ساحرہ ہے کہاں۔؟ میں خود ہی اسے بتا دوں۔" وہ اٹھنے لگے۔

"میرے خیال میں وہ کچن میں ہے۔ بھیجتی ہوں۔" وہ درد کی اٹھتی لہریں دباتی کچن کی سمت چلی آئی۔

کس قدر کٹھنائیوں سے گزر کر وہ نیویارک پہنچا تھا۔ ثریا کو ایڈمٹ کرانے کے بعد گویا اس کے سر سے منوں بوجھ سرک گیا تھا۔ ڈاکٹر باقر کے حوالے سے سر مائیکل آرتھر نے اس کا پر تپاک خیر مقدم کیا تھا۔

انہوں نے چیک اپ کے بعد اسے بتایا کہ وہ پیدائشی طور پر اتنی ابنارمل نہیں تھی بلکہ بچپن میں اس کے ساتھ حادثہ بھی ہوا تھا جس کے نتیجے میں اس کے سر پر شدید چوٹ آئی تھی۔ ظاہر ہے وہ لاعلم تھا۔ سب کچھ سن کر وہ خاموش ہی رہا۔ تائید و تردید سے بے نیاز۔

ابتدائی چیک اپ تک وہ نیویارک ہی میں رہا اور کچھ نہیں تو سیر و تفریح ہی ہو گئی۔ اس نے سوچا باضمیر۔ و بے ضمیر کی زندگی میں تحت الثریٰ و عرش کا فرق ہوتا ہے شہلا۔ تمہارے حوالے سے ضمیر نے اپنی گرفت مزید مضبوط کر لی ہے۔ میں ثریا کو نہیں۔ تمہیں منہ دکھانے کے...... قابل نہیں ہوں۔ اب تو خدارا میرا پیچھا چھوڑ دو۔ ابتدائی چیک اپ کے بعد حوصلہ افزا رپورٹ ملی۔ تو واپس اپنے مرکز پر آ گیا۔

اور شہپر کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔

شہپر کی تصاویر انلارج کرائیں اور گھر میں سجائیں۔

جب وہ اپنا ثریا کا اور شہپر کا گروپ فوٹو فریم میں لگا رہا تھا تو کال بیل بج اٹھی وہ تصاویر وہیں چھوڑ کر دروازے تک آیا تو سامنے والی نیگرو خاتون مسز مایہ کھڑی تھیں۔ پوری کھیسیں نکال کر اخلاق سے پر مسکراہٹ کا مظاہر کیا۔

"مسٹر ملک۔ بہت لیٹ آئے۔ میں انتظار کرتی رہی۔ آپ کی ڈاک جمع ہو گئی تھی۔" انہوں نے کئی لفافے اس کی سمت بڑھائے۔

"تھینک یو۔ اندر آ جائیں۔ میں آپ کو اچھی سی کافی پلا سکتا ہوں۔"

"پلیز۔" وہ دروازے سے ہٹ کر اندر آنے کی دعوت دیتا ہوا بولا۔

شاید وہ رسمی اخلاق کا ادراک نہیں رکھتی تھیں۔ اس کے پیچھے چلی آئیں۔

"ہاؤ۔ بیوٹی فل چائلڈ۔" انہوں نے بے ساختہ شہپر کی تصویر پر ریمارکس کیے انہوں نے مڑ کر اسے بچے سے اس کا تعلق پوچھا۔

"میرا بیٹا ہے۔" وہ نظریں چرا کر بولا۔

"تم شادی شدہ ہو۔؟"

"جی۔!" اس نے گویا اقرار جرم کیا۔

"تو پھر بیوی اور بچہ ساتھ کیوں نہیں رکھتے۔" وہ رواں انگریزی میں تابڑ توڑ سوال کر رہی تھیں۔

"آنے والے ہیں چند دنوں میں۔" اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے کافی بنانے کچن
چلا آیا اور اس گھڑی پر نادم تھا جب مسز ماریہ کو مارے اخلاق کے اندر آنے کی دعوت دے بیٹھا تھا۔

کافی پینے کے دوران اسے بیوی بچے کے بارے میں بہت سی معلومات مادام ماریہ کو مہیا کرنا پڑیں وہ بہت
تھیں کہ مسز ملکھ کی موجودگی اس گھر میں رونق کا سبب ہوگی۔ اور وہ بھی اس اپارٹمنٹ کو اکثر لاکڈ دیکھ کر بور نہیں ہوں گی۔

وہ بڑی گھریلو قسم کی خاتون تھیں۔ ان کے شوہر فروٹ کا بزنس کرتے تھے۔ بچے کافی بڑے بڑے ہو
تھے۔ جو صبح کے گئے شام کو اسکول سے آتے تھے۔ اور جب چھٹیاں ہوتیں تو عارضی طور پر مختلف کاموں پر چلے جاتے۔

چھٹیاں ہوتے ہی وہاں ٹی وی پر اشتہار شروع ہو جاتے ہیں کہ فارغ بچوں کی فلاں اسٹور "فلاں انڈسٹری"
ضرورت ہے۔ اگر وہ چاہیں تو رجوع کر سکتے ہیں۔ گویا آمدنی کا سنہری موقع امریکہ کا یہ قاعدہ ملک نواز کو بے حد پسند آیا
کہ چھٹیاں مکمل طور پر چھٹیاں ہوتی تھیں بچے تمام نصاب اسکول کے حوالے کر کے شاد شاد چھٹیوں کے خیال سے گھر
کو لوٹتے تھے۔ اس دوران ان کا ذہن۔ اسکول۔ ہوم ورک۔ اس قسم کے خیالات سے بالکل آزاد رہتا تھا۔ پھر سمجھدار
کے بچے۔ ان چھٹیوں میں مختلف عارضی ذمہ داریاں نباہ کر اچھے خاصے ڈالر کما لیتے تھے۔ یا پھر اپنے والدین کے ہمراہ مختلف
جگہوں پر تفریح کرنے چلے جاتے تھے۔ یہاں چھٹیوں سے مراد چھٹیاں ہی ہوتی تھیں یہ نہیں کہ بچے چھٹیوں میں بھی ہو
ورک کی وجہ سے پریشان۔ صفحے کے صفحے سیاہ کرنے پر لگے ہوئے ہوں مادام ماریہ کافی دیر بیٹھی رہی تھیں۔

"میری شادی کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اس لیے۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

"جتنا عرصہ آپ نے بتایا یہ بھی کافی ہے۔" سسٹر آمنہ نے سوئے ہوئے شہپر کی پیشانی سے بال سمیٹے۔
ورنہ آج کل تو دسویں مہینے۔ لڑکیاں بچہ کھلانے لگتی ہیں۔"

اتنا حسین بچہ سسٹر آمنہ کی گود میں دیکھ کر وہ حیران سی تھی۔ کہ وہ خود تو واجبی سی شکل کی مالک تھیں اور کافی عمر
نظر آ رہی تھیں۔

"آپ کے ہاں بھی تو یہ "صاحب" بہت لیٹ آئے ہیں۔" اس نے شہپر کے چہرے کو پر شوق انداز
دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے ماشاء اللہ بہت حسین بہت پیارا بچہ ہے۔"

سسٹر آمنہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ "یہ میرا بچہ نہیں ہے۔ میں تو اس کی گورنس ہوں۔ اتفاق سے۔ اور جب
اس کے ماں باپ خوبصورت ہیں تو ظاہر ہے یہ کیوں ان سے پیچھے رہتا۔" انہوں نے پیار سے شہپر کو دیکھا۔

"تو اس کے والدین کہاں ہیں۔؟" ساحرہ کو تعجب ہوا۔

"وہ امریکہ میں ہیں انہی کے پاس جا رہے ہیں ہم۔"

"میں کچھ سمجھی نہیں۔" ساحرہ الجھی۔

"دراصل شہپر۔ اس بچے کا نام ہے۔" انہوں نے فوراً وضاحت کی پھر بولیں "شہپر کی ممی کی طبیعت ٹھیک
نہیں ہے۔ اس لیے وہ علاج کی غرض سے اپنے شوہر کے ہمراہ پہلے چلی گئیں۔ کیونکہ انہیں وہاں ایڈمٹ ہونا تھا۔ میری
تیاری مکمل نہیں تھی۔ اور بچہ میرے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے ہم اب جا رہے ہیں۔"

اوہ۔ چچ۔ کیا ہو گیا ہے اس کی ممی کو......؟" ساحرہ نے تاسف سے شہپر کو دیکھا۔

"زیادہ تو مجھے بھی علم نہیں۔ کچھ ذہنی طور پر ابنارمل ہو گئی ہیں۔؟"

"اف۔ شاید کسی ٹریجڈی کی وجہ سے۔؟" ساحرہ نے خیال ظاہر کیا۔

"بظاہر تو کوئی غیر معمولی بات میں نے نہیں دیکھی ان کے ہاں۔ اول درجے کے صاحب حیثیت لوگ
زمیں دار گھرانہ ہے۔ مسٹر ملک کی ایک مکمل فیملی ہے۔ وہ خود بھی بہت اعلیٰ بہت شاندار انسان ہیں۔ میں نے ان میں
کوئی بات نہیں پائی جس کی وجہ سے مسز ملک ڈپریسڈ ہو گئی ہوں۔ اب آگے واللہ عالم۔"

انہوں نے ساحرہ کی جانب دیکھتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"خدا کرے وہ ٹھیک ہو جائیں ورنہ بچے پر برا اثر پڑے گا۔" ساحرہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

"آمین! جھونپڑیوں کچے گھروں کوارٹروں میں رہنے والوں کے باہمی اختلافات سے پورا محلہ باخبر ہو جاتا
لیکن عالیشان گھروں میں رہنے والوں کے باہمی اختلاف، ائیر کنڈیشنڈ بیڈ رومز سے باہر آنے میں کافی وقت لیے
بعض اوقات تو گھر کے ایک فرد کو دوسرے فرد کے مسئلے کا دنوں علم ہی نہیں ہو پاتا۔
ہو سکتا ہے۔ یہ "بیڈ روم اختلاف" کا رزلٹ ہو۔ جو مسز ملک جان پر لے بیٹھی ہیں۔" سسٹر آمنہ نے
زبانی مواد پیش کیا تو ساحرہ نے ان کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا۔

پھر وہ اس کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ تب اس نے بتایا۔

وہ ہیوسٹن میں مقیم اپنے شوہر امان زید کے پاس جا رہی ہے۔ ایک الوہی سی مسرت ساحرہ کے چہرے سے
ابھری۔ وہ اس ڈپریسڈ ماحول سے رہائی پانے پر کافی سکون محسوس کر رہی تھی۔

اس نے بتایا کہ اس کا سسرال بہت اچھا ہے۔ ساس کا حال ہی میں انتقال ہو گیا ہے اس کی جٹھانی ایک
مہربان عورت ہے اگر سسٹر آمنہ کو شعر و ادب سے لگاؤ ہے تو انہیں جان کر شاید خوشی ہو کہ اس کی جٹھانی نامور شاعرہ شہلا
حسن ہے۔

حقیقی رفقاء سے محروم رہنے والی سسٹر آمنہ کی سب سے بڑی دمساز کتابیں......ہی رہی تھیں شہلا حسن کے
بارے میں انہوں نے کافی پڑھا تھا۔ روایتی عورت و آگاہ عورت کی رسہ کشی کی ترجمان اس کی شاعری نے بارہا ان کی
آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔ اگرچہ شہلا حسن کی شاعری کا کینوس بے حد وسیع تھا لیکن عورت کا وہ غم جو آگہی کے جبری
روایت سے گلے ملنے کے نتیجے میں ظاہر ہوتا ہے اس نے شہلا حسن کو ان کے قلب میں......اتار دیا تھا۔ انہیں تجسس ہوا۔
وہ اتنا گہرا اور دردناک کیوں کہتی ہے ساحرہ نے بے نیازی سے بتایا۔

"ہماری بھابی کو خدا کی عطا کردہ تمام نعمتیں حاصل ہیں۔ بہت خوش اور مگن ہیں سب ہی انہیں بے پناہ
چاہتے ہیں۔"

سسٹر آمنہ کو بے حد تعجب ہوا۔ کہ ایک خوش و خرم اور پرسکون زندگی گزارنے والی شاعرہ نیزے کی انی کی
طرح چبھتے ہوئے شعر کیسے کہہ لیتی ہے۔

"ان کے شوہر کیسے ہیں۔؟" وہ کسی نتیجے پہنچنا چاہتی تھیں۔

"بہت اچھے۔ گریس فل اور سوبر سے بے انتہا چاہتے ہیں بھابی کو۔"

"جوائنٹ فیملی سسٹم ہے آپ کے ہاں۔؟" انہوں نے خصوصیات سے پوچھا مبادا مسز ساحرہ امان کو دور
کے ڈھول سہانے لگتے ہوں۔

"جی۔ ہاں۔ اب تک تو جوائنٹ فیملی سسٹم ہی تھا۔ تین "کپل" تھے ہم اس گھر میں۔ ساس، جیٹھ جٹھانی۔
اور "ہم" ایک کپل" تو ٹوٹ گیا یعنی ہماری ساس کا انتقال ہو گیا۔ اور ہم امریکہ میں بس رہے ہیں۔ یعنی کہہ سکتے ہیں کہ

اب تک تو جوائنٹ ہی تھے۔ وہ مسکرائی تو مسز آمنہ نے بھی گفتگو کا رخ موڑ دیا۔

''نندیں وغیرہ بھی ہوں گی۔؟'' انہوں نے غور سے ساحرہ کا چہرہ دیکھا۔ ان کا مشاہدہ تھا آج کل کی شادی شدہ خواتین ساس سے زیادہ نندوں سے پریشان ہوتی ہیں۔

''جی۔'' ساحرہ کا چہرہ دکھی اثرات دینے لگا۔

''ایک تو شادی شدہ ہیں۔ پنڈی میں رہتی ہیں۔ اور ان سے بڑی۔ بلکہ میرے شوہر سے بھی بڑی۔ گزشتہ سال سے لاپتہ ہو گئیں۔ ان کا ذہنی توازن درست نہیں تھا میری ساس کا دراصل اسی غم میں انتقال ہوا ہے۔ وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں۔''

''اوہ۔!'' اب متاسف ہونے کی باری مسز آمنہ کی تھی۔

اسی وقت شہپر نے جاگ کر مسز آمنہ کو پریشان کرنا شروع کیا تو وہ اس کی جانب متوجہ ہو گئیں اور سلسلہ گفتگو منقطع ہو گیا۔

یہ اتنا سارا تعارف انہوں نے کراچی ائیر پورٹ کی انتظار گاہ ہی میں نمٹا لیا تھا۔

ڈیپارچر لاؤنج سے باہر آ کر مسز آمنہ کو زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑا۔ ان کے ''مسٹر ملک'' منتظر کھڑے تھے۔ ساحرہ کا اور ان کا ساتھ ڈیپارچر لاؤنج تک رہا تھا۔ وہ بھی کافی گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی اس کا سامان بھی مختصر تھا۔ جلد ہی کلیئرنس سے فارغ ہو کر وہ باہر جا چکی تھی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب وہ باہر ملک نواز کی گاڑی تک آئیں۔ تو انہوں نے دیکھا وہ بہت پریشان کھڑی ہے۔

''ایک منٹ سر!'' کہہ کر وہ اس کی جانب بڑھیں۔

''مسز امان۔ کیا بات ہے کوئی ریسیو کرنے نہیں آیا آپ کو۔؟''

''اور کون آتا انہوں نے ہی آنا تھا۔ پتا نہیں کیا بات ہے کیوں نہیں آئے ابھی تک اتنی لاپروائی تو نہیں برت سکتے۔ وہ حد درجہ پریشان تھی۔

''ایڈریس تو ہوگا ناں آپ کے پاس ٹیکسی سے چلی جایئے گا اگر کچھ دیر تک اور نہ آئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہمت سے کام لیں۔

ساحرہ کے لیے اس وقت مسز آمنہ کا دم کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

ملک نواز گاڑی میں سامان رکھ چکا تھا اور مسز آمنہ کے پلٹنے کا انتظار کر رہا تھا اسی وقت بلیو سوٹ میں ملبوس مانی بڑا پریشان سا آتا دکھائی دیا۔

''السلام علیکم!'' ساحرہ کے انداز میں خفگی سی تھی۔

''سوری یار۔ تمہیں تو بہت پریشانی ہوئی ہوگی۔ وہ کمبخت گاڑی راستے میں خراب ہو گئی۔ فسٹ ٹائم ایسی نہیں تھی حالانکہ۔'' وہ شرمندہ ہوا۔

''خیر۔ اپنی پرابلم۔؟'' اس کے انداز والہانہ تھے۔ ساحرہ نے اسے مسز آمنہ کی طرف متوجہ کیا۔

''ان کی وجہ سے میری ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔''

''بھول مت جایئے گا۔ ہمیں۔'' ساحرہ نے شہپر کے رخسار تھپتھپائے۔

''ایک ہی شہر ہے ملنے کے راستے خود بخود نکل آئیں گے۔'' مسز آمنہ بھی خلوص سے بولیں۔

مانی نے بھی غیر معمولی اور پرکشش سے بچے کے رخسار بے ساختہ چھوئے۔

''ہاؤ بیوٹی فل چائلڈ۔'' اسے بلومنگ فلاور (Bloomig flower)

وہ جلدی سے ملک نواز کی گاڑی کے پاس پہنچ گئیں۔

''سوری سر! وہ خاتون میری ہمسفر ہیں۔ ان کے شوہر لیٹ پہنچے بہت پریشان ہو رہی تھیں۔'' انہوں نے جلدی سے وضاحت کی۔

ملک نواز نے تازہ اخبار سے نظر اٹھائی اور اخبار ڈیش بورڈ کی طرف اچھال دیا۔

''میں سمجھا آپ کی کوئی رشتہ دار یا جاننے والی ہیں۔'' (عمر کے ڈفرنس کی وجہ سے دوست تو نہیں سمجھ سکتا تھا)

''ہم ایک دوسرے کی وجہ سے طویل سفر کی بوریت سے بچ گئے۔ سر۔''

''یہ تو بے حد اچھا ہوا۔'' اس نے سگار کا کونہ دانتوں سے نوچ کر جواب دیا پھر جھک کر سگار لگانے لگا۔

''یہ بھی فرسٹ ٹائم امریکہ آئی ہیں۔ اس لیے ذرا گھبرا رہی تھیں۔''

''ہوں۔!'' ملک نواز نے گاڑی میں چابی گھما کر لاتعلقی سے ''ہوں'' کہہ کر حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ ورنہ اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس سارے قصے سے۔

جب تک وہ اپنی ہم سفر کے پاس کھڑی رہیں وہ سرخیوں کی تفصیل میں ''اترا'' رہا شہپر تو ٹھیک رہا ناں۔؟''

''مسز آمنہ کو ایک دم یاد آیا کہ ملک نواز نے بیٹے کے لیے کوئی بے ساختگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ صرف اس کے رخسار چھونے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

''الحمدللہ۔ بالکل ٹھیک۔ آپ نے یاد کیا تھا سر۔ شہپر کو۔؟'' ملک نواز کی آنکھوں کے تاثرات پر سیاہ چمکدار شیشوں کے پردے تھے لیکن لب ضرور مسکرا دیے۔

''ظاہر۔ ہے۔ کوئی شک؟ بھئی بیٹا ہے میرا۔ وہ بھی اتنا کیوٹ۔'' اس نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اس کھیل کا مرکزی کردار۔ قدرتی رشتے کی اولین اہم کڑی...... وہ اپنا چھوٹا سا دہانہ پھیلائے مسکرائیے جا رہا تھا۔ ملک نواز نے آنکھوں پر سے گلاسز اتار دیے۔ اب وہ نظر سے بول رہا تھا اپنے بیٹے سے اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں اور لب بھی۔

''کتنے بجے پہنچا جہاز۔؟''

''میرے خیال میں ساڑھے سات بج رہے تھے صبح کے۔''

''نہیں۔ سر۔ جب بیٹھے بیٹھے بور ہونے لگے تو کوئی ائیر پورٹ آ جاتا۔ چینج مل جاتی۔ درمیان میں جتنے ممالک کے ائیر پورٹ آئے سر۔ وہاں بھی بہت لطف اٹھایا۔ اپنی ہم سفر کی وجہ سے۔''

''گڈ۔! باتوں کے دوران پتا ہی نہ چلا۔ وہ اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔

مادام ماریہ اپنے ''لاسٹ چائلڈ'' کو لیے کھڑکی میں کھڑی تھیں۔ ملک نواز کو گاڑی سے اترتے دیکھا پھر مسز آمنہ اور شہپر کو۔ وہیں کھڑے کھڑے کمنٹری کرنے لگیں اپنے شوہر کے لیے جو باتھ روم میں گھسے شیو بنا رہے تھے۔

''جانتے ہو ناں۔؟ سامنے والے اپارٹمنٹ فور کے ونڈرفل پاکستانی کو۔ آج اس کے بیوی بچے آ گئے ہیں۔ اس کے بیٹے کو تو میں تصویر میں بھی دیکھ چکی ہوں اس کی بیوی ''ایجڈ'' ہے۔ بالکل بے مزہ ''کپل'' ہے مجھے یہ کپل دیکھ کر دکھ ہو رہا ہے جون۔ مسٹر ملکھ کے ساتھ سخت ٹریجڈی ہوئی۔ جون مجھے اس کی بیوی بالکل پسند نہیں آئی۔

جون...... ایک سیکنڈ کے لیے آ کر دیکھ تو۔ تمہیں بھی دکھ ہوگا۔

اب مت آؤ۔ وہ اندر جا چکے ہیں۔'' انہوں نے کمنٹری ختم کردی۔

حقیقت صرف وہی..... نہیں ہوتی جو ہم پر گزرتی ہے۔ بلکہ حقیقت وہ بھی ہوسکتی ہے جو دیکھ رہے ہوتے ہیں اور گزر دوسرے پر رہی ہوتی ہے۔

جانے کب اس نے اپنی پاکٹ ڈائری پر یہ سطریں لکھ ماری تھیں۔ اب جو نظر سے گزریں تو احساس ہوا۔ سچ لکھا تھا۔ کیا کسی کو یقین آسکتا ہے کہ یہ سب میرے ساتھ ہوا۔ اور آج کے دور میں میری لگام میرے ضمیر کے ہاتھ میں ہے۔

''عشق کرنے والے کتنے حساس کتنے سچے اور کس قدر سادہ ہوئے ہیں ملک نواز!'' اس نے اعتراف کیا۔

'' کیوں۔ ہوں میں اتنا باضمیر۔؟ جو باضمیر ہوتے ہیں۔ کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے ان کی زندگی۔ آخر میں ڈاکٹر باقر کے سامنے انکار بھی تو سکتا تھا۔ میں شہلا کے گھر پر یہ عذاب مسلط کرسکتا تھا۔

'' کیوں ہے، میرا چہرہ اتنا سچا۔؟ میں جھوٹ کیوں نہیں بول پاتا۔؟'' وہ اپنا سامان سمیٹ کر سوٹ کیس میں ڈالتے ہوئے خود سے لڑ رہا تھا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ شہپر لڑکھڑاتا ہوا دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ اس نے ابھی نیا نیا چلنا سیکھا تھا۔

ملک نواز نے بیزار کن انداز میں دروازے کی سمت دیکھا وہائٹ ڈریس میں شہپر اپنی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے خون میں دوڑنے بھاگنے لگا۔

باپ کی جانب دیکھ کر والہانہ مسکرایا تھا۔

انگاروں پر چھینٹے پڑ گئے۔ الاؤ ٹھنڈے ہوگئے۔ جہنم پردے میں ہوگئی وہ بھی جواباً مسکرایا تو شہپر والہانا گرتا پڑتا اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

رشتوں کے گداز سے اس کا وجود ٹھنڈک سی پانے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے گود میں اٹھالیا۔ خوشبو دار مہکا مہکا سا شہپر اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ چھوٹی سی انگلی اٹھا کر ادھر ادھر اشارے کرنے لگا۔

''یار۔ اتنے جلے بھنے انسان کے ہاں تم جیسا خوش مزاج بیٹا کیسے ہوگیا۔؟ اور یہ تم کیا ادھر ادھر ٹہلیں کر رہے ہو۔؟ کہاں ہیں وہ تمہاری والدہ دوئم؟''

وہ اسے لیے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ شہپر بار بار اس کا چہرہ چھو رہا تھا۔ اسے بے حد تعجب ہوتا تھا کہ خراب سے خراب موڈ کو یہ ڈیڑھ فٹ کا انسان کتنی آسانی سے خوشگوار کردیتا تھا۔ جانے کیوں وہ اپنے اندر ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتا تھا۔ آفس سے واپسی پر عموماً سسٹر آمنہ اسے لیے ہوئے منتظر کھڑی ہوتی تھیں۔ وہ باپ کی سمت کتنے والہانہ انداز میں ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ پوری شدت سے محسوس کرتا تھا کہ اماں جی۔ ابا جی۔ بھائی رب نواز۔ رضیہ کے ساتھ رشتے کی لہریں آر پار ہو کر اپنائیت کا یقین دلاتی تھیں۔ یا پھر اب شہپر اس کے دل پر ہاتھ دھرے رہتا ہے اسے خود رشتوں کی صداقت معلوم ہوچکی تھی۔

اسے معلوم ہوگیا تھا۔ کہ اماں جی۔ اس کے قریب رہنے سے جلد صحت یاب کیوں ہوجاتی تھیں۔ جب بڑی بے رحمی سے انہیں خدا حافظ کہہ کر شہر آنے لگتا تھا تو ان کی آواز پر آنسو کیوں غالب آجاتے تھے وہ کیوں پھوٹ پھوٹ کر رویا کرتی تھیں۔

غصہ آور ابا جی اس کے اس قدر لاڈ کیوں اٹھاتے تھے۔؟

قدرت کے یہ انداز کتنے فطری اور حقیقی ہیں..... تعلق کی کڑیاں روحوں سے جڑی رہتی ہیں۔

''سب سے بڑی گنہگار تم ہو شہلا..... شاید۔؟ نہ تم اظہار ذات کو ضروری سمجھتیں۔ نہ میں تمہیں جانتا۔ نہ تمہاری آرزو کے محرومی کے انگارے چنتا۔ نہ سکون کے لیے۔'' پیتا..... اور نہ مزید سب کچھ ہوتا جو آج ہے۔ خواہ کتنی بار ئیں میرے بیڈ روم میں گھس آئیں..... دیوانی..... یا خود محتاط..... اتنا تو مجھے خود پر اعتماد ہے۔''

''ہونہہ..... اعتماد۔!'' کوئی اس کے وجود کے اندر مسکرایا۔

''یہ جو تم نے اپنے آپ پر اتنے پہرے بٹھائے ہوئے تھے یہ اسی کا رزلٹ ہے۔ جو قدرت کی نفی کرتا ہے قدرت انتقاماً اس سے اپنا آپ منواتی ہے پھر قہقہہ مار کر ہنستی ہے پوچھتی ہے۔ بڑا کون۔؟ ''تو..... یا ''میں''۔؟

تم نے حقدار کو اس کا حق نہیں دیا۔ وہ انگاروں پر لوٹ کر خالی ہاتھ چلی گئی۔

''کس کے لیے تم اپنا وجود بچا بچا کر رکھ رہے تھے۔؟'' شہلا نے کہا تھا۔؟ تم اسے یقین دلانا چاہتے تھے کہ تم بے عشق میں اتنے سچے ہو کہ ہر امتحان سے سرخرو آئے ہو۔؟''

فطرت سے منہ موڑ کر چل رہے تھے۔ دل دکھا رہے تھے۔ قدرت کب تک معاف کرتی۔؟ اس پر سے نازیہ کہ باضمیر ہو۔ اپنے کیے کی سزا پا رہے ہو۔ محسوس اس لیے کر رہے ہو کہ قدرت چاہتی ہے کہ محسوس کرو۔ اور جانو کہ خدا کتنا اور ہے۔

تقدیر وہ نہیں جو ''دکھا'' رکھا ہے۔ تقدیر وہ ہے جو کوشش کے بعد ملتا ہے۔ حرکت کے بعد میسر آتا ہے۔

کیے کا پھل تقدیر ہوتا ہے مسٹر ملک نواز۔ یہ تمہاری تقدیر ہے۔

مت جلو۔ کڑھو۔ یا تو کچھ کھا کر مرجاؤ۔ یا پھر جھیل لو۔

وہ شہپر کو گود سے اتار چکا تھا۔

سسٹر آمنہ اس کے لیے کافی بنا کر لائی تھیں۔

''تو مسز ملک آپ کے ہمراہ ہوں گی۔؟''

''دعا کیجیے۔''

''میری تو دل سے دعا ہے کہ وہ ٹھیک ہوجائیں۔ کتنی رونق ہوجائے گی اس گھر میں۔''

اس نے دھڑکتے دل سے اس کے جسم کی حرکت محسوس کی تھی۔

تمام سہولتوں سے مزین روم میں اس وقت اس کے ہمراہ صرف مائیکل آرتھر تھے۔ وہ جاگ چکی تھی۔ پاسپٹل کے سادہ و آرام دہ کپڑوں میں ملبوس ایک نئی ثریا سامنے تھی۔ گم صم۔ اور سوچتی ہوئی۔ شعور کی قوت سے محسوس کرنے والی پایا۔ اس نے ملک نواز کی سمت دیکھ کر نظریں مائیکل آرتھر کی طرف موڑ لی تھیں۔

ڈاکٹر مائیکل آتھر نے اسے کہا کہ وہ اس سے کچھ باتیں کرے۔ اور جب تک وہ مکمل صحت یاب نہیں ہوجاتی اس کے پاس رہے اس لیے کہ وہ اشاروں سے باتیں کر کر کے پہلے سے زیادہ پاگل ہوجائے گی۔ سب سے بڑی ٹریجڈی اس کے ساتھ یہی ہے کہ وہ زبان نہیں سمجھتی۔ برین واشنگ ہوچکی ہے اس کے لیے ایک پاکستانی ڈاکٹر و ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ ان تمام باتوں سے تو ملک نواز لاعلم نہیں تھا اس نے خواہش ظاہر کی کہ ڈاکٹر یوسفی کو بھی یہاں بلا لیا جائے۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر یوسفی بھی کمرے میں تشریف لے آئے۔

ہم وطن و ہم زبان کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ تین ماہ پیشتر جب ملک نواز نے چکر لگایا تھا تو علاج تندہی سے

ہورہا تھا۔اوراسے بتایا گیا تھا کہ وہ تین ماہ بعد آکر مل لے۔کیونکہ وہ بتا چکا تھا کہ وہ جلد جلد اتنی دور آنے سے قاصر ہے

ڈاکٹر یوسفی ثریا کی جانب بڑھے۔

''یو آر رائٹ گڈ لیڈی۔'' ڈاکٹر مائیکل نے اس کا سر تھپتھپایا۔

''تم کو بھوک تو نہیں لگ رہی۔'' ڈاکٹر یوسفی نے اس کا ہاتھ تھام کر شفقت سے پوچھا۔

ثریا نے نفی میں سر ہلایا۔

''نیند آئی تھی اچھی سی۔؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''انہیں جانتی ہو......؟'' انہوں نے ملک نواز کی جانب اشارہ کیا۔

ثریا نے ایک نظر ملک نواز کو دیکھا پھر ڈاکٹر یوسفی کی طرف بے چارگی سے دیکھنے لگی۔

''یہ اس دنیا میں تمہارے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔نہیں سمجھیں۔؟ یہ تمہارے بہت قریبی رشتے دا ہیں۔'' انہوں نے جملہ آسان فہم کیا۔

''اگر تمہارا علاج کرانے میں اتنی دلچسپی نہ لیتے تو تم۔جب تم باہر نکل کر دیکھوگی تو پتا چلے گا، ذہنی مریض کم زندگی گزارتے ہیں۔اوروہ ایسی زندگی گزارنے پر اس لیے مجبور رہیں کہ ان کے پاس یا ان کے لواحقین کے پاس اتنا پ نہیں کہ وہ اتنا مہنگا علاج کرا سکیں۔

ثریا...... تمہیں مسٹر ملک کے بارے میں روز بتایا اور سمجھایا جاتا رہا ہے۔ان کا تم سے کیا رشتہ ہے۔تم ک طرح بیمار ہوگئی تھیں۔کس طرح ٹھیک ہوئیں۔یاد آیا۔؟ یہ وہی مسٹر ملک ہیں۔انہیں اپنی آواز سناؤ۔تا کہ وہ بھی سا ترقی کا نمونہ دیکھیں۔بولو۔شاباش۔سلام کیسے کرتے ہیں۔؟ سلام کرو انہیں بتایا تھا ناں۔؟ شاباش۔''

ثریا نے ملک نواز کی سمت دیکھا۔پھر آہستہ سے بولی۔

''السلام۔موعلیکم۔''

''جواب دیں مسٹر ملک......'' ڈاکٹر یوسفی نے ٹہوکا مارا۔

''وعلیکم السلام۔!وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولا۔

''کوئی بات کرو ان سے۔شاباش۔''

ثریا نے ملک نواز کی سمت دیکھا۔

''بیٹھ جایئے۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''ویل۔'' دونوں ڈاکٹرز نے اظہار مسرت کیا۔

''مسٹر ملک آپ ثریا کو اپنے اور ثریا کے بارے میں بتایئے۔آئی مین۔ریلیشنز امنگ یو۔'' ڈاکٹر یوسی او مائیکل آٹھ کر باہر چلے گئے۔''ثریا آپ میری کزن اور میری بیوی ہیں۔آپ سے مجھے ایک بڑا پیارا سا بیٹا ملا ہے۔ پیدائش کے دوران آپ کی حالت خراب ہوگئی تھی۔اسی دوران ہمارا بیٹا ہوا۔تب سے آپ زیر علاج ہیں۔''

ڈاکٹر باقر کے کہے بلکہ سکھائے الفاظ اس کے ہونٹوں سے پھسل پڑے۔ثریا کے چہرے پر سخت الجھن آثار تھے۔

پھر ملک نواز نے اسے سمجھایا کہ اس علاج کے دوران اس کی برین واشنگ بھی کی گئی وہ ماضی کے بار

نے سے قاصر رہے گی۔کیونکہ پچھلے تمام واقعات اسکرین سے مٹا دیے گئے ہیں ثریا نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا تھا۔ بار بار نظریں اٹھا کر ملک نواز کی سمت دیکھتی رہی تھی۔

معاً ملک نواز کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔اسے یاد آیا کہ یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ ثریا نے ایک صحت مند بچے جنم دیا ہے۔تمام ڈاکومنٹس میں یہیں تحریر ہے کہ وہ بچپن ہی سے ذہنی مریضہ ہے۔

اب وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اس کی بیوی اور بچے کی ماں ہے۔

اس نے ثریا کی سمت دیکھا پھر اس کے نزدیک چلا آیا۔

''جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں۔وہ کسی کے سامنے مت دہرانا۔'' وہ آپ سے ایک دم پھر تم پر آ گیا کہ پرانی عادت تھی۔

ثریا نے بغور ملک نواز کی سمت دیکھا۔یہ نیلی۔بھوری آنکھوں والے انگریز ڈاکٹر۔جن کی پھیکی سی جلد میں ئی جاذبیت نہیں تھی۔

یا پھر ڈاکٹر یوسفی اور ڈاکٹر مجید قریشی جیسے نصف گنجے ڈاکٹر ان کے مقابلے میں اس کا یہ رشتے دار یا شوہر کتنا پر شش تھا۔کتنا مکمل سا۔اس کا ذہن بتدریج صحت مند ہو رہا تھا۔حس لطیف پوری طاقت سے کام کر رہی تھی۔اسے ایسا وس ہو رہا تھا۔کہ وہ سو کر جاگی ہے۔سوئی کب تھی؟ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔

چھوٹے نوزائیدہ بچے کی تمام حسیات بتدریج نشوونما پاتی جاتی ہیں اور ایڈجسٹمنٹ خود بخود ہوتی رہتی ہے۔ یہ حال ذہنی مریضوں کا ہے۔تندرستی کے عمل کے بعد ان کے تمام اعمال و افعال خود بخود ہر شے سے ہم آہنگ ہونے ے ہیں۔

اسے ملک نواز پر ٹوٹ کر یقین آ گیا تھا۔کہ اس کی وہ حس بھی تیزی سے کام کر رہی تھی جو رسمی اور غیر رسمی لقات کا فرق بتاتی ہے۔

ادھر ملک نواز باتیں تو کر رہا تھا۔لیکن ابھی تک وہ حالت تحیر میں تھا۔اس نے اپنی زندگی میں کسی ذہنی مریض صحت مند حالت میں نہیں دیکھا تھا۔۔بلکہ۔انہیں پاگل خانوں میں سر ہی ٹکراتے دیکھا تھا۔

یا پھر نفسیاتی کلینک میں اسپتال میں لواحقین کا صبر آزماتے ہوئے ڈاکٹر باقر کے الفاظ یاد آئے۔

''یہ وہ پاگل نہیں ہے جو زنجیر کیے جاتے ہیں۔صرف ذہنی مریضہ ہے۔بلکہ بچپن کی غلط ٹریٹ منٹ نے اسے نقصان پہنچایا۔انہوں نے کہا تھا اصل چیز تشخیص ہوتی ہے۔بالکل اسی طرح کہ لیور رکھنے کی جگہ معلوم ہو جائے تو تو ین اٹھا کر رکھ دی جائے۔'' پھر اس نے سوچا۔

''حیرت تو نہیں کرنا چاہیے مجھے پھر سائنس کا کمال ہی کیا۔کہ بیلی لینڈنگ کرنے والے طیارے کو بائیں ڑ کا کمیل سمجھ کر ٹھیک کر دیں۔اور ایک ''انسان'' کو ٹھوکریں کھاتے دیکھتے رہیں اور اس کا علاج نہ سوچ سکیں۔چاند کے ڑھوں میں اچھی طرح جھانک آئیں مریخ پر ہوا کے سراغ لگا آئیں اور ایک انسانی دماغ کو نہ سمجھ پائیں۔یہی تو اصل ائنسی ترقی ہے۔''

وہ ثریا سے ہلکے پھلکے سوالات کرنے لگا۔

جن سے اکثر کے جواب اس نے نہیں دیے۔

جب شہپر سو جاتا تھا تو سسٹر آمنہ کو سونے گھر میں وحشت سی ہونے لگتی تھی بعض اوقات وہ کلام پاک لے کر

بیٹھ جاتیں یا کھڑکی کے نزدیک کرسی رکھ کے نیچے بھاگتے دوڑتے ٹریفک پر نظریں جما دیتیں۔

آج بھی جب شہپر سو گیا تو وہ خاموشی سے گھبرا سی گئیں۔ کچن میں جا کر صفائی کرنے لگیں پھر تھوڑی سی فروٹ کر فریج میں رکھی۔ تب بھی طبیعت کسی طور نہ بہلی تو وہ دونوں بیڈ رومز کی حالت کا اندازہ کرنے چلی آئیں' سر کا بیڈ درست کیا۔ خواہ مخواہ ہی اچھی بھلی بیڈ شیٹ تبدیل کر ڈالی۔ جب سائیڈ ٹیبل پر جھاڑن پھیرنے لگیں تو درمیان سائز کی براؤن ڈائری پر نظر پڑی جو کھلی ہوئی تھی لیکن الٹ کر رکھی ہوئی تھی گویا کوئی اچانک لکھتے لکھتے کسی ضروری کام سے اٹھ کر گیا ہو۔

وہ فطرتاً مہذب اور با اصول تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی ڈائری پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب ابھی ان کا ارادہ نہیں تھا کہ وہ یہ اخلاقی جرم کریں۔ لیکن جب انہوں نے ڈائری سیدھی کی تو پندرہ دن پرانی تاریخ کے نیچے اشعار لکھے ہوئے تھے جو انہوں نے پڑھ ڈالے۔

امید پرسش غم کس سے کیجیے ناصر؟
جو اپنے دل پر گزرتی ہے کوئی کیا جانے
قوت غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل
اے عشق کہیں لے چل اس پاپ کی بستی سے
نفرت گاہ عالم سے لعنت گاہ ہستی سے
اے عشق کہیں لے چل۔
اے عشق۔
اے عشق۔

اوہ میرے خدا۔ میرا خیال غلط نکلا مسز ملک۔ مسٹر ملک۔ آپ کو اتنی شدت سے چاہتے ہیں۔ پھر آپ کو کون سا غم اس حالت کو پہنچا گیا۔ مسز ملک آ جائیں تو۔ میں انہیں ضرور بتاؤں گی کہ آپ اس دنیا کی خوش نصیب ترین عورت ہیں۔ جس کی صحیح عمر میں شادی ہوئی جسے۔ ایک شاندار شخصیت کا حامل شوہر ملا۔ اعلیٰ حسب نسب کا حامل اور صاحب حیثیت ایک انتہائی حسین بیٹا۔ اور پھر سب سے بڑھ کر اس قدر شدت سے چاہنے والا شوہر کہیں اتنی ساری خوش نصیبوں نے تو آپ کے ہوش نہیں اڑا دیے۔؟ مسز ملک میں شدت سے آپ کی منتظر ہوں۔

ہاسپٹل جانے سے پہلے۔ اس نے ریسلنگ کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔ نیویارک میں آ کر "اس" سے محروم رہ جانا اسے گوارا نہیں تھا۔ دوسرے۔ وہ ثریا کے تصور سے بچنا چاہتا تھا اس کی کھوجتی خاموش اور مظلوم سی نظریں اس کے اعصاب توڑ پھوڑ دیتی تھیں۔ وہ تھوڑی تفریح کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پاکستان میں دیکھا تھا کہ لوگ ریسلنگ کی ریکارڈنگ دیکھ کر ہی پھولے نہیں سماتے۔ عموماً پاکستان میں نیویارک میں منعقدہ ریسلنگ کی ریکارڈنگ دکھائی جاتی ہے۔ اس کا خیال تھا فریش اور لائیو ریسلنگ مقابلے دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

اس کا خیال تھا خدا نے اسے بے حساب مال و دولت سے نواز کر شخصیت کو بیلنس اور زندہ رکھنے کی کوشش ہے۔ وگرنہ اتنے روگ جو اس کی جان پر لگے ہیں ان میں اگر معاشی تنگی بھی شامل ہو جاتی تو شاید پھر وہ خودکشی کر لیا۔ معا آسودگی بھی بہت سی پریشانیوں کا علاج بن جاتی ہے۔

اس نے اپنا کراچی کا ایک فلیٹ بیچ کر اور اپنی بچت لا کر حال ہی میں ایک پاکستانی تاجر کے ساتھ مل کر اس

شیئر کرنے سے اسے پرائے دیس میں بھی معاشی استحکام حاصل ہو گیا تھا۔

ویسے تو "بزنس! ایڈمنسٹریشن کے ایک اہم عہدیدار کی حیثیت سے بھی اس کی معاشی حالات اطمینان بخش ناصر صاحب اسے "پرنس" کہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ آل راؤنڈر بھی مشہور تھا۔ ایم۔ کام کے بعد اس نے ادب میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کر لی تھی۔ پھر ایم۔ بی۔ اے کیا عشق نے ستورشیں شروع کیں تو پھر اس نے کتابوں ڈھونڈی۔ جرنلزم میں ایم۔ اے کیا۔ اخباروں رسالوں کے دفاتر میں خود کو بہلایا۔ مگر دل نہیں بہلا۔

اور پھر سب سے رشتے توڑ کر جی بہلانے امریکہ آیا۔ تو کمپیوٹر کورسز کیے۔ ناصر صاحب کو جب اس کے کورسز کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ہنس کر کہا تھا۔

"یار۔ کچھ اپنے بچوں کے لیے بھی رہنے دو۔"

"ناصر بھائی۔ بے کار سے بیگار بھلی۔ وقت تو کاٹنا ہوتا ہے نا۔؟" یہ اس کا جواب تھا۔

"بہت اچھے...... بھئی ایسے "بیگار" کی اللہ سب کو توفیق دے۔" اس کی سوچیں ٹھیک کر پھر ایک مرکز پر آ کر ئیں۔

عورتوں کی چیخیں۔ مردوں بچوں کی سیٹیاں۔ واہ و تحسین۔ وہ مزید سوچوں کی وادیوں میں نہ بھٹک سکا۔

ریسلنگ بہت دلچسپ تھی۔ اس نے بہت لطف اٹھایا۔ جب وہ فریش باہر آیا تو یاد آیا کہ آخر وہ نیویارک کس خوشی میں ناپ رہا ہے۔ وہ یہاں کس مقصد کے لیے آیا ہے۔؟

"ملک نواز یہ تمہاری سینتیس سالہ زندگی کا سب سے اہم موڑ ہے۔ سنبھل کے۔" جب وہ ثریا کے کمرے میں تو وہ فائل میں رکھے کاغذات پر کچھ لکھ رہی تھی۔ وہ متحیر سا آگے بڑھا۔

وہ اردو اور انگریزی میں لکھے نام "ثریا" پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بچوں کے سے انداز میں بہت سنبھل سنبھل کے۔

"السلام علیکم۔"

ثریا نے نظریں اٹھائیں۔ "وعلیکم السلام۔" اس نے خود کار مشین کی طرح جواب دیا۔ بلیو پینٹ اور دھاری ٹ میں سگار کا سرا کچلتے ہوئے اسے اپنا یہ "رشتے دار" بہت اچھا لگا۔

"کیا ہو رہا ہے۔؟ نام لکھا جا رہا ہے۔ لکھ کر کس نے دیا ہے۔؟" ابھی وہ زیر علاج تھی۔ اس لیے تھوڑی ی تو تھی قوت ارتکاز ابھی بھی نارمل نہیں تھی عموماً چونک پڑتی تھی اور اس طرح دیکھتی تھی گویا کہہ رہی ہو "مکرر۔"

"یہ نام جو لکھا ہے ناں جس پر تم ہاتھ پھیر رہی ہو...... کس نے لکھ کر دیا ہے۔؟"

"ڈاکٹر یوسفی نے۔!" اس نے آہستگی سے بتایا۔

"کیسے ہیں ڈاکٹر یوسفی۔؟" اس نے ثریا کی موٹی انگلیوں میں دبے قلم کی حرکت پر نظریں جما کر پوچھا۔

"ہوں۔؟" ثریا سمجھی نہیں۔

"میرا مطلب ہے کیسے لگتے ہیں تمہیں۔؟" یہ محض بات برائے بات کر رہا تھا۔

"آپ سے اچھے ہیں۔" اس نے "ث" کے نقطے گہرے کیے۔

"ہائیں۔؟" بالکل غیر متوقع جواب تھا۔ وہ سٹپٹا سا گیا تھا۔

"آپ۔ کہاں چلے جاتے ہیں......؟"

"بھئی، میں تمہارے ساتھ ہاسپٹل میں تو داخل نہیں ہو سکتا ناں۔ اور اب تو تم بالکل ٹھیک ہو۔ جلد ہی گھر

چلیں گے۔"

"گھر کہاں ہے۔؟ اسی ملک کے دوسرے شہر میں۔ ہیوسٹن میں۔"

"میرا دل چاہ رہا ہے گھر دیکھوں۔" وہ بہت سادگی سے کہہ رہی تھی۔

"اسے اتنے اچھے انداز میں بات کرتے دیکھ کر ملک نواز حواس باختہ ہونے لگتے تھے۔ اس کا جی چاہتا، اسے لے کر "درالسلام" میں اڑ کر پہنچے اور کہے کہ۔ دیکھو اپنی ثریا۔ کو۔ اور اسی بات پر میری تمام خطائیں معاف کر دو۔

ڈاکٹر باقر نے بہت مرتبہ اسے سراہا بھی تھا کہ وہ واقعی ایک اچھا انسان ہے جس نے ایک اجنبی لڑکی پر پیسہ خرچ کیا۔ ورنہ خطا کار تو اس سے بھی بڑھ کر...... ہوتے ہیں لیکن۔؟ (کاش یہ اجنبی ہوتی۔ پھر شاید میں ضمیر کی زبان کاٹ دیتا۔ آنکھیں پھوڑ دیتا مشکل تو یہی ہے کہ یہ اجنبی نہیں ہے۔)

"باقر بھائی۔ بینک نے آج تک بچت پر جتنا دیا تھا وہ ادھر خرچ کر دیا ہے۔ میری جیب سے کیا گیا ہے؟" اس نے ہنس کر اپنی سخاوت کو بے اثر کیا تھا۔

ثریا سفید فرل لگی میکسی میں ملبوس تھی۔ اس کے بال ترشے ہوئے تھے۔ وہ ہونٹ بھینچے بڑی دل جمعی سے قلم چلا رہی تھی۔

"پھر لکھ لینا ثریا۔ جب میں چلا جاؤں گا۔"

ثریا چونک پڑی۔ "ہوں۔؟"

"بھئی باتیں کرو مجھ سے میں تم سے باتیں کرنے آیا ہوں۔"

"ملک۔!" ثریا کی خوبصورت آواز میں اس کا نام کیسا سجا تھا۔

ڈاکٹر یوسفی کی محنت بہت واضح ہو رہی تھی۔ وہ اس "رشتے دار" سے اسے ذہنی طور پر بیحد قریب کرنا چاہتے تھے۔

"ہوں۔ کہو۔؟"

"آپ اس دن کیا کہہ رہے تھے۔؟"

"کس دن۔؟" وہ الجھا۔

"آپ کہہ رہے تھے۔ میں۔ میرا بیٹا۔ مم۔ بیمار تھی جب......" وہ بے ربط سی تھی۔

"گھر جا کر دیکھنا۔" اسے ثریا اس دم بہت اپنی سی لگی۔

"کب چلیں گے؟"

"اور جلدی چلین گے۔ ڈاکٹر مائیکل کہہ رہے تھے بہت جلد بالکل تندرست ہو جاؤ گی۔ (ڈاکٹر یوسفی بتا رہے تھے کہ آج کل "ارتکاز" "توجہ" اس کو مشق کرائی جا رہی ہے۔

اسلامک سینٹر میں ایجاب وقبول کے بیس اس نے رخت سفر باندھا تھا علاج کی تمام شہادتیں بھی جمع کرا دی تھیں۔ ثریا کو پورے تین گھنٹے سمجھانے میں صرف کیے تھے کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے۔ ثریا کے اور اپنے قانونی تعلق کو نقول پلاسٹک کوٹڈ کروا کے بریف کیس میں احتیاط سے رکھی تھیں۔ علاج تیرہ ماہ میں مکمل ہوا تھا۔ کچھ دوائیں بدستور جاری رکھنا تھیں۔

اسی دن انہوں نے ہیوسٹن روانگی اختیار کی۔ ہاسپٹل کے عملے نے ثریا کو بہت سی مبارکبادیوں اور دعاؤں کے ہمراہ رخصت کیا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد چیک اپ کرانے کی ہدایت کی تھی۔

جب وہ سیاہ میکسی، سیاہ سوئیٹر اور سرخ شال میں لپٹی ثریا کو لے کر اپنے اپارٹمنٹ میں پہنچا۔ تو سسٹر آمنہ۔ اتنے جوڑے کو مبارکباد دینے بے ساختہ انداز میں آگے بڑھی تھیں۔ ان پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔

"کونگریچولیشن۔ مسٹر اینڈ مسز ملک۔"

"تھینکس مس آمنہ!" ملک نواز کا لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا۔

"شہپر کہاں ہے۔؟ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

"ابھی ابھی سلایا ہے۔ شہپر کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہو گیا۔؟" اس کے چہرے کے ہر نقش نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"ہلکا سا ٹمپریچر ہے۔"

"آپ اتنا لائٹ کیوں لے رہی ہیں۔ ہلکا سا ہے تو بڑھ بھی سکتا ہے۔" اس کے لہجے سے اس کی ازلی و ...ازشی عیاں تھی۔ "آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا چاہیے تھا۔"

"میں نے بے بی پیٹس استعمال کی تھیں۔ کافی افاقہ ہے۔" سسٹر آمنہ کی آواز کانپ رہی تھی۔ "مجھے گھر کی ...ت کا بھی خیال تھا سر۔ اور......"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اور ہاں نوٹ کر لیجیے۔ گھر اس بچے سے بڑھ کر نہیں ہے صرف اور صرف اس بچے کی ...یں نے زندگی میں خوامخواہ کے کھڑاگ مول لیے ہیں۔"

اس نے سسٹر آمنہ کی بات کاٹ کر سرد مہری سے کہا تھا......

اور ثریا کو وہیں چھوڑ کر شہپر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ثریا حیران پریشان کھڑی تھی۔ سارے راستے ایک مخلص دمساز کا کردار نبھانے والا گھر آ کر کتنا بدل گیا تھا ...ے سسٹر آمنہ کی بھی سمجھ نہ آ رہی تھی کہ آخر عورت کون ہے۔؟

سسٹر آمنہ نے آگے بڑھ کر ثریا کے ہاتھ تھام لیے۔

"مسز ملک۔ دوسرا جنم خیر کا ہو...... میری دلی دعا ہے۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔ آپ کے ڈریسز وارڈ روب ...الکل تیار ہیں۔ آپ لباس تبدیل کر لیں۔ اور مجھے بتائیں چائے پئیں گی یا کافی، یا کھانے کا انتظام کروں۔"

"میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔ ملک سے پوچھ لیں۔"

"سسٹر آمنہ اسے شہپر والے کمرے میں لے آئیں۔ ملک نواز نے بیٹے پر کمبل ڈالتے ہوئے قدموں کی ...ہٹ کی تو گردن موڑ کر دیکھا۔

"مس آمنہ...... پلیز ایک کپ کافی بنا دیں۔" شاید اس نے سسٹر آمنہ کو ٹالا تھا وہ فوراً باہر نکل گئیں۔

ملک نواز نے ثریا کی سمت دیکھا۔

"ادھر آؤ ثریا۔"

...نے سہمی ہوئی نظروں سے ملک نواز کی سمت دیکھا۔ پانچ منٹ کے وقفے کے بعد وہ پھر پتھر تبدیل ہو چکا تھا......

ملک نواز کو سبز آنکھوں کے سہم نے جیسے لوٹ لیا۔ وہ اس کی سمت بڑھا۔

"جان...... یہ...... ہمارا بیٹا ہے۔ شہپر۔"

ثریا کی پرشوق نظروں نے بچے کا جائزہ لیا۔ ایک حسین اور صحت مند بیٹا۔ مامتا اور محبت اندھی اور بہری ہوتی

ہے۔اسے یہ بچہ اپنا اپنا سا لگا۔اسے اس تخلیق کے لیے اٹھایا گیا کرب یاد نہیں تھا۔وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک عورت ماں بننے
کے لیے کن کن مراحل سے گزرتی ہے۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ عورت ماں کس طرح بنتی ہے۔

لیکن اس من چاہے آدمی کا اصرار تھا کہ وہ ماں۔

وہ پیچھے پیچھے کی جانب پلٹ کر سوچنا چاہتی تھی تو اسے صرف وہ مشینیں یاد آتیں جو اس نے آنکھ کھول کر
دیکھی تھیں۔جہاں بہت سے سرخ و سفید افراد مشین کی طرح کام کر رہے تھے۔

اسے وہ کرب یاد تھا جو سر ایک لوہے کے خول میں جکڑے جانے کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا اس سے آگے سوچنے
کی کوشش کرتی تو اعصاب جواب دینے لگتے۔ذہن کے پردے صرف سائے رینگتے محسوس ہوتے۔وہ ذہنی اعتبار سے
نارمل تو ہو گئی تھی۔لیکن دماغی و ذہنی طور پر ان افراد کی کیٹیگری میں شامل تھی جو کمزور حافظے کے مالک ہوتے ہیں۔چیزیں
رکھ کر اگلے ہی لمحے بھول جاتے ہیں۔

لیکن رشتے ناتوں کا افتخار تو حافظے کا محتاج نہیں ہوتا۔کم از کم اس افتخار سے ان کے وجود کو ایک خود اعتمادی
میسر آتی ہے۔

اسے رشتہ میسر بھی آیا تھا تو یہ...... ناقابل اعتبار سا۔

اس نے جھک کر بغور شہپر کو دیکھا۔

''کتنا پیارا ہے یہ۔؟''اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''آخر تمہارا بیٹا ہے۔''

اسی وقت مسز آمنہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

ثریا شوہر کی رومانوی سے بے نیاز تھی اور اس سے بھی کہ مسز آمنہ کمرے میں چلی آ چکی ہیں ملک نواز نے
رخ موڑ کر آمنہ سے ثریا کے بارے میں گفتگو کی جس کے جواب میں انہوں نے پیار سے ثریا کے ہاتھ تھامے۔

''مسز ملک...... آپ کپڑے بدل لیں اور آرام کریں۔''وہ محبت بھرے انداز میں تھام کر کمرے سے باہر
لے گئیں۔ان کے پیچھے ملک نواز ہی باہر کی جانب چلا تھا۔

☆☆☆

لاؤنج سے اٹھ کر وہ باتھ روم میں گیا تھا۔سخت سردی کے باوجود کافی وقت باتھ روم میں گزار کر نم بالوں میں
انگلیاں چلاتا باہر آیا تھا تو ایک نئی تبدیلی اس کی منتظر تھی۔اس کے بیڈ کا دوسرا کونا آباد ہو چکا تھا۔

وہ رک گیا۔

یہ تو اسے یاد نہیں رہا تھا کہ اب وہ باقاعدہ شادی شدہ فرد ہے۔ایک مکمل گھرانے کی بنیاد رکھی جا چکی ہے۔
کمرے میں ہیٹر آن تھا۔

اس نے شکر کیا کہ ثریا سو چکی ہے۔ورنہ وہ اس کے الجھن بھرے رویے پر کیا سوچتی......؟ ہر چند کہ اسے
احساس تھا کہ بطور شوہر اس نے ثریا کو ڈھیروں اسرار اور رموز سے آگاہ کرنا ہوگا۔بہت سی باتیں سمجھانی ہوں گی۔لیکن فی
الحال آج کی شب وہ پرسکون نیند لینا چاہتا تھا۔

وہ بیڈ پر آکر دراز ہو گیا۔ثریا نے کروٹ بدل لی۔

ملک نے دیکھا اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔گویا وہ سو نہیں رہی تھی رو رہی تھی اسے دکھ محسوس ہوا۔

''کیا بات ہے ثریا۔؟''اس نے فاصلے کم کیے۔

وہ کچھ نہیں بولی۔البتہ سسکیاں تیز ہو گئیں۔

اس نے سائیڈ سے رومال اٹھا کر ثریا کے اشک صاف کیے۔

''دیکھو...... اس طرح نہیں...... جو بات بھی ہے...... صاف صاف بتاؤ''ملک نواز کے بازو اپنا سفید سا
ہاتھ جما کر وہ پھر رو پڑی تھی۔

''ملک...... میں کون ہوں۔؟''

ملک نواز کو جھٹکا سا لگا۔وہ یقیناً ہوش مندی کے زینے عبور کر رہی تھی۔

''مجھے شہپر کو دیکھ کر خیال آیا۔جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے تو اس کے پالنے والے ہوتے ہیں کتنے پیار سے رکھتے
ہیں۔میں سوچ رہی ہوں کہ جب میں شہپر جنتی تھی۔تو اور مجھے یقین کیوں نہیں آتا کہ...... آپ...... شہپر...... مجھے سوچ
سوچ کر چکر آنے لگتے ہیں......

ملک نواز نے اسے شیشے کی طرح سنبھالا۔

''جو کچھ تمہیں بتایا ہے وہ حقیقت ہے ثریا۔کیا کوئی غیر کسی کے لیے اتنی مشکلات اٹھا سکتا ہے جو میں نے
تمہاری خاطر اٹھائی ہیں۔تم ذہن پر زور مت ڈالا کرو۔ورنہ۔تمہیں ہی نقصان ہوگا۔یہ گھر تمہارا ہے۔میں تمہارا ہوں۔
ہمارا ایک پیارا سا بیٹا ہے۔ثریا۔اب ہم مکمل ہو چکے ہیں۔''(آہ)

عشق وقتی طور پر پردے کے پیچھے چلا گیا۔ملک نواز کے اندر کا فطری انسان ابھر آتا۔فطری انسان چند لمحوں
کے لیے فطری تقاضوں کے سامنے گھٹنے ٹیک بیٹھا۔یوں تو شب زفاف گزر گئی۔وہ صبح دس بجے اٹھ گیا تھا لیکن وہ اسی طرح
نڈھال تھی۔

جب وہ نہا دھو کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا تو ثریا چونک کر اٹھ بیٹھی تھی۔

ملک نواز کو آئینے میں دیکھ کر اس کی نظریں بار حیا سے جھک کر رہ گئی تھیں۔اس پر بہت کچھ منکشف ہوا تھا۔

اسے شہپر کے سلسلے میں دلائے گئے یقین یاد آئے کہ وہ اس کا حقیقی بیٹا ہے۔اس کا شدت سے جی چاہا کہ وہ
یاد کرے کہ پہلے پہل ملک اس سے کس طرح ملا تھا؟

''ثریا۔!''

''جی۔؟''

''اٹھو یار۔گھر سنبھالو۔''اس نے مسکرا کر ثریا کی آنکھوں میں جھانکا۔وہ بے انتہا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

''ملک نواز تم بھی اندر سے روایتی مرد ہو......گھر بنانے کے شوقین۔بیوی کے بازوؤں میں سکون ڈھونڈنے
کے آرزومند۔

آج کل تمہاری ہر سوچ بیوی بچے پر آکر ٹھہر جاتی ہے......''وہ برش ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

کال بیل بجی تو مسز آمنہ جانے کہاں گھسی ہوئی تھیں۔ثریا نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔''

"وہ جی۔ یہاں مس آمنہ ہوتی تھیں۔ گورنس۔"

"اندر آ جائیں۔ وہ یہیں ہیں۔ آپ کون ہیں۔؟ اس نے نازک سی دلکش نقوش کی مالک لڑکی کو دلچسپی سے دیکھا۔ جو گود میں خوبصورت سے بچے کو اٹھائے کھڑی تھی۔

"میں ان کی دوست ہوں...... آپ غالباً مسز ملک ہیں۔" حیرت انگیز طور پر اسے مس آمنہ کے "لارڈ" کا نام یاد تھا حالانکہ کئی ماہ گزر چکے تھے ان کی ملاقات ہوئے۔

"جی ہاں۔" ثریا اسے اندر لے آئی۔

"مس آمنہ۔!"

"جی میڈم۔؟" آمنہ کی آواز کہیں دور سے آئی۔

"دیکھیں کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

ساحرہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چہرہ دیکھا بھالا ہے۔ کہاں دیکھا تھا کچھ یاد سا نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کئی بار ثریا کا جائزہ لیا تھا۔ بھرپور قد و قامت اور دلکش ہیر اسٹائل کے ہمراہ وہ ایک سا حسن تھا۔

اسی وقت آمنہ ہاتھ آنچل سے پونچھتی اندر داخل ہوئیں۔

"ار۔رے۔" ان کی آواز میں تحیر اور خوشی تھی۔

"یہ دیکھیے۔ آج آ رہی ہیں آپ۔؟" وہ شاکی ہوئیں۔

"بس مس آمنہ کچھ نہ پوچھیے۔ میں بھی آپ کی طرح اکیلی ہی ہوں گھر میں۔ اور پھر شروع شروع میں تو مجھے یہاں کا معلوم بھی نہیں تھا۔ اکیلے نکلتے ڈر لگتا تھا اب ذرا کچھ اس نئے ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کیا ہے۔ اور پھر میں "ادھر" بھی مصروف تھی۔" ساحرہ نے اپنے بیٹے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"مجھ سے شکوہ کر رہی ہیں آپ نے کوشش کی کبھی میرے ہاں آنے کی۔؟"

"دیکھیے مسز امان۔ میں آپ کی طرح خود مختار تو نہیں ہوں ناں۔ خدانخواستہ پیچھے کچھ ہو جاتا تو ظاہر ہے سب کچھ مجھے ہی سہنا پڑتا۔ میں مالکن نہیں ملازمہ ہوں۔"

وہ بہت خوش خوش امریکہ آئی تھیں۔ لیکن چند دنوں بعد انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ اپنے وطن میں اکیلی ہوتے ہوئے بھی اکیلی نہیں تھیں۔

البتہ ثریا کی آمد کے بعد انہیں زندگی کی حرارت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ ثریا کے ساتھ بے حد مصروف رہتی تھیں اس کو کھانے وغیرہ بنانا سکھاتی تھیں۔ گھر کے دوسرے کام کاج۔ پڑھائی لکھائی...... کہ لارڈ کا کہنا تھا کہ مکمل برین واشنگ کے ان کے حافظے میں کچھ بھی نہیں ہے۔

انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ مالکن "لارڈ" کی طرح ٹائٹ نہیں تھیں۔

ان کا طرز عمل بالکل دوستوں کی طرح تھا۔ بالکل پکی سہیلی جیسی۔

اگر صاحب رات کو مالکن کو کوئی تحفہ پیش کرتے تو وہ شرمگیں مسکراہٹ کے ہمراہ اسے دکھانا نہ بھولتیں۔

اگر صاحب سے کسی بات پر ڈانٹ پڑتی تو بھی وہ آمنہ کو ہنستے ہوئے بتانا نہ بھولتیں۔

وہ حیرت سے پوچھتیں "میڈم آپ کو مسٹر ملک کی ڈانٹ پر غصہ نہیں آتا۔"

وہ کھلکھلا اٹھتیں۔ "مجھے ان کی ہر ادا پر پیار آتا ہے۔ بس جب وہ غصے میں ہوتے ہیں تو تھوڑا سا ڈر لگتا ہے"

کا غصہ اتنا غضب ناک ہوتا ہے لگتا ہے کھڑکی سے باہر اٹھا کر پھینک دیں گے۔" وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس پڑتیں۔

آمنہ اپنی مالکن کو حیرت سے تکا کرتیں۔

شاید جن عورتوں کو ایسے۔ روحانی جسمانی اور مادی تقاضے پورے کرنے والے بھرپور شوہر ملتے ہیں وہ اتنی خوش باش نظر آتی ہیں......؟

لیکن ان کی وہ ذہنی بیماری۔ ان کا ذہن پھر اس نقطے پر آ کر ٹھہر گیا۔ ساحرہ اپنی خداداد ذہانت کے بل بوتے منہ کی مجبوریاں محسوس کر سکتی تھی۔

اس لیے وہ ان سے بدگمان نہیں تھی۔

"ارے۔ مس آمنہ۔ آپ نے تو کبھی ذکر ہی نہیں کیا اپنی ان دوست کا۔ اب تو میں صحت یاب ہو چکی تھی پل آتیں۔"

ثریا کا لہجہ شیریں اور محبت بھرا تھا۔

"یہ آپ کا بیٹا ہے؟" ثریا نے بچے کے رخسار چھوئے۔ "اس کا نام کیا ہے۔؟"

"سلمان زید۔ اس کے دادا نے رکھا ہے۔" ساحرہ نے بچے کے رخسار پر پیار کیا۔

"آپ کا بیٹا کہاں ہے۔؟" ساحرہ نے پوچھا۔

"اس کے پپا کام کر رہے ہیں۔ وہ انہیں کے پاس بیٹھا کھیل رہا ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔ انہیں ڈسٹرب نہ کر رہا ہو۔" وہ قمیض نیچے کی طرف کھینچتی باہر نکل گئی۔

"اتنی دیر سے سوچ رہی ہوں۔ انہیں کہاں دیکھا ہے۔ اب یاد آیا کہ دراصل یہ میری نند سے بہت مل رہی ہیں۔"

"مس آمنہ۔ اپنی مہمان سے چائے کافی کا نہیں پوچھیں گی۔" ثریا نے شہپر کو اٹھائے ہوئے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"اوہ مجھے تو دھیان ہی نہیں رہا۔" آمنہ شرمندہ سی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"بس یہ تکلف رہنے دیں۔ میں چلتی ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔"

"کوئی دیر نہیں ہوگی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ملک سے کہہ دوں گی وہ چھوڑ آئیں گے۔" ثریا نے شہپر کو گود میں جما کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

آمنہ باہر نکل گئیں۔

وہ دونوں بچوں کے بارے میں باتیں کرنے لگیں۔

چائے کے بعد ساحرہ نے جانے کے لیے اصرار کیا تو ثریا ملک نواز کے پاس چلی آئی وہ سر جھکائے تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا......

"سنیں۔!"

"ہوں۔!" اس نے ہوں کہا نظریں نہیں اٹھائیں۔

"وہ ہماری ایک دوست ملنے آئی تھیں۔ ان کا گھر کافی دور ہے۔ بچے کے ساتھ ہیں۔ آپ ذرا ان کو چھوڑ آئیں۔"

"اس وقت میں ایک ضروری کام کر رہا ہوں۔ کیا وہ تھوڑی دیر انتظار کر لیں گی۔؟"

"کام بعد میں بھی ہو جائے گا وہ پریشان ہو رہی ہیں......"

"پریشان ہونے سے کیا ان کے پر لگ جائیں گے کہ اڑ کر پہنچ جائیں گی۔؟" وہ جھلا گیا۔

"اچھا چھوڑیں میں ان سے کہہ دیتی ہوں کہ آپ مصروف ہیں۔"

ملک نواز نے سر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا چھوٹی چھوٹی آستینوں والی گلابی قمیص و شلوار میں بغیر دوپٹے کے ناراض سی آنکھوں کو بہت بھائی۔

کچھ شے ضرور ہو ثریا میری سالوں پرانی سلگتی آپ پر چھینٹے مارتی ہو۔ یہ سبز تو ازلی ہوش مند پر دین عرف چو کے پاس بھی نہیں تھے......

"چلو یار......" وہ کاغذ سمیٹ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس طرح......؟" ثریا نے اس کے سلیپنگ سوٹ پر ناقدانہ نظر ڈالی۔

"کیا حرج ہے۔؟ اتنا سجا بنا کر نہ بھیجا کرو اپنے میاں کو...... تمہیں اچھا لگتا ہوں۔ کسی اور بھی اچھا لگ سکتا ہوں۔"

"آہستہ بولیں۔ کیا سوچے گی وہ......؟ اور یہ آپ سے کس نے کہہ دیا آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔؟"

"بتاؤں۔؟" وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"اچھا اچھا۔!" ثریا نے پناہ مانگی۔

ملک نواز نے لباس تبدیل کیا۔ تو ثریا اسے ہمراہ لے کر ساتھ والے کمرے میں چلی آئی۔

مس آمنہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ ہمارے "سر" ہیں۔۔ مسٹر ملک نواز۔"

"السلام علیکم۔!"

وعلیکم السلام۔" سلامتی کا تبادلہ ہوا۔

"آپ کس جگہ جائیں گی۔؟"

ساحرہ نے ایڈریس بتا دیا۔

ملک نواز گاڑی نکالنے نیچے چلا گیا۔ اور تینوں الوداعی کلمات کا تبادلہ کرنے لگیں۔

چچا جان کی سخت طبیعت خراب تھی۔ اس لیے وہ بچوں کو حسن کے پاس لے کر نہیں جا رہے تھے۔ بچوں کو حسن سے ملانے کا یہ مطلب نہیں تھا وہ ہار مان چکے ہیں۔

بلکہ اس بہانے وہ حسن کو سمجھانے اور قائل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے جانے کیوں انہیں یقین سا تھا کہ حسن ان کی بات ایک روز ضرور مان لے گا۔

وہ شام کے کھانے کے انتظام کر کے پسینہ سکھانے لان کی طرف آئی تھی جب اس کی ڈارک براؤن کرولا گیٹ میں داخل ہوئی۔

وہ چونکی ضرور لیکن اظہار نہیں کیا بدستور ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کرتی رہی بلکہ اس کی طرف سے مکمل پشت کر لی۔

اس کا عاشق صادق دل واویلے پر اتر آیا تھا۔ کہ وہ اس کے رنگے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اس کی منت کر لے۔ اس کی محبت جیت لے۔ لیکن اس نے قابو پا لیا۔

"میں نہیں پلٹوں گی۔ میں نہیں مانوں گی دل کا کہا۔ میں اس کی منت کبھی نہیں کروں گی۔ محبت کی کر لوں گی

خاک کر دے۔ لیکن مجھے شکست نہ دے۔

کوئی کیا جانے محبت و عشق کے گلے میں ضبط کی گھنٹی ڈالنا کتنا بڑا معرکہ ہے مجھے پتا ہے۔ میری زندگی کا سفر ہو کر رہ گئی ہے......اور اس یقین کے بعد......میں کیوں اسے سوچوں......کیوں اس کا دھیان کروں۔؟

"امی۔!" ہما کی آواز پر وہ چونک کر پلٹی۔

"امی۔ آپ کو دادا جان بلا رہے ہیں۔"

"ان سے کہو میں غسل سے فارغ ہو کر آ رہی ہوں۔" اس کا لہجہ بدلحاظ اور پتھریلا ہو گیا۔

"لیکن آپ تو۔"

"مت آگے سے بولا کرو۔ مت جرح کیا کرو......" وہ بیٹی پر الٹ پڑی۔

ہما خوف سے لرز کر رہ گئی اور جان کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"سنو...... کہہ دو دادا جان سے...... میں فارغ نہیں ہوں......" وہ باتھ روم میں گھس کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"نہیں ہے مجھے فرصت۔ میں فارغ نہیں ہوں۔ نہیں ہوں میں اتنی بے کار کہ دنیا کی خوشیاں بانٹتی رہوں۔"

رو رو کر اس کے پپوٹے سوج گئے تھے کتنی دیر اس نے یخ پانی میں پناہ ڈھونڈی۔ زرد شلوار سوٹ میں شالوں پھیلائے وہ آہستگی سے سسر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا خیال غلط نکلا باتھ روم میں اتنی دیر لگانے کے باوجود وہ ابھی تک باپ کے پاس تھا۔

وہ پلٹ گئی۔

"شہلا...... بیٹے۔!" چچا جان کی نحیف سے آواز ابھری۔

"میں معافی چاہتی ہوں چچا جان! میں اس وقت کمرے میں نہیں بیٹھ سکتی۔ برائے مہربانی مجھے نہ بلائیں۔"

وہ باہر نکل آئی تھی۔

پانچ منٹ بعد اسے گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو وہ سسر کے کمرے میں چلی آئی۔

"جی چچا جان۔!" وہ اس طرح گویا ہوئی جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

"میں کہہ رہا تھا۔ دوا کا وقت ہو چکا ہے مجھے دوا دے دو تا کہ میں کچھ دیر آرام کر لوں......" وہ بھی اس کے چچا تھے انہوں نے بھی یہ ظاہر کیا کہ آپس میں اٹھنے والا تنازعہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا ہے۔

"کچھ فرق ہوا اس دوا سے۔" اس نے ایش ٹرے میں سلگتے ایک ٹکڑے پر نظر ڈال کر رسماً پوچھا۔

"ہاں۔ کافی فرق ہے۔ ڈاکٹر خان تو مجھے ہمیشہ سے راس ہیں۔"

"جی۔ وہ ہیں ہی بہت قابل ڈاکٹر......" اس نے ان کی ہتھیلی پر ٹیبلیٹ رکھ کر تائید کی۔

☆☆☆

وہ آنکھوں پر بازو رکھے اندھیرے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"امی۔ میں آ جاؤں۔"

"آؤ۔ کیا بات ہے۔؟ اس کے لہجے میں بیزاری تھی۔"

"ہما اندر چلی آئی۔ اور لائٹ آن کر دی۔ وہ اسی طرح لیٹی رہی۔"

''امی۔!''

''ہوں۔؟''

''امی۔ یہ پپا دے گئے ہیں۔''

اس نے فوراً اس کی سمت دیکھا۔ ہما کے ہاتھ میں براؤن لفافہ تھا۔

انجانے خدشات کے تحت اس کا دل کانپ گیا۔ کیا وہ ڈراپ سین کرنے آیا تھا۔؟

''کیا ہے یہ۔'' اس نے سنبھل کر پوچھا جواب میں ہما نے لفافہ ماں کے ہاتھ میں تھما دیا اس نے خود کو مضبوط بنا کر لفافے میں جھانکا۔ ایک طویل سانس اپنے سینے سے آزاد کی۔ پچاس کے نوٹوں کی دو گڈیاں تھیں۔

''کیوں لیے تم نے۔ کیا تم نے ان سے کہا تھا''

''امی۔!'' ہما کی آواز ابھر آگئی۔ وہ ماں کے کاندھے سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

''امی۔ میں نے پپا سے کہا تھا۔ پیسے تو امی کے پاس بھی بہت ہیں دادا جان کے پاس بھی ہیں۔ جو ہمارے پاس موجود ہے وہی کیوں ہمیں دی جاتی ہے۔؟''

اس نے اپنی کم سن لیکن بے پناہ حساس و باشعور بیٹی کی طرف بڑھ دکھ سے دیکھا۔

''ہما...... میرے بیٹے...... میری انا تمہاری محبت اور خوشیوں سے بڑھ کر نہیں ہے۔ تمہارے پپا بہت اچھے ہیں بیٹے۔ لیکن قصوروار میں بھی نہیں ہوں۔ میں تمہیں یہ رقم واپس لوٹانے کو کہہ رہی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے باپ کے اور تمہارے درمیان فاصلے پیدا کرنا رکھنا چاہتی ہوں۔ یہ بات نہیں ہے بیٹے، بات یہ ہے کہ مجھے ڈر ہے کہ ان کے پاس ایک مزید طعنے کا اضافہ نہ ہو جائے کہ میں مادی لحاظ سے ان کی محتاج رہی ہوں اور اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہی ہوں۔ بیٹے۔ دوسرے میرے خون میں جذب نہیں تھے۔ اس لیے جی بھر کر مجھے ستایا۔ ہما کم از کم لوگ تو میرا ساتھ دو......''

اس نے ہما کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔

''امی! میں کل فون پر پپا سے کہہ دوں کہ ہمیں پیسوں کی نہیں آپ کی ضرورت ہے اگر آپ ہم سے پیار کرتے ہیں تو ہمیں ہماری ضرورت کی چیزیں کہہ دوں امی......؟''

''تم اپنے پپا سے ہر بات کرنے کے سلسلے میں آزاد ہو۔ جاؤ...... اب مجھے سونے دو۔''

''امی اگر پپا نے ہماری بات مان لی تو۔ آپ......'' وہ بات پوری نہ کہہ سکی۔ (میری جان۔ میری ذات دفاعی ہے۔ جارحیت نہیں ہے)

''بیٹے۔ اپنی عمر سے بڑی باتیں نہ کرو۔ کیوں وقت سے پہلے پریشانیاں مول لے رہی ہو۔''

شہلا نے اپنا سفید سفید بازو پھر آنکھوں پر رکھ لیا۔ ہما نے ماں کا بازو چوم لیا۔

''امی! میرا دل چاہتا ہے میں آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں دے ڈالوں۔'' اس کے معصوم ذہن نے بڑے سے سوچا۔

آمنہ ثریا پر بہت محنت کر رہی تھیں۔ ثریا نے بھی اچھا رزلٹ دیا۔

ملک نواز کی سختی سے ہدایت تھی کہ ثریا کو قطعی تنہا نہ چھوڑا جائے۔ آمنہ اسے ساتھ لگائے رکھتیں۔ وہ بھی ہر کام میں بڑی دلچسپی و شوق کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

مجھ سے دیر تک باتیں کرتے ہیں...... میں سنتی رہتی ہوں۔ وہ بولتے ہوئے

اس نے آج کسٹرڈ بنا کر آمنہ سے چیک کرایا۔

آمنہ نے بہت تعریف کی۔

''آمنہ...... ملک کو پسند آجائے گا۔'' آمنہ کے کہنے پر اس نے مس'' کہنا چھوڑ دیا تھا۔

''بہت پسند آئے گا میڈم...... آپ بے فکر رہیں۔''

''آپ میرا دل رکھتی ہیں۔ سچ مچ بتائیں۔''

آمنہ کو مالکن کی اس ادا پر ٹوٹ کر پیار آگیا۔

''بہت ہی سادہ ہیں آپ...... کیوں ڈرتی ہیں آپ اتنا...... میں نے سنا ہے سب ہی مسٹر ملک کے موڈ سے ڈرتے ہیں۔ کم از کم آپ کو تو نہیں ڈرنا چاہیے۔''

''آمنہ...... ہم آپ سے ایک بات کہیں۔''

''کہیئے۔'' وہ ہمہ تن گوش ہو گئیں۔

''آمنہ۔ ملک رات کو وہ موٹی سی بوتل سے کیا نکال کر پیتے ہیں۔'' (چچ۔ چچ۔ مسز ملک تو شراب کا نام و پہچان تک بھول گئیں......)

''وہ شراب پیتے ہیں۔ یہ بری چیز ہوتی ہے۔ مسز ملک۔ انسان کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ انسان ہوش میں نہیں رہتا۔''

''آمنہ۔ پھر ملک کیوں پیتے ہیں......؟'' وہ پریشان ہو اٹھی۔

(میں آپ سے زیادہ تو نہیں جان سکتی۔) پتا نہیں میڈم۔ بعض لوگ فیشن کے طور پر پیتے ہیں۔ بعض لوگ ذہنی الجھنوں سے چھٹکارے کے لیے نشہ کرتے ہیں۔ آپ انہیں منع کیا کریں۔ یہ پھیپھڑوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

''میں انہیں کیسے روکوں۔ آمنہ......؟'' وہ بے بسی سے بولی۔

''آپ انہیں ہر دم خوش رکھنے کی کوشش کیا کریں۔''

''میں تو انہیں کچھ بھی نہیں کہتی۔ آمنہ سچ ان کا بہت خیال رکھتی ہوں۔ مجھے رات کو بہت نیند آرہی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی خاطر جاگتی رہتی ہوں...... وہ مجھ سے دیر تک باتیں کرتے ہیں...... میں سنتی رہتی ہوں۔ وہ بولتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ہر چیز تو ہے۔ پھر وہ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔؟''

''اگر آپ انہیں شراب سے دور کر دیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا...... آپ انہیں بتایئے گا ان کے بچے بھی یہ مکروہ چیزیں استعمال کریں گے تو ان کو برا محسوس نہیں ہوگا وہ انہیں کیسے روکیں گے۔؟''

''ہاں یہ میں ضرور کہوں گی۔''

''ویسے رات ملک کا موڈ بے حد خوشگوار تھا۔ وہ دیر تک کچھ لکھتے رہے تھے۔ اس وقت مجھے واقعی محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت دکھی ہیں۔ لیکن جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو مسکرا دیے اور لکھنا بند کر دیا۔

آمنہ...... یہ سوٹ تمہاری پسند تھا ناں۔؟'' اس نے اپنے سراپے پر نظر دوڑائی۔

''جی میڈم...... آمنہ نے اس کے تن پر سجے سیاہ کڑھے ہوئے سوٹ کو دیکھا۔

''ملک کو بہت پسند آیا۔ کہہ رہے تھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

''کوئی شک نہیں اس میں۔'' آمنہ مسکرائیں۔

''آمنہ! سوپ لے آئیں میں شہپر کو سوپ پلا دوں۔'' وہ شہپر کو گود مین اٹھا کر بولی۔

''مانی آپ میری بات کا یقین کریں سچ...... ایک دم ثریا باجی...... سیم پہلی مرتبہ تو خیر مجھے ان کا دھیان نہیں آیا۔ لیکن چہرہ البتہ جانا پہچانا محسوس ہوا۔ دراصل میں نے ثریا باجی کو صرف ایک دو مرتبہ ہی دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ شادی سے پہلے ایک مرتبہ شادی کے بعد یعنی شادی والے دن جب وہ دلہن دیکھنے کے شوق میں میرے پاس بیٹھی تھیں۔

''کاش مسز ملک پہلے ہی مل جاتیں تو ہم انہیں ثریا باجی بنا کر ای کے پاس لے جاتے۔ وہ بچ تو جاتیں۔''

''ہاں...... بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شکلوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔'' مانی نے بیوی کی بات توجہ سے سن کر تبصرہ کیا۔ اس کا لہجہ دکھ سے ٹوٹ رہا تھا۔

گمان ایک بار پھر بھوکے درندوں کی مانند لپک کر آئے۔

''جانے کہاں ہوں گی ثریا باجی۔ کیسی ہوں گی...... کوئی انہیں کھانے پینے کا بھی پوچھتا ہوگا۔؟''

''بہت اچھی عادت ہے مسز ملک کی۔ کہنے لگیں آپ کہاں اتنی دور جائیں گی۔ میں گاڑی میں پہنچوا دیتی ہوں۔ اپنے شوہر کو کام سے اٹھا کر کہا کہ ڈراپ کر کے آئیں۔ وہ بھی بیچارے بھلے آدمی ہیں۔ فوراً ہی تیار ہو کر آ گئے۔ مجھے چھوڑنے آئے شکر ہے کہ آس پاس کوئی اچھا ہم وطن تو نظر آیا۔ میں ان لوگوں کو کسی روز چائے پر مدعو کروں گی۔ کیا خیال ہے۔؟''

''اچھا ہے۔ اگر تمہاری طبیعت اس طرح بہلتی ہے تو ایسے سہی۔''

''مزے کی بات یہ بھی ہے کہ مسز ملک بھی گذشتہ سال ذہنی عارضے میں مبتلا تھیں اگر ہم لوگ انہیں اس حالت میں دیکھ لیتے تو یقیناً اپنی ثریا باجی سمجھ لیتے اور مسٹر ملک پر دعوا دائر کر دیتے۔'' ساحرہ ہنس پڑی تو مانی کے لبوں پر بھی پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''ہاں یار...... جانے کہاں ہو گی ثریا باجی...... ایک پھانس ان کے نام کی آج بھی دل میں ترازو ہے...... آہ۔''

''میڈم! آپ چلیں گی ناں۔ مسز اماں کے ہاں۔؟ انہوں نے فون پر بہت تاکید کی ہے۔''

''ہاں۔ آمنہ۔ میں ضرور ان کے ہاں جاؤں گی۔ مجھے ساحرہ بہت پسند آئی ہیں۔ میں تو آپ کو لے کر خود ان سے ملنا چاہتی تھی۔ لیکن آپ کہتی ہیں کہ بن بلائے نہیں جانا چاہیے۔ وہ بھی نئے لوگوں کے ہاں......''

''جی ہاں...... میڈم...... بالکل......'' آہ...... سچ آپ تو سب آداب بھول چکی ہیں آپ اتنے معزز آدمی کی شریک حیات ہیں۔ لیکن سوسائٹی موو کرنا بھول چکی ہیں۔ کتنی بڑی ٹرجڈی ہے۔)

''کب بلایا ہے۔؟''

''پرسوں شام۔!''

''کہاں کا پروگرام ہے۔؟'' ملک نواز جو باتھ روم میں کھڑا شیو بنا رہا تھا ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جنہیں آپ ڈراپ کر کے آئے تھے۔ سر۔ ان کے ہاں۔ چائے پر مدعو ہیں۔''

''بھئی! یہ کون محترمہ ہیں۔ کہاں سے ان کا نزول ورود ہوا ہے۔؟'' اس نے شیونگ مگ میں برش ڈبویا۔

''سر۔ میں نے بتایا تھا ناں۔ یہ میری ہم سفر تھیں۔ جب میں اور شہپر امریکہ آئے تھے۔''

آمنہ نے بتایا بہت اچھی ہیں۔'' ثریا نے کہا۔

''تمہاری رائے مشکوک ہے ثریا۔ تمہیں برا کون لگتا ہے۔؟'' اس نے چھیڑا۔

''نہیں سر! واقعی بہت اچھی ہیں۔ اور مجھے تو اس لیے اور زیادہ اچھی لگتی ہیں کہ میری پسندیدہ شاعرہ سے ان کا ...زہی تعلق ہے۔ شہلا حسن کا نام آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ سر اس لیے کہ شعر و شاعری سے تھوڑی بہت آپ کو بھی دلچسپی ...ہیں نے شلف میں شاعری کے مجموعے دیکھے ہیں......''

ملک نواز تولیے سے منہ پونچھ رہا تھا چند ثانیے اسی پوزیشن میں کھڑا رہ گیا۔

''کیا رشتہ ہے ان محترمہ کا شہلا حسن سے؟'' اس کی آواز آہستہ لیکن مضبوط تھی۔

''وہ مسز امان کی جٹھانی ہیں۔ بس یہ وہی بھائی ہیں۔'' تنہائیوں نے مسز آمنہ کو تفصیل کا عادی بنا دیا تھا۔ ...نواز ہر کام بھول گیا۔

''یہاں ان کے ساتھ کون رہتا ہے۔؟'' ملک نواز نے قمیض و بنیان سے آزاد بدن پر بڑا سا تولیہ پھیلایا۔

''بس دونوں میاں بیوی اور ان کا بچہ......'' آمنہ باتھ روم کی اوٹ سے ہی جواب دے رہی تھیں۔ ثریا ...ہی ٹیبل کے سامنے بیٹھی نیل پالش لگا رہی تھی۔ شہپر قالین پر بیٹھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔

پھر آمنہ میلی بیڈ شیٹ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

''ثریا......!'' ملک نواز کا بھاری آواز مین سوچ کا انداز شامل تھا۔

''جی......!'' اس نے ناخن پر آہستگی سے برش چلایا۔

''بات سنو۔ غور سے......''

''جی......!''

''تم مسز اماں کے ہاں نہیں جاؤ گی۔''

ثریا نے چونک کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھا باتھ روم میں واش بیسن کے سامنے کھڑا ملک نواز تولیے ...ہنا چہرہ رگڑ رہا تھا۔

''کیوں ملک۔؟''

''بس کہہ جو دیا۔ کوئی ضرورت نہیں ان لوگوں سے تعلق بڑھانے کی۔''

وہ مجھے اچھی لگتی ہیں ملک۔ میں ضرور جاؤں گی۔''

ملک نواز کا بھیجہ الٹ گیا۔ اس کے سامنے تو اس کے والدین بھی بے بس ہو جاتے تھے اور یہ۔ اس کی ...تی کی بیوی۔

''مجھے عادت نہیں ہے اپنی کسی بات کے جواب میں ''نہ'' سننے کی۔'' وہ دھاڑا۔ ثریا کا دل کانپ کر رہ گیا۔

ملک نواز کا موڈ سخت خراب ہو گیا تھا اس نے باتھ روم کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ شہپر سہم کر ثریا کے پاس ...ڑا ہوا۔

''بیڈ روم اختلاف'' کے آثار پر آمنہ بھی کچن میں کھڑی ڈر گئیں۔

''مسٹر ملک خود تو احتیاط نہیں کرتے۔ پھر مسز ملک کے لیے پریشانیاں اٹھاتے ہیں......'' انہیں مسٹر ملک پر ...آ گیا۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اگر خدانخواستہ پھر کچھ ہو گیا۔؟ کم از کم انہیں اپنے بچے کا ہی خیال کرنا چاہیے ...کون انہیں سمجھائے۔ ان کی امی ہی آ جائیں تو بہت اچھا ہو......''

اور وہ بے تحاشا پانی بہائے ہوئے بے تکان سوچ رہا تھا۔

اسے یاد آیا۔ میگزین کی سلور جوبلی تقریب میں شہلا نے اپنے دیور کا تذکرہ کیا تھا کہ وہ ہیوسٹن میں ہیں۔

شاید یہی ہے وہ۔

کیا وہ لوگ اس صحیح الدماغ ثریا کو اپنی ثریا تسلیم کر سکتے ہیں۔؟ خواب میں بھی نہیں۔ لیکن مجھے احتیاط کرنا چاہیے۔

اگر میں ان لوگوں کو بتا دوں کہ یہ تمہاری ثریا ہے۔ اور لاکھوں روپے کے علاج نے اس کی بدبختی کو روشن بختی میں بدل دیا ہے۔

تو وہ مجھ سے پوچھیں گے کہ میں نے یہ فیاضی یہ مہربانی کیوں کی۔؟"

میں نے ایک ذہنی مریضہ کو اس کے گھر پہنچانے کے بجائے اپنے گلے کا ہار کیوں بنایا۔؟ کیا مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اس کے بھائیوں کے سامنے اعتراف گناہ کر لوں۔؟ ہرگز نہیں۔ شاید کسی شخص میں یہ ہمت نہ ہوگی کہ وہ کسی بھائی کے سامنے اس کی بہن کے ساتھ زیادتی کا اعتراف کرے......

باقر بھائی...... پھر پھنس رہا ہوں...... اب مجھ میں برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔ شوٹ کر دوں گا دونوں کو۔ ثریا کو بھی اور شہپر کو بھی۔

اس کی سوچ پھر انتہا کو پہنچنے لگی۔

"شہلا حسن۔ بس کرو۔ جینے دو۔ اتنے روگ تو لگا لیے ہیں تمہاری خاطر۔!"

☆☆☆

ثریا نے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اور آمنہ کا مقام نہیں تھا کہ وہ مسز ملک سے مصر ہو سکتیں۔ وہ شہپر کو ساتھ لے کر چلی گئی تھیں۔

اس نے کافی تیار کی اور ملک نواز کے پاس چلی آئی۔

"مجھے ضروری چیزیں چاہئیں۔ مجھے شاپنگ سینٹر لے چلیں۔"

"بھئی، میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ مس آمنہ کو لے کر چلی جانا۔"

"مس آمنہ کے ساتھ ہی تو جاتی رہی ہوں اب تک...... آپ مجھے کہیں لے کر نہیں جاتے۔ جب میں ا عورتوں کو دیکھتی ہوں جو اپنے شوہروں کے ساتھ آتی ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے۔ آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے مجھ پر ترس کھایا ہے۔ آپ میری کبھی کوئی بات مانتے ہیں۔ ہر بات ڈانٹ دیتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا آپ میرا علاج کراتے بلکہ کسی پاگل خانے میں داخل کرا دیتے۔ میں کتنی اکیلی ہوں۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رونا تو اسے ویسے بھی آ رہا تھا کہ وہ مسز امان کے ہاں نہیں جا سکتی تھی۔ ٹراؤزر اور بلاؤز میں ملبوس بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھے ہوئے وہ بیڈ پر دوزانو بیٹھی ہوئی معصوم سی بچی لگی۔

ملک نواز بیڈ کی پشت سے ٹکا مطالعے میں مصروف تھا۔ وہ بے پناہ حساس تھا۔ ثریا کے گونگے دکھ اس کے دل پر نازل ہونے لگے۔ وہ واقعی قابل رحم تھی۔ اس نے روتی ہوئی ثریا پر نظر ڈالی۔

"ثریا۔!" وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"ثریا۔ ادھر دیکھو۔"

ثریا نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ایک لمحے کو روئی روئی آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔

"ادھر آؤ......" اس نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔

"بات سنو۔ تنگ نہیں کرتے یار۔ ادھر تو آؤ......"

وہ کھسک کر اس کے قریب آ گئی۔

"دیکھو ثریا۔ اب تو میرا سب کچھ تم ہی ہو ناں۔ تم اس گھر کی مالکن ہو۔ ہمارے گاؤں کی چودھرانی ہو۔ تم ...دوں پر ترس کھا سکتی ہو۔ کوئی تم پر نہیں۔ تم اس دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں سے ہو۔ مت رویا کرو یار۔ مجھے تکلیف ...ہے۔ کس چیز کی کمی ہے تمہارے پاس؟"

اس نے ثریا کو خود سے قریب کر کے بچوں کی طرح چمکارا۔

"آپ مجھے گاؤں کب دکھائیں گے۔؟" اسے ایک دم یاد آیا۔

"جلدی دکھائیں گے۔"

"ملک۔ آپ نے مسز امان کے ہاں جانے سے کیوں منع کیا ہے؟"

"ہے کوئی وجہ۔ میں تمہارا بُرا نہیں چاہتا۔ کہ تم میرے پیارے سے بیٹے کی ماں ہو۔"

"یار! وہ تصویریں تم نے کہاں رکھی تھیں۔ ان میں سے دو تصاویر فریم کرانا ہیں۔ ایک تمہاری اور ایک شہپر ......" اس نے بات بدل دی۔

"کون سی تصویر فریم کرائیں گے میری۔؟ وہ شہپر کی پیدائش سے پہلے والی۔"

"ہاں۔ وہ بالکنی والی۔ ہاہا۔ ہا۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔

ثریا جھینپ گئی۔ بالکنی والی تصویر میں وہ بے حد بے ڈول اور مضحکہ خیز دکھائی دیتی تھی۔ شہپر کی پیدائش میں ...ف چند دن ہی باقی تھے جب ڈاکٹر باقر نے یہ تصویر اتاری تھی۔ یا اتروائی تھی۔

"وہ تصویر کوئی فریم میں لگانے کے قابل ہے۔؟ ایسی کیا یادگار بات ہے اس میں۔؟ کیا میں دوبارہ ماں نہیں ...ں گی۔"

وہ اس کے شانے سے ٹک کر بولی۔

"تمہیں مزید بچوں کا شوق ہے۔؟"

"شہپر کی پیدائش تو مجھے یاد نہیں ہے ملک۔ میرا دل چاہتا میرے بہت سارے بچے ہوں۔"

"مثلاً۔ دو تین درجن......" وہ شرارت سے بولا۔

"نہیں۔ کم از کم چار یا پانچ۔ جو گھر میں ادھم مچا کر رکھیں مین ان میں اتنی مصروف رہوں کہ کہیں جانے کی ...ست نہ ملے۔ پھر آپ مجھے کہیں جانے کو منع بھی کریں تو مجھے دکھ نہ ہو۔" وہ سادگی سے بولی۔

"اتنی ہوشیاری کی توقع میں تم سے نہیں کر سکتا تھا۔ گھما پھرا کر بات وہیں لے آئیں کہ مسز امان کے ہاں ...ں جانے نہیں دیا۔؟"

اچھا یہ بتاؤ تمہارے لیے کون زیادہ اہم ہے۔ میں یا مسز امان۔؟"

"ظاہر ہے آپ۔ لیکن آپ کا ان کا کوئی مقابلہ بھی تو نہیں ہے۔"

"بات مان لو۔ یار۔ کیوں غصہ دلاتی ہو۔؟"

اور وہ واقعی خوش دلی سے مسکرا دی۔

اس نے شہلا کو بتا دیا تھا کہ آج وہ نادیہ کے ہاں اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنے جائے گی حنا کو ڈرائیور لے جا چکا تھا۔ گاڑی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی وہ بھی بس اسٹاپ کی طرف مڑ گئی۔

چلچلاتی دھوپ کی حدت سے ہما کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ جس وقت وہ حسن کے دفتر پہنچی پرسنل سیکرٹری فون پر گفتگو میں مصروف تھی۔

''پپا ہیں اندر......؟''

''آپ کس سے ملنا چاہتی ہیں بیٹے۔؟''

''اپنے پپا حسن سے۔ میرا نام ظل ہما ہے۔!''

سیکرٹیری نے انٹرکام پر سیر کو متوجہ کیا۔

''سر! آپ کی بیٹی ظل ہما آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔''

''جایئے۔'' اس نے ہما کو اشارہ کیا۔

اسکول یونیفارم میں بیگ اٹھائے ہوئے ہما کو دیکھ کر وہ پریشان سا ہو گیا۔

''السلام علیکم پپا۔!''

''وعلیکم السلام بیٹے۔ کیا بات ہے۔؟'' اس کا لہجہ متفکر تھا۔

''پپا میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔''

حسن نے سوالیہ نظروں سے بیٹی کو دیکھا...... ''ہوں۔؟''

''پپا......ہم وہ پیسے نہیں لیں گے۔ بلکہ کبھی بھی نہیں بولیں گے۔''

(شہلا۔ میرے بچوں کو میرے لیے شجر ممنوعہ بنا کر تم اچھا نہیں کر رہی ہو)

''بیٹے۔ پیسے سے زندگی کی بہت سی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ آپ کی ضروریات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔''

''ہمیں اس سے بھی زیادہ ضروری چیز چاہیے۔''

''بولو بیٹا......میں کوشش کروں گا کہ تمہاری مطلوبہ چیز ہر حال میں مہیا کروں۔''

''پپا۔ ہمیں آپ چاہئیں۔'' حسن کو اپنی اس کمسن بیٹی سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ وہ سٹپٹا کر رہ گیا اس نے چند لمحوں کی سوچ کے بعد سر اٹھایا۔

''تو بیٹا! آپ تینوں بہن بھائی آجائیں میرے پاس۔''

''اور امی......؟''

اس بات کا جواب حسن کے پاس نہیں تھا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔

''ہما......ادھر آؤ۔ میرے پاس۔''

ہما مقابل سے اٹھ کر باپ کے نزدیک چلی آئی۔

حسن نے اسے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''زندگی۔ تم ابھی ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔

ہما بیٹے۔ اچھا بتاؤ دنیا میں چوری و قتل کے علاوہ سب سے بری بات کیا ہے۔؟''

''جھوٹ بولنا۔ پپا......'' اس نے اپنے طور پر جواب دیا۔

''ہاں بیٹا......جھوٹ بولنا۔ دھوکا دینا......یہ ایک ہی بات ہے۔''

''امی نے آپ سے جھوٹ بولا ہے پپا۔؟''

''پتا نہیں بیٹے۔ ہو سکتا ہے میں نے ہی اس پر ظلم کیا ہو......'' (میں لاعلم تھا تو اسے جرات کرنا چاہیے تھی۔ تیرہ سال پر محیط دھوکا تھوڑا ہوتا ہے؟)

''پپا......امی بہت روتی ہیں رات کو جب ہم سو جاتے ہیں۔ آپ انہیں کیوں رلاتے ہیں۔؟''

''(اس معزز کو احساس ذلت رلاتا ہے۔ میری جدائی نہیں)

''امی کو پتا ہے بیٹا کہ آپ یہاں آئی ہیں۔؟ اس نے سنی ان سی کر کے پوچھا۔

''نہیں......''

''بری بات بیٹے......دھوکا نہیں دیتے۔ حنا نہیں آئی آج اسکول۔؟''

''وہ ڈرائیور کے ساتھ چلی گئی۔ میں نے امی سے سہیلی کے ہاں کا بہانہ کیا تھا لیکن یہ بھی سوچا تھا آپ سے مل کر امی کو سچ سچ بتا دوں گی۔ پپا۔ میں حنا اور گڈو بتا دوں کہ پپا ہمارے ساتھ رہیں گے۔؟

''میں سوچ کر جواب دوں گا۔ ہما......میرے بیٹے۔ باپ سے بدگمان مت ہو۔ میں تم لوگوں سے شرمندہ ہوں۔ مگر اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ مجھے دھوکے باز پسند نہیں آؤ۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

اولاد کے سامنے والدین کیسی بھربھری مٹی بن جاتے ہیں۔ وہ بیٹی کو بہلا رہا تھا لیکن اس کا ذہن سوچ رہا تھا بڑا کٹھن وقت آرہا ہے۔ اس کی بیٹی اپنی عمر سے آگے سوچنے والی اور بے پناہ حساس ہے۔ بیٹیاں تو باپ کی کمر کا خم بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ تو شاید مجھے دے گی۔

''پپا۔ آپ شام کو آئیں گے دادا جان کو دیکھنے۔؟''

(ہاں میری روح۔ آؤں گا۔ باپ کو دیکھنے نہیں عذاب جھیلنے۔)

تھوڑی دیر بعد وہ بیٹی کے ہمراہ دارالسلام کا رخ کر رہا تھا۔

کتنی بے قراری سے وہ بیٹی کی راہ دیکھ رہی تھی۔

ہما کو حسن کی کار سے اترتا دیکھ کر وہ الجھ سی گئی۔ لیکن بالکنی سے اتر کر نیچے نہ آئی۔

ہما۔ فوراً اس کے پاس آئی تھی۔ ''السلام علیکم امی۔!''

''وعلیکم السلام۔ کیا نادیہ کے گھر سے کوئی چھوڑ کر گیا ہے یا اکیلی آرہی ہو؟'' اس نے بیٹی کو آزمائش کی کٹھالی میں ڈالا۔

''امی......مجھے پپا چھوڑ کر گئے ہیں......''

''راستے میں ملے تھے۔؟''

''نہیں۔ امی۔ وہ امی میں۔ مم۔ میں ان کے آفس گئی تھی۔'' اس نے سچ ضرور بولا مگر جان پر گزر گئی۔

''ہما۔!''

''جی امی۔؟''

''تم کھانا کھا کر اپنے سوٹ کیس تیار کرو اور اپنے پپا کو فون کرو کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے جائیں۔''

''امی۔!'' ہما کانپ گئی۔

"تم نے ہرچند کہ مجھے نہیں بتایا کہ تم اپنے باپ کے آفس کیوں گئی تھیں اس کے باوجود مجھے وہ باتیں پتا ہیں جو تم کر کے آئی ہو۔ سو سال کی دادی اماں کا کردار مت نبھاؤ۔ آخر تم اسی شخص کی اولاد ہو جس کی رفاقتوں نے محض ذہنی بے سکونی دی۔"

"امی...... میں نے کیا کیا ہے۔؟" اس نے بمشکل پوچھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تمہارے پپا نے ساری زندگی ناک سے لکیریں کھنچوائی ہیں۔ لیکن اب میں۔ تم نے پھر مجھے دو کوڑی کا کر کے دکھ دیا ہے ان کے سامنے! بولو۔ میری اجازت کے بغیر تم کیوں گئیں۔" وہ اس کی سمت بڑھی، ہما ڈر کے پیچھے ہو گئی۔ اس کی شفیق ماں کے سر پر گویا خون سوار ہو گیا تھا۔

"ہما۔ تجھے ایک دن ویسے بھی رخصت کرنا ہے ایسے سہی۔ میں نہیں رکھوں گی اپنے پاس۔ نہیں رکھوں گی۔ میں جانتی ہوں وہ ہمیشہ یہی سمجھیں گے اب بچوں کو سیڑھی بنا رہی ہوں۔ کیا تم باپ بیٹی سے قدرت نے قسم لی تھی کہ ہر لمحہ تاک کر میری آن کو نشانے بنایا۔ چلو کھانا کھاؤ۔ اور تیاری کرو......"

"امی۔!"

"ایک لفظ نہیں سنوں گی۔ ہما۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے ورنہ بھرکس نکال دوں گی۔ مار مار کر۔!"

ہما ڈر کر باہر نکل گئی۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔ کتنے ہی قطرے اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔

"تمہاری رفاقتوں میں، میں نے انا کو گہری نیند سلا دیا تھا حسن۔ میری انا کو ہاتھ سے پکڑ کر اور کھینچ کر اٹھانے والے بھی تم ہی ہو حسن۔!

انا ہر انسان میں ہوتی ہے۔ یہ۔ تو جلتے پھنوں والا سانپ ہوتا ہے کہیں زہر اتارنے کو تیار بیٹھا ہوتا ہے کہیں بیٹھا کینچلی بدل رہا ہوتا ہے، کہیں کنڈلی مارے بیٹھا ہوتا ہے۔ جب یہ کنڈلی مارے بیٹھا ہو تو اس سے چھیڑ چھاڑ نقصان دہ اور خطرناک ہوتی ہے۔

میری انا تو کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ کیوں چونکا۔ اب کے ہر نقصان میں زیادہ حصہ تمہارا ہو گا حسن۔!

سرخ شلوار سوٹ اور سیاہ دوپٹے مین وہ فینسی پرس اٹھائے کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ باتھ روم سے نکل کر نہیں دے رہا تھا۔

"میں بالکل تیار کھڑی ہوں ملک۔"

"ایک منٹ...... کیا شہپر کو بھی لے کر جا رہی ہوں۔"

"ہرگز نہیں۔ ذرا بھی نہیں چلے گا اور گود میں آنے کی فرمائش کرے گا۔"

"تمہاری مرضی۔" وہ دروازہ کھول کر باہر آیا۔

اتنے سلیقے سے تیار کھڑی ثریا کو دیکھ کر وہ تہہ دل سے مس آمنہ کا ممنون ہو گیا۔

"چلو یار......!" اس نے ریسٹ واچ کلائی میں ڈالی اور کی رنگ اٹھائی دوسرے ہاتھ سے گلاسز آنکھوں پر چڑھائے۔ عجلت اس کی ہر ادا سے عیاں تھی۔ بلیو پینٹ اور بے حد باریک دھاریوں والی خوبصورت شرٹ میں وہ بے حد تر و تازہ تھا۔

وہ اس کے پاس سے گزرا تو ثریا نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ۔" اور اس کے اوپر ہی دو بٹن لگائے گلے میں سیادہ دوپٹہ ڈالے اور وینٹی پرس بغل میں دبائے بٹن لگاتی ثریا۔ اس کے اعصاب پر چھانے لگی۔ اس کے وجود میں

مہکی خوشبوئیں جذب ہیں جس میں شہلا کی سانسیں سفر طے کرتی ہیں...... ثریا۔ کا چہرہ شہلا کے چہرے میں منتقل ہو گیا۔ اس کے سینے سے ہوک سی اٹھی۔

(یہ میرا امن چاہا نہیں ہے۔ میں قدرت کے بہلاووں میں نہیں آؤں گا، میں اب بھی محروم ہوں۔)

ثریا۔ حیران پریشان اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔؟"

"ہاں میں ٹھیک ہوں......" وہ گاڑی کی سمت بڑھ گیا۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے زینے طے کرتے ہوئے۔ اس کی نظر ساحرہ پر پڑی۔ اسے خوشی سی ہوئی لیکن ملک نواز ساتھ دیکھ کر ساری خوشی سرد مہری میں بدل دینا پڑی۔

"اوہ...... السلام علیکم۔ مسز ملک......"

"وعلیکم السلام!" بجائے ساحرہ کے اس نے ملک کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"اس روز آپ نہیں آئیں مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔"

"بس طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔" اس نے پھر شوہر کی طرف دیکھا۔

"خریداری کرنے آئے ہیں۔"

"ہوں، زیادہ تر شہپر کی چیزیں ہی لینا ہیں۔ آج ملک جلدی آ گئے تھے اس لیے سوچا ضروری چیزیں لے آئیں۔"

"دیکھو بھئی وہ میڈیکل اسٹور تو آج بند ہے۔ اب آگے جانا پڑے گا۔ اور تم یہاں کیوں۔؟ اور معاف کیجیے ا..." مانی کی زبان کو بریک سے لگ گئے...... السلام۔ م۔ ثث۔ ثریا باجی......" اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

ثریا کی آواز پر ملک نواز نے گردن موڑ کر دیکھا تھا ایک لمحے کو تو وہ شہ زور مرد چکرا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس طرح ثریا کو اپنی جانب بلائے۔ اس نے غیر اختیاری طور پر قدم بڑھا دیے وہ اس طرح تیزی سے آگے جا رہا تھا گویا کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

جب اس نے پلٹ کر دیکھا تھا اس وقت مانی شدید حیرت کے ساتھ کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے گراؤنڈ فلور پر پہنچا اور ایک ڈرگ اسٹور کے سامنے رک کر چہرے سے پسینہ صاف کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا مانی ثریا سے کیا کہہ رہا ہو گا۔؟ ثریا اسے کیا جواب دے رہی ہو گی۔؟

ادھر ثریا نے "ثریا باجی آپ؟ کہنے والے نوجوان کو بڑے تعجب سے دیکھا تھا۔

"جی۔؟" آخر کار اس نے کہا تھا۔

"آپ کہاں سے آئی ہیں۔؟ میرا مطلب ہے پاکستان کے کس شہر سے؟" وہ برابر برے حالوں میں تھا۔

ثریا ایک دم سوچنے لگی۔ "نیویارک سے۔" وہ بولی اور ساحرہ بے ساختہ ہنس پڑی "کاش پاکستان میں بھی نیویارک بن جائے۔ یہ تو امریکہ کا شہر ہے مسز ملک!" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"مسز ملک۔؟" مانی نے بیوی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ان کے شوہر کا نام ہے۔ غالباً ملک جانباز۔؟" اس نے استفسار کے انداز مین ثریا کی سمت دیکھا۔

"آپ آدھا نام ہی لے لیں۔ آدھا نام غلط بتایا ہے آپ نے۔" ثریا نے مسکرا کر کہا۔

وہ غلط نام لینے پر مسکرائی تھی۔ جانباز کہنے پر نہیں ابھی وہ اتنی اہلیت نہیں رکھتی تھی۔ کہ جانباز" میں مزاح تلاش کر لیتی۔

"میں بھی پہلے روز آپ کو دیکھ کر چونک گئی تھی۔ دراصل امان کی بڑی بہن کی شکل بالکل آپ جیسی ہے۔"

مانی ابھی تک بغور ثریا کو دیکھ رہا تھا۔ کیا دنیا میں دو انسانوں کے مابین اتنی مشابہت ہو سکتی ہے۔؟ حتیٰ کہ بالائی لب کے کنارے پر نقش یہ گہرا سیاہ تل بھی ہے۔

"ارے یہ ملک کہاں چلے گئے۔ مجھے چھوڑ کر....." معاً ثریا گھبرائی اور اس طرف بڑھ گئی جہاں ملک نواز گیا تھا۔

"حد کرتے ہیں آپ امان۔ کہاں ثریا باجی..... کہاں یہ چودھرانی۔"

"چودھرانی۔؟" مانی متعجب ہوا۔

"جی کروڑپتیوں کی بہو ہیں یہ..... بڑے زمیندار ہیں یہ لوگ۔ اور مل آنر بھی..... ان کے اپنے گاؤں کے نزدیک ہی ان کی شوگر مل بھی ہے۔ ان کے شوہر تو شکل سے پرنس ہی لگتے ہیں۔ مس آمنہ کہتی ہیں ان کے تو جوتے بھی برطانیہ سے آتے ہیں اور وہ کمپنی تیار کرتی ہے جو دنیا کے امیر ترین افراد کے جوتے بناتی ہے۔ گویا ہزاروں روپے تو ان کے پیروں میں ہوتے ہیں۔

مسز ملک تو گھر میں بھی ڈائمنڈ استعمال کرتی ہیں۔ چار ڈائمنڈ کی انگوٹھیاں ہر وقت ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ بھلا بتائیے یہ ثریا باجی کیوں کر ہو سکتی ہیں جب کہ وہ بچپن ہی سے ذہنی مریضہ تھیں۔ ویسے امان اس قسم کی ٹریجڈی ان کے ساتھ بھی ہو چکی ہے۔ بیٹے کی پیدائش کے دوران یہ بھی ذہنی مریضہ ہو گئی تھیں۔ نیویارک ہی میں ان کا علاج ہوا ہے۔ شاید انہوں نے ٹھیک سے آپ کی بات سنی نہیں تھی جب ہی تو "نیویارک" کہہ بیٹھی تھیں شاید وہ سمجھتی ہوں کہ آپ ان کی سابقہ رہائش کے بارے میں پوچھ رہے ہوں۔

ثریا باجی پاکستان میں گم ہوئی تھیں۔ یہ امریکہ ہے امان....."

اور امان کو ساحرہ کی باتوں پر یقین کرنا پڑا۔ لیکن اس کے دل کی حالت عجیب ہو گئی تھی۔

"ویسے ان کے شوہر میں تھوڑا سا نخرہ پایا جاتا ہے۔ اس دن مجھے ڈراپ کرنے آئے تو تمام راستے خاموش رہے۔ حالانکہ اخلاقی طور پر انہیں کوئی رسمی سی بات تو کرنا چاہیے تھی اور آج ہی دیکھیں۔ تھوڑی بہت واقفیت تو ہے ہی۔ ہم سے چاہیے تھا کہ آپ سے ملتے خیر..... وہ جو کہتے ہیں ناں کہ تم اپنے مال میں مست ہم اپنی کھال میں مست تو ہمیں بھی کوئی تمنا نہیں کہ ان سے رشتے داری گانٹھیں۔ چلیے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے مانی کا ہاتھ ہلایا۔

وہ ایک گہری سوچ کے ساتھ آگے بڑھا تھا۔

"واہ میرے مولا..... شکلیں ایک جیسی اور مقدر میں زمین آسمان کا فرق....."

☆☆☆

ملک نواز کو کہیں نہ پا کر وہ پریشان سی ہو کر ایک جگہ رک گئی تھی۔

"یا اللہ۔ یہ کہاں چلے گئے۔؟" اس نے ہراساں ہو کر سوچا۔

گوری گوری ننگی ٹانگوں والی میمیں اور چٹی چمڑی والے مرد اپنی دھن میں آ جا رہے تھے۔ اسے سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ آخر وہ کیا کرے۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے کاندھے پر ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ وہ اچھل سی پڑی۔

"کہاں چلے گئے تھے۔ آپ۔؟" وہ روہنکھی سی ہو گئی۔

"بھئی تم مذاکرات میں مشغول تھیں میں نے سوچا اتنے میں ضروری چیزیں لے لوں....." اس نے ساتھ

ساتھ ثریا کا چہرہ بھی پڑھا۔

"کیا کہہ رہے تھے جھاڑ کانٹے۔؟"

"جی۔؟" وہ الجھی۔

"بھئی کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے ثریا کی سبز آنکھوں میں مسکرا کر جھانکا۔

"کچھ نہیں..... وہ مسز امان کے شوہر مجھے اپنی بہن سمجھ بیٹھے تھے۔"

"تو کیا تم ان کی بہن ہو نہیں۔؟ بھئی میرے علاوہ اب تو سب مردوں کی تم بہن ہی ہو۔ چلو یار جو لینا ہے لو۔ دیر ہو جائے گی تو مس آمنہ پریشان ہوں گی۔"

اس نے ثریا کے ایک جملے سے سارے جواب پا لیے تھے۔ ایک اطمینان کا سانس اس کے سینے سے آزاد ہوا تھا۔

☆☆☆

ثریا نے کروٹ بدلی اور تھوڑی ہی دیر میں غافل ہو گئی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سائیڈ ٹیبل کی طرف جھک گیا اور اپنی ڈائری نکالی۔ ٹیبل لیمپ آن کیا۔ اور بال پوائنٹ سے شعر رقم کیا۔

ع کیا ہوا جو تم نہیں میرے
میں بھی اپنا شریک حال کہاں

پھر اس کے قلم نے ایک شعر مزید لکھا۔

ع ملتا ہے سکون دل کو تو اٹھتا ہے دھواں بھی
اے دوست۔ تیری یاد خوشی بھی ہے گراں بھی

رات کے سائے سپنولیے کی طرح میرا اعصاب پر رینگ رہے ہیں۔ گمان ہوتا ہے تخلیق کے کرب تجھے بھی رہے ہوں گے۔ کرب کا چہرہ مختلف سہی۔ ہیں تو گھر کے دروازے کھلے۔ تو اپنی سوچوں کو آزاد کر..... میں تو بیٹھا ہی سواگت کو ہوں۔ اس زمانے کا دوسرا نام نفاق ہے۔ تو ناشکری ہے دکھ روتی ہے۔ یہ منافقت ہے۔ میں بھی حیوانی جبلتوں کی تسکین کے بعد تجھے یاد کر رہا ہوں ایک میری طلب ہے جو میری ہم سفر پوری نہیں کر سکتی ایک میری طلب ہے جو تجھ سے پوری نہیں ہو سکتی۔ میں بھی منافق ہوں۔ تیرے نام پر چیز اپنا کر اپنا مطلب نکال رہا ہوں۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی جیون ساتھی سے پیٹھ موڑ کر سچ لکھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ سچ پیٹھ موڑ کر نہیں کیے جاتے۔ میرے نصیب کا نام آتش کدہ ہے دوست! اب میری مجبوریاں ہی میرے سچ ہیں۔ یاد نہ آیا کر۔"

اس نے قلم بند کر دیا۔ اور سر کے نیچے ہاتھوں کا تکیہ بنا کر کچھ سوچنے لگا۔

"ہیلو! ننھی منی کانپتی ہوئی آواز۔

"ہیلو۔ کون۔؟ بوجھل مردانہ آواز۔

"پپا..... میں ہما بول رہی ہوں۔"

"بولو۔ میری جان۔"

"پپا۔ امی مجھ سے سخت ناراض ہیں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

(اسے میری ہر چیز سے ناراض ہونا چاہیے) لیکن کیوں۔؟" وہ متردد ہوا۔

"میں آپ کے پاس چلی گئی تھی ناں۔"

"لیکن آپ لوگ تو پہلے بھی میرے پاس آتے رہے ہیں۔"

"نہیں پپا۔ امی اس لیے خفا ہیں کہ میں نے آپ سے ساتھ رہنے والی بات کی ہوگی۔ اور پھر میں ان سے جھوٹ بول کر گئی تھی ناں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا لیکن وہ سب سمجھ جاتی ہیں۔ مجھے جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔ انہیں جھوٹ سے نفرت ہے۔"

(چور دوسرے چور کو چور ہی کہتا ہے میرے لہو۔) "ہوں......؟"

"پپا مجھے امی کی سمجھ نہیں آتی ابھی پچھلے ہی دنوں تو انہوں نے کہا تھا کہ تم اپنے پپا سے ہر بات کر سکتی ہو۔"

"اب کیا کہہ رہی ہیں تمہاری امی......؟"

"وہ کہہ رہی ہیں تم اپنے پپا کے پاس رہو انہیں کہو آ کر لے جائیں۔ لیکن پپا میں انہیں ناراض کر کے آپ کے پاس آنا نہیں چاہتی۔ اور پھر مجھے گڈو اور حنا جو یاد آیا کریں گے۔"

اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ حسن کا دل لہو لہو ہونے لگا۔

"میری زندگی......" اس کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا تھا۔ (ہم اپنے بچوں کے کتنے بھیانک دشمن ہیں) "تم مت آؤ۔ اگر تمہارا دل اداس ہوتا ہے وہ تمہیں نکال نہیں پھینکیں گی۔"

"لیکن پپا امی مجھ سے ناراض جو ہیں۔"

"ان کی ناراضگی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ آہستہ۔ آہستہ۔ روتے نہیں بیٹا۔"

"پپا آپ امی سے خود کہہ دیں کہ آپ مجھے نہیں رکھ سکتے۔ آپ فون کر دیں امی کو۔"

میں زبان کاٹ چکا ہوں۔ میں اس سے بات نہیں کر سکتا۔

کچھ نہیں ہوتا۔ تم فکر نہ کرو۔" اس نے فون رکھ دیا۔ ہما کی سسکیاں اسے جھلائے دے رہی تھیں۔

☆☆☆

"ارے چھوڑو یار۔ میرا تو ابھی دماغ گھوم رہا ہے۔ ارے یار کوئی حد بھی ہوتی ہے مشابہت کی۔"

"یہ بھی خدا کی شان ہے مانی۔ جو کچھ ہے آخر آپ کے سامنے ہی ہے۔" ساحرہ نے بچے کو کاٹ میں لٹایا۔

"میں سوچ رہا ہوں اگر اپنی ثریا باجی کا مقدر بھی مسز ملک جیسا ہی ہوتا تو ہمارے گھرانے کا نام بہشت پکارا جاتا۔ میرا دماغ آؤٹ ہو جائے گا ساحرہ۔ میرا جی چاہ رہا ہے کوئی آ کر زور سے کہہ دے کہ مسز ملک ثریا باجی ہی ہیں۔"

"جن کے ڈاکٹروں نے پر لگا دیے اور وہ اڑ کر امریکہ آ گئی ہیں۔" ساحرہ نے جل کر اضافہ کیا۔

مانی نے خالی خالی نظروں سے ساحرہ کی سمت دیکھا۔ "تم درست کہہ رہی ہو۔ ساحرہ لیکن تم میری ذہنی کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ اوہ میرے خدا۔"

"مانی۔ آپ کسی روز میرے ساتھ چلیے گا۔ میں آپ کو دکھا کر لاؤں گی کہ وہ لوگ کیا شے ہیں۔"

"نہیں۔ خیر آپ کو کیا پڑی اتنے کلف دار آدمی کے ہاں جانے کی۔ بس آپ خدارا نارمل ہو جائیں۔" ساحرہ نے ایک دم خود ہی لائن بدل دی۔

"خیر ایسا سرپھرا تو میں بھی نہیں ہوں۔ ساحرہ! اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں۔ اتنی طرحدار عورت ثریا باجی۔ میری عقل خبط ہو کر رہ گئی ہے اس حیرت انگیز مشابہت پر۔"

"اس دن تم کہہ رہی تھیں تو میں یہی سمجھا تھا کہ بس جھلک سی مارتی ہوں گی۔ لیکن۔"

"چھوڑیں بھی۔ اور اب تو خدا کرے کبھی آپ کا اور مسز ملک کا سامنا نہ ہو۔" اس نے وارڈ روب میں ے لٹکانے شروع کر دیے۔

☆☆☆

"بھئی۔ اسے مس آمنہ کے پاس چھوڑ کر آ جاؤ۔ میں سونا چاہتا ہوں۔"

ثریا سیدھی لیٹی ہوئی تھی شہپر اس کی قمیض کے بٹنوں سے کھیل رہا تھا۔ وہ مسکراتی نظروں سے اس کا خوبصورت بغور دیکھ رہی تھی۔ اسے بچے کا خود سے کھیلنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایسے میں ملک کی ٹوک اسے پتھر کی طرح لگی۔

"کیا ضروری ہے کہ یہ مس آمنہ کے پاس سوئے۔ یہ رو تو نہیں رہا ہے ملک میں اسے اپنے پاس ہی لٹا لیتی ہوں۔" ثریا نے شہپر کی موٹی موٹی کلائیاں تھام کر گود پر اوندھا کر لیا اور اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔

"فی الوقت تو نہیں رو رہا لیکن بچے رات کو رو پڑتے ہیں۔" وہ جھلایا۔

"نہیں روئے گا۔" وہ ضد سے بولی اور اسے پہلو میں لٹا کر بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

"ٹھیک ہے اگر رویا تو تم دونوں ماں بیٹے کو باہر نکال دوں گا۔ سمجھیں۔؟"

"سمجھ گئے۔" وہ بدستور اس میں مگن تھی۔

ملک نواز نے دروازہ بند کیا اور۔ وارڈ روب کے نچلے خانے سے جام و سبو نکالا۔

ثریا بچے میں مگن تھی اس نے توجہ نہ کی لیکن جب ملک نے گلاس زور سے سائیڈ ٹیبل پر دے مارا تو اس نے ردن موڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ کوفت اور ناپسندیدگی کی علامتیں اس کے چہرے پر رچ گئیں۔

اسی وقت ملک نواز نے اپنی طرف کا لیمپ آف کر دیا۔

ثریا کو اپنے شانے پر ملک کا ہاتھ محسوس ہوا۔

"یہ سڑی بسی چیز پی کر تو آپ مجھ سے بات بھی نہ کیا کریں۔" اسے جیسے بچھو نے ڈنک مارا تھا وہ کھسک کر گے ہو گئی تھی۔

"مجھے پتا ہے۔ اسے کیا کہتے ہیں۔ آمنہ سے پوچھا تھا میں نے۔"

"پتا ہے۔ محبت کسے کہتے ہیں......؟ کیا تم جلے ہوئے بربر پر ہاتھ......ر......رکھ سکتی ہو......؟ جو محبت کرتا ہے ل کا پورا وجود آگ پر رکھا ہوتا ہے جب آگ ناقابل برداشت ہونے لگتی ہے تو یہ۔ یہی۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں۔ چھوڑیں مجھے۔"

"مجھے نفرت سے نہ دھتکارو ثریا۔"

"میرا بازو چھوڑیں ملک۔ مجھے اور شہپر کو باہر جانے دیں پھر جتنی مرضی چاہیں پی لیں۔" وہ اس کی وحشت سے بوکھلا اٹھی۔

لیکن وہ اس کی وحشت سے مقابلہ نہیں کر سکی۔ شہپر بری طرح رو پڑا۔

اس کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ ملک نے خونی نظروں سے شہپر کی سمت دیکھا۔ اور اسے ایک ہاتھ سے اٹھا کر کارپٹ پر دے مارا۔ ثریا۔ آئیں۔ بائیں کرتی رہ گئی۔ مارے خوف کے شہپر کی آواز پھٹ گئی تھی۔ ثریا اذیتوں کے جال میں پھنس گئی۔ کس قدر رویا تھا شہپر لیکن وہ اسے اٹھانے سے قاصر تھی۔

باہر مس آمنہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ایک لمحے کو تو ان کا جی چاہا وہ دروازہ توڑ ڈالیں لیکن وہ تو مداخلت کے تصور ہی سے خوفزدہ تھیں۔

تھوڑی دیر بعد طوفان تھم گیا تھا۔

ثریا تیزی سے شہپر کی سمت لپکی۔ ٹوائے ہیلی کاپٹر کا پر شہپر کی پیشانی میں کھب گیا تھا۔ خون ابھی بھی نکل رہا تھا۔ ثریا نے بے ساختہ اپنی ہتھیلی اس کے زخم پر رکھ دی اور انتہائی غصے سے ملک نواز کی جانب دیکھا جو کروٹ بدلے غافل تھا۔

وہ شہپر کو گود میں گھر کر کمرے سے باہر نکل آئی مس آمنہ باہر کھڑی ہوئی تھیں ثریا کو دیکھ کر تیزی سے اس کی سمت آئیں۔

"کیا ہوا۔؟ ارے اس کے تو خون نکل رہا ہے۔" وہ حواس باختہ سی نظر آنے لگیں انہوں نے شہپر کو فوراً اپنی گود میں لے لیا اور اس کی مرہم پٹی کرنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ثریا اپنا حلیہ ٹھیک کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد مس آمنہ باہر آگئیں۔

"میڈم! آپ میرے کمرے میں سو جائیں شہپر کو سلا دیا ہے۔ میں لاؤنج میں سو جاتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ کہتی ہوئی مس آمنہ کے کمرے میں چلی آئی۔

صبح کو وہ دیر تک پڑی سوتی رہی مس آمنہ کئی بار اٹھا گئی تھیں تب وہ کسلمندی سے اٹھ بیٹھی تھی۔ باہر آئی تو مس آمنہ کو شہپر کو ناشتہ کرانے میں مصروف پایا۔

"ملک اٹھ گئے؟" اس نے سوئی سوئی آواز میں پوچھا۔

"کافی دیر سے جاگ رہے ہیں۔ آپ کا پوچھ رہے تھے۔" وہ اپنے بیڈ روم میں چلی آئی۔

ملک نواز اپنے قمیض بنیان سے آزاد وجود پر کمبل پھیلائے اخبار دیکھ رہا تھا۔ ثریا بنا رکے باتھ روم میں چلی گئی۔ دیر تک گرم پانی سے غسل کیا پھر سیاہ باتھ گاؤن لپیٹ کر باہر آگئی۔

"ثریا۔!" ملک کی آواز پر وہ خاموش رہی اور گیلے بالوں میں برش چلاتی رہی۔

"ثریا۔ ناراض ہو۔؟"

وہ پھر بھی چپ رہی۔

"میں شرمندہ ہوں ثریا۔ رات تمہارے ساتھ اور شہپر کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی۔ میں آج صبح صبح وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اس مکروہ چیز کے پاس بھی نہیں جاؤں گے۔ اس نے بارہا مجھے گھات لگا کر زنجیر کیا مگر میں نے سبق نہ سیکھا۔ لیکن اپنے بچے کے ماتھے پر لگا زخم کا نشان مجھے بہت آزار پہنچا رہا ہے۔ میں بہت پچھتا رہا ہوں۔"

"ثریا۔ تمہیں میری باتوں پر یقین نہیں۔؟"

"ملک۔ رات تو حد ہی ہو گئی کتنے ظالم ہیں آپ۔؟"

"میں نے سب سے زیادہ ظلم اپنی جان پر کیے ہیں۔ بلاشبہ میں بہت ظالم ہوں۔"

میرے پاس آؤ ثریا۔ میری بات تو سنو۔" تب وہ اٹھ کر اس کے پاس چلی آئی۔

اور پھر ملک نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ثریا کی آنکھوں کے سامنے اس نے قیمتی ساری بوتلیں باتھ روم میں جا جا کر واش بیسن میں بہا دیں اور تمام بوتلیں ڈسٹ بن تک پہنچا دیں۔

ظاہر ہے ثریا کا دل قدرتی طور پر صاف ہو جانا تھا۔ اس کے دل سے تمام گلے شکوے دھل گئے حالانکہ رات

...دل چاہ رہا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہو اور تمام عمر ملک کی صورت نہ دیکھے۔

ایسی جارحیت۔ ایسی وحشت۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

"ملک۔ رات آپ مجھے پہلی مرتبہ برے لگے تھے۔" وہ سادگی سے اس کے شانے سے ٹک کر بولی۔

"قدرتی سی بات ہے۔ دکھ دینے والوں سے تو ہم ہی محبت کرتے ہیں۔" اس نے اخبار پھیلا کر اپنے ...ے کے سامنے کیا۔

"میں نے آپ کو دکھ دیے ہیں کیا؟" ثریا چونک کر الگ ہو گئی۔

(میں کتنا کامیاب کھلاڑی ہوں۔ ہونہہ۔) وہ تلخی سے مسکرایا۔

"عورتیں کتنی نادان ہوتی ہیں۔ روٹی کپڑے سے بہل جاتی ہیں۔ مرد فطرت سے مجبور ہو کر اپنا مطلب نکالتا ...عورت اسے محبت سمجھتی ہے۔ کتنی قابل رحم ہے۔ عورت۔ مغرب میں یہ بات ٹھیک ہے۔ گاڑی نہیں چل رہی تو الگ ...ئے اور ہمارے ہاں بیچاری عورت۔ پیٹ کی خاطر۔ محبت کرنے پر مجبور ہے۔"

میں کہ اپنی بیوی کو شاہانہ انداز میں رکھتا ہوں۔ کہنے سے پہلے اس کی طلب سے بہت زیادہ مہیا کر دیتا ہوں۔ ...یہ میرے ماتھے کے بل دیکھ کر بات کرنے پر مجبور ہے۔ ساتھ رہنے سے انسیت ضرور ہو جاتی ہے۔ اسے محبت نہیں ...نے۔ محبت تو بے ساختہ ٹھوکر ہوتی ہے۔ اچانک لگتی ہے۔ جتنی زیادہ اچانک اور شدید لگتی ہے اتنی زیادہ گہری چوٹ لگتی ...۔ اتنی دیر سے سنبھالا ملتا ہے۔

محبت تو اصلیت ہی کھو بیٹھی ہے۔

جیسے کہ آج کل۔ ہر دوسرا شخص "عظیم" ہے۔

اسی طرح۔ رواداری بھی محبت ہے۔ انسیت بھی محبت ہے۔

مروت بھی محبت ہے۔

"اگر۔ یہ سب محبت ہے تو پھر۔ ثریا۔ تم بھی محبت سے محروم تو نہیں ہو۔ تمہاری صورت...... آنکھوں کو اچھی ...تی ہے۔ تمہارا وجود میری بہت سی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں بھی اس زمانے جیسی محبت کر رہا ہوں۔ ...۔ گویا اس زمانے کے معیار کے لحاظ سے میں تمہاری محبت میں قسم بھی کھا سکتا ہوں۔"

تیرا ماں جایا ہے۔ جا کر رکھ رو لے۔ خدا معلوم کب صورت دیکھنے کو ملے۔

جا چلی جا۔ بھائی کے سینے سے سر ٹکا کر۔ زہر رو لے۔"

اس کا دل بری طرح تڑپا کہ کسی طرح وہ بھائی پر حقیقت آشکارا کر دے لیکن ہر مرتبہ حوصلہ جواب دے گیا۔ ...ہاں تک کہ وہ بچیوں کو لے کر چلے گئے۔

وہ اس کو منع کرنے کے باوجود اسی طرح آتا تھا۔ کبھی باپ کی عیادت کرنے کبھی بچوں کو ساتھ لے جانے۔

صبور بھائی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے فوراً پردہ گرا دیا ...ا۔ گڈو آپا کے پاس گیا۔ وہ لیکچر کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

اپنی دانست میں کافی دیر بعد وہ نیچے آئی تھی۔ راہداری عبور کرتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ گئے۔

"میری اجازت کے بغیر میری بچے کس طرح کراچی چلے گئے۔؟"

"وہ اکیلی تو نہیں گئی۔ اپنے ماموں کے ساتھ گئی ہیں۔" چچا جان کی کمزور آواز ابھری۔

''اچھا ماموں ہے۔ بچیوں کے لیے اتنی اہمیت اور بچیوں کے باپ سے ملنا تک گوارا نہیں کیا۔''

''ہم نے نہیں بتایا اسے کہ تم کوئٹہ میں ہو۔''

''وجہ۔؟'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

''اس لیے کہ تمہارا ابال وقتی ہے پھر اپنے گھر کو تماشا بنانے کا فائدہ۔؟''

''اوہ۔ حیرانی تو بہت تھی مجھے کہ موصوف اپنی دکھیا بہن کا حساب کتاب لینے نہیں آئے''

''حسن۔ اتنی دور مت کھڑے ہو کہ کبھی پاس بھی نہ آ سکو۔ صبور، تمہاری بیوی کا بھائی سہی لیکن تمہارا بھی خون ہے وہ میرے بڑے بھائی کی اولاد ہے۔ تمہاری اور اس کی رگوں میں ایک خون دوڑ رہا ہے۔ وہ ''موصوف'' نہیں تمہارا بھائی ہے''

چچا جان اس کے لہجے کی زہریلی اجنبیت برداشت نہیں کر سکے۔

''حسن......؟''

''جی......؟''

''بیٹے بس کرو......غصہ ناراضگی میاں بیوی میں ہو جاتی ہے۔ کیوں مجھے زندہ درگور کرنے پر تلے ہوئے ہو''

''ابو۔ جو کچھ بھی ہے ناقابل بیان ہے۔ آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس موضوع پر بات نہ کیا کریں پلیز۔''

''بہت پچھتاؤ گے۔''

''بہت پچھتا رہا ہوں۔''

''کاش خدا نے مجھے اولاد نہ دی ہوتی۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''حسن۔ محبت ایک دم نفرت میں نہیں بدلا کرتی۔'' انہیں وہ دن یاد تھے جب حسن کی ہر حرکت سے اس کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ شہلا کے لیے۔

''دھوکا کھایا انسان زخمی شیر ہوتا ہے ابو''

میں سارے سبق پڑھ چکا ہوں۔ جو نہیں پڑھے تھے وقت۔ نے پڑھا دیے ہیں۔''

''حسن۔ وہ بہت صابر اور نیک بچی ہے۔''

''ہاں۔ صابر تو وہ بہت ہے۔'' حسن نے تلخی سے ذومعنی بات کی۔

☆☆☆

ابھی وہ ہما کے مسئلے سے نمٹ نہ پائی تھی کہ امی نے صبور بھائی کو کوئٹہ بھجوا دیا کہ خود تو وہ آ کر نہیں دیتی چھٹیوں میں بچیوں کو ہی کراچی بھیج دے تاکہ انہیں بھی پتا چلے کہ ان کے کس قدر رشتے دار ہیں۔

صبور بھائی کی آمد سے وہ پریشانی میں مبتلا ہو گئی تھی کہ جھگڑے نہ بڑھ جائیں۔ چچا جان کو ابھی بھی امید تھی کہ حسن ایک دن گھر لوٹ آئے گا اس لیے انہوں نے بھی کسی پر اپنے گھریلو حالات آشکارا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

لیکن صبور کو دیکھ کر انہیں بھی پریشانی سی ہوئی۔ مبادا بچوں کے منہ ہی سے ماموں کے سامنے کوئی بات نکل جائے جبکہ بھائی کو فون پر وہ ''سب خیریت ہے۔'' کہتے رہے تھے۔ آج کل ان کی کوششوں میں تیزی آ گئی تھی کہ حسن کا اکراؤ'' کچھ کم ہو جائے لیکن صبور بھائی نے بتایا وہ دو دن سے زیادہ نہیں ٹھہریں گے۔

تب اس نے بچیوں کو سمجھا بجھا کر ماموں کے ساتھ کراچی بھیج دیا کہ وہ گھر سے متعلق کوئی بات نہ کریں۔

یہ بات اسے بھی پتا تھی کہ یہ باتیں چھپنے والی نہیں۔ لیکن جتنی دیر پردے میں رہے بہتر ہے کہ مصداق ''

خاموش رہنا چاہتی تھی۔

سارے خاندان کو پتا تھا کہ حسن اکثر دورے پر ہوتا ہے کبھی اندرون ملک کبھی بیرون ملک۔ اس لیے ابھی یہ بات چھپی ہوئی تھی اور اس لیے بھی چھپ گئی تھی کہ جھگڑے کے فوراً بعد حسن جاپان چلا گیا تھا۔ ڈیڑھ ماہ کے لیے۔

صبور بھائی کی موجودگی میں وہ چور کی داڑھی میں تنکے کے مصداق خواہ مخواہ ہی بے قرار و پریشان سی پھرتی رہی۔ گاہے گاہے بچیوں کو سمجھاتی رہی کہ اپنے گھر سے متعلق کسی سے کوئی بات نہ کریں۔ کوئی پوچھے تو بتا دیں کہ پپا جاپان گئے ہیں نہیں آئے۔

''شہلا۔ اس بات کو چھپانے کا کوئی فائدہ؟'' بارہا اس کے قلب سے آواز آئی۔

''کب تک چھپے گی یہ بات۔؟''

کہ تم ایک ردکی ہوئی دھتکاری ہوئی عورت ہو۔

تمہارا شوہر۔ تمہاری طرف دیکھنا بھی گنوارا نہیں کرتا۔

معاشرے میں تمہارا سر ننگا کرنے والا وہی شخص ہے۔ جس کی تم نے پرستش کی ہے۔

تیرا ماں جایا ہے۔ جا کر رکھ رو۔ لے۔ خدا معلوم کب صورت دیکھنے کو ملے۔

جا چلی جا۔ بھائی کے سینے سے سر ٹکا کر۔ زہر رو لے۔''

اس کا دل بری طرح تڑپا کہ کسی طرح وہ بھائی پر حقیقت آشکارا کر دے لیکن ہر مرتبہ حوصلہ جواب دے گیا۔ یہاں تک کہ وہ بچیوں کو لے کر چلے گئے۔

وہ اس کو منع کرنے کے باوجود اسی طرح آتا تھا۔ کبھی باپ کی عیادت کرنے کبھی بچوں کو ساتھ لے جانے۔

صبور بھائی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کی گاڑی پورچ میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے فوراً پردہ گرا دیا تھا۔ گڈو آیا کے پاس گیا۔ وہ لیکچر کی تیاری میں مصروف ہو گئی۔

اپنی دانست میں کافی دیر بعد وہ نیچے آئی تھی۔ راہداری عبور کرتے ہوئے اس کے قدم سست پڑ گئے۔

''میری اجازت کے بغیر میری بچے کس طرح کراچی چلے گئے۔؟''

''وہ اکیلی تو نہیں گئی۔ اپنے ماموں کے ساتھ گئی ہیں۔'' چچا جان کی کمزور آواز ابھری۔

''اچھا ماموں ہے۔ بچیوں کے لیے اتنی اہمیت اور بچیوں کے باپ سے ملنا تک گوارا نہیں کیا۔''

''ہم نے نہیں بتایا اسے کہ تم کوئٹہ میں ہو۔''

''وجہ۔؟'' اس کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔

''اس لیے کہ تمہارا ابال وقتی ہے پھر اپنے گھر کو تماشا بنانے کا فائدہ۔؟''

''اوہ۔ حیرانی تو بہت تھی مجھے کہ موصوف اپنی دکھیا بہن کا حساب کتاب لینے نہیں آئے''

''حسن۔ اتنی دور مت کھڑے ہو کہ کبھی پاس بھی نہ آ سکو۔ صبو، تمہاری بیوی کا بھائی سہی لیکن تمہارا بھی خون ہے وہ میرے بڑے بھائی کی اولاد ہے۔ تمہاری اور اس کی رگوں میں ایک خون دوڑ رہا ہے۔ وہ ''موصوف'' نہیں تمہارا بھائی ہے''

چچا جان اس کے لہجے کی زہریلی اجنبیت برداشت نہیں کر سکے۔

''حسن......؟''

''جی......؟''

''بیٹے بس کرو......غصہ ناراضگی میاں بیوی میں ہو جاتی ہے۔ کیوں مجھے زندہ درگور کرنے پر تلے ہوئے ہو۔''

''ابو۔ جو کچھ بھی ہے ناقابل بیان ہے۔ آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ اس موضوع پر بات نہ کیا کریں پلیز۔''

''بہت پچھتاؤ گے۔''

''بہت پچھتا رہا ہوں۔''

''کاش خدا نے مجھے اولاد نہ دی ہوتی۔'' اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''حسن۔ محبت ایک دم نفرت میں نہیں بدلا کرتی۔'' انہیں وہ دن یاد تھے جب حسن کی ہر حرکت سے اس کے جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔ شہلا کے لیے۔

''دھوکا کھایا انسان زخمی شیر ہوتا ہے ابو۔''

میں سارے سبق پڑھ چکا ہوں۔ جو نہیں پڑھے تھے وقت۔ نے پڑھا دیے ہیں۔''

''حسن۔ وہ بہت صابر اور نیک بچی ہے۔''

''ہاں۔ صابر تو وہ بہت ہے۔'' حسن نے تلخی سے ذومعنی بات کی۔

''اس طرح کیسے گزرے گی حسن۔؟''

''میں دوسری شادی کر لوں گا۔''

چچا جان کو جھٹکا سا لگا۔ وہ بہت آگے پہنچ گیا تھا۔ ''برائے مہربانی آئندہ میرے سامنے اس قدم کی بات نہ کی جائے۔''

''جو ضروریات تمہاری ہیں وہ شہلا کی بھی ہیں اپنے لیے راستے سوچتے ہو اس کے بارے میں کیا سوچا۔؟''

''کیونکہ وہ دھوکے باز ہے اس لیے اسے اپنے حصے کی سزا ضرور جھیلنا چاہیے تاکہ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہے۔'' وہ شان استغنا سے گویا ہوا۔

''استغفراللہ۔ تم جانتے ہو یہ کتنا بڑا گناہ ہے۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ کوئی پاکباز عورت پر بہتان لگائے تو اسے چاہیے کہ چار گواہ پیش کرے ورنہ دوسری صورت میں بہتان طراز کو درے لگائے جائیں۔'' مارے طیش کے وہ اپنی بات جاری نہ رکھ سکے۔

''دن میں سینکڑوں مرتبہ میری مردانگی اور غیرت پر کوڑے برستے ہیں ابو۔ میں ان دروں کی اذیت تنہا نہیں سہوں گا۔ جس نے مجھے اتنے بڑے عذاب سے دوچار کیا ہے وہ تمام تکلیفوں میں حصے دار ہو گی۔ رہی گواہی کی بات جو عشق کے آتش دان میں دہک رہا ہے۔ ایک دن بے قرار ہو کر یہاں موجود ہو گا۔ آپ دیکھ لیجیے گا۔ اس کی تحریر کی سطر سطر آنچ دیتی ہے۔ وہ ایک دن یہاں آ جائے گا۔ بے ساختہ۔ کہ اسے خود بھی پتا نہیں چل سکے گا۔ چار کو چھوڑیں۔ آٹھ گواہوں کا آئینہ ہو گا۔ دیکھ لیجیے گا۔''

''ارے کوئی ہوتا تو کب کا آ لیتا۔ نادان انسان۔ کیوں اپنے گھر کی آگ بھڑکا رہا ہے۔؟'' وہ شل سے ہو گئے۔

''آگ لگانے والا قصوروار ہو گا یا بھڑکانے والا۔؟ ظلم کی ابتدا ہی ظلم ہے۔ باقی سب لایعنی۔''

''تو پھر تم اسے آزاد کر دو۔ تاکہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار سکے۔'' چچا جان نے بدقت تمام اپنی بات کہی۔ وہ اس کا مستقبل کا پروگرام جاننا چاہ رہے تھے۔

''وہ صرف میرے مرقد پر شادیانے بجائے گی۔ اس سے پہلے نہیں۔ اور ابو۔ ایک بات سن لیجیے۔ آئندہ

میں آؤں تو اس قسم کی باتیں نہ ہوں۔ ورنہ'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ''خود کو پتھر کر لوں گا۔''

☆☆☆

از ہیوسٹن

بھائی رب نواز!

السلام علیکم!

خیریت سے مطلع کرتے ہوئے آپ سب کی خیریت کا طالب ہوں۔ آپ کے خط ملتے ہیں۔ تین روز پہلے آپ کا خط ملا تھا ہمیشہ کی طرح آپ نے لکھا کہ اماں جی بہت یاد کرتی رہتی ہیں۔ مجھے اس کا ہے۔ میرا پروگرام ہے کہ میں ایک ماہ کی چھٹی لے کر پاکستان آ جاؤں لیکن ایک بات یاد رہے جو میں اس سے لکھ چکا ہوں کہ میری بیوی یہ سمجھتی ہے کہ وہ ہمارے رشتہ دار ہیں آپ سب کو بھی یہی ظاہر کرنا ہے میں نے آپ کو یہ کہ وہ طویل ذہنی بیماری کے بعد صحتیاب ہوئی ہے۔

اس کا بھی بہت اصرار ہے کہ وہ آپ سب سے ملے۔ اس سلسلے میں آپ لوگوں کو میری ہدایات یاد رکھنا آپ لوگوں سے ملنے کے بعد یا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی یا پھر اور زیادہ پریشان۔ اب اس کا پریشان ہونا میرا ہوتا ہے۔ میں نے اسے یہی بتایا ہے کہ وہ میری ماں کی بھانجی ہے اور امی جی کو بھی اس کی خالہ بن کر ملنا ہے میں پہلے ساری باتیں لکھ چکا ہوں میرا خیال ہے بار بار لکھنے کی ضرورت نہیں آپ اماں جی کو اور اچھی طرح سمجھا دیں۔

آپ نے بچے کے بارے میں پوچھا ہے تو عرض ہے وہ ماشاءاللہ صحت مند ہے تھوڑی تھوڑی باتیں کرتا ہے ابھی مکمل طور پر صحت مند نہیں ہے ابھی وہ پچھلا وقت یاد کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔ اس سے ملنے کے بعد آپ نے اسے یقین دلانا ہے کہ آپ لوگ اس سے اچھی طرح واقف ہیں باقی باتیں پاکستان آنے پر اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ اماں جی، بھابھی، ماموں پٹواری کو سلام اور بچوں کو پیار۔ خورشید تو اپنی بیوی کے ساتھ کراچی ہی میں ہو گا۔ پندرہ دن ہوئے میں نے اسے فون کیا تھا۔

آپ کا ملک نواز

اس نے خط لفافے میں ڈال کر مس آمنہ کو خوشخبری سنائی کہ وہ جلد ہی پاکستان جا رہے ہیں۔ مس آمنہ اس خبر سے بے حد خوش ہوئیں اور اپنے بھائی بھتیجوں کے لیے تحائف خریدنے کا پروگرام بنانے لگیں۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر ملک نواز نے کہا کہ وہ بھی اپنی ساس اور جٹھانی کے لیے تحائف خریدے گی۔ ملک نواز نے اسے فوراً رقم مہیا کر دی۔ وہ صبح انہیں شاپنگ سینٹر چھوڑتا ہوا چلا جائے گا۔

''مس آمنہ......؟''

''جی سر......؟''

''پاکستان سے واپسی پر ہم یہ اپارٹمنٹ تبدیل کر لیں گے۔''

''کیوں سر۔؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''یہ اپارٹمنٹ بہت چھوٹا ہے۔ مجھ اکیلے کے لیے تو یہ کافی تھا لیکن فیملی کے ساتھ اتنے سے گھر میں پرابلم ہے۔ اور ہاں۔ ملازمت کی شرائط میں ایک شرط اور نوٹ کر لیں۔''

''جی سر۔؟'' وہ پریشان دکھائی دینے لگیں۔

"آپ میرے علم میں لائے بغیر کسی کو نئے اپارٹمنٹ کا ایڈریس نہیں دیں گی اور نہ ہی کسی کو میری اجازت کے بغیر مدعو کریں گی۔"

"جی۔؟ وہ شرائط سن کر ہونق سی ہو گئیں۔"

"آپ پاکستان چل رہی ہیں ان شرائط پر غور کرنے کے لیے آپ کے پاس کافی وقت ہے آپ پر یہ ملازمت جبر نہیں ہے۔"

انہوں نے ہول کر ملک نواز کی شکل دیکھی۔ اس شخص کی وساطت سے انہوں نے زندگی کے بہت سے ارمان پورے کیے تھے۔ ان کی خدمات کا بہت معقول مشاہرہ انہیں ملا کرتا تھا وہ اس گھر میں بہت آزادی سے گھوما پھرا کرتی تھیں۔ مسٹر ملک تو آفس کے بعد اپنے بیڈ روم میں بند ہو جاتے تھے اور ان کے گھر کی اصل کرتا دھرتا وہی ہوا کرتی تھیں۔ دنیا کی بیش قیمت چیزیں اس گھر میں موجود تھیں جن کو استعمال کرنے میں وہ پوری طرح آزاد تھیں۔ جدید ترین مشینری اس گھر میں مہیا تھی۔ ایسی ایسی چیزیں ان کے استعمال میں تھیں جن کا تیسری دنیا کے ممالک میں تصور بھی نہیں تھا۔ ہر چیز ان کی ملکیت کی طرح تھی۔ قیمتی خوبصورت کراکری کا انہیں جنون کی حد تک شوق تھا اور اس گھر میں جدید ترین کراکری فرانس اور اٹلی کی تیار شدہ استعمال ہوتی تھی ان کے ساتھ ملازموں والا رویہ نہیں اپنایا گیا تھا۔ ان کا اپنا بیڈ روم شاہانہ طریقے سے آراستہ تھا۔ ملک نواز سے مل کر ان کی ڈھیروں خواہشات کی تکمیل ہوئی تھی۔ انہیں اپنی تنخواہ میں سے زر خرچ کرنے کی ضرورت کبھی کبھار ہی پیش آتی تھی۔ اپنی اس ملازمت کے دوران انہوں نے اتنی رقم پس انداز کر لی تھی کہ پاکستان میں جا کر کوئی خوبصورت سا فلیٹ خرید سکیں۔

وہ اتنی نادان نہیں تھیں کہ چند شرائط کی وجہ سے اتنے عیش و آرام کو ٹھوکر مار سکیں۔ انہوں نے سر اٹھا کر شرائط قبول کر لیں۔ کہ ملازمت انہیں اور بھی مل سکتی تھی لیکن اتنے ٹھاٹ باٹ والی زندگی شاید ہی میسر آتی۔ مسز ملک جیسی مالکن بھی شاید کوئی نہیں ہوتی۔ وہ کبھی بھی آمنہ کی نگرانی نہیں کرتی تھیں کہ وہ کیا کھاتی ہیں کیا پیتی ہیں کس طرح رکھتی اٹھاتی ہیں۔ بالکل اپنے گھر جیسی بات تھی اور پھر جب سے وہ ہیوسٹن آئی تھیں ان کی بھابھیاں علیحدہ ان سے مرعوب تھیں۔ جلنے والے علیحدہ متاثر تھے۔ ملک نواز سے ملاقات اپنی کسی گم گشتہ نیکی کا ثمرہ ہی سمجھتی تھیں۔ اور پھر دواؤں اور اسپرٹ کی مہک سے رچے ماحول کے مقابلے میں اس گھر میں رہائش ہر لحاظ سے نفع بخش تھی۔

"سر آپ بے فکر رہیں جیسا آپ چاہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔"

"آپ جلدی نہ کریں بہت وقت ہے آپ کے پاس سوچنے کے لیے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

(سوچنا کیا۔ اتنے ٹھاٹ سے رہنا اور اتنی حسین صورتوں کے بیچ رہنا۔ کیسے برا لگ سکتا ہے؟)

☆☆☆

مس آمنہ تو ایئر پورٹ سے سیدھی کراچی کینٹ چلی گئی تھیں جب کہ ملک نواز کو اگلے روز لاہور جانا تھا ثریا اور شبیر کے ہمراہ۔

جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئے خورشید کی بیوی موٹا سا پائپ پکڑے بڑے اطمینان سے پورچ دھو رہی تھی۔ ملک نواز کو دیکھ کر چونک کر کھڑی ہو گئی۔

"سا مالیکم صاحب۔ بیگم صاحب۔"

"وعلیکم السلام بھئی۔ یہ خورشید کہاں ہے۔؟" وہ سوٹ کیس اٹھا کر راہداری کی سمت چلا۔

"صاحب رہنے دیں۔ وہ جرا کام کو باہر گیا ہے۔ آ کے رکھ دے گا آپ ہی۔"

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

ثریا شہپر کو اٹھائے ابھی گیٹ ہی میں ڈٹی ہوئی تھی۔

"چلو ثریا۔ تم اندر چلو۔"

وہ چاروں جانب کھوجتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ملک نواز نے بتایا تھا کہ یہ ان کا ذاتی گھر ہے پاکستان آ کر وہ یہیں رہا کرتا ہے۔ اس نے بنگلے کی خوبصورتی کا اندازہ باہر سے ہی کر لیا تھا۔ اس نے شہپر کو نیچے اتار دیا اور خود نیم تاریک راہداری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی لیکن اسے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ سوائے ڈرائنگ روم کے تمام کمرے بند تھے وہ دوبارہ باہر جانے لگی اسی وقت ملک نواز راہداری کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا دونوں ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

"یہ کمرے تو بند ہیں۔" اس نے اشارہ کر کے بتایا۔

"ہوں۔ ابھی خورشید آتا ہے کھول دے گا۔ تم جب تک ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔" اسی وقت بے پایاں خوشی پاتا ہوا خورشید اندر آیا۔

"سلام صاحب۔ صاحب آپ نے تو کچھ بتایا نہیں۔ اچانک۔ تک۔ تک۔" ثریا پر نظر پڑتے ہی وہ بری طرح ہکلا کر رہ گیا۔

سرخ شلوار قمیض میں ملبوس ثریا کو دیکھ کر وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ اسے اس میں بہت سی تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین و تر و تازہ دکھائی دے رہی۔ بالوں کی تراش بہت خوبصورت تھی پتلا سا دوپٹہ گلے میں ڈالے ہوئے اس کی بے نیازی قابل دید تھی۔

"یہ خورشید ہے ثریا۔"

"جی آپ نے بتایا تھا۔ آپ اس سے کہیں کہ یہ کمرے کھولے۔"

"خورشید یہ کمرے کھول دو۔"

"ایک منٹ صاحب۔" وہ غالباً چابیاں لینے گیا تھا۔

"شہپر کہاں ہے۔؟" اچانک ملک نواز کو خیال آیا۔

"اس کی بیوی کے پاس ہے۔ عجیب گندی سی لڑکی ہے۔ جب کہ یہ خورشید تو بہت صاف ستھرا ہے۔" ثریا نے ناک سکوڑی۔

"ملک۔ کیا گاؤں بہت دور ہے۔"

"ہاں کافی دور ہے۔" اسی وقت خورشید داخل ہوا اور ایک ایک کر کے تمام کمروں کے لاک کھول دیے۔ ثریا نے ہینڈل گھما گھما کر دروازے کھول دیے۔ ملک نواز بغور اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا احساس ملکیت اور عجیب سی بے نیازی ثریا کی ہر حرکت سے عیاں تھی۔

"اے لڑکے۔ کیا نام ہے تمہارا۔ تمام کھڑکیاں کھولو پردے ہٹاؤ۔"

خورشید نے جھٹ حکم کی تعمیل کی۔ کمرے روشن ہو گئے۔ تمام کمرے صاف ستھرے تھے۔ ثریا نے وارڈ روب پھیر کر غالباً دھول مٹی دیکھنا چاہی لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ ایک نفیس مرد اسے ہوش کی دنیا میں پہلے پہل ملا تھا اسی کی چھاپ اس کے روم روم پر لگ گئی تھی۔ شہپر کا جھولا دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''اچھا دیکھیں شہر اور میں یہاں رہ کر جا چکے ہیں لیکن مجھے ذرا یاد نہیں۔ کمال ہے۔''

''اچھا۔ یہ ہمارا بیڈروم ہے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہو کر بولی۔

ملک نواز ہونٹ بھینچے بغور اس کی ایک ایک حرکت دیکھ رہا تھا۔

گاؤں میں شور سا مچ گیا تھا کہ ملکانی کی چھوٹی بہو آئی ہے امریکہ سے۔ ایک جم غفیر تھا جو دلہن دیکھنے ٹو کر پڑا تھا۔

ثریا لائٹ براؤن شلوار سوٹ میں ملبوس تھی دوپٹہ اس نے مخصوص انداز میں گلے میں اٹکا رکھا تھا گود میں شہ کو بھرے بیٹھی تھی۔

لوگوں کو مایوسی نہیں ہوئی۔ اونچی، لمبی، چوڑی اور بے پناہ خوبصورت اور بچہ بھی بے حد حسین وصحت مند ملکانی نے جھٹ بہو بیٹے پر سے صدقے اتارے۔

ملک بازو لپیٹے ایک موڑھے پر بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا۔

گاؤں کی لڑکیاں بنا پلک جھپکائے بغور ثریا کو دیکھ رہی تھیں۔ ثریا گاہے گاہے ملک نواز کو دیکھ کر مسکرا دیتی لڑکیاں بھی شرما کر مسکرا دیتیں۔

گاؤں کی عورتیں ملکانی کو مبارکباد دے رہی تھیں انہیں ملکانی کی بہو بہت پسند آئی تھی۔

''تھک گئی ہو گی پتر۔'' ملکانی نے خوشی سے نہال ہو کر خوشبوؤں میں بسی بہو کو سینے سے لگا لیا۔

''انہیں خالہ جان کہو گی۔ یہ تمہاری خالہ ہیں۔ تمہاری امی کی بہن'' تنہائی میسر آتے ہی اس نے ثریا کو سمجھایا تھا۔

''آپ نے پہلے بھی بتایا تھا۔''

''اور دیکھو۔'' وہ قمیص کے بٹن کھولتے ہوئے پھر اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''اماں جی سے الٹے سیدھے سوال کرنے نہ بیٹھ جانا۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے سنا۔؟''

''ہوں۔'' اس نے نیند سے بوجھل آنکھیں کھول کر ہنکارا بھرا تھا۔

اسے سوتا دیکھ کر ملک نواز اماں جی کے پاس چلا آیا تھا۔ ملکانی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''خیر نال۔ پتر۔ آ جا۔ میرے کول بہہ جا۔'' (خیر سے آ بیٹا میرے پاس بیٹھ جا) ملکانی کے چہرے روشنی کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ ملک نواز ماں کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کے روئیں روئیں میں ٹھنڈک اور اپنائیت کا احسا سرایت کر گیا۔ گویا صحرا ودست کی طویل سیاحت کے بعد گھنے درخت کی چھاؤں میسر آئی ہو۔

''وہٹی۔ سو گئی اے۔ پتر۔؟'' دلہن سو گئی ہے بیٹے؟

''جی اماں جی۔''

''پتر۔ یہ وہی ہے جس کے مگروں تو نے حیاتی برباد کی۔'' (بیٹے یہ وہی ہے جس کی خاطر تو نے زندگی ی کی) انہوں نے بیٹے کی مضبوط پشت پر ہاتھ پھیرا۔

(آہ۔ کاش ایسا بھی ہو جاتا)

''لیکن۔ اماں جی۔ میں نے تو کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے کوئی پسند ہے...... یا......؟'' اس نے تعجب سے ماں سمت دیکھا۔ ''تو نے نہیں کہا۔ تیری صورت نے ہزار بار کہا۔ ساری حیاتی۔ تیری شکل دکھ کہتی رہی ہے۔ پہلی واری نے تیری صورت پہ سکون دیکھا ہے۔''

پتر تیری پریشان صورت میرے کالجے (کلیجے) میں آگ بھر دیتی تھی۔ مولا۔ تجھے سکھ دے اور اس عورت کو ے لیے بھاگوان بنا دے۔ آمین۔'' ملکانی نے آنچل پھیلا کر دعا دی۔

ملک نواز گویا ٹھنڈے سائبانوں میں آ گیا۔ کیا ہوتے ہیں ماں باپ بھی میری ذات سے ماں کو آج تک نہیں ملا اور یہ قطرہ قطرہ پگھلتی ہے اور دعا دیتی ہے۔ اسے احساس ہوا وہ بہت خوش نصیب ہے۔ اس نے بدتمیزی کی اور نے منہ چوم لیا۔ ہر بے ہودگی پر سینے سے لگا کر دعا دی۔ ماں۔ واقعی انمول ہوتی ہے۔

ماں بننے کے بعد عورت کتنی قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اپنی ہستی تج دیتی ہے۔ بچے روتے ہیں تو تڑپتی پھرتی بچے ہنستے ہیں تو مسکرا دیتی ہے۔ بچوں کو دکھ ہوا تو انگاروں پہ چلتی ہے۔ بچے خوش ہوں تو سکون سے سوتی ہے۔ آہ۔ کو تو چھالے کی طرح سنبھالنا چاہئے۔ کیسی دکھیا جان ہوتی ہے ماں کی۔ اولاد تو اس کے جذبوں کی رمق نہیں پا سکتی اگر پا ے تو قدموں پر سر رکھ کر کبھی نہ اٹھائے۔

میں جانتا ہوں ماں۔ تو میری خاطر قطرہ قطرہ پگھلی ہے۔ انگارہ انگارہ سلگی ہے۔ میں تیری آنکھوں میں نکتے ڈرتا تھا کہ تیرے سارے خوبصورت جذبے آنکھوں کے راستے مجھ میں نہ اتر جائیں۔ میرے پاؤں میں زنجیر نہ جائے۔ ماں کی نرمی اور محبت نے ملک نواز کے وجود میں آگ سی بھر دی تھی وہ ملکانی کی آغوش میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

''اماں جی۔''

''ماں قربان پتر۔'' ملکانی بے قرار ہو گئی۔

''ماں جی۔ میں بہت بڑا مجرم ہوں۔ بہت بڑا گنہگار۔''

''رب نہ کرے پتر۔ اے وہ صورت نہیں ہے۔ پتر۔ ماں کا دل ہن (اب) کمزور ہو گیا ہے۔''

''اماں جی۔ کہیں سے کوئی ایسا بندہ لا دو۔ جو ایک بار میرے سارے سچ سن لے۔''

''مجھے سنا دے پتر''

''میرے منہ پر تھوک نہ دینا ماں۔''

ملکانی نے بے قرار ہو کر ملک نواز کی پیشانی چوم لی۔ اپنی ہڈیوں کی سوا (راکھ) بنا کے تیری اکھاں وچ پا داں رے لال۔ میں کیں تھوکاں گی کملے۔ (پاگل)

''اماں جی۔ میری اصلیت بہت بری ہے۔'' وہ آہستگی سے اور بڑے دکھ سے گویا ہوا'' اماں جی سچا دودھ نے والی سے جھوٹ نہیں بولا جا رہا۔''

''میں نے تیرے سامنے جھولی پسار کر کہا ہے۔ ماں صدقے۔ سارے دکھ کہہ دے ماں سے میں زندہ ہوں ہر دکھ اٹھاؤں گی سوہنے پتر۔ تو کہہ تو سہی۔''

''ڈرتا ہوں ماں۔ اس رات کے اندھیرے تو مجھے اور میرے بیوی بچے کو باہر نہ نکال دے۔'' اس نے کھوں سے بازو ہٹا کر ماں کو دیکھا۔

''ساری حیاتی میرے توں دور رہا ہے۔ ترسی ہوئی نظراں ہیں۔ میرے نال مذاق نہ کر۔ کہہ وی دے۔ اپنا ارے اپنے جرم۔ میں تیری ماں آں پتر۔'' اس نے جھک کر ایک بار پھر ملک نواز کی پیشانی چوم لی۔

''اماں جی۔ یہ سچ ماں کے سامنے جائز نہیں۔ غیرت کو گوارا نہیں۔ میں منہ موڑ کر سچ کہوں گا۔ تو نے خاموشی ے سننے ہیں سارے سچ۔''

''جیسے خدا اور فرشتوں کے آگے میں کھلا ہوا ہوں اور خدا جس قدر بھی میری حقیقت سے واقف ہے اتنے پچ میں۔ ماں کے سامنے کہہ دوں گا۔''

ملکانی کا کلیجہ کانپا

(اتنی بڑی دنیا میں اتنے سارے انسانوں میں سچ کہنے کے لیے ماں تیرا انتخاب کیا ہے) اس نے ماں کو بتایا کہ اندھیری آندھی کس طرح آئی تھی۔ وہ کس طرح حرف آشنا ہو کر دیوانہ بنا۔ کس طرح وہ پل پل سلگا۔ کس طرح تڑپا اور کس طرح ایک رات بدنصیبی کھلے بالوں کے ساتھ بند دروازے پھلانگ کر آئی کس طرح وہ کمزور لمحات کی زنجیر میں گرفتار ہوا۔

اس نے بتایا کہ اس نے کب حرام آب حیات منہ کو لگایا اور کس طرح چھوڑا۔

ملکانی دم سادھے اس کے اعتراف گناہ سن رہی تھی۔ وہ گناہ سے زیادہ بیٹے کے ملال سن رہی تھی۔ وہ اعتراف سے زیادہ اس کی محرومیاں محسوس کر رہی تھی۔ اس کے بیٹے کے خاموش آنسو اس کے قلب پر گر رہے تھے۔ اس کا کلیجہ پھٹ رہا تھا کہ جس بیٹے کو وہ ہتھیلی کا چھالہ بنا کر رکھنا چاہتی تھی وہ کڑی دھوپ میں جلا اور۔ خوب جلا۔ مٹا اور دل کھول کر مٹا۔ زندہ جلا۔ اور بغیر آواز نکالے جلا۔ تڑپا اور تنہا تڑپا۔

وہ اعتراف کر رہا تھا اور وہ انگاروں پر پھسل پھسل کر گر رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کے سارے دکھ اس کے سارے ملال۔ اس کی ساری محرومیاں ایک گھونٹ مین پی جائے۔

ماں کی رگوں سے خون نچوڑ کر پینے والے۔ بھوک مٹانے والے۔ ماں دشمن نہیں سب سے بڑی رازدار۔ دمساز ہوتی ہے۔ ماں زندہ ہو تو اولاد دکھ نہیں اٹھاتی۔

ہزار واری تجھ سے تیرے دکھ پوچھے کہ نہیں۔؟

ہزار واری تجھے آواز دے کر بلایا کہ نہیں۔؟

ملک نواز نے اپنی ایک ایک واردات سے ماں کو مطلع کیا۔ وہ سانس رد کے خاموشی سے سنتی رہی۔ اس کے آنسو گرتے رہے ملک نواز کے گریبان کو بھگوتے رہے۔

یہ سب واقعات ملک نواز کا ماضی ہو گئے تھے اور ماں کے جی کا آزار۔

اس نے شہلا۔ ثریا تک حرف حرف سچ ماں کے سامنے کھول دیا۔

''پتر۔!'' ان کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے سنائی دی۔

''جی اماں جی۔؟''

''پہلے کیوں نہیں بولا تھا۔''

''اماں جی پہلے آپ بہت سخت تھے۔ آپ مٹی ہوئے تو میں بھی پانی ہو گیا۔ میں اتنا بدل گیا ہوں۔ اور اماں جی آپ بھی کتنا بدل گئے ہو۔''

''پتر۔ چنگا ای کیتا اے (اچھا ہی کیا ہے) یہ کام تو تو نے مردوں والا کیا ہے۔ آخرت کے بڑے عذاب سے خود کو بچایا ہے۔''

(عاقبت کے عذاب سے تو ناقابل برداشت ہیں) اس نے تلخی سے سوچا۔

''وو ہٹی بری نہیں اے پتر۔ پر دکھ کی گل اے ہے۔ کہ ''یہ''...... ''وہ'' پھر بھی نہیں ہے۔ تو تے وہیں کا دیا

ے۔ پتر۔''

''ماں۔ ماں۔ ہی ہوتی ہے۔ بات بہت اچھی طرح سمجھ گئی ہے۔''

''اس کا نام مقدر ہے شاید۔ اماں جی۔''

''پتر۔ میرے کول اک گل تے دس۔'' (مجھے ایک بات تو بتاؤ)

''جی اماں جی۔؟''

''پتر۔ او۔ بیاہی ہوئی بال بچوں والی اے۔؟''

''بتایا ناں اماں جی۔ ثریا کی بھابھی ہے۔''

''پتر۔ تو نے اوہدے نال کوئی ایسی گل بات تو نہیں کر دی کہ اس کے آدمی کی نظر میں آ گئی ہو۔؟'' ماں نے ے عجیب سا سوال کیا۔

''نہیں اماں جی۔ میں نے اس کے ساتھ کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ایک بار غلطی سے الٹا سیدھا خط اسے لکھ دیا تھا۔ اس کی شرم مجھے آج بھی ہے۔ لیکن وہ سمجھدار عورت ہے اس نے ضائع کر دیا ہو گا۔ لیکن مجھے افسوس آج بھی ہے برداشت سے کام لینا چاہئے تھا۔ جبکہ اسے کچھ بتانے کا فائدہ بھی نہیں تھا۔''

''ہاں پتر۔ یہ تو نے غضب کیا۔ اگر اس کے آدمی کے ہاتھ وہ چٹھی لگ جاتی۔ پتر مرد کا دماغ بڑا زہریلا ندا۔ جب وہ تیرے کسی کام کی نہیں تھی تو کم از کم اسے گھر بار میں خوش رہنا چاہی دا اے۔''

''اس کے مگروں ہو یا تو وی۔ پر تو وی بے قصور اے۔ بعضوں کے کالج وچ سچا رب اگ رکھ دیندا اے۔ ہن نے ملدی ہو گی؟'' (تو بھی کسی کے پیچھے پاگل ہوا۔ لیکن تو بھی بے قصور ہے۔ بعض لوگوں کے کلیجے میں خدا آگ رکھ دیتا ہے۔ اب تو ملتی ہو گی) ماں نے بہت سارے اظہار چھپا کر بیٹے کو کریدا۔

ملک نواز کو احساس ہوا۔ داستان ادھوری رہ گئی۔ اس نے پھر تفصیل سے ماں کو بتایا۔

''پتر۔ او۔ تے کملے ہو گئے ہوں گے۔ جوان دھی۔؟ پتر۔ اے بڑا ظلم کیتا اے۔ ثریا کی ماں تو مر گئی ہو گی۔ بیٹے وہ تو پاگل ہو گئے ہوں گے۔ جوان بیٹی۔ یہ بڑا ظلم کیا ہے)'' (ماں کو دوسری ماں کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔)

''اماں جی۔ اس ظلم کا پورا پورا بدلہ چکا دیا ہے میں نے۔ ایک دن ثریا نے ان سے بچھڑنا ہی تھا۔ آپ بھی تو رہی تھیں جس دن سے آپ کی شادی ہوئی آپ کو دوبارہ ہندوستان جانا نصیب نہیں ہوا۔ اور نانا نانی آپ سے ملے رہ گئے۔''

''ٹھیک ہے۔ پر ایس طراں نہیں ہویا سی (پر اس طرح نہیں ہوا تھا) اے خوشی کے سودے تھے۔''

''اماں جی۔ آپ نے میرے سارے گناہ سارے سچ سن لیے۔ اب جو مرضی سزا دیں۔'' تو تو نے گناہ تے کیتے نیں۔ پر کفاروں دے نال۔ سچا رب تجھے معاف کرے مجھے خوشی ہے تو میرے کول آ کے ہلکا ہو گیا اے۔ ہن تیری گرہستی اے تو شاد و آباد رہے۔ سارے غم لگ جاون گے جدوں تیری اولاد لیق (لائق) نکلے گی۔''

انہوں نے اپنی کھڑی زبان میں دعاؤں کے خزانے خالی کرنا شروع کیے۔

اور ملک نواز سر سے پاؤں تک اس قدر ہلکا محسوس کر رہا تھا...... اس کا وجود روئی کے گالوں میں ڈھل گیا ہو۔

''اماں جی......!'' اس نے ماں کی آغوش سے سر اٹھایا۔

''سوہنے پتر۔؟''

''اماں جی۔ جس طرح ہوا پانی روشنی انسان کے لیے ضروری ہے۔ اتنی ہی ضروری ماں بھی ہے۔ اماں جی آج مجھے اس حدیث کی سمجھ آئی ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہاری جنت دوزخ ہیں۔''

''جیوندا رے پتر۔ سویرا دا بھولا ہو یا سی۔ کوئی گل نئیں۔'' (جیتا رہ بیٹے صبح کا بھولا ہوا تھا۔ کوئی بات نہیں)

ملک نواز نے تاروں بھرے آسمان کی وسعت دیکھ کر ماں کے ظرف کا اندازہ کیا۔ کافی دیر سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر اندر چلا آیا۔ جہاں ثریا شہپر کو سینے سے لگائے خوش نصیبی کی نیند سو رہی تھی۔ ملکانی باہر کھٹر پٹر کر رہی تھیں۔ غالباً تہجد کے نوافل کی تیاری ہو رہی تھی۔ ان کے ماتھے پر شکنیں اگرچہ گہری تھیں لیکن ایک صادق بیٹے کی ماں ہونے کا افتخار بھی ان کی پیشانی سے ہویدا تھا۔ یہ سوچ ہی ان کے لیے اعزاز تھی کہ ان کا بیٹا کم ظرف نہیں۔ ورنہ اس دنیا میں لوگوں سے کیا کچھ سرزد نہیں ہوتا۔ جبکہ ان کے بچے نے جان و مال سے کفارہ ادا کیا۔ انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ تہجد کے نوافل کے بعد فجر کی اذان تک صرف اور صرف اس کے لیے دعائیں کریں گی۔

☆☆☆

''مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میری اجازت کے بغیر میرے بچوں کو اتنی دور لے جایا جائے۔''

''یار۔ حسن۔ تم تھے ہی کب۔؟ اور پھر کیا ہم غیر ہیں۔؟'' شہلا بھی عرصے سے کراچی نہیں آئی تھی۔''

''میں نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ڈالی ہوئیں۔''

''تم کوئٹہ کب واپس آئے۔ اور یار تمہیں کیا ہوا ہے۔؟ صبور جھلا سے گئے۔''

''میں گیا ہی کب تھا جو واپس آتا۔''

''لیکن تم گھر پر تو نظر نہیں ائے۔ اور چچا جان نے بھی بتایا تھا کہ''

''انہیں جھوٹ بولنے کا شوق ہے تو بولتے رہیں خوشی سے۔ جبکہ میں تو اس قسم کے موقع کا منتظر تھا کہ کب نہ لوگوں سے سامنا ہو۔''

''حسن۔ دیکھو۔ مجھے یہ تمہارے انداز سمجھ میں نہیں آ رہے جو بات ہے صاف صاف کہو کیا صرف بچوں کو کراچی لانے پر اتنا غصہ۔؟'' یہ بچے ہمارے بھی کچھ لگتے ہیں۔''

''کبھی لگتے تھے۔'' حسن نے بات کاٹی۔

''معموں میں مت بات کرو۔ میرا بلڈ پریشر بڑھ رہا ہے۔'' صبور پریشانی سے بولے۔

''میرا تو کئی سالوں سے نارمل نہیں ہے۔'' اس نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔

''میں تمہارے انداز سمجھنے سے قاصر ہوں۔'' صبور نے الجھتے ہوئے فون رکھا تھا۔

''پپا کا فون تھا ماموں جان؟ آپ نے ہمیں کیوں نہیں دیا۔؟'' ہما بسوری تھی۔

''پپا جلدی میں تھے بیٹے۔!'' ان کے چہرے پر سوچ کے گہرے سائے تھے۔

''ہما......!''

''جی ماموں جان......''

''ادھر آؤ بیٹے......!'' انہوں نے ہما کو اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بیٹھ گئی۔

''انسان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ سچا ہو۔'' انہوں نے ہما کے گرد بازو پھیلایا۔

''بیٹے۔ جب میں کوئٹہ گیا تھا تو پپا کہاں تھے۔؟ سچ سچ بتانا۔''

ہما کا چہرہ ایک دم پھیکا سا پڑ گیا۔

''آپ سے پپا کیا کہہ رہے تھے ماموں جان......؟'' ہما نے الٹا سوال کر دیا۔

''وہ مجھ پر ناراض ہو رہے تھے کہ میں بغیر اطلاع کے آپ دونوں کو کراچی کیوں لے آیا...... آپ لوگوں نے ہی بتایا تھا کہ پپا ٹور پر گئے ہیں...... جبکہ ابھی آپ کے پپا کہہ رہے تھے کہ وہ کوئٹہ ہی میں تھے...... آپ سب نے جھوٹ بولا تھا نا''

ماں کی سخت ہدایتوں کے باوجود ہما سے جھوٹ نہ بولا گیا۔ سارے سچ عکس اس کے چہرے پر جھلملانے لگے۔ اس کی سبز آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے۔

''پپا ہمارے ساتھ نہیں رہتے ماموں جان......'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

صبور جیسے بجلی کی ننگی تاروں کو چھو گئے۔

''کب سے......؟'' انہوں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا۔

''جب دادی جان کا انتقال ہوا تھا ناں بس اس کے بعد سے، پہلے تو آتے بھی نہیں تھے۔ اب تو خیر آ جاتے ہیں...... لیکن امی سے نہیں بولتے...... امی بہت روتی ہیں ماموں جان۔'' ہما پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

صبور کا گویا سینہ شق ہو گیا......

شہلا...... یہ لڑکی اپنی عادتیں نہیں بدلے گی۔ سب کے دکھ بانٹے گی اور اپنا احوال ہمیشہ چھپائے گی......

انہیں یاد نہیں پڑتا تھا کہ شہلا نے کنوار پن میں انہیں کبھی زچ کیا ہو...... بلکہ اور دوسرے گھر والوں کو بھی...... کبھی اپنی ذات سے پریشان نہیں کیا...... تنکو کی انگلی کو تیز آنچ بھی چھو جاتی تو وہ منہ سر لپیٹ کر لیٹ جاتی تھی اور اعلان کر دیتی تھی کہ ''بحالی ہمت'' تک وہ ہر قسم کی خدمت سے قاصر ہے۔

اور ایک شہلا...... پورے پورے ہاتھ جلا کر بھی پٹی باندھ کر اپنے روزمرہ کے فرائض میں مگن رہتی...... اسے کہ منہ سے سنانے کی شاید عادت نہیں ہے۔ اسی لیے اس کے اشعار آگ کی طرح دہکتے ہیں اور دلوں تک لو دیتے ہیں...... ان کی لاڈلی بہن جانے کس آگ میں جل رہی تھی اور وہ بے خبر تھے...... ایک آگ سی ان کے وجود میں بھر گئی تھی۔ عجیب سا اضطراب ان پر طاری ہو گیا تھا۔ ''حسن اگر زیادتی تمہاری ہوئی تو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شوٹ کر دوں گا۔ ہم نے یہ شیشہ نہیں قدردان سمجھ کر ہی دیا تھا۔'' ان کا لہو ابلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ انہوں نے ہما کی طرف دیکھا پھر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

''جاؤ...... بیٹے کھیلو کودو...... پریشانی کی کوئی بات نہیں...... بعض اوقات اچھے دوستوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے۔''

☆☆☆

''حاضر ہو سکتا ہوں......؟''

''اوہ...... آیئے صاحب......!'' مدتوں بعد روبرو تھے لیکن سلام و دعا کے بغیر۔

''بچیوں کو گھر چھوڑ کر آ رہا ہوں۔'' صبور اس کے مقابل ڈٹ گئے۔

''شکریہ......!'' اس کی سرد مہری قابل دید تھی۔ گویا سارے زمانے سے خفا تھا۔

''کیا میں اس ڈرامے بازی کا پس منظر معلوم کر سکتا ہوں......'' صبور نے اس کے رویے پر پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

''آپ کی بہن بہتر بتا سکتی ہیں...... یہ بتایئے کیا پینا پسند کریں گے......؟''

صبور کا جی چاہا کہہ دیں ''تمہارا خون'' لیکن وہ برداشت کی حد پھلانگنے سے گریز کر رہے تھے۔

''میں فالتو انسان نہیں ہوں...... میلوں کا سفر طے کر کے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں...... تیرہ چودہ برسوں بعد یہ تم نے کون سا روپ نکالا ہے...... کیا سوانگ بھرا ہے۔''

''میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہوں صبور...... تمہاری بہن نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔''

''اسی زیادتی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔''

''وہ بزدل اور دھوکے باز ہے...... اس نے بیک وقت دو انسانوں کو تماشا بنایا ہے......''

''خبردار حسن...... بس...... تم میرا خون ہو...... میرے عم زاد ہو...... ہمارے درمیان کم از کم پچھلے رشتوں کے لحاظ ضرور ہونے چاہئیں......'' وہ تاب نہ لا سکے۔ پھر دوبارہ بولے۔

''اس خاندان کی بہترین لڑکی تمہیں ملی تھی...... تمہاری آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔''

''تم میری بات سمجھنے سے قاصر رہو گے صبور...... اس لیے کہ وہ تمہاری بہن ہے اور اس رشتے کے گہرے جذبات پردے کی طرح تمہاری آنکھوں پر پڑے ہیں۔ فرض کرو اگر تمہیں علم ہو کہ تمہاری بیوی ایک عرصے سے تمہیں دھوکا دے رہی ہے تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا......؟''

صبور ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''میں اور تم دو بھائیوں مگر ایک خون کی اولادیں ہیں لیکن میں ذہنی غربت اور پستی میں تمہاری سطح تک نہیں پہنچ سکتا۔''

''ہر لاعلم شخص مجھے یہی بات کہنے میں حق بجانب ہے......'' اس کا انداز بھسم کر دینے والا تھا۔

''سب کی تمنا یہی تھی کہ معاملہ نہ کھلے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ کم از کم تم لوگوں کو تو حقیقت معلوم ہونا چاہئے۔ صبور۔ اس کی وجہ سے ایک اچھا بھلا شخص چودہ سال سے نفسیاتی کیس ہے اور چودہ سال بعد میں۔ میں بن رہا ہوں آخر تم لوگوں نے اسے رائے کی آزادی کیوں نہیں دی تھی۔ وہ پڑھی لکھی تھی......''

''یہ رشتہ اس کی تائید ہی سے طے ہوا تھا...... بے وقوف انسان......'' صبور خود پر قابو نہ رکھ سکے۔ دھاڑ کر بولے تھے۔ جس پر وہ بگڑ کر بولا تھا۔

''آہستہ بولو۔ تماشا نہ بنو اور نہ بناؤ...... جو معلوم کرنا ہے اس سے معلوم کرو...... میں کھلونا نہیں ہوں جس سے تم لوگ کھیلو......'' اس کا لہجہ سنگین ہو گیا...... ''اس سے متعلق ہر شخص میرا مجرم ہے۔ اس کے حوالے سے میں ہر رشتہ مقطع کرتا ہوں......''

صبور کو ایسا محسوس ہوا...... گویا وہ سچ مچ نفسیاتی کیس بن رہا ہے۔

وہ اصل حقیقت حال معلوم کرنے علیل چچا کو زچ کرنے دارالسلام چلے آئے تھے۔

ثریا کو اس قدر سکون میسر آیا تھا کہ وہ دیر تک پڑی سوتی رہی تھی۔ شہپر کے اٹھنے پر رب نواز کی بیوی اسے لے گئی تھی...... ملک نواز دیر سے سونے کے باوجود جلد اٹھ گیا تھا...... رب نواز کی بیوی شہپر کو تیار کر کے دالان میں لے آئی۔

''نواز...... تیرا بیٹا بہت ہی خوبصورت ہے میرا دل کرتا ہے اسے میں اپنے پاس رکھ لوں......''

''بچے...... عموماً اپنے ماں باپ پر ہی جاتے ہیں۔'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''تو تو کبھی اتنا سوہنا نہیں ہوگا......'' بھابھی نے بھی چڑایا۔

''نہ دھیے...... یہ نہ کہہ...... اگر مجھے یہ نہ بتایا جاتا کہ یہ نواز کا پتر ہے تو بھی میں پچھان (پہچان) لیندی کہ

میرے پوت دا چن اے'' (میرے بیٹے کا چاند ہے)

(یہی خوف تھے اماں جی...... جو یہ آج اس دالان میں کھیل رہا ہے۔ اور اندر ایک زندگی پرسکون نیند لے رہی ہے)

''اماں جی...... اینوں نظر دا ٹکہ لا دو تسی......'' رب نواز کی بیوی شہپر کو گود میں بھر کر ساس کے پاس چلی آئی ملکانی نے بڑے چاہ سے پوتے کو بازوؤں میں بھر لیا۔ اسی وقت ثریا ڈولتی ہوئی کمرے سے باہر آئی اور آتے ہی ملک سے مخاطب ہوئی۔

ملک...... گاؤں بہت اچھا ہے۔ مگر ایک برائی ہے یہاں کمرے کے ساتھ باتھ روم نہیں ہوتے۔ خالہ جان ملک کہتے ہیں ہر انسان کو صبح صبح نہانا چاہئے۔ چاہے سردی ہو چاہے گرمی......''

سیاہ کشمیری کام کے کرتے شلوار اور بنا دوپٹے کے وہ جھومتی ہوئی بے پناہ حسین لگی تھی۔

رب نوازی کی بیوی کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی...... شکر کرو ثریا...... یہ تمہارا ملک تمہیں غسل خانے میں بند رہنے کو نہیں کہتا۔

''بھابھی...... آپ لوگوں نے تو بدنام کر رکھا ہے۔ اتنی صفائی ستھرائی تو ہر انسان کو کرنا ہی چاہیے۔'' ملک نواز نے مسکراتی نظر میں ثریا کا حسن جذب کیا...... (حسن میں کتنا جادو ہوتا ہے...... اگر یہ حسین نہ ہوتی تو کتنی ناقابل برداشت ہوتی...... اس نے منصفانہ انداز میں خود کو کھنگالا تھا۔

''برکتے......'' رب نواز کی بیوی نے ملازمہ کو آواز دی۔

''ہلاں آئی بی بی......'' برکتے کی آواز کہیں دور سے آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ حاضر خدمت تھی۔

''دیکھ...... وو ہٹی دے نہان دا انتظام کر...... چھیتی کر...... غسل خانہ شیشہ بنا دے۔'' اس نے ہدایت کی۔

ملک نواز بھابھی کے اس انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جو اس کی بیوی اور بچے پر نثار ہو رہی تھی۔

ملکانی...... ایک مستقل سوچ میں مستغرق تھیں...... لیکن خود کو حاضر دماغ ظاہر کر رہی تھیں۔

''اماں جی...... کیہہ سچ رئے او (اماں جی کیا سوچ رہی ہیں) رب نواز کی بیوی نے استفسار کیا۔''

''کج وی نئی دھیے...... میں سوچ رئی آں گھروں وو ہٹی آئے...... دعوت......'' (گھر میں دلہن آئی ہے۔ دعوت)

''کیوں نہیں اماں جی...... ضرور......'' بہو نے فرطِ شوق میں ساس کی بات کاٹی تھی۔ ملک نواز گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بغور ماں کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

وہ بغور اس لیے دیکھ رہا تھا کہ اس کے ''سچ'' کا ماں پر منفی ردِعمل تو نہیں......

''بی بی...... آ جاؤ......'' ملازمہ نے آ کر جھومتی جھامتی ثریا کو متوجہ کیا تھا۔

رب نواز کی بیوی باورچی خانے کا انتظام دیکھنے باورچی خانے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

ملکانی گرمیوں میں ہمیشہ دالان میں سویا کرتی تھیں۔ دالان کا رخ بھی مغرب کی سمت تھا۔ پھر چھت پر بھی پنکھے لگے ہوئے تھے۔ مغربی ہواؤں کے سبب یہ بڑا دالان بے حد آرام دہ تھا...... وہ نماز سے فارغ ہو کر تسبیح پڑھ رہی تھیں کہ ثریا پیازی اور آسمانی پرنٹ کے خوبصورت شلوار سوٹ میں ملبوس چلی آئی...... اور تخت پر ملکانی کے پاس بیٹھ گئی...... ملکانی تسبیح پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کا ایک ایک نقش ٹٹولتی رہیں۔ اچھی صورت کے جادو نے ان کے احساسات پر خود اثر کیا...... ان کی آنکھوں سے نرمی، شفقت اور دھیمی سی مسکراہٹ جھانکنے لگی...... ان کے ہونٹ ضرور ہل رہے تھے لیکن مکمل توجہ بہو کی طرف ہو گئی تھی۔ یہ لازمی امر ہے کہ انسان جس سے محبت کرتا ہے اس سے منسوب ہر شے اچھی لگنے لگتی ہے۔ انہوں نے تسبیح کا حلقہ تمام کیا اور چوم کر رکھ دی اور دعا میں مصروف ہو گئیں۔ ثریا اپنے خوبصورت ترشے ہوئے بالوں

ہے کھیلتی رہی۔ اس کی سبز آنکھوں میں سوچ کے عکس تھے۔

اسی لمحے ملکانی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''دھیئے...... کا کا سو گیا......؟ (بیٹی بچہ سو گیا......؟)

''جی اماں جی......'' وہ ان کی بات سمجھ گئی تھی اور ملکانی بھی اس سے اردو بولنے کی کوشش کرتی تھیں۔ ہر چند کہ اردو کو اپاہج کر دیتی تھیں۔

''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی......؟'' انہوں نے اس کے پیازی ہونٹوں کی تراش کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا......

''اماں جی...... ملک کہہ رہے تھے آپ میری خالہ ہیں...... اور میں آپ کو خالہ جان کہا کروں۔ لیکن سب تو آپ کو اماں جی کہتے ہیں۔ میں نہیں کہوں گی خالہ والہ۔'' اس نے زمین پر پاؤں سے خط کھینچے۔

''کوئی بات نہیں...... تو مجھے اماں جی ہی کہہ لے پتر...... خالہ وی ماں ورگی ہوندی اے...... ماں مرے ماسی جیے......'' (خالہ بھی ماں ہی کی طرح ہوتی ہے۔ ماں مرے خالہ جیے)

''جی اماں جی......؟'' ثریا کے پلے خاک نہیں پڑا۔

''مطلب یہ ہے پتر...... ماں کے بعد خالہ بھی ماں جیسی محبت دے سکدی اے۔ خالہ ماں جیسی ہی ہوتی ہے۔''

ثریا نے سمجھ کر سر ہلایا۔

''اماں جی...... آج آپ سے میں نے بہت ساری باتیں پوچھنا ہیں۔'' وہ آہستگی سے بولی۔

''چل فیر (چل پھر) آ جا میرے بستر تے۔ آرام سے ماں دھی گلاں کراں گے (آرام سے ماں بیٹی باتیں کریں گے) انہوں نے جھک کر چپل ٹٹولی۔

وہ ملکانی کے لمبے چوڑے پلنگ پر آ گئی...... وہ لیتی رہی لیکن ملکانی بیٹھی رہیں۔

''اماں جی...... آپ ملک کی اماں جی ہیں اور میں شہپر کی ممی ہوں...... اور میری ماں...... کون تھی اماں جی...... آپ کی تو بہن تھیں۔ آپ نے تو انہیں دیکھا ہوگا ناں......؟''

ملکانی اس سوال کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ایک دم ٹپٹا گئیں۔ پھر سنبھل کر بولیں۔

پتر...... تیری ماں بھلی عورت سی...... اونوں یاد کرن دا فیدہ (اس کو یاد کرنے کا فائدہ) ہن تے میں تری ماں آں دھیے (اب تو میں ہی تیری ماں ہوں بیٹی) ملکانی نے اپنے بیٹے کی سوچ میں جواب دیا۔

''ماں کتنی اچھی ہوتی ہے...... اماں سے اچھا تو کوئی بھی نہیں ہوتا...... ہے ناں اماں جی......؟''

''ہاں میری دھی......'' مانواں ٹھنڈیاں چھانواں'' (مائیں ٹھنڈی چھایہ ہوتی ہیں)

(اماں جی...... اس کا علاج ہوا ہے۔ یہ پچھلی باتیں یاد نہیں کر سکتی) ان کے کان میں جیسے ملک کی آواز گونجی۔ وہ اس کے ماضی کے حوالے سے بات نہیں کر سکتی تھیں۔

''امریکہ تو بہت اچھا ہوگا۔''

''ہاں اماں جی...... بہت اچھا ہے۔ صاف ستھرا بہت ہے ناں...... اور اماں جی نیو یارک تو اس جگہ سے بھی اچھا ہے جہاں ہم رہتے ہیں'' ...... ثریا کو ایک دم امریکہ یاد آیا تو پرجوش ہوگئی۔

''اچھا......!!''

''جی اماں جی...... میرا علاج وہیں ہوا ہے ناں...... اماں جی......؟''

''ہوں......؟'' ملکانی نے ہنکارا ابھرا۔

''اماں جی۔ بچے کو بہت احتاط سے پالنا چاہئے...... اسے چوٹ سے بچانا چاہئے۔ اگر سر میں چوٹ لگ ے تو وہ پاگل ہو سکتا ہے...... علاج تو ہو سکتا ہے اماں جی لیکن کیا فائدہ ایسی زندگی کا جب وہ تمام پچھلی باتیں ہی بھول ے۔ کبھی کبھی انسان کا دل چاہتا ہے وہ پیچھے گزرنے والی باتیں یاد کرے...... پہلے کیا ہوا تھا یاد کرے...... ہے ناں اماں ......؟''

''ہاں...... میری دھی......''

''اسی لیے میں شہپر کا بہت خیال رکھتی ہوں......''

''میں نے دیکھا ہے دھیے تو بہت اچھی ماں ہے......'' ملکانی نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی...... ثریا کو ہی مسرت کا احساس ہوا۔

''اماں جی...... میری بھی کوئی زندگی ہے...... نہ ماں باپ یاد ہیں نہ بہن بھائی...... نہ آپ لوگوں کے ساتھ راوقت......'' اس کی آنکھوں سے قطرے بہہ نکلے۔

نرم دل سی ملکانی کا کلیجہ کٹ گیا...... نواز تو نے اس پر لاکھوں لگا دیے...... لیکن...... جو ظلم تو نے اس پر توڑا ہے کا کوئی بدل نئیں...... میرے لال...... ڈار سے کونج وچھڑ گئی اے (بچھڑ گئی ہے)

''کوئی گل نئیں پتر...... انسان پہ وڈے وڈے امتحان آتے ہیں...... یہ تیرے نصیب کا لکھا تھا میری دھی تو خوش رہا کر...... گھر گرہستی ہے تیری...... رب تجھے شاد و آباد رکھے۔''

''اماں جی میں بھابھی کے ساتھ کام کراتی ہوں تو وہ مجھے منع کیوں کرتی ہیں......؟''

''او تیرا خیال کردی اے پتر...... آئے...... ہائے......'' ملکانی بھی لیٹ گئیں۔ ثریا کھسک کر ایک طرف ہوگئی۔

''کوئی بات نئیں...... لیٹی رہ...... لیٹی رہ......'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

وہ باتیں کرتے کرتے غافل ہوگئی تھی...... ملک نواز نے باہر آ کر دیکھا تو ساس بہو غافل تھیں۔ اس کے با پر یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی...... وہ واپس پلٹ گیا تھا۔

تہجد کے بعد تو ویسے ہی ملکانی سو نہیں پاتی تھیں...... صبح کو انہوں نے ثریا کو قے پہ قے کرتے دیکھا تو ان کا ٹھنکا۔ وہ تسبیح پکڑے اس کے پیچھے ہی آ کھڑی ہوئیں۔

''ایہہ کیہہ حال ہٹا لتا اے۔......'' پھر ایک دم نہیں یاد آیا کہ وہ ان کی بولی مشکل سے سمجھتی ہے۔ لہذا دوبارہ

''کب سے ہے یہ تیری حالت......؟''

''تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں...... مس آمنہ کہہ رہی تھیں کہ ملک کو بتا دوں لیکن اماں جی مجھے شرم آتی ہے......'' اس نے نظریں جھکائے جھکائے ساس کو باور کرایا کہ وہ اپنی اس حالت سے بے خبر نہیں ہے......

''اللہ تجھے سلامت رکھے......'' ان کی آواز سے مسرت چھلک رہی تھی...... ''رب نے مینوں بہوتا دتا اے ندا نے مجھے بہت دیا ہے) خوب باگ باڑی بنائی ہے'' (خوب باغ کا غنچہ بنایا ہے) وہ اسے تھام کر اپنے کمرے میں لا ئیں۔ اور اپنے بستر پر لٹا دیا۔

پھر رب نواز کی بیوی کو آواز دی...... ''سیدہ......'' (سعیدہ)

وہ آموجود ہوئی۔

''منشی نوں آکھ کالا بکرا لے آئے...... میں صدقہ اتاراں...... کدی لوکاں دی نظر لگ جاوے میرے پتر دے گھر نوں'' (کبھی لوگوں کی نظر لگ جائے میرے بیٹے کے گھربار کو) پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔

''سیدہ (سعیدہ) میری تمنا سی کہ رب میرے پتر نوں گھربار والا کرے اس کی باغ باڑی ہو...... میری تمنا پوری ہوئی ہے...... میں جناں شکرا ادا کراں گھٹ اے۔''

سعیدہ کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ وہ بھی دو بچوں کی ماں تھی...... وہ منشی کو حکم دینے چلی گئی۔

جب ملک نواز اپنے معمولات سے نمٹ کر برآمدے میں آیا تو عجیب چہل پہل دیکھنے کو ملی۔ ملکانی نے کالا بکرا ثریا کے نزدیک کر کے ہاتھ لگانے کو کہا۔ ثریا نے ہاتھ لگایا تو منشی کو کہا کہ اسے ذبح کروا کر گوشت تقسیم کر دے...... منشی بکرے کی زنجیر پکڑ کر باہر نکل گیا۔ تمام نوکرانیاں اپنے تمتماتے چہروں کے ساتھ ادھر ہو گئیں...... سعدہ دیور کو دیکھ کر شرما کر مسکرا دی......اور وہاں سے چلی گئی۔

ملکانی نے ثریا کو لٹا دیا اور چپل ٹٹولنے لگیں...... سر اٹھایا تو حیران پریشان بیٹا نظر آیا۔ وہ مسکرا دیں۔

''ماں صدقے پتر...... کیوں پریشان اے......؟''

''اماں جی...... ابھی یہاں کیا ہو رہا تھا؟'' تردد اس کی آنکھوں سے عیاں تھا۔

''کوئی گل نئیں پتر۔ وو ہٹی چنگی اے'' ......وہ معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔ اے دا خیال کریں۔ پریشان کریں...... پریشان کریں...... یہ تینوں بہت ای چنگی چیز دیوے گی۔ (یہ تم کو بہت ہی اچھی چیز دے گی)

وہ مبہم سی بات کر کے باہر نکل گئیں۔

''کیا ڈرامہ ہے جی......؟'' وہ ثریا کے پلنگ کی پٹی سے ٹک گیا۔

''کچھ بھی نئیں......'' وہ شرما کر مسکرا دی۔

''اتنا سب کچھ ...... پھر بھی کچھ نئیں ......اور کیا چیز دینے کا پروگرام ہے......؟''

(اف کس قدر اناڑی تھا) وہ جھنجھلا گئی۔

''دیکھو جی...... جو بات ہے تمہیں کو بتانی ہے...... اس لیے کہ یہ سب ہی بغیر بتائے گئے ہیں اور الہام مجھے ہونے سے رہا۔''

''کچھ بھی نئیں ایسے کہہ رہی تھیں اماں جی'' وہ بتا نہ پائی...... شہپر کی دفعہ میں انہیں کیسے پتا چلا ہو گا......؟

''بھئی...... کیا مصیبت ہے......؟ وہ جھلا گیا۔''

''بات سنیں......''

''سنا بھی دو......''

''جب شہپر ہوا تھا تو......''

''اوہ......'' وہ اب اتنا بھی نادان نہیں تھا۔

''ہوں...... تو یہ بات ہے......'' وہ شرارت سے مسکرایا۔

''رحم کرو یار...... کیوں اتنے جھنجھٹوں میں پھنسا رہی ہو......''

''یہ جھنجھٹ ہے......؟'' وہ خفا ہوئی۔

''اگر یہی رفتار رہی تو خدشہ ہے...... بہت جلد ایک ''ٹیم'' تیار ہو جائے گی۔''

(ہائے اللہ۔ کس قدر بے لگام ہے......) ثریا پر کڑی گزر گئی۔

ملک نواز نے ثریا کے چہرے پر بکھرتے حیا کے خوبصورت رنگ دیکھے۔

''تمہارے پاس میری چیز ہے اس لیے پہلے سے زیادہ اچھی لگ رہی ہو آج کل......''

ثریا......اس سے نظر چرا کر مسکراتی رہی۔

☆☆☆

''ارے ناک میں دم کر دیا ہے ان بدتمیزوں نے۔ توبہ توبہ بچے ہیں یا اللہ کا عذاب۔''

''ارے توبہ نگو۔ حد ہے تم سے بھی......'' شہلا نے دھموکڑے جڑتی نگو جو ایک طرف کیا۔

''ارے۔ اپیا۔ سچ بتایئے...... آپ کے بچے بھی اتنا تنگ کرتے ہیں......؟ وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''بچے تو بچے ہوتے ہیں نگو۔ اس عمر میں سب ہی شرارتیں کرتے ہیں۔ امی سے پوچھنا تم کس قدر شرارتیں کرتی تھیں۔''

''ارے نہیں اپیا...... آپ کو ان کی حقیقت نہیں معلوم...... سچ...... پورے پلین میں ''مقبولیت'' حاصل کر کے آ رہے ہیں۔ اگر ایر ہوسٹس پھرتیلی نہ ہوتی تو یہ کاٹ پٹ میں گھس کر پائلٹ کو ریٹائرمنٹ پر مجبور کر دیتے......''

شہلا کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا۔ نگو کی بری حالت دیدنی تھی۔

''آپ کو تو پتا ہے سب ماں ہی کو کہتے ہیں کہ یہ تربیت کی ہے...... اس قدر مصروف ہستیاں ہیں کہ انہیں تو تربیت حاصل کرنے کی فرصت نہیں۔'' اس بے پریشان زلفوں کو جوڑے کی شکل دی۔

''ارے چھوڑ وا تنے پیارے پیارے بلونگڑوں کا پیچھا۔''

''اب دیکھیے یہ ہارون ہی ہے...... چھوٹا سا تھا تب سے دیکھ رہی ہوں۔ سچ کبھی ڈانٹنے تک کی نوبت نہیں آئی۔''

''یہ...... ہارون......'' شہلا نے سوالیہ نظروں سے نگو کو دیکھا۔

''میرے جیٹھ ہیں ناں فاروق عثمانی۔ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی امی کا انتقال ہو چکا ہے...... اب میرے پاس ہی رہتا ہے...... بلکہ میری شادی کے فوراً بعد معظم (نگو کے شوہر) اسے لے آئے تھے۔ سچ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔''

شہلا نے سولہ سترہ سال کے ''بچے'' جو دیکھا۔ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ سلو کے چہرے پر چلا کی کشش تھی۔ شہلا کو یاد آیا اس نے تو آتے ہی بڑی شائستگی سے سلام کیا تھا مگر نگو کی ہڑبونگ میں وہ توجہ نہ کر سکی تھی۔

''ہارون یہ ہماری اپیا ہیں شہلا۔ جن کی باتیں میں تم سے اکثر کیا کرتی ہوں۔ ہیں ناں اتنی ہی پیاری جتنی میں بتایا کرتی ہوں۔'' نگو کا الہڑپن اسی طرح قائم دوائم تھا۔

شہلا بہن کو دیکھ کر بے تحاشا خوش ہوئی تھی۔

''ارے نگو میں تو کئی مرتبہ تمہارے ہاں گئی ہوں۔ لیکن ہارون کو کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں چھپا کر رکھتی تھیں۔؟''

''خوب جانا ہوتا ہے آپ کا۔ دیوار کو ہاتھ کو ہاتھ لگانے آئی ہیں جب بھی آئی ہیں۔ یہ اسکول گیا ہوتا تھا یا میچ وغیرہ کھیلنے۔ میں نے ذکر بھی کیا تھا شاید آپ کو دھیان نہیں۔''

''چلو بھئی تمہیں نہلا دوں پہلے...... حالانکہ کوئی فائدہ تو نہیں......'' اس نے تینوں بچوں کو ہنکایا۔

''پڑھتے ہو ہارون۔'' نگو کا ''زلزلہ'' ختم ہوا تو اس نے ہارون کا حال احوال پوچھا۔

''جی آنٹی..... آپ کو آنٹی کہوں ناں۔؟''

''بڑے شوق سے.....'' وہ مسکرائی۔

''کس کلاس میں پڑھتے ہو۔''

''فرسٹ ایر میں۔''

''اوہ۔ بھئی تم تو کالجیٹ ہو۔'' اسے خوشی ہوئی۔

اسی دم صبور بھائی چچا جان کے کمرے سے باہر آئے..... ہارون کو دیکھ کر بے تحاشا چونک پڑے۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔ ارے بھئی۔ یہاں.....!'' وہ حالت استعجاب میں تھے۔

''آنٹی بھی آئی ہیں۔ انکل۔''

''ارے نگہت آئی ہے۔ بغیر کسی اطلاع کے۔ ہے کہاں۔''

''بچوں کو نہلا دھلا رہی ہے۔ آپ کب آئے تھے بھائی جان.....؟''

''آدھا گھنٹہ ہوا ہے۔ چچا جان کے پاس تھا۔ تم اوپر کام کر رہی تھیں غالباً.....؟''

''جی.....'' اس کا چہرہ پھر بجھ چکا تھا۔ کس قدر دل چاہ رہا تھا بھائی سے پوچھے..... ''میدان کارزار سے آ رہے ہو۔ معرکہ کیسا رہا۔؟ میری چنری پر لگے داغ گن کر آ رہے ہو کہ نہیں۔ سارے الزامات سن لیے۔ کچھ رہا کہ نہیں۔؟؟'' لیکن وہ کچھ نہ پوچھ سکی۔ ہارون ان کی طرف سے پشت کیے بیگ کھول کر شاید اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ صبور اخبار لے کر بیٹھ گئے۔ شہلا کمرے سے باہر چلی گئی۔

''ارے۔ صبور بھائی..... السلام علیکم۔ کہاں غائب تھے۔ آپ.....'' نگو بڑے سے تولیے میں اپنے تین سالہ بیٹے کو لپیٹے ہانپتی غسل خانے سے برآمد ہوئی تھی..... بھائی کو دیکھا تو چہک اٹھی۔

''اس کا مطلب ہے تمہیں خبر مل گئی تھی کہ میں کوئٹہ آیا ہوا ہوں۔''

''ہم سے زیادہ ''باخبر'' ہو کر کوئی دکھائے.....'' وہ بچے کے جسم کو خشک کرتے ہوئے تفاخر سے گویا ہوئی۔

''خبردار جو میرے آنے سے پہلے ملے.....'' اس نے بچے کو جسم پر تیز تیز کپڑے چڑھاتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا..... بچہ ماں کی ڈانٹ پر وقتی طور پر دبک گیا۔

''کھیلنے دیا کرو نگو۔''

''قسمت کے اتنے تیز ہیں سارا جہان ان کا حمایتی ہے۔ آپ کو تو بہت اچھی طرح پتا ہے۔ انہیں تو پیدا ہوتے ہی خبر ہو گئی تھی کہ یہ مٹی سے بنے ہیں۔ کہتے ہیں جس سے بنے ہیں اس سے کیا پرہیز.....؟ یہ اپیا کہاں چلی گئیں۔؟ ہارون اس کا خیال رکھنا۔ نیچے نہ اتر جائیں۔ ٹارزن کی.....'' بھائی کی موجودگی کا خیال کر کے اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور دوسرے بچے کو نہلانے گھس گئی۔

پانچ منٹ کے شور وغل نے کمرے کی مکدر فضا بدل کے رکھ دی تھی۔

بچہ ماں کے اوجھل ہوتے ہی چھپکے سے بیڈ سے اترنے لگا۔ ہارون دوبارہ بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

''ارے۔ رے۔ رے.....'' صبور نے بھانجے کو بازوؤں میں بھر لیا۔ ''یار اس سے تو ہمیں بھی ڈر لگتا ہے۔ تمہیں نہیں لگتا.....؟'' بیگ بند کرتا ہارون بے ساختہ مسکرا دیا۔

''بات یہ ہے انکل۔ فیتھ۔ یونیٹی اور ڈسپلن۔ آنٹی کا پسندیدہ قول زریں ہے۔ اور ان تینوں کو اس سے اختلاف ہے۔ بلکہ زبردست اختلاف۔''

صبور مسکرا دیے..... ''خوب کہتے ہو یار۔''

''شعر سنا رہے ہو.....؟'' نگو نے اپنے دوسرے بیٹے کو بیڈ پر ٹکایا۔

''نہیں..... بلکہ ہاں۔ قصیدہ بھی اشعار ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ قصیدہ کہہ رہا تھا تمہاری شان میں۔''

صبور مسکرائے۔

''ایک یہی تو بے چارہ قدر دان ہے۔ اسی لیے تو اسے بطور ''درباری شاعر'' ساتھ رکھتی ہوں۔'' وہ پھر جھپاک سے باتھ روم میں گھس گئی۔

صبور اپنا قہقہہ نہ روک سکے..... ''یہ کبھی نہیں بدلے گی۔'' ابھی کچھ دیر پہلے وہ کس قدر پریشان تھے اور پریشانی تو اپنی جگہ بدستور تھی لیکن نگو کی ایک جھپک میں ماحول بدل سا گیا تھا۔

''نگو۔'' شہلا اندر داخل ہوئی۔

''جی اپیا.....؟'' وہ باتھ روم ہی سے بولی تھی۔

''کیا بناؤں.....؟'' وہ کھانے سے متعلق پوچھنے آئی تھی۔

''بس اپیا بے وقوف مت بنائیے گا۔ یہ کام ہارون کے چچا بخوبی کر رہے ہیں۔''

''میں کھانے کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔'' وہ مسکرا پڑی۔

''اچھا..... آپ بناتی ہیں۔؟ ہم دراصل پکاتے ہیں.....! ایسا کریں اپیا۔ دال چاول پکا لیں۔ میں اور بڑے بچے بہت شوق سے کھاتے ہیں..... کام بھی سیدھا سادھا ہے۔ اچار کے تو آپ کے ہاں ''گھڑے'' بھرے ہوں گے..... ہمیشہ کی طرح..... تھوڑا سا سلاد میں بنا لوں گی۔'' وہ پانی میں شرابور اپنے تیسرے اور بڑے بیٹے کو باتھ روم ہی سے تیار کر کے باہر نکل آئی۔

اس کا حلیہ دیکھ کر سب مسکرا دیے۔

''ارے اپیا۔ آپ نے بچوں کو کہاں چھپا رکھا ہے.....؟''

''ارے بھئی۔ چھپانے کیوں لگی۔ گڈو سو رہا ہے۔ حنا ساتھ والوں کے ہاں قرآن پڑھنے گئی ہوئی ہے۔ بہت اچھی قاریہ ہیں۔ ہما نے بھی ان ہی کے پاس قرآن ختم کیا ہے اور ہما ملازمہ کے ساتھ ضروری چیزیں لینے گئی ہوئی ہے۔''

شہلا کو تعجب ہوا۔ نگو نے حسن کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔

''چچا جان تو اٹھ چکے ہوں گے..... میں سلام کر آؤں۔''

''وہ سو کب رہے تھے.....؟'' شہلا نے کہا۔

''لیجیے۔ اتنا شور ہنگامہ ہو رہا تھا۔ وہ نظر ہی نہیں آئے۔ میں سمجھی سو رہے ہیں۔ ابھی تک طبیعت خراب ہے۔؟''

''ہوں.....''

''مانی کا بھی فون وون آ جاتا ہو گا.....؟''

''ہاں..... فون تو وہ مہینے میں ایک بار ضرور کرتا ہے۔''

''ساحرہ ٹھیک ٹھاک ہے.....؟''

"ہوں......" شہلا نے پھر ہوں میں جواب دیا۔

نگو نے بڑا سا دوپٹہ اپنے گیلے کپڑوں پر پھیلایا اور چچا کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔

تھکن سے اس کا برا حال تھا...... سارا دن کی مصروفیت بچوں کی دھما چوکڑی...... اس کا دل چاہ رہا تھا جلد سے جلد بستر پر گر جائے۔

وہ تیزی سے اپنے بیڈ کی سمت آئی۔ دیکھا تو نگو لیٹی ہوئی میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی۔ اس نے کھسک کر شہلا کو جگہ دی۔

"آ جائیں اپیا۔ بہت تھک گئی ہوں گی۔"

وہ لیٹ گئی۔ "بہت تھک گئی ہیں اپیا۔"

"ہاں...... کافی تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ اور چھوڑو...... یہ تو روز کا معمول ہے۔"

"اپیا...... پتا ہے میں کتنی پریشانی میں آئی ہوں......؟"

(آفرین ہے تجھ پر نگو...... تیرا پریشانیوں میں یہ حال ہوتا ہے۔ یہ انداز ہوتا ہے۔؟؟)

"خیریت......؟"

"امی نے پانچ روز پہلے فون کر کے بتایا تھا کہ ہما حنا آئی ہوئی ہیں۔ بھائی جان لے کر آئے ہیں۔ اگلے روز میں نے امی کا انتظار کیا کہ شاید بچیوں کو لے کر آئیں۔ پھر اگلے دن میں نے فون پر معلوم کرنا چاہا تو پتا چلا بچیاں بھائی جان کے ساتھ واپس چلی گئی ہیں۔ مارے تعجب کے میرے تو اعصاب فیل ہونے لگے۔ امی کا لہجہ بھی پریشانی ظاہر کر رہا تھا۔ وہ رک گئی۔

(ہاں۔ ہاں نگو...... بتا میری جگ ہنسائی کی داستان......) "اچھا پھر......"

نگو نے شہلا کا جذبات سے عاری "اچھا پھر؟" سنا اور ایک حیران نظر ڈالی۔

"پھر میں امی کے پاس گئی تھی۔ بھائی تو میکے گئی ہوئی ہیں۔ ان کا تو ملتان ٹرپ' ایک ماہ سے کم نہیں ہوتا۔

"اپیا......"

"ہوں......"

"کیا ہو رہا ہے...... امی نے کہا نگی تو کب سے کہہ رہی ہے کوئٹہ جانے کے لیے۔ جا۔ جا کر بہن کے دکھ کو کم کر آ...... وہ تو اتنی ہواس باختہ ہو رہی ہیں آج کل۔ ہر آنے والے مہمان کی صورت سہم کر دیکھتی ہیں کہ کوئی بری خبر ہمراہ نہ لایا ہو۔ میں بھی بہت عجلت میں دوڑی ہوں...... میں جانتی ہوں۔ حسن بھائی سیر ہیں تو صبور بھائی سوا سیر۔ ہمارا تو ایک ہی بھائی اپیا۔"

اس نے گردن موڑ کر نگہت کو دیکھا۔ یہ کھلنڈری سی نگہت کتنی گہری ہے۔ صبح جب آئی تو اس کی کسی ادا سے ظاہر نہیں تھا کہ وہ اتنی "باخبر" ہے۔

"اپیا......"

"ہوں......"

"اپیا...... لوگ ارمان کرتے ہیں کہ ہمارا کوئی اپنا ہو تو اس سے اپنے دکھ سکھ کہیں...... آپ ہمیں اپنا نہیں سمجھتیں......"

"کیسی باتیں کرتی ہے نگی۔ بات یہ ہے کہ ہر طرح سے نقصان میرا ہی ہے۔ انسان جتنی مضبوطی سے عزت و تکریم کی عمارت بناتا ہے اگر کبھی اچانک افتاد آ جائے تو یہ عمارت اتنی ہی شدت اور دھماکوں سے ٹوٹتی ہے...... کالے کوس آواز سنائی دیتی ہے۔ میری خاموشی میں میرا تحفظ ہے...... میری شہرت۔ میری نیک نامی...... میرے لیے وبال جان بن چکی ہے نگو......! جتنا سن کر آئی ہے۔ جو آ کر محسوس کیا ہے...... وہی تجھے ہر بات سمجھانے کو کافی ہے۔

اتنا اضافہ اور سن لو۔ وہ مجھ سے سب کچھ لے چکے ہیں۔ میں نے بخوشی دیا تھا لیکن میری پاک دامنی کا غرور کوئی نہیں چھین سکتا...... انہیں انسانوں کی پہچان نہیں ہے نگو...... وہ میرے لائق نہیں ہیں......

اور امی بابا سے کہہ دینا...... وہ "چمکتی چیز تھے؟ سونا نہیں تھے۔ اور یہ بھی کہہ دینا کہ خبر آج ملی ہے آپ لوگوں کو...... حالانکہ بہت ہی پرانی ہے۔ اور خدا کے لیے نگہت یہ بھی کہہ دینا کہ...... مجھے ہمدردی کے نام پر پریشان نہ کیا جائے۔ میرا نصیب العین میرے بچے ہیں۔ میں اب بھی مطمئن ہوں۔" کئی قطرے دائیں بائیں لڑھک کر تکیے میں جذب ہو گئے۔

"ایک بات ہے نگہت......"

"جی اپیا......؟"

"جن مردوں کو اللہ اتنا انتہا پسند بناتا ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ ان کے دماغ میں سوچیں پڑھنے والا خصوصی آلہ بھی لگا دیا جائے۔ جس سے وہ ہر انسان کی حقیقت سے واقف رہیں۔ ناکام ازدواجی زندگی کا زہر ان کی رگوں میں بھی تو اترتا ہوگا۔ ان کے اس رویے میں آسودگی کا پہلو کسی جانب سے نظر نہیں آتا۔"

"نگی......"

"جی اپیا......"

"لوگ ملال اور پچھتاوے کیوں انتخاب کرتے ہیں......؟"

"کج فہم اور بدنصیب ہوتے ہیں ایسے لوگ۔" نگہت نے بمشکل اپنے آنسو روکے۔

"نگو...... آئندہ مجھ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرنا۔ نمک پاشی ہوگی۔ جو تم لوگوں کو جائز ہے نہ روا......"

"میں جانتی ہوں اپیا امی نے مجھے آنے کے لیے اسی لیے کہا تھا۔ کہ خدانخواستہ گڑبڑ زیادہ ہوئی تو ان سے برداشت نہیں ہو سکے گا...... اور......"

"تمہیں زیادہ بتانے کی کیا ضرورت......؟ بس کہہ دینا۔ "دارالسلام" میں اب ادھورے لوگ بستے ہیں۔ برا حال پوچھیں تو کہنا۔ جتنی مضبوط چیز ہوتی ہے اتنے ہی شور سے ٹوٹتی ہے...... ابھی تو اس عمارت پر ضربیں پڑنا شروع ہوئی ہیں...... آپ لوگ چاہیں تو شور اور ٹوٹ پھوٹ سے بچا سکتے ہیں۔ یہ میرا نصیب ہے۔ یہ میری آگ ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ ابھی صبور بھائی کو بھی یہی سمجھا کر آ رہی ہوں!"

"کیا آپ ہم سے الگ ہیں اپیا......؟"

"دکھ رونا ٹھیک نہیں۔ دکھ دے کر سکھ حاصل نہیں ہوتے اور نہ ہی دکھ سنا کر......"

اس نے کروٹ بدل لی۔ نگہت آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

"میری واپسی کے بعد بابا آئیں گے۔"

"بابا سے کہنا۔ تماشا دیکھنے نہ آئیں۔ جیسے پہلے آتے تھے اسی طرح آئیں۔"

اس کا انداز اتنا سرد ہو چلا تھا کہ نگہت مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ کر پائی۔

''خدیجہ......''

''جی ملکانی......''

''دیکھ دھی دے وچ مالش کر...... دھنیے دے تیل نال......'' (بیٹی کے سر میں مالش کرو۔ دھنیے کے تیل کی) پھر ثریا کو سمجھاتی ہوئی بولیں......'' ان دنوں دماغ میں ٹھنڈ اور سکون ہونا چاہیے...... بالک صحت مند ہوتا ہے......اور جب تک فارغ نہیں ہو جاتی تجھے امریکہ نہیں بھیجوں گی......سنا۔؟ زچہ کو سو چیزیں چاہی دی دیں۔ انگریزی دوائیاں تے خون خشک کر دی ایں۔ نہ کوئی ہریرے اچھوانی بنا کے دین والا نہ گڈیوں کو اخنی (یخنی) اور کسر رہ جائے تو ساری عمر پوری نئیں ہوندی...... بڈھاپا چھیتی آندا (بڑھاپا جلدی آتا ہے)

''کیا سبق پڑھا رہی ہیں اماں جی......؟'' ملک نواز بڑی نک سک سے تیار تھا۔

''چنگے ای سبق پڑھا رئی آں...... بے فکر رہ......''

ثریا گھٹنوں کے گرد بازو باندھے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ خدیجہ مالش کر رہی تھی۔

''تیرے کدھر کے ارادے ہیں......؟''

''میں ذرا لاہور ہو کر آ رہا ہوں۔ جیپ لے کر جا رہا ہوں......'' اس نے رسٹ واچ پر نظر دوڑائی۔

''میں بھی چلوں گی۔'' ثریا بچوں کی طرح ٹھنکی...... ''میں بھی دیکھوں گی لاہور کیسا ہوتا ہے......؟''

''اماں جی۔ سمجھائیں کہ ''لاہور'' کیسا ہوتا ہے......؟'' وہ ماں کی طرف متوجہ ہوا...... پھر ثریا سے گویا ہوا۔

''محترمہ۔ دو میٹر لمبی دم ہوتی ہے۔ نیلی آنکھیں ہوتی ہیں۔ نہ سینگ ہوتے ہیں نہ دانت۔ اس لیے خطرناک نہیں ہوتا۔''

ملکانی......خوب ہنس رہی تھیں۔ ان کا تھل تھل کرتا وجود بل رہا تھا۔ درمیان میں کھانسی بھی پڑھتی تھیں۔

ملک نواز کے ہونٹوں پر اس کی مخصوص دھیمی مسکراہٹ تھی جو خاص خاص مواقع پر وارد ہوتی تھی۔ ملکانی کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

وہ اپنے جلے بھنے جھلائے بیٹے کی اس تبدیلی پر بہت خوش تھیں۔

ثریا نے ناراضگی سے منہ موڑ لیا تھا۔

''حد کرتی ہو ہو یار...... لاہور ایر پورٹ سے گاؤں آتے آتے اچھا خاصا لاہور دیکھا ہے تم نے اور ابھی تو میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں...... پھر چلیں گے۔ ابھی تو ہیں ہمارے پاس کافی دن۔''

''کافی دن کیہہ......؟ بہوتے دن۔ اے نہیں جاؤندی ابھی دس مہینے تک۔''

ملک نواز نے تعجب سے ماں کی سمت دیکھا۔

''پتر......ہن تے تیرے گھر کا نور اے (اب تو تیرے گھر کا نور ہے یہ) اس کی حفاظت کرنی چاہی دی اے۔''

''وہاں ہمارے پاس ملازمہ ہے اماں جی۔''

''او کیہ کرے گی......؟ مینوں نئیں دیرا...... اے نوں نئیں جان دینا۔'' (مجھے نہیں پتا۔ اسے نہیں جانے دینا)

''جیسی آپ کی مرضی۔ واپسی پر بات ہو گی۔ اچھا خدا حافظ۔'' پھر جاتے پلٹ پڑا۔ ثریا ملکانی سے کافی فاصلے پر تھی۔ وہ اس کے نزدیک پہنچ کر گویا ہوا۔

''یار شہپر کا خیال کیا کرو۔ تم تو بالکل ہی چھٹی پر رہتی ہو۔ اس کا تو لب و لہجہ بگڑ جائے گا۔''

''کیا کروں میں۔ لوگ خود ہی میری گود سے لے جاتے ہیں۔''

''تم خود ہی عادت ڈال رہی ہو۔ ابھی وہ میرے پاس آیا تھا۔ عجیب سی مہک آ رہی تھی اس کے کپڑوں سے۔ اس کے کپڑے خود بدلا کرو۔ وہ اتنے سارے ٹیلک...... اور بے بی لوشنز اچار ڈالنے کے لیے رکھے ہیں......؟ پہلی زمت میں اسے ٹھیک ٹھاک کرو۔''

''بھیجئے تو سہی اسے میرے پاس...... وہ منشی کا بیٹا صبح سے لے کر گیا ہوا ہے۔''

ملک نواز باہر نکل گیا۔

اس کے جاتے ہی منشی کا بیٹا شہپر کو گود میں لیا۔

''ایسے ہی بی بی جی۔ کھیتوں میں لے جاتا ہوں۔ یہ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔''

''اچھا......؟''

''جی بی بی جی......''

''اچھا سنو...... میرے ساتھ آؤ...... وہ شہپر کے ہمراہ اپنے رہائشی کمرے میں آئی...... اور ایک ٹالکم پاؤڈر کا ڈبہ منشی کے بیٹے کو تھما دیا۔

''یہ رکھ لو...... روز نہا کر یہ پاؤڈر ضرور لگایا کرو۔ بہت پیاری خوشبو ہے اس کی...... اور اپنے سر میں یہ الٹے سیدھے تیل مت لگایا کرو۔ کپڑوں میں سے بھی تیل کی مہک آنے لگتی ہے پھر تم شہپر کو بھی کھلاتے ہو تو شہپر کے کپڑوں میں سے بھی آنے لگتی ہے۔ ملک غصہ کرتے ہیں...... ہلکی ہی بو بھی انہیں برداشت نہیں......'' اس نے کئی کیورا صابن کی ٹکیہ بھی اسے دی؟'' اس سے سر دھویا کرو...... بڑی اچھی خوشبو ہے ملک کہتے ہیں...... خوشبوؤں سے ذہن پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے......ہلکی ہلکی خوشبوؤں سے خوشبو تیز ہو تو بدبو کی طرح کھٹکتی ہے...... بہا دھو کر شہپر کو لے جایا کرو اور جب تک دل چاہے ساتھ رکھا کرو۔''

ملکانی جو ضروری کام سے اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھیں اس کا طرز عمل دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں ابھی جو ملک نواز نے ثریا سے باتیں کی تھیں انہوں نے سن لی تھیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے مزاج کا بخوبی علم تھا۔

اتنی خوب صورت اور سیر عورت کو بہو کی صورت دیکھ کر ان کا قلب مسرور تھا۔

وہ منشی کے بیٹے سے ناک چڑھا کر حقارت سے بھی بات کر سکتی تھی اور منع کر سکتی تھی کہ وہ بچے کو نہ لے جایا کرے......لیکن کتنے پیار سے اسے چیزیں دے دے کر سمجھا رہی تھی مبادا بچے کا دل ٹوٹ جائے۔ جب کہ ملک نواز کو ان نزاکتوں کا خیال نہیں رہتا تھا۔

نواز...... ''وہ'' تجھے نہیں ملی۔ لیکن جو تیرے پاس سے اس کا کا بھی جواب نہیں۔ یہ مقدر کی بات ہی ہے کہ ایک گھر اس کے نہ ہونے سے ویران ہوگا اور ایک آباد ہے۔ یہ تو نصیبوں والی عورت ہے۔ میرے لال...... جس نے تجھے بدل دیا...... تجھے اس سے اولاد ملی۔ تیرے مال میں برکت ہوئی۔ ہور کی کیہہ چاہی دامینوں۔ (اور مجھے کیا چاہیے)

ثریا ساس کو دیکھ کر جھینپ سی گئی تھی...... ''میں نے سوچا...... اس کے پاس سے بھی وہی خوشبوئیں آنا چاہئیں جن کی ملک کو عادت ہے۔ اس لیے یہ چیزیں۔''

''کوئی گل نئیں پتر...... تو میرے لاڈلے پتر دا کنا خیال کر دی اے۔ جیوندی رہ میری دھی (کوئی بات نہیں تو

میرے بیٹے کا کتنا خیال کرتی ہے۔ جیتی رہ میری دھی)

''توبہ......اماں جی......ملک کے جانے سے گھر کتنا سونا سا ہو گیا ہے۔ ہے ناں......؟''

''ہاں......وہ تیرے دل کی بھی رونق ہے اور میرے دل کی بھی......''

وہ ہر دم تیرے ساتھ ہے اس لیے تو مجھ سے زیادہ نصیب والی ہے۔ عمراں لنگیاں دھپے جھلکی سی وکھا کے چنا جاند ااے۔'' (عمریں گزر گئیں جھلک سی دکھا کر چلا جاتا ہے)

ملکانی ثریا سے آغاز گفتگو تو اردو میں کرتی تھیں مگر روانی میں بھول جاتی تھیں اور اپنی مخصوص زبان پر آجاتی تھیں۔

''اماں جی......تو آپ ہمارے ساتھ ہی رہا کریں۔''

''کس طراں رہ سکتی آں۔ گاؤں میں تھوڑے کام ہیں۔''

''آپ کیا کرتی ہیں......؟'' ثریا کو تعجب ہوا......بھائی رب نواز جو ہیں۔''

''گھروں کے بہت کام ہوندے ہیں۔ ہور فیر۔ میرے پتر تو کدی نہیں آکھیا کہ اماں جی میرے نال رہو۔''

''پہلے کی بات اور تھی اب اور بات ہے......پہلے تو میری وجہ سے بھی آپ لوگ پریشان ہوں گے۔ خیر۔ میں ملک سے کہوں گی کہ ہم اماں جی کو اپنے ساتھ رکھیں گے۔''

''جیوندی رہ پتر۔ اوتے مرضی دا مالک اے......اپنی مرضی کرتا ہے......خیر۔ رب اونوں خوش رکھے۔''

پھر وہ اپنی ضروری بات کرنے لگیں کہ ان کی بیٹی رضیہ آرہی ہے۔ یہ ہے وہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ بڑے پروگرام سے گاؤں سے نکلا تھا۔ ملتان روڈ عبور کر کے وہ شاہ نور اسٹوڈیو کی جانب آرہا تھا۔ اس کے ایک فلمساز دوست نے تین سال قبل فلم کی تکمیل کے لیے تین لاکھ روپے لیے تھے اور اب واپسی کا تذکرہ کیا تھا اور ملنے کو کہا تھا۔

شاہ نور ابھی کافی فاصلے پر تھا۔ وہ اسکیم موڑ پر آیا تھا کہ تیز رفتار جیپ کو بریک لگانا پڑے۔ ویگنیں اور دیگر گاڑیاں رکی ہوئی تھیں اور راستہ تقریباً بند تھا۔ وہ جیپ سے اتر کر نیچے آیا۔ معلوم ہوا کہ سوزوکی وین اور ایک رکشہ کا تصادم ہو گیا ہے اور رکشہ ڈرائیور تو موقع پر ہی ختم ہو گیا جب کہ سوزوکی وین کا ڈرائیور اور اس کا ہمراہی بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے۔ جاں بلب زخمیوں کے سرہانے ابھی مشورے ہی ہو رہے تھے۔ وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا زخمیوں کے قریب آیا۔

ٹریفک کانسٹیبل نے زخمیوں کے پاس سے ان کے شناختی کارڈ برآمد کیے تھے۔ وہ ٹریفک کانسٹیبل کی پشت پر جا کھڑا ہوا تھا۔

''حسن زید......ولد......زید فاروقی......مینجنگ ڈائریکٹر شیخ انٹر پرائزز......'' مستقل رہائشی پتا ''دارالسلام ۷۰-G- کوئٹہ۔''

ملک نواز کا تو گویا بھیجہ ہی اڑ گیا۔

اتنے سارے لوگوں میں وہ اس کا رشتہ دار نکل آیا تھا۔

اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر زخمیوں کی جیپ کا رخ سیکریٹریٹ کی جانب موڑ دیا۔ نہایت تیزی سے جیپ چلاتا ہوا وہ مقامی ہاسپٹل کے ایمرجنسی وارڈ میں آیا تھا۔ زخمیوں کو داخل کرا کے بھی اس کی اضطراری کیفیت بدستور تھی۔ اسے اپنے رنگین محبوب کو تصور ہی میں سفید دوپٹہ اوڑھے دیکھ کر وحشت ہو رہی تھی......وہ بار بار رسٹ واچ

پر نظر دوڑا رہا تھا۔

تقریباً پینتالیس منٹ بعد ڈاکٹر دروازہ کھول کر باہر آیا۔

اس نے ملک نواز کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بتایا کہ زخمیوں کی حالت خطرے سے باہر ہے اور پریشانی کی بار صرف یہ ہے کہ انہیں فوری طور پر خون کی ضرورت ہے۔ بلڈ گروپ ٹیسٹ کیا جا رہا ہے؟ وہ انتظار کرے۔

اسے کافی انتظار کرنا پڑا۔ اسے اس سست روی پر بے تحاشا غصہ آرہا تھا۔

وہ طویل برآمدے میں ٹہلتے ٹہلتے کھول رہا تھا......دل مصمم ارادہ کر لیا کہ ہاسپٹل کی انتظامیہ سے نبٹے بغیر وہ گاؤں نہیں جائے گا۔ اسی وقت نرس اسے بلا گئی۔

وہ خود پر قابو پاتا ہوا ڈاکٹر کے کمرے میں چلا آیا۔

''تشریف رکھیے۔''

''وہ تو خیر میں رکھ لوں گا۔ پہلے یہ جا کر دیکھ لیجیے کہ زخمیوں میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ معاف کیجیے گا ڈاکٹر......آپ کے لیے یہ روزمرہ کے واقعات ہیں لیکن......''

اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں......'' ڈاکٹر کھسیا سا گیا تھا۔''' آخر مخصوص پروسیجر سے نمٹے بغیر تو کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔''

''میں جانتا ہوں......'' ملک نواز کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ غور کر آئی۔

اس کی شخصیت ہی میں ایسی کوئی خاص بات تھی کہ مخاطب توہین آمیز رویے سے لاشعوری طور پر اجتناب کرتا تھا۔ شاید اس کا قدرتی تیکھا پن۔ اور نخروں سے مزین خود اعتمادی جو اس کی شخصیت کا غیر معمولی پن اور معاشرتی حیثیت آشکارا کرتی تھی۔ اس کے وجود سے منسلک ہر شے اس کی حیثیت کا اظہار کرتی تھی۔ اور امارت سے مرعوب ہونا اس معاشرے کی امتیازی خو بیخ ہے۔ کہ عمر اور کم تجربہ کار ڈاکٹر کا لہجہ خود بخود معذرت خواہانہ ہو گیا......وہ ملک سے گویا ہوا۔

''بات یہ ہے محترم۔ تمام پروسیجر صرف ڈاکٹر پر ڈیپینڈ (انحصار) نہیں کرتا۔ کافی ورکرز انوالو ہوتے ہیں یہ رزلٹ ہے۔ ایک صاحب کا بلڈ گروپ اے پازیٹو ہے دوسرے کا اونیگیٹو......اے پوزیٹو والے صاحب کو تو خون مہیا کیا جا رہا ہے او نیگیٹو ہی ہمارے پاس صرف ایک بوتل ہے جبکہ دو بوتل درکار ہیں۔''

''تھینکس گاڈ......دیکھیے ڈاکٹر صاحب......خوش قسمتی سے میں ان افراد میں سے ہوں جن کا بلڈ گروپ او نیگیٹو ہے......پلیز......''

ڈاکٹر نے ملک نواز کے خون چھلکاتے لبوں پر بے حد انسان دوست مسکراہٹ دیکھی۔ اس کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ایک ایک کر کے میری کئی چیزیں تم سے......تمہاری ذات سے وابستہ ہو رہی ہیں شہلا......اور فاصلے جوں کے توں ہیں۔ اور رہیں گے۔ کتنی بھیانک حقیقت ہے اور تعجب کی بات ہے کہ میں زندہ ہوں۔

وہ ڈاکٹر کی تقلید کرتا ہوا اس کمرے میں چلا آیا جہاں اسے خون دینا تھا۔

''ایک تو تم نے ابھی تک بچوں کے نام بھی نہیں بتائے۔ بھئی میں عرفیت کا قائل نہیں عرفیت بھی نام ہی ہوتا ہے۔ نام پہچان کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ جبکہ عرفیت کے معنی بھی یہی ہیں۔''

اب یہ ہما کاشف کو گنڈو کہنے لگی تھی......پھر گنڈو ہی چل پڑا......اور تم نے تو نرالی ہی عرفیت رکھی ہے۔ بچوں کی۔'' نمبر 1 نمبر 2 نمبر 3 چچا جان مسکرا دیے۔

''اب کیا بتاؤں۔ کیا جواب دوں آپ کو چچا جان۔''

''یہ ہمارے بچے...... دراصل۔ ''حزب اختلاف'' ہیں۔ باپ دادا کے رکھے ہوئے نام پسند نہیں۔ یہ نمبر 1 نائیٹ رائیڈر کا مائیکل ہے۔ اور نمبر 2 جیکسن والا مائیکل ہے۔ یہ نمبر 3 ابھی کسی تیسرے مائیکل کے مشہور ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔'' نگو نے بڑے مصروف اور پرمزاح انداز میں تشریح کی۔ وہ سوٹ کیس میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ چچا جان بھتیجی کے برجستہ جملوں پر بے ساختہ ہنسے تھے۔ پھر اطمینان سے چچا کے سامنے بیٹھ کر بولی۔

''وہ جو ہمارے سسر ہیں ناں...... انہوں نے کہا ہمارے ہاں نام اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے رکھے جاتے ہیں وہ بھی ''عبدل'' کے ساتھ...... وہ خود عبدالرحمٰن عثمانی ہیں۔ ان کے والد عبدالعزیز...... معظم کا نام ان کے ننھیال والوں نے معظم رکھ دیا تھا۔ مگر ابا جان انہیں عبدالجبار کہتے ہیں۔ معظم کے ابا جان کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں کو بغیر ''عبدل'' کے پکارنا بے ادبی ہے۔ نمبر 1 کا نام انہوں نے عبدالباسط نمبر 2 کا عبدالمصور اور نمبر 3 کا عبدالباری رکھا ہے۔ اور پوتے ہیں کہ ''مائیکل برادرز'' بنے پھرتے ہیں۔ ذرا بلا کر خود ہی پوچھ لیجئے۔ اس کے ساتھ پابندی یہ ہے کہ نام باسط باری نہ لیے جائیں بلکہ عبدل کے ساتھ استعمال کیے جائیں۔ اس لیے میں نمبر 1 نمبر 2 نمبر 3 کہہ کر بلاتی ہوں۔ کیا کروں اتنے لمبے نام ہیں انہیں تو ایک منٹ میں ساٹھ مرتبہ بلانا پڑتا ہے۔ ٹوکنے کے لیے...... ان کے لیے تو بہترین ٹائپسٹ بھی مجبور ہے......'' نگوں بچوں کی شرارتوں سے کچھ زیادہ ہی عاجز تھی۔

''بیٹے...... تمہارے آنے سے گھر میں رونق ہو گئی تھی...... کیوں اتنی جلدی جا رہی ہو......؟'' وہ شفقت سے گویا ہوئے۔

''بس چچا جان مجبوری ہے۔ معظم کو اور بھائی صاحب کو بہت پریشانی ہو رہی ہو گی......؟''

''بھائی صاحب......؟''

''ہارون کے ابو...... بیوی تو ہیں نہیں...... دوسری شادی پر آمادہ نہیں ظاہر ہے ان کی ضروریات کا خیال بھی مجھے ہی رکھنا ہوتا ہے۔ اماں جان اور ابا جان اپنے چھوٹے بیٹے کے پاس رہتے ہیں۔'' نگو نے اپنی ذمہ داری اور ان کی اہمیت گنوائی۔

''ہاں بیٹے بچیاں گھر بار والی ہو جائیں تو بہت ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ اب عالیہ ہی ہے اسے وقت ہی نہیں ملتا۔ شہلا علیحدہ ہر وقت مصروف...... سچی بات یہ ہے کہ مجھے شہلا کا بہت احساس ہے۔ ان چند سالوں میں پے در پے وہ قباحتیں ٹوٹی ہیں کہ ہماری تو کمر ہی ٹوٹ گئی ہے۔ شہلا کا دم اس گھر کے لیے بہت غنیمت ہے۔ مانی تو مستقل آنے کو کہتا ہے میں نے ہی منع کر دیا ہے یہاں سوائے ذہنی الجھنوں کے رہ ہی کیا گیا ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے دکھ سکھ بانٹنے کو بہت ہیں۔

حالات کی شکست و ریخت نے چچا جان کو سوا تر بڑھاپا عطا کیا تھا۔

نگو نے ان کی کیفیت بہت شدت سے محسوس کی تھی۔

''کیا معلوم چچا جان آنے والا وقت پھر مہربان ہو۔'' نگو کو ہمیشہ سے روشن دیکھنے کی عادت تھی۔

''ہاں...... میرے بیٹے...... اسی امید پر زندہ ہو......'' وہ آہستگی سے بولے۔

''تم بھی اتنی جلدی جا رہی ہو...... تم کیا آئیں اس گھر میں گویا زندگی آ گئی تھی۔''

نگو بنا کچھ کہے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''صبور تو پرسوں چلا گیا...... ایرپورٹ کیسے جاؤ گی......؟''

''فکر نہ کریں اپیا چھوڑ آئیں گی۔ کہہ رہی تھیں......''

''نگہت......!''

''جی چچا جان......؟''

''بیٹے...... تم نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا......؟ اپنی بہن کے دکھ بھی نہیں گنوائے۔'' نگو ان کے قریب چلی آئی۔

''چچا جان...... میری بہن کم نصیب ہے۔ بدنصیب نہیں۔ آپ جیسے مہربان سایہ دار درخت جو ہیں اس گھر میں...... ورنہ بدنصیب اور بھی ہم نے دیکھے ہیں۔ بہت دیکھے ہیں انہوں نے نگہت کے سر پر کانپتا لرزتا ہاتھ رکھ دیا۔

''بھائی بیگم...... کہا کرتی تھیں۔ یہ نگو بہت لاابالی...... لاپروا...... اور بے وقوف ہے...... لیکن میری بیٹی تو بہت دانشمندی کی ایک سطر ضرور سکھا دیتا ہے۔ خدا تمہیں خوش رکھے...... گھر پہنچ کر فون ضرور کر دینا۔''

''بے فکر رہیے۔ پہلا کام یہی کروں گی۔''

وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

وہ صرف گڈو کو ہمراہ لے کر نگہت کو سی آف کرنے ایئرپورٹ گئی تھی۔ اس نے ہارن دیا تو بوڑھی ملازمہ نے جلد ہی گیٹ کھول دیا اس نے گاڑی لاک کی گڈو اندر بھاگ گیا تھا۔ وہ جانے کے لیے مڑی تو ملازمہ نے کہا۔ ''بیگم صاحبہ...... بڑے صاحب کہہ رہے تھے جیسے ہی آپ آئیں تو ان سے ملیں؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔

''خیریت......؟''

''جی...... بہت پریشان ہیں...... ابھی یہیں ٹہل کر آپ کا انتظار کر رہے تھے۔'' وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر تیزی سے سسر کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ کمر پر ہاتھ باندھے اضطراری کیفیت میں ٹہل رہے تھے۔ بہو کو دیکھ کر رک گئے۔

''شہلا...... بیٹے...... ابھی ایک نامعلوم شخص کا فون آیا تھا کہ...... حسن کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے...... اسپتال کا نام فون وغیرہ بھی بتا رہا تھا...... میں نے لکھ لیا ہے۔'' شہلا کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپا...... (کب ختم ہوں گے امتحان۔)

''بھلا نام چھپانے کی کیا ضرورت تھی...... کسی نے مذاق نہ کیا ہو چچا جان......'' اس نے دل کو بہلایا۔ ''وہ صرف دو دن کے لیے لاہور گیا تھا...... اسے آج آ جانا چاہیے تھا۔ آواز سے وہ شخص معقول آدمی معلوم ہو رہا تھا...... دیکھو سب ضروری چیزیں لکھوائی ہیں۔ حتیٰ کہ ڈاکٹرز کے نام...... کہہ رہا تھا معمولی چوٹیں ہیں...... خطرے کی کوئی بات نہیں۔''

شہلا...... غیر اختیاری طور پر فون کی طرف بڑھی تھی۔

ڈاکٹر خاور ابھی ابھی اٹھ کر گئے تھے کہ فون کی گھنٹی چیخ پڑی۔

پولیس اور مخصوص ضابطہ کارروائی کی وجہ سے وہ ابھی تک پھنسا ہوا تھا۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اس ''مدد'' رسائی پر پچھتا بھی نہیں رہا تھا۔

اس نے ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیلو......'' دوسری طرف سے نسوانی آواز ابھری۔

''جی......؟''

دیکھیے میں کوئٹہ سے بول رہی ہوں۔ اور میں نے اس نمبر پر رنگ کیا ہے۔'' دوسری طرف سے نمبر بتایا گیا۔

''یہی نمبر ہے۔ فرمائیے......'' وہ اس آواز کو پہچاننے سے کیسے قاصر رہتا۔ یقیناً وہی تھی اس کی بدقسمتی کی ''بسم اللہ''

''دیکھیں جی...... میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آج کوئی زخمی ''حسن زید'' کے نام سے ایڈمیٹ ہوا ہے......؟ معاف کیجئے۔ میں معلوم کرنا تو بھول ہی گئی کہ آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔؟''

(بدخواہ نہیں ہوں) ''میں ڈاکٹر خاور کا دوست بول رہا ہوں۔ اور حسن زید سے متعلق اطلاع درست ہے۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔'' وہ بہت آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

''کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ یہ حادثہ صادر میں کس جگہ ہوا۔؟''

''بالکل بتا سکتا ہوں اس لیے کہ ان کو زخمی حالت میں اس ہاسپٹل تک پہنچانے والا میں ہی ہوں۔''

''ان کی حالت کیسی ہے۔؟''

''بہتر ہے۔''

''کیا وہ ہوش میں ہیں۔؟''

''جی...... لیکن بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔''

''کوئی خطرہ تو نہیں ہے۔''

''ہرگز نہیں۔'' (خدا کرے تمہاری حیات کے رنگ سلامت رہیں) اس کی آواز بدستور مدھم تھی۔

''آپ کی آواز صحیح نہیں ہے۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔؟''

''کیا بہت ضروری ہے۔؟''

''آخر آپ ہمارے کرم فرما ہیں۔''

''دعاؤں میں یاد رکھیے گا...... نام میں کیا رکھا ہے......؟'' اس نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

اسے خدشہ تھا کہ کہیں وہ پھر بے اختیار نہ ہو جائے۔

''میں جانتا ہوں شہلا تم وہ زخم ہو جو ہمیشہ کا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن پہلے کی بات اور تھی۔ اب مجھ پر بددیانتی کا الزام آ جائے گا۔ حالانکہ ابھی بھی بہت دن لگ جائیں گے خود کو سنبھالنے میں۔'' سگار نکال کر وہ اس کا سرا چکھنے لگ گیا۔

یہ میرے کانوں میں کس کی آواز آئی تھی...... یہ خواب تھا......؟

یہ طلسم تھا۔؟

وہم تھا...... گمان تھا۔؟ کیا تھا......؟

(کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں۔؟) ''بس نام ہی پوچھو گی......؟ ہونہہ......'' وہ تلخی سے مسکرایا۔

اے میرے خیال کی انتہا...... آئندہ مجھ سے کلام نہ کرنا...... ایک ایک زخم گنوا دوں گا...... کیا کرو گی پھر......؟

میں کرچی کرچی شیشہ جوڑتا ہوں۔ تم پھر گرا دیتی ہو۔

ڈاکٹر خاور اپنے ساتھی ڈاکٹر کے ہمراہ داخل ہوئے اور خیال کا سلسلہ دراز نہ ہو سکا۔

جب تک ضابطے کی کارروائی ہوتی رہی وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ ٹریفک کانسٹیبل اور کئی لوگوں کے بیانات قلمبند ہوئے۔

وہ ملک نواز بن ملک شہباز تھا...... اپنے علاقے کی مقتدر ہستی...... ہر فرد اس کی اصلیت جاننے کے بعد بصد احترام پیش آیا۔ بلکہ ''جذبہء'' خدمت خلق پر تحسین و آفرین کے ڈونگرے بھی برسائے گئے۔

اب باقی کام رہ جاتا تھا زخمیوں اور مرحوم و مغفور رکشہ ڈرائیور کے اہل و عیال کا جب وہ شاہ نوار کے ایک آفس سے باہر آیا تو رات کے نو بج چکے تھے۔ اب اس کی جیپ کا رخ پھر گاؤں کی جانب تھا۔ تقریباً گھنٹے کا سفر تھا۔

وہ جانتا تھا اگر بارہ بجے سے پہلے گھر نہ پہنچا تو اماں جی اور ثریا بے انتہا پریشان ہو جائیں گی۔ گاؤں میں فون پہنچنے کے کافی امکانات روشن ہو چکے تھے۔ اسے تو عرصہ ہو چکا تھا۔ فون پر ہی معاملات طے کرتے ہوئے...... اگر وہ پاکستان سے باہر نہ ہوتا تو کب کا یہ معرکہ سر ہو چکا ہوتا۔ اور حویلی میں فون لگ چکا ہوتا۔ جبکہ گھر کے دیگر لوگوں کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ یہ سب دراصل وہ اس لیے سوچ رہا تھا کہ اسے اگلے روز بھی لاہور میں کام پڑ گئے تھے کہ دو زخمیوں میں سے ایک سے اس کا ''خصوصی ربطہ تھا۔ جس کے حال سے باخبر ہونے کی غیر شعوری سی تڑپ تھی۔

دوئم...... اس کی جیب میں تین لاکھ روپوں کا چیک تھا۔ جو رات آٹھ بجے وصول پایا تھا۔ اور آٹھ بجے بینک کھلے نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے اگلے روز جمع کرانا تھا تا کہ تصدیق ہو جائے کہیں ایسا نہ ہو اماں جی آدھے گاؤں کو لاہور کی طرف روانہ کر دیں۔ کیوں کہ آج سے قبل کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ وہ آنے اور نہ آنے کی وضاحت کر کے نہ چلا ہو۔

اور وہ ثریا...... خوب مل بیٹھیں گے دیوانے دو...... وہ محتاط ڈرائیونگ کرتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا۔ کبھی گھر والوں کے پریشان چہرے سامنے آتے اور کبھی حیات بخش آواز...... ''آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں......؟'' متضاد سوچیں اس پر حملہ آور ہوتیں جنھیں وہ جھٹک دیتا تھا۔

اور یہ فیصلہ تو وہ کر ہی چکا تھا کہ کسی بھی قیمت پر وہ حسن کے سامنے نہیں آئے گا۔ صبح پھر وہ لاہور آئے گا۔ اس کی خیریت سے آگاہی حاصل کرے گا۔

اور پھر ہمیشہ کی طرح اجنبی بن جائے گا۔

اور وہ اس کی خیریت اسی سے معلوم نہیں کرے گا۔

بلکہ......

ڈاکٹر خاور سے بالا ہی بالا معلوم کرے گا۔ کہ ''اس کی'' حیات کے رنگ اسی طرح چمک رہے ہیں کہ نہیں۔؟

☆☆☆

اس کے خدشات کے عین مطابق...... بھائی رب نواز تو پھاٹک پر ٹہلتے مل گئے۔ اسے دیکھ کر ایک طمانیت سی ان کے چہرے پر نظر آئی تھی۔

''کہاں رہ گئے تھے یار۔؟'' وہ فکرمندی سے بولے۔

''لاہور گیا تھا بھائی۔ ملنے ملانے میں تو وقت لگ ہی جاتا ہے۔'' وہ جیپ اندر لے گیا۔

ملکانی تخت پر بیٹھی تسبیح گھما رہی تھیں ثریا ان کے پاس بیٹھی تھی۔

''بہت دیر ہو گئی آپ کو۔ کہاں رہ گئے تھے۔''

''جہنم میں......'' وہ بری طرح جھلا پڑا۔ ''بندہ باہر جائے تو دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔''

''ہائے۔ ہائے پتر۔ غصہ کرن دی کیہڑی گل اے''۔ (بیٹے غصہ کرنے کی کیا بات ہے) ملکانی نے ٹوکا۔

''رات وہی تے بہوتی ہو گئی ہے پتر۔ خیر ناں۔ ٹھیک ٹھاک تے ہے ناں تو؟ رات بھی بہت ہو گئی ہے۔ تو

ٹھیک ہے نا۔

''ٹھیک ٹھاک ہوں اماں جی......اب کیا ہونا ہے مجھے۔'' وہ شکستہ لہجے میں کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ ملکانی نے بہو کو بیٹے کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا۔

ثریا اس کے پیچھے چلی آئی۔

''کھانا کھائیں گے آپ۔؟'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے اس نے سر اٹھا کر ثریا کی سمت دیکھا۔

''ہاں کھاؤں گا۔ لیکن تم خدیجہ کو اٹھا کر کہہ دو۔ خواہ مخواہ ہاتھ پاؤں جلا بیٹھیں تو۔'' اس نے امریکن کچن کی عادی بیوی کو کسی ناگہانی سے بچانا چاہا۔

ثریا بنا کچھ بولے واپس پلٹ گئی۔

''وہ کپڑے بدلنے لگا۔ ہلکا پھلکا نائٹ سوٹ پہن کر ایک عجیب سا اطمینان محسوس ہوا۔

اس نے سوئے ہوئے شہپر کے رخسار چھوئے۔ ''مزے میں سو رہے ہو یار۔ وہاں تمہارے ماموں ممانی تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اگر تمہاری ماں کو سب رام کہانی معلوم ہو جائے۔ تو شاید میرے سینے میں چھری اتار دے۔'' وہ وہ تلخی سے مسکرایا۔ پھر کوٹ کی جیب سے تہہ شدہ اخبار نکال کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر میں خدیجہ کھانے کی کشتی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور کھانا سلیقے سے میز پر لگانے لگی۔

''بی بی! کہاں ہے تمہاری۔؟'' اس نے خالی پلیٹ اپنے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کون۔؟ خدیجہ شاید سمجھی نہیں۔''

''بھئی۔ شہپر کی ممی کہاں ہیں۔؟''

''آ رہی ہیں جی۔ ہاتھ دھو رہی ہیں۔'' وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ثریا اندر داخل ہوئی۔ اس نے ملک کو گہری نظروں سے ٹٹولا۔ شاید اس کے موڈ کا اندازہ لگا رہی تھی۔

''کھانا کھا لیا تم نے۔؟'' اسے خیال آ گیا۔

''نہیں۔'' وہ اختصار سے بولی۔

''کھا لیتیں بھئی۔ عجیب ہو تم بھی۔'' وہ اس کو جگہ دینے کی نیت سے ایک طرف کھسک گیا۔

''پریشانی ہو تو بھوک کب لگتی ہے۔'' وہ اس کے برابر بیٹھ گئی۔ (یک طرفہ محبت کی آگ کیا ہوتی ہے۔ تم تو اچھی طرح جانتے ہو ملک۔ قدر کرو ثریا کی۔ جو تم اسے نہیں دے پا رہے یہ تمہیں دے رہی ہے۔)

اس نے ثریا کی سمت دیکھا۔ ہیرے کے نازک آویز سے اس کے رخساروں پر جھک آئے تھے اس نے اپنے تراشیدہ بالوں کو ربڑ بینڈ میں قید کر رکھا تھا۔ نکھرے نکھرے گلابی چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

''اماں جی کھانا کھا چکیں۔؟''

''جی۔ میں نے انہیں زبردستی کھلا دیا تھا۔ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔''

''تم کافی اچھی بہو ہو۔'' اس کے لہجے میں شگفتگی عود کر آئی۔

''آپ کو احساس ہو جائے۔ بڑی بات ہے۔'' اس کے لہجے میں شکایت سی تھی۔

''بڑی بڑی باتیں کرنے لگی ہو۔ ارے بہت حساس ہیں۔ ہم۔ بہت ساری باتوں کا احساس ہے ہمیں۔

ابھی تو تم سے بہت کچھ پوچھنا ہے۔ ہماری چیزیں سنبھال کر رکھتی ہو۔ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔'' وہ مسکرایا۔

''ملک۔ آپ کتنی محنت کرتے ہیں۔ اور ہم آرام سے رہتے ہیں۔'' اس نے بات بدل دی۔

''ارے کہاں محنت کر رہا ہوں۔ پکنک منا رہا ہوں پاکستان میں۔''

''امریکہ میں تو کرتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں نا۔''

''ارے کام تو کرتے رہنا چاہیے ناں۔ دل لگا رہتا ہے۔ بندے کا۔''

''لیکن گھر سے تو دور ہو جاتے ہیں۔ آپ گھر میں نہیں ہوتے تو میرا دل نہیں لگتا۔''

وہ صاف دلی سے بولی۔ تو ملک نواز کو عجیب سی مسرت کا احساس ہوا۔

''ارے تمہارے ساتھ تو میں بہت برا سلوک کرتا ہوں۔ پھر بھی۔؟''

''پھر بھی......!'' وہ مسکرا پڑی۔

''دیکھو۔ فی الحال ایسی باتوں سے بچو۔ کیوں امتحان میں ڈالتی ہو مجھے۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ثریا نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔ لیکن فوراً ہی پلکوں کی جھالر گرا لی۔ جملہ مشکل تھا مگر نظر کی زبان آسان تھی۔ وہ پھر کچھ بول نہ سکتی تھی۔

صبح ناشتا کرتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تو ثریا نے فوراً اس کی نیت بھانپ لی۔

''آپ پھر کہیں جا رہے ہیں۔؟''

''ہاں بھئی رات تو تم لوگوں کی وجہ سے مجھے گرتے پڑتے یہاں پہنچنا پڑا تھا اور نہ کام بہت رکے ہوئے ہیں میرے آج چونکہ جلدی جا رہا ہوں اس لیے عصر تک واپس آ جاؤں گا۔''

پھر وہ ماں کو اطلاع دیتے دالان کی طرف گیا تھا۔ شہپر کو دیکھ کر اس کے چہرے پر قدرتی مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے بھی باپ کی طرف دوستانہ مسکراہٹ پھینکی۔

''یار۔ اتنے دن ہو گئے تم سے تو ٹھیک طرح بات ہی نہیں ہوئی۔'' اس نے بیٹے کو زور سے ہوا میں اچھالا۔

''شکر ہے تجھے اپنی غلطیوں کا احساس تو ہونے لگا۔'' ملکانی نے شہپر کے کرتے کی تر پائی کرتے ہوئے جتایا۔

ملک نواز نے بھرپور مردانہ قہقہہ لگایا۔ ''اچھا اماں جی۔ آپ بھی چوٹ کرنا سیکھ گئی ہیں۔''

''سیکھنا لہیہ۔ وگت (وقت) آپ ہی سکھا پڑھا دیندا اے (سیکھنا کیا ہے وقت آپ ہی سکھا پڑھا دیتا ہے) یہ سویرے سویرے کدر چلیا اے......فیر۔؟'' (یہ سویرے سویرے کہاں جا رہے ہے پھر۔؟)

''یہی بتانے آیا ہوں۔ لاہور ہی جا رہا ہوں۔ شام کو جلد ہی آ جاؤں گا۔''

اس نے شہپر کے رخسار چوم کر گود سے اتارا اور قدم باہر کی سمت بڑھائے۔

''پپا۔!'' شہپر کی معصوم آواز بلکنے لگی۔ وہ باپ کے پیچھے دوڑا تھا۔

میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب
زنجیر سی اک پاؤں میں چھنک جاتی ہے

اس کی ولدیت کا اعتراف اب منہ سے۔ زبان سے ہونے لگا تھا۔

رشتے کا افتخار۔ اور ایک عجیب سی معتبری کا احساس اسے سر سے پاؤں تک بھگو گیا۔

''پپا۔'' شہپر بازو پھیلائے اس کی جانب بڑھا تھا۔ کوئی اس کے موڈ کو دیکھے بغیر کبھی اس سے بات کر سکا تھا۔؟

کوئی اس کا ماتھا دیکھے بنا بے تکلفی پر اتر سکا تھا۔؟ اسے چھو سکا تھا۔؟ شہپر نے باپ کو عجیب۔ بے نیازی و مان سے تھام لیا تھا۔ جیسے جانے نہیں دے گا۔

''یہ۔ مجھے قید کر چکا ہے۔'' اس نے دوبارہ اسے گود میں اٹھا لیا۔

ملکانی نے سوچتی نظروں سے یہ سارا ڈرامہ دیکھا۔

انہیں معلوم تھا ملک نے کبھی کسی بچے کو گود میں نہیں کھلایا۔ وہ تو وہ راستہ چھوڑ کر چلا کرتا تھا۔ جس پر بچوں کے چھو جانے کا امکان ہو۔

اور اب کپڑوں کی ''کریز'' کی پروا کیے بغیر بیٹے کو بہلا رہا تھا۔ ڈارک بلیو فینسی ڈریس میں سرخ و سفید اور صحت مند شہپر آنسوؤں سے اپنے رخسار بھگو چکا تھا۔

ملک نے بے ساختہ اس کے پھولے پھولے اور بھیگے رخسار چوم لیے۔

''میری جان۔ مت تنگ کرو بہت کام پڑے ہیں۔ یار تم ذرا اور بڑے ہوتے تو تمہیں ساتھ ہی لے کر جایا کرتے۔'' وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''ثریا۔!''

''جی......؟''

''بھئی دیکھو۔ اسے سنبھالو۔ جانے ہی نہیں دے رہا۔''

''کوئی ایسا بھی ہے۔؟'' وہ مسکرا پڑی۔ ایک عجیب سی فخریہ مسکراہٹ کہ جو ملک کو قابو میں کر سکتا ہے۔ وہ اس کے وجود کا ایک حصہ ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شہپر کو گود میں لیا۔

''ارے یہ کیا میلی سی چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ جاہلوں کی طرح موٹی موٹی۔'' اس نے ثریا کی کلائی تھام لی لاشعوری طور پر۔

''انہیں ''کڑے'' کہتے ہیں۔ اماں جی نے پہنائے ہیں۔ کیسے اتار دوں۔؟''

''تو بھئی۔ انہیں پالش کرا لو۔'' اس نے اسی رسمی انداز میں کہا تھا اور۔ بے توجہی سے کلائی چھوڑ دی تھی۔

وہ اسے چھوتا تھا اور ثریا اپنے آپ میں نہیں رہتی تھی۔ کہ اسے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا کہ وہ کتنی اعلیٰ اور اچھی سی چیز ہے۔ اور اس کی ہے۔

ملک کی طرف سے اپنائیت کا ہلکا سا اظہار بھی اسے ایک الوہی سی خوشی دیتا شہپر پھر بلکنے لگا تھا۔

ملک نے بیٹے کے رخسار تھپتھپائے۔

''یار...... ممی پپا سے اچھی ہے۔ یقین کرو۔ تم اسے لے کر یہاں سے ٹل جاؤ تو میں نکل جاؤں گا۔ اور تم ہو کہ۔''

''میرا دل نہیں چاہتا کہ آپ ہمارے بغیر جائیں یا ہمارے ساتھ نہ ہوں۔ میرا تو دل ہی نہیں لگتا ہے۔ سچ ملک...!''

''عشق ہو گیا ہے۔؟'' اپنائیت کے بھرپور احساس سے وہ شوخ سا ہو گیا تھا۔

''یہ کیا ہوتا ہے۔؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''ایک بیماری ہوتی ہے۔!''

''آپ ہمیں بیماریاں لگانا چاہتے ہیں۔؟''

''کون لگاتا ہے خود بخود لگ جاتی ہے۔ اچھا اب تم جاؤ۔ بیٹے کے سامنے کیوں رومینٹک سین۔ اچھا۔ خدا حافظ۔''

وہ بات ادھوری چھوڑ کر اور خدا حافظ کہہ کر جیپ نکالنے بیرونی احاطے کی طرف مڑ گیا تھا۔

جب وہ ہاسپٹل پہنچا تو گیارہ بج چکے تھے۔ سورج کی تمازت بڑھ چکی تھی وہ ڈاکٹر خاور کے کمرے میں آیا تو ہوا وہ راؤنڈ پر ہیں۔ وہ پھر باہر آ گیا۔

حسن کے کمرے کے دروازے پر ڈاکٹر خاور نرسوں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔

''السلام علیکم ڈاکٹر۔!'' وہ ان کی جانب بڑھا۔

''وعلیکم السلام مسٹر ملک کیسے ہیں آپ۔؟'' ڈاکٹر خاور کا انداز پُرتپاک تھا۔

''اچھا ہوں۔ سنائیے مریض کیسے ہیں۔؟''

''گڈ نیوز فار یو۔ ہوش میں ہیں۔ ڈرائیور کو چوٹیں زیادہ آئی ہیں۔ دوسرے صاحب کے گھر والے آج صبح ہی پہنچے تھے۔''

''کون کون۔؟'' وہ ذرا سا ہچکچایا۔

''مسٹر حسن کے والد اور ان کی صاحبزادی آپ کا پوچھ رہے تھے۔''

''پھر۔؟'' وہ ذرا سا الجھا۔

''پھر میں نے بتا دیا۔ کہ ہیں ایک کرم فرما۔ بہت ممنون ہیں آپ کے۔''

''خیر یہ تو انسان ہونے کے ناتے میرا فرض تھا۔ اور تو فکر کی کوئی بات نہیں۔؟''

نو۔ آنکریکٹ۔'' انہوں نے چارٹ نرس کو تھمایا۔

''وہ۔ ڈاکٹر خاور۔ مسٹر حسن کی وائف تو نہیں آئیں۔؟''

''نہیں۔ وہ تو نہیں آئیں۔'' دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں واپس چلے آئے۔

نرس وارڈ میں چلی گئی۔

''کون تھے یہ صاحب سسٹر؟ حسن کی باتوں آواز اُبھری۔

''وہی تھے سر جنہوں نے آپ کو زخمی حالت میں یہاں پہنچایا تھا۔'' اس نے انجکشن تیار کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

''اندر نہیں آئے۔؟''

''پتا نہیں کیوں سر۔؟'' وہ سائستگی سے گویا ہوئی۔

''نام کیا ہے ان کا۔؟'' ملک کا نام سن کر اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ عجیب سی ''چڑ'' محسوس ہونے لگی تھی اسے ''ملکوں'' سے۔

''ان کا نام سر۔ ملک نواز ہے۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

ایک بم سا عین ان کے سر پر پھٹا تھا۔ ''ملک نواز۔؟'' اسے شاید یقین نہیں آیا تھا۔

''جی سر ملک نواز۔'' اس نے یقین مضبوط کیا۔

''بہت ریمارک ایبل پرسنالٹی ہیں سر۔'' نرس بہت متاثر نظر آ رہی تھی۔

''ان کی وائف تو نہیں آئیں؟''

حسن کے کانوں میں ملک نواز کا تھوڑی دیر قبل کہا فقرہ گونجا۔ وہ سر سے پاؤں تک جھلس کر رہ گیا۔

"میرے گھر پر اطلاع کس نے دی تھی؟"

"شاید مسٹر ملک ہی نے۔" نرس کو پے در پے سوالات سے الجھن ہونے لگی۔

"ہوں۔" حسن نے لمبا سا "ہوں" گیا اس کا ذہن سوچوں میں گم ہو چکا تھا۔

"وہ سب آپ سے ملنے کے شائق ہیں مسٹر ملک۔ کوئی حرج نہیں ملنے میں۔ آپ تو ان کے محسن ہیں مجرم تو نہیں۔"

"چھوڑیں۔ ڈاکٹر۔ اب ایسا بھی ضروری نہیں۔" ان نے سگار سلگانا شروع کر دیا۔

"نمائش ودکھاوے اور خود نمائی کے اس دور میں آپ حیران کن انسان ہیں۔"

ڈاکٹر خاور مسکرا دیے تو ملک نے بھی چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

"کیا مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے؟" وہ مسکرایا۔

"نہیں۔ اب ایسا بھی ضروری نہیں۔" ڈاکٹر خاور نے اس کا جملہ لوٹا کر حساب برابر کیا۔

"کب تک ہیں آپ امریکہ میں۔؟" ڈاکٹر خاور دوست سے ہو گئے تھے۔

"پتا نہیں۔ دیکھیں کب تک ہیں۔ ویسے ابھی تو میرا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ تب تک تو امریکہ ہی میں سمجھے۔ فی الحال میرا یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن ایک دن تو اپنے گھر آنا ہی ہوگا۔ میں اپنے بچے کو یہیں بھیجوں گا اس کے اپنے کلچر میں تعلیم کے لیے میں نے اس کے لیے خواب دیکھا ہے۔ کہ اسے پی۔ اے۔ ایف کی سمت لاؤں گا۔ یہ خواب میں نے اپنے لیے دیکھا تھا۔ لیکن کنسن ٹریشن (یکسوئی) حاصل نہ ہو سکی۔ بس مجھے بلندیاں اور بلند لوگ بہت اپیل کرتے ہیں۔"

"ایک ہی بیٹا ہے۔؟"

"فی الحال۔" وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا تو ڈاکٹر خاور بھی مسکرا دیے۔

"وہاں آپ کس جاب پر ہیں۔؟"

"بزنس ایڈمنسٹریشن کا ایک چھوٹا سا 'پرزہ' ہوں۔"

"میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ کتنا چھوٹا پرزہ۔" وہ اس کی انکساری سے متاثر نظر آتے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"کم ان۔!" ڈاکٹر خاور نے دروازے کی سمت دیکھا۔

کمرے میں بارہ تیرہ برس کی "سویٹ لگنگ" سی لڑکی داخل ہوئی اور آگے بڑھتے ہوئے کچھ جھجک سی گئی۔

"آؤ۔ بے بی۔ خیریت۔" ڈاکٹر خاور متفکر سے ہو گئے۔

"وہ میں پوچھنے آئی ہوں۔ کیا میں اپنے پپا کے پاس ٹھہر سکتی ہوں۔؟"

"کیوں نہیں۔ ایک آدمی ان کے پاس ٹھہر سکتا ہے۔" ڈاکٹر خاور نرمی سے بولے۔

ملک نواز ششدر سا اس بچی کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ثریا کا بچپن اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

"کیا میرا پپا۔ جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔؟" وہ کس قدر متفکر تھی۔

"بالکل۔ فکر نہ کرو۔ بے بی۔ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے پاپا۔" وہ شفقت سے بولے۔

تب وہ ملک نواز کو دیکھے بغیر واپس چلی گئی۔

"مسٹر حسن کی صاحبزادی۔" ڈاکٹر خاور نے ملک کو بتانا ضروری سمجھا۔

"اندازہ ہو گیا تھا مجھے۔" وہ واپس حواسوں میں آ گیا تھا۔

"بہت حساس بچی ہے۔ پتا نہیں مسٹر حسن کی وائف کیوں نہیں آئیں کہ بچی بہت چھوٹی ہے۔" پھر ڈاکٹر کو خدا حافظ کہہ کر بینک جانے کے لیے اپنی جیپ کی طرف آ گیا تھا۔

ہما حسن کے سرہانے جا کھڑی ہوئی تھی۔

"بہت تکلیف ہو رہی ہے پپا۔؟" وہ بہت پریشان تھی۔

"نہیں بیٹے۔ اب میں کافی ٹھیک ہوں۔" اس نے بیٹی کو دلاسا دیا۔

"لیکن چوٹیں تو بہت آئی ہیں۔" اسے باپ کی بات پر اعتبار نہیں آیا تھا شاید۔

"ہاں بیٹے "چوٹیں" تو واقعی بہت آئی ہیں۔" اس نے گہری سانس لی۔

"آپ جوس پئیں گے پپا۔؟"

"نہیں میری جان۔ قطعی خواہش نہیں۔"

"وہ کتنے اچھے انکل ہیں پپا جنہوں نے آپ کو خون دیا ہے۔ ہے ناں۔؟"

"تم ملی ہو ان سے۔؟" اس نے چونک کر بیٹی کی شکل دیکھی۔

"نہیں۔ وہ مجھے نہیں ملے۔ حالانکہ ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ کیوں پپا۔؟"

"ہوں۔ انسانیت کا تقاضہ تو یہی ہے۔" اس نے پھر طویل سانس لی۔

"امی تو بہت پریشان تھیں۔" اس نے باپ کی شکل بغور دیکھ کر کہا۔

"دادا جان کہاں ہیں آپ کے؟" وہ پھر طرح دے گیا۔

"بازار تک گئے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔" باپ نے بات بدلی تو اسے دکھ ہوا۔

"شہپر۔ خدا کی قسم۔ بہت پریشان ہوں میں تم سے۔" وہ کچن ہی میں سے چلائی تھی۔

"سچ۔ ممی پہل شہ پارہ نے کی تھی۔ پہلے یہ مجھے تنگ کرتی ہے پھر آپ سے شکایت کرتی ہے۔"

"ہاں۔ تم تو بہت نیک ہو۔ کل اوپر والے اپارٹمنٹ کی کھڑکی پر بھی تمہیں شہ پارہ نے لٹکایا تھا۔ ہے ناں۔؟ اور وہ مسز پال کا آسٹریلین پیرٹ (طوطا) بھی شہ پارہ نے اڑایا تھا۔" وہ بدستور کچن ہی میں سے بول رہی تھی۔

"ہونہہ" کھڑکی میں لٹکنا کوئی بری بات ہے۔؟" وہ بڑبڑایا۔ "اور وہ مسز پال کا پیرٹ میں نے نہیں اڑایا تھا۔ اٹ فلیواٹ سیلف۔ مسز پال ازاے لائیر۔ آئی ڈس لائیک ٹو ہر سوچ۔ بٹ۔ آئی ہیٹ ہر۔" وہ آرٹ ہو گیا تھا۔

(بلکہ وہ خود اڑا تھا۔ مسز پال جھوٹی ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں بلکہ اس سے نفرت کرتا ہوں) "مسز ہونہہ "بلیک برڈ" (کالا پرندہ) وہ صوفے پر الٹا ہو گیا تھا۔

مس آمنہ نے اسے پیچھے سے آ کر تھام لیا تھا۔

"بابا بری بات۔ بڑوں کو اس طرح نہیں کہتے۔ مسز پال نے سنا تو کیا سوچیں گی۔؟ کہ شہپر کے ممی پپا اپنے بچوں کو کچھ نہیں سمجھاتے۔ جوان کا بچہ اتنا "ال مینرڈ" ہے۔"

شی از ال میرڈ ہر سیلف۔ "بلیک برڈ۔" (وہ خود بدتمیز ہے۔ کالا پرندہ) اس پر مس آمنہ کی بات کا کوئی اثر نہ [illegible] ہوا تو ثریا کو اپنی جانب گھورتا پایا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ممی۔ آئی سوئیر۔"

"بُری بات بیٹے قسم نہیں کھاتے۔" مس آمنہ نے اس کا گال تھپتھپائے۔

"چھوڑیں آمنہ۔ یہ خود سمجھ جائے گا۔ اس کے پپا آ چکے ہیں۔ ایک ایک حرکت بتاتی ہوں اس کی۔" نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی۔

شہپر کی تو سٹی گم ہوگئی۔

"اوہ سچ ممی۔ سوری ممی۔ اب کچھ نہیں کروں گا۔ سچ مچ ممی۔" اس کی گھگھی بندھ گئی۔

"نہیں بس بہت ہوگیا۔ آج تو میں انہیں بتا کر ہی رہوں گی۔ بہت پریشان کرتے ہو تم۔"

"پلیز ممی نہیں کروں گا ناں شرارت۔ آپ پپا کو نہ بتائیں۔ پلیز ممی۔"

"تم ہمیشہ یونہی کہتے ہو۔"

"ممی مجھے پپا سے ڈر لگتا ہے۔ آپ تو بہت سویٹ ہیں۔ آئی لو یو سو مچ ممی۔" اس کے خوشامدانہ انداز پر مس آمنہ کو مسکراہٹ دبانا مشکل ہوگئی۔

"دیکھ رہی ہیں آمنہ؟ یہ ہمیشہ اس طرح نہیں کہتا۔؟"

"ممی۔ پپا کا غصہ بہت سخت ہوتا ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ اس دن انہوں نے اندھیرا کر کے باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ مجھے وہاں جن بھوت دکھائی دے رہے تھے۔ اس دن میں مر جاتا ممی۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"تم تو ہمیشہ ہی ایسے جھوٹے وعدے کرتے ہو۔ اور ان کے جاتے ہی وعدہ خلاف ہو جاتے ہو۔"

"بس۔ ممی۔ آ۔ آ۔ آئی۔" وہ بری طرح ہکلا کر رہ گیا۔ ملک نواز ہیر برش ہاتھ میں لیے دروازے ہی میں رکا ہوا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے۔؟" اس کی بھاری آواز گونجی۔

"ک۔ کک۔ کچھ نہیں۔ ڈزن میٹر پپا۔ ہے ناں ممی۔؟" ثریا جلدی سے بولی۔

"عجب دھمکیوں میں بات کرتی ہو۔" وہ نچلا ہونٹ دبا کر مسکرا دیا تو شہپر کی جان میں جان آئی۔

مس آمنہ کشن ٹھیک کرنے لگ گئی تھیں۔ ملک نواز واپس پلٹ گیا۔ شہپر نے اُچک کر ثریا کا رخسار چ لیا۔ "تھینکس ممی۔" ثریا مسکرا پڑی۔

☆☆☆

"ہیلو السلام علیکم!"

"کافی اچھا جا رہے ہیں باقی بھائی۔ واقعی میں بہت شرمندہ ہوں۔ کہ گڑیا کی شادی میں شریک نہ ہو سکا آپ کو اپنی مجبوری سے آگاہ کر چکا ہوں۔ بچوں کا بھی سیشن شروع ہے اور میں بھی چھٹی لینے سے قاصر رہا۔"

"ویسے سب ٹھیک ٹھاک رہا۔ چلیے۔ بہت اچھا ہوا۔ آپ ایک فرض سے تو عہدہ برآ ہوئے۔"

"مس آمنہ تو ہمیشہ ہی سے آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ پوچھتی رہتی ہیں آپ کا۔"

"ثریا اصل عیش تو ان کے ہیں۔ اس قدر مصروف رہتی ہیں کہ۔ بس مس آمنہ کا دم غنیمت ہے۔ ورنہ تو یاد ہی نہیں رہتا کہ ان بچوں کا کوئی باپ بھی ہے۔ ہاہا۔ ہا۔ شہپر۔ بہت جینیئس بچہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی بے انتہا شرا بھی۔ نہ جانے کیوں۔ میرے سامنے تو خاموش رہتا ہے عموماً لیکن دوسرے گھر والے نشانے پر رہتے ہیں اس کی ممی تو ہر چھپائی ہے۔ لیکن ہم نے بھی زمانہ دیکھا ہے۔ آخر ہے تو میرا بیٹا۔ جی؟۔ ہاہا۔ ہاہا۔ ہا۔" اس نے ایک طویل قہقہہ لگایا۔

"جی۔ اعتراف۔ جی ہاں۔! یہ سب اسی اعتراف کے تو بکھیڑے ہیں۔ تعلیمی لحاظ سے تو مجھے مطمئن کر

بس اپنی ماں کو بہت تنگ کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بے چاری تو بے قصور ہے۔" اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

"جی ہاں۔ بچوں کی چھٹیاں ہوں گی تو آنے کی کوشش کروں گا۔ کیونکہ میرا ارادہ ہے کہ شہپر کو پاکستان ورس سے منسلک کرا دوں۔"

"نہیں خیر۔ ابھی تو وہ چھوٹا ہے۔ میرا آئندہ کا پروگرام ہے۔ اس وجہ سے جلد ہی پاکستان کا چکر لگے گا۔ شہپر می کو بھی اپنی "ساس" سے بہت محبت ہے۔ مجھے اکثر اس جھوٹ پر یقین کرنا پڑتا ہے۔ کہتی ہے پاکستان اور "ساس" یاد آتے ہیں اب تو تینوں بچے ہی اسکول جاتے ہیں۔ صبح جاتے ہیں شام کو آتے ہیں۔"

ثریا کی امپروومنٹ قابل رشک ہے۔ آپ اس کی تحریر دیکھیں گے تو یقین نہیں آئے گا۔ انگریزی اسے انداروں نے اور شہپر نے سکھا دی ہے۔ یعنی انگریزوں جیسی انگریزی بول ہی لیتی ہے گزارے لائق۔ اور کچھ شہپر بھی ول کی وجہ سے آدھی اردو آدھی انگریزی بولتا ہے۔ اور شہ پارہ بھی۔ شہریار تو کافی چھوٹا ہے اپنی ماں ہی کی بولی بولتا ہے۔"

"جی۔ واقعی گھر تو سن گیا۔ بس دعا کیا کریں۔ آپ جیسے مخلص لوگ تو میری راہ کی روشنی ہیں اور زندگی کا ب ہیں۔"

"بالکل۔ میں شکر گزار ہوں خدا کا۔ آپ کا۔ مس آمنہ کا۔"

"اچھا جی۔ ثریا کا سلام لیں۔ او کے۔ خدا حافظ۔" اس نے ریسیور کریڈل پر آہستگی سے ڈال دیا۔

اسی وقت ثریا سیاہ اور سرخ لائینوں والی ساڑھی میں ملبوس اندر داخل ہوئی۔ اور سیاہ ڈائل کی رسٹ واچ جو ت چم چم کر رہی تھی باندھنا شروع کر دی۔

"گویا تیار ہوگئیں۔" اس نے ثریا کے چہرے کی دائمی خوبصورتی کو نظر میں جذب کیا۔

"آپ ذرا شہپر پر نظر رکھیے۔" وہ مصروف سے انداز میں گویا ہوئی۔

"کیوں؟ اسے نہیں لے کر جا رہی ہیں۔؟ حالانکہ برتھ ڈے پارٹی تو ہوتی ہی بچوں۔"

"وہ خود ہی نہیں جا رہا۔ حالانکہ مسز پال تو اسے بہت پیار کرتی ہیں۔ کہتا ہے۔ وہ "کالی" ہیں۔ اور ان کے کان بہت چھوٹے ہیں۔"

پھر تو اسے "گدھے" بہت پسند آئیں گے۔ خاصے لمبے کان ہوتے ہیں گدھوں کے۔" بیٹے کے خیالات سن کر اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ برابر والے اپارٹمنٹ میں عارضی طور پر قیام پذیر یہ نیگرو ہمسائی بہت اچھے اخلاق کی عورت تھی۔

"اسے کنٹرول کرو ثریا۔ یہ دل آزاری کے انداز سیکھ رہا ہے۔ وہ کہاں۔ میرے پاس بھیجی جانا۔" ثریا پرس ر گفٹ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

تھوڑی دیر بعد سہما ہوا شہپر اس کے سامنے تھا۔

خوبصورت وہائٹ ڈریس میں ملبوس تھا۔ سنہرے بال ریشم کے تاروں جیسے پیشانی پر جھک آئے تھے۔ سرخ رخ ہونٹ بڑی بے دردی سے کاٹ رہا تھا۔

"اے۔ پرنس۔ ادھر آؤ۔ (اس نے بیٹے کو "پرنس" بلایا تو اسے ناصر صاحب یاد آ گئے جو اسے پرنس کہا کرتے تھے۔)

وہ ڈرا ڈرا باپ کے نزدیک آ گیا۔

ملک نے بازو کو گھیرے میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا۔

''کیا عمر ہے تمہاری۔؟'' اس نے شہپر کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

''آئی۔ایم۔الیون ایرز اولڈ۔پپا۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں بولا۔

''صرف گیارہ سال کے۔؟ میں تم سے عمر میں بڑا ہوا ناں۔؟'' اس نے بیٹے کے جانچتی نظروں سے دیکھا۔

شہپر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور تم سے زیادہ جانتا ہوں ناں۔؟''

شہپر نے پھر ''ہاں'' میں ہردن ہلائی۔

''جو بات میں کہوں گا۔کیا تمہیں اس کا یقین آئے گا۔؟''

''یس پپا۔'' اس نے خوشبودار باپ کے وجود میں گم ہو کر جواب دیا۔

''تو پھر۔یاد رکھنے والی بات ہے۔کہ جو انسان بھی مسکرا کر اور سچی محبت کے ساتھ ملتا ہے۔وہ بہت خوبصورت ہے۔جو آپ کو چاہتا ہے پسند کرتا ہے۔وہ آپ کی دولت ہے۔''

شہپر نے حیران آنکھیں باپ کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

''جو محنت کرتا ہے۔بیٹے۔وہ بدصورت نہیں ہوتا۔یقین کرو۔

مسز پال۔آپ سے بہت پیار کرتی ہیں۔وہ ہمارا خزانہ ہیں۔آپ کو ان کی محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیے۔لوازا ے بیوٹ مائی سن۔وہ بھی ہاتھ پاؤں والی انسان ہیں۔وہ ''بلیک برڈ'' کیسے ہو سکتی ہیں جبکہ ''برڈ'' کے تو پر ہوتے ہیں۔''

شہپر نے شرمندگی نے آنکھیں جھکا لیں وہ تو سمجھتا تھا کہ پپا کو کچھ نہیں پتا۔جبکہ پپا تو ''بلیک برڈ'' والی بات جانتے ہیں۔اسے واقعی شرم آ گئی۔

''یہ میرے لیے دکھ کی بات ہے کہ میرے بیٹے کی وجہ سے کسی کا دل دکھے۔محبت کرنے والوں سے نفرت نہیں کرتے۔میری زندگی ارنگ محبت اور دولت اللہ دیتا ہے بیٹے اور اللہ کی دی ہوئی چیز کو بُرا نہیں کہتے اگر میں میں جو تمہارا پپا ہوں سیاہ۔ایک دم بلیک ہوتا۔؟ تو پھر آپ تو مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہ کرتے۔یا آپ کی ممی۔''

شہپر ملک نواز سے لپٹ گیا۔

''سوری پپا۔(ٹیلی۔ویری سوری۔''

''آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں محترم۔لہٰذا مسز پال کے ہاں چلے جایئے۔ٹونی سے پال انکل سے مسز پال سے کہیے۔سوری آئی ایم سو مچ لیٹ۔بٹ آئی کیم۔''

اس نے مسکرا کر شہپر کی پشت تھپتھپائی۔

وہ فوراً باہر بھاگ گیا۔ملک نواز کے لبوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

وہ دروازہ پر دستک دے کر اندر چلی آئی تھی۔

''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام۔بیٹے۔اچھی تو ہو۔''

''جی اماں جان۔بالکل ٹھیک ہوں۔سر ہیں۔؟''

''ہاں۔اندر ہے وہ بلاتی ہوں۔''

''جمشید۔دیکھو بیٹا۔ہُما آئی ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمرے سے باہر آ گئے۔

''السلام علیکم۔سر۔'' ہما کھڑی ہو گئی۔

''وعلیکم السلام۔ٹھیک ہو۔؟''

''جی۔ایک دم ٹھیک۔پھر مطلب ہی سے آئی ہوں۔

''کسی طرح بھی آئیں۔مجھے خوشی ہوئی۔کوئٹہ سے کب واپسی ہوئی۔؟''

''کل شام ہی آئی ہوں سر۔امی تو آنے ہی نہیں دے رہی تھیں۔کہ اتنی جلدی کیوں جا رہی ہو۔لائٹ ںاہے۔میرے تو اعصاب پر حاوی رہتا ہے۔''

''ارے۔رے۔رے۔اعصاب پر حاوی نہ کرو۔لائٹ لو۔آخر جینیس لڑکی ہو۔''

''تھینک یو سر۔'' وہ شکر گزاری کے ساتھ مسکرا دی۔

''سر۔وہ میرے نوٹس عامر قریشی نے واپس کر دیے۔؟''

''ہاں۔دے گیا تھا۔''

''بس اسی لیے آئی تھی سر۔پلیز نوٹس عنایت کر دیجیے۔شام گہری ہو رہی ہے۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔آپ کی نانی کا گھر یہیں نزدیک ہی تو ہے۔''

''جی سر۔نزدیک تو ہے۔مگر دیر ہونے پر پریشان ہو جائیں گی۔وہ کہتی ہیں میں ان کی بہت بڑی ذمہ داری .امی سے بھی بڑی۔ذمہ داری۔'' وہ مسکرائی۔

''امی سے بھی بڑی۔؟ کیا مطلب۔؟ میری ناقص عقل میں یہ بات واضح نہیں ہوئی۔''

''مطلب یہ کہ امی تو ان کی بیٹی تھیں۔لیکن میں جناب حسن زید کی صاحبزادی ہوں۔''

''اچھا۔'' جمشید نے چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔

''ارے اماں جان۔یہ آپ نے کیا کیا۔؟'' ہُما نے جمشید کی والدہ کو ٹرے اٹھائے دیکھا تو شرمندہ سی ہو گئی۔

''کیا کرنا بیٹے۔ذرا سی، چائے بنائی ہے۔''

''آپ نے کیوں تکلیف کی۔؟'' وہ حقیقت سی تھی۔

''اتنے فارمل نہیں ہوتے ہُما۔چائے ہی تو ہے۔'' جمشید مسکرا دیے۔

''شاباش چائے بناؤ۔خود بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔''

''اور کوئٹہ کا موسم کیسا ہے۔؟''

''نارمل ہے سر۔کیسا ہوتا ہے اس پتھریلی زمین کا موسم۔'' وہ لاشعوری طور پر آزردہ سی ہو گئی تھی۔

''گھر میں سب خیریت ہے۔؟''

''جی۔دادا جان کی کچھ طبیعت خراب تھی۔وہ تو مجھ سے بے انتہا پیار کرتے ہیں۔کہتے ہیں میں ان کی پوتی نہ بلکہ بیٹی بھی ہوں۔دراصل میری پھوپھو ہوتی تھیں ثریا میں ان میں بہت ملتی ہوں۔دادا جان تو کہتے ہیں۔تم ہ ہی ہوں۔''

''کیاان کاانتقال۔''

''نہیں نہیں سر۔ یاشاید۔ دراصل وہ ذہنی طور پر اب نارمل تھیں ایک دن گم ہوگئی تھیں پھر نہیں ملیں۔''

''اوہ۔ یہ تو واقعی ٹریجڈی ہوئی۔'' جمشید نے افسوس ظاہر کیا۔

''ڈھونڈا تو ہوگا۔'' اماں جان نے ہُما کی صورت دیکھی۔

''آج تک ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ۔'' ہُما کی سبز آنکھوں میں پانی تیر گیا۔

''ہاں بیٹے۔ بعض اوقات ایسے حالات سے سابقہ پڑ جاتا ہے جو تصور میں نہیں ہوتے۔ یہ بھی قدرت کی طرف سے امتحان ہوتے ہیں۔ جن پر صبر کرنا پڑتا ہے۔'' اماں جان نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اور دادی جان تمہاری۔''

''پھوپھو کے گم ہونے کے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔''

ماحول افسردہ سا ہوگیا تھا۔ چند ثانیے تینوں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ پھر جمشید نوٹس کی فائل لینے اندر کمرے میں چلے گئے۔

''کوئی نہ کوئی دکھ۔ کوئی نہ کوئی کمی ہر انسان کے ساتھ ہے بیٹے۔ میں نے بھی ایک جوان لاشہ اٹھایا ہے۔ جمشید سے چھوٹا تھا جعفر۔ اپنے بھائی کی بیٹی سے اس کی تو بات چیت طے تھی۔ وہ پسند کرتا تھا اسے۔ بس ایک دن چپ چپاتے چل دیا۔ آہ۔ جہاں کہیں دکھ سنتی ہوں۔ کان کھڑے ہو جاتے ہیں میرے۔ جی چاہتا ہے دکھیا کا دکھ بانٹ لوں۔ اذیت کسی کی ہو۔ غم چاہے کسی کا بھی ہو۔ میری برداشت سے باہر ہے۔'' ہُما نے ڈاکٹر جمشید کی والدہ کو قدر دان نظروں سے دیکھا۔ ''اللہ۔ کس قدر حساس ہیں یہ۔ امی کی طرح۔''

(امی۔؟۔ آہ۔)

''یہ لیجیے ہُما۔ عامر شکریہ کہہ رہا تھا۔'' جمشید نے فائل اس کی کی سمت بڑھائی۔

''شکریہ سر۔ اچھا میں چلتی ہوں۔''

''میں آپ کو چھوڑ آؤں گا ہُما۔''

''بہت بہت شکریہ سر۔ ابھی رات نہیں ہوئی میں چلی جاؤں گی۔'' وہ جلدی سے بولی تھی۔

''اچھا۔ سر۔ اماں جان۔ خدا حافظ۔''

''خدا حافظ بیٹا۔'' اماں جان سے سوچ کے بھنور میں ڈوبے ڈوبے جواب دیا تھا۔

''ارے خورشید۔ تم ناں۔ بے وقوف بہت ہو۔''

''کیسے چھوٹے مالک۔'' وہ پریشان سا ہوگیا۔

''ایسے۔ کہ اتنے بڑے گھر کے واچ مین ہو۔ روز صفائی کرتے ہو۔ اور سوتے سرونٹ کوارٹر میں ہو۔ ارے پپا کے بیڈروم میں سو جایا کرو۔ جب ہم لوگ امریکہ میں ہوتے ہیں۔''

خورشید نے ملک نواز کے شاندار سے لیکن بے انتہا شرارتی سے وارث کو مسکرا کر دیکھا۔ ''مالک کو پتا لگ گیا ناں۔ میری کھال میں بھس بھروا کر مین گیٹ پر لٹکوا دیں گے۔''

''ہیں۔؟'' شہپر کے خاک پلے نہیں پڑا۔

''آئی کڈ ناٹ انڈراسٹینڈ۔ یہ ''بھس'' کیا ہوتا ہے خورشید۔؟''

''چھوٹے مالک۔ یہ جانور کی پسندیدہ ڈش ہوتی ہے۔ خورشید نے بڑی علمیت سے بتایا۔

''اچھا۔ لیکن یہ کھال میں کس طرح بھرا جا سکتا ہے۔؟''

''ہڈیاں۔ آنتیں باہر نکال کر۔''

''بھئی ہمیں سمجھ نہیں آئی۔'' شہپر نے بے زاری سے کہا۔

''خورشید۔ یہ بائیک جو باہر کھڑی ہے۔ کیا اس میں ہر وقت پٹرول۔ یا۔ ڈیزل بھرا ہوتا ہے۔؟''

''ہاں۔ جب مالک آتے ہیں تو ہر وقت۔'' خورشید نے بتایا۔

''خورشید پپا یہاں گاڑی کیوں نہیں لیتے۔؟ وہاں تو ہمارے پاس اکورڈ سے بھی اچھی گاڑی ہے۔ باقر انکل اکورڈ سے بھی اچھی۔ ممی بھی کہہ رہی تھیں۔ کہ ہم پانچ انسان ایٹ اے ٹائم بائک پر نہیں بیٹھ سکتے۔ ویسے بھی بائیک پرانی ہوگئی ہے۔''

''خیریت تو ہے چھوٹے مالک۔ یہ بائیک پر بڑا زور پڑ رہا ہے۔ کہیں۔ لے مت اڑیے گا۔ پولیس دھر لے گی۔''

''یہاں۔ فائن کو (جرمانے کو) کو دھر کہتے ہیں۔؟'' وہ سادگی سے پوچھ رہا تھا۔

''میرا مطلب ہے پولیس پکڑ کر لے جائے گی۔''

''تو لے جائے۔ ہمیں کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ بس پپا سے لگتا ہے۔ اگر تم نے کبھی پپا سے شکایت کی ناں تو ہم چھت سے نیچے کود جائیں گے۔'' اس نے دھمکی دی۔

''مجھے چغل خور سمجھا ہے آپ نے۔؟'' خورشید نے ننھے سے شہزادے کے رخسار چھوئے۔

''تمہاری بیگم صاحبہ ہو سکتا ہے پپا سے میری شکایتیں کیا کریں۔'' کیا حفظ ماتقدم کا انداز تھا۔

''نہیں۔ نہیں۔ میں انہیں سمجھا دوں گا۔'' خورشید نے اطمینان دلایا۔

''تھینک یو۔ سو مچ۔''

''کیا مطلب۔ یعنی۔'' خورشید کا ماتھا ٹھنکا۔

''نہیں۔ نہیں۔ ہم تو ایسے ہی کہہ رہے ہیں۔'' شہپر ایک جست میں باہر تھا۔

اس نے ہر طرف سے اطمینان کر لیا۔ ممی اور مس آمنہ شاپنگ کرنے گئی ہیں۔ پپا باقر انکل کے ساتھ بینک ہیں۔ خورشید کچن میں ہے اس کی بیوی پپا کا بیڈروم ٹھیک کر رہی ہے۔ میدان صاف ہے۔ اس نے بائیک کی چابی لی اور چپکے سے باہر نکل گیا۔

کافی دور بائیک کو ایسے ہی کھینچا۔ کافی فاصلے پر لا کر اسٹارٹ کی تھی۔

گرمی اس قدر شدید پڑ رہی تھی بقول نانی جان چیل بھی انڈا چھوڑ بیٹھی تھی۔

اس پے سے سنسان راستے۔ کینٹ ایریا سے کافی پرے ایک بے رونق سی سڑک تھی جس پر وہ بڑی ہمت سے چلی جا رہی تھی۔ عائشہ کے ہاں شام تک کا پروگرام تھا۔ یہی سوچ کر اسے اطمینان تھا کہ جاتے کے ساتھ ہی ٹھنڈا ٹھنڈا جوس پھر اچھا سا کھانا بھی اور پھر ٹھنڈے کمرے میں تقریباً ایک گھنٹے کی اچھی سی نیند بھی۔

عائشہ سے اس کی دوستی کراچی آتے ہی فوراً ہوگئی تھی۔ اس دوستی میں تعجب کی بات تو کوئی خاص نہیں تھی سوائے اس کے کہ عائشہ اس سے ایک سال سینئر رہی تھی۔ اور آج کل اپنے کسی انکل کے کلینک میں کام کر رہی تھی۔

وہ اس کی بہترین دوست تھی۔ تعلیمی معاون تھی۔ اور ٹھنڈی چھایا جیسی تھی۔ ہمیشہ سے کہتی آ رہی تھی۔

''ہُما۔ تجھے پتا ہے۔ تیری ان سفید آنکھوں میں صدیوں پرانا کوئی طلسم بولتا ہے۔؟'' وہ شرما کر ہنس پڑتی

تھی۔ پھر سوچا کرتی تھی۔

(میری ثریا پھوپھو کی آنکھیں بالکل مجھ جیسی تھیں۔ کوئی ان کا طلسم بھی ہوگا۔ کاش۔ ان کا وہ طلسم بن کر وہ جاتا۔ اور جب وہ اس کی سوچ معلوم کرتی تو ہُما سچ بول دیتی۔

عائشہ سنجیدہ سی ہو جاتی۔ "ہو سکتا ہے کوئی آ ہی گیا ہو ان آنکھوں کے طلسم میں۔؟"

"آ سکتا تھا اگر وہ احساسات سے عاری نہ ہوتیں۔"

وہی آنکھوں کے ذکر سے شروع ہو کر۔ آج نہایت کی منزلوں تک آ پہنچی تھی۔ نانی جان اور چھوٹے ماموں کو بھی عائشہ پر بہت اعتبار تھا بلکہ وہ بہت پسند کرتے تھے اس دوستی کو ایک فائل اور وہ اناٹومی کی موٹی سی کتابیں تھیں۔ جو اچھل کر دور جا گری تھیں اور ہُما پختہ فٹ پاتھ پر گھٹنوں کے بل گری تھی۔

وہ اس سکوت میں پرندے کی آواز تک کی متحمل نہ تھی کجا کہ کوئی اپنی موٹر سائیکل کے کرتب سے اسے اس طرح "محظوظ" کرتا۔

اس کی ہتھیلیاں اور گھٹنے بری طرح چھل گئے تھے۔ کوفت شرمندگی۔ اور اذیت نے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر دیے تھے۔

معاً موٹر سائیکل واپس اسی کی سمت آئی۔ تو وہ بوکھلا کر جلد ہی کھڑی ہوئی۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی تھی۔ جب اس نے گیارہ بارہ برس کے بچے کو بڑے فراٹے اور خود اعتمادی سے بائیک چلاتے دیکھا۔ وہ اس کے پاس آ کر ٹھہر گیا تھا۔ پھر تیزی سے اس کی فائل اور کتابیں اٹھا کر اس کے نزدیک چلا آیا۔

"آئم۔ سو۔ سوری مس۔ آئی۔ ڈونات وانٹ اِٹ۔" وہ بے ساختگی اور شرمندگی سے گویا ہوا تھا۔

"بھئی۔ شکل سے تو مستقبل کے کارآمد آدمی دکھائی دیتے ہو۔ اتنی چیز کا کسی کو خیال نہیں۔ کمال ہے۔" ہُما پر تو فی الحال جھلاہٹ طاری تھی۔

"جی۔؟" شہپر سمجھ نہیں سکا۔

"تمہارا سر۔ چھوٹے شیطان۔ یہ بتاؤ۔ تمہارے والد یا والدہ یا پھر دونوں سوتیلے ہیں۔؟"

امریکی معاشرت کا ایک حصہ بن جانے والا بچہ۔ سوتیلے کا مطلب نہ سمجھ سکا جس کے پاس کالے گورے گٹ پٹ کرنے والے امریکی رہتے تھے۔

ہُما اس کے امریکن انداز میں انگلش بولنے ہی سے سمجھ گئی تھی۔ کہ "باہر کی ہوا" ہے۔ "میرا مطلب ہے اسٹیپ مدر۔ اسٹیپ فادر۔" ہُما نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے تشریح کی۔

"تو پھر وہ تمہارے دشمن کیوں ہیں۔؟ وہ بائیک تمہیں دے کر انہوں نے کون سے جنم کا بدلہ لیا ہے۔؟"

"یہ تو میں خود لے کر آیا ہوں۔ ماما اور ممی شاپنگ کرنے گئی ہوئی تھیں۔ اور پپا باقر انکل کے ساتھ۔ میں خورشید سے چھپ کر لے آیا۔ کیا کرو۔ مجھے بہت شوق ہے بائیک چلاتے کا۔" شہپر نے بڑی بے بسی سے کہا۔

"آپ کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ سو۔ سوری مَیڈم۔" وہ پھر معذرتی انداز میں بولا۔

"آیئے۔ لیٹ۔ سٹ بی ہائنڈ می۔" بڑی فراخ دلی سے پیشکش ہوئی۔

"ارے نہیں۔ کچھ دن اور جی لینے دو۔ ادھورے کام مجھے چھوڑنا پسند نہیں۔ آخری سال ہے میرا۔" ہُما جلد لیے بولی۔

"پھر آپ مر جائیں گی۔؟" شہپر پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

ہُما اپنے چھلے گھٹنے کی تکلیف بھول گئی بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اے۔ کوہ قاف سے بھی کہیں "پرے" کے پرنس۔ میڈیکل کا آخری سال ہے۔ زندگی کا مجھے کیا پتا God Know Best (خدا سب سے بہتر جانتا ہے۔)

"اوہ۔ یس۔ آپ کو تکلیف تو نہیں ہو رہی؟" اسے پھر ہُما کے گرنے کا خیال آیا۔

"بہت ہو رہی ہے۔ تمہاری جگہ اور کوئی ہوتا ناں۔ تو بہت مارتی۔"

"مجھے کیوں نہیں مارا؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔ اور ہُما کے گویا دل میں اتر گیا۔ سیاہ جینز اور سرخ ہاف اسٹین شرٹ کے عکس میں اس کا اپنا چہرہ بھی لال ہو رہا تھا۔ خوبصورت ریشم جیسے بال اور گوشت سے ٹھوڑی میں بہت واضح گڑھا۔ اس پر سے امارت کا عکس اور خود اعتمادی کی فراوانی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے۔؟"

"آپ کمپلین کریں گی۔"؟ وہ گھبرا گیا۔ (پپا آ نہ گئے ہوں)

"اچھا اب میں بائیک کو ویسے ہی لے جاؤں گا۔ یہ دیکھیے میں نے چابی نکال دیا ہے۔"

"ارے اس قدر ہیوی ہوتی ہے۔ یہ بائیک۔ مجھے تو حیرانی ہے تم نے سنبھالی کیسے ہے۔؟"

"بہت اسٹرونگ ہوں میں۔ چھوٹا ہوں تو کیا ہوا۔" وہ فخریہ بولا۔

(اے معصوم روح۔ تجھے کہیں خود ہی کی نظر نہ لگ نہ جائے۔) اس نے اس کے رخسار بے ساختگی سے تھپتھپائے تھے۔

"آپ اگر شکایت نہ کریں تو میں آپ کو اپنے گھر لے جا سکتا ہوں۔ بنڈ تج کر سکتا ہوں کولڈ ڈرنک پلا سکتا ہوں۔" اس نے شرائط کے ساتھ پیشکش کی۔

ہُما کا دل چاہا اسے بہت سا پیار کر لے۔ "ہوں۔ اس کا مطلب ہے تمہارا گھر نزدیک ہے!؟"

"کوائٹ نیئر۔ لیکن پہلے پرامس۔ آپ میرے ممی۔ پپا سے کچھ نہیں کہیں گی۔ پتا ہے میں آپ کو کیوں اتنا لائیک کر رہا ہوں۔ آپ بالکل میری ممی جیسی ہیں۔ بس میری ممی آپ سے ذرا بڑی ہیں۔ بہت اچھی ہیں ممی صرف وارننگ دیتی ہیں۔

"دیکھو شہپر مان جاؤ پپا سے بول دوں گی۔" لیکن بولتی نہیں ہیں۔" اس نے ماں کی نقل اتار کر بتایا۔

وہ بائیک لے کر آہستہ آہستہ چل پڑا تھا اور ہُما اس کے ساتھ ساتھ۔ وہ اتنی وزنی بائیک کو کھینچ رہا تھا اور ہُما کو ترس آ رہا تھا۔ "کتنی زیادتی کی ہے تم نے اپنے ساتھ۔" ساتھ ساتھ وہ خود بھی دیکھ رہی تھی کہ بائیک ادھر ادھر نہ جھول جائے۔

صرف ایک موڑ مڑنے کے بعد اور تھوڑا سا چلنے کے بعد وہ سیاہ گیٹ کے سامنے لے آیا تھا اور بڑی آہستگی سے اندر داخل ہوا۔ بائیک پورچ میں دیوار کے ساتھ لگائی اور پھر ہُما کو وہیں کھڑے رہنے کا اشارہ کر کے اندر غائب ہو گیا۔ چند لمحے بعد بائیں جانب بنے دروازے کی چٹخنی گرنے کی آواز آئی۔ اور دروازہ کھول کر شہپر نے ہُما کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحات کے لیے ہُما جھجکی پھر اندر چلی گئی۔

ان وہائٹ۔ اور میرون رنگوں کا خوبصورت ملاپ تھا ڈرائنگ روم میں۔ وہ میرون خوبصورت کدیوں والے صوفے کی طرف بڑھی اور اسی لمحے ملازمہ بھی اندر آئی تھی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' ہُما نے جواب دیا۔

''کون ہیں یہ چھوٹے مالک۔'' خورشید کی بیوی کی نظریں پُر شوق تھیں۔

''گیسٹ ہیں ہماری۔ ذرا ان کے لیے کولڈ ڈرنک لے آؤ۔ شہ پارہ کہاں ہے۔؟ اور ممی آ تو نہیں گئیں۔؟''

''پارو بی بی اپنے کمرے میں ہیں۔ بیگم صاحبہ تو نہیں آئیں آمنہ بی بی آ گئی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں بیگم صاحبہ ڈاکٹر باقر کے گھر چلی گئی ہیں۔''

''تھینکس گاڈ۔ اب تم جلدی سے کولڈ ڈرنک لے آؤ۔'' شہپر نے اپنے سفید ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ہُما مسکرا دی۔

تھوڑی دیر بعد خورشید کی بیوی چھوٹی سی ٹرے میں کولڈ ڈرنک لیے چلی آئی۔

''آپ جی۔ بیگم صاحبہ کی رشتہ دار ہیں۔؟'' اس نے بغور ہُما کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ لیکن تم نے مجھے ان کا رشتہ دار کیوں سمجھا؟'' ہُما نے گھونٹ بھرا۔

''آپ ان میں بہت مل رہی ہیں۔ بہت ہی۔ کیوں چھوٹے مالک۔؟'' اس نے شہپر سے بھی تائید چاہی۔

''ہوں۔ ہم نے انہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ یہ ہماری ممی میں بہت مل رہی ہیں۔''

''ہاں جی۔ بہت مل رہی ہیں۔ وہ پھر بولی۔

''ارے بھئی۔ شہپر۔ اب تو تمہاری ممی سے ملنے کو بہت ہی دل چاہ رہا ہے۔'' ہما کا اشتیاق بڑھ گیا۔

''آپ ان سے ضرور ملیے گا۔'' بہت اچھی ہیں میری ممی۔'' وہ بے نیازی سے ٹیبل پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔'' لیکن ان سے میری شکایت مت کیجیے گا۔ کیا آپ بینڈ یج کریں گی۔؟''

نہیں۔ ایسی کوئی خاص چوٹ نہیں آئی۔ ہُما نے انکار کر دیا۔

''کر لیجیے۔ پپا کہتے ہیں۔ ٹیٹنس ہو جاتا ہے۔'' اس نے اطلاع بہم پہنچائی۔

''بہت معلومات ہیں۔'' ہُما ہنس پڑی۔

''آئے دن گرتے جو رہتے ہیں چھوٹے مالک۔'' خورشید کی بیوی نے ٹکڑا لگایا۔

شہپر نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

''ارے بھئی۔ شہپر مہمان کو لے آئے اور ہمیں بتایا۔ یا۔ یا۔'' مس آمنہ ہُما کو دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔ بات ادھوری رہ گئی۔

''ہمارے پاس تو وائرلس ہے لیکن آپ کے پاس نہیں ہے ماما۔ پھر کیسے بتاتے۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''ارے بھئی انٹروڈکشن تو کراؤ۔'' وہ دونوں کو باری باری دیکھ کر بولیں۔

''یہ ہماری دوست ہیں ماما۔'' وہ شانِ استغنا سے گویا ہوا۔

''دوست۔؟'' آمنہ ہنس پڑیں۔ ''میں جان گئی ہوں۔ یقیناً میڈم کی رشتے دار ہیں۔'' ان کے لہجے میں اٹوٹ یقین تھا۔ سمجھ لیجیے۔ ان کی کسی شرارت کا رزلٹ ہے۔''

''وہ شرارت بھی تو پتا چلے۔ جس کا اتنا خوبصورت رزلٹ ہے۔''

شہپر نے ڈر کر ہُما کی شکل دیکھی۔

''ایسی کوئی خاص شرارت نہیں ہے۔ میں تو اسی بلاک کے ایک گھر میں اپنے دوست سے ملنے رہی تھی کہ۔

''کہ ہماری دوستی ہو گئی۔'' شہپر بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

''اچھا۔ اچھا۔ گرمی بہت ہو رہی ہے۔ اچھا کیا آ گئیں۔'' آمنہ بولیں۔

''شہپر کی ممی کب آ جائیں گی۔؟''

''وہ تو اب رات تک ہی آئیں گی۔ ان کی دوست انہیں لے گئی ہیں شام کا کھانا وہیں کھائیں گی۔ شام کو ان ڈرائیور آ کر بچوں کو بھی لے جائے گا۔ ان کی دوست کا ڈرائیور۔''

''اوہ۔ اس کا مطلب ہے آج ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' آمنہ نے معذرت کی۔

''اب تو لنچ کا وقت ہو چلا ہے۔ آپ شہپر کی دوست ہونے کے ناتے آج کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔''

''نہیں۔ بہت بہت شکریہ۔ میری دوست میرا انتظار کر رہی ہو گی...... میں شہپر کی ممی سے ملنے پھر آؤں گی۔''

''اچھا بھئی ننھے دوست۔ بہت بہت شکریہ۔ کولڈ ڈرنک اور ٹھنڈے ڈرائنگ روم کا۔''

ہُما نے شہپر کے رخسار چھوئے۔ ''خدا حافظ۔'' وہ باہر نکل گئی۔ پیچھے پیچھے مس آمنہ بھی۔ شہپر نے ریکارڈ پلیئر انگلش دھن لگا دی۔ اور ڈرائنگ روم کے دروازوں کے بولٹ گرا گرا اچھلنے کودنے لگا تھا۔

باہر سے مس آمنہ نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

سچ مچ ہُما کو بے انتہا اشتیاق ہو چلا تھا کہ وہ شہپر کی ممی کو دیکھے۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ اس کے پیپرز شروع ہو لیے۔ وہ تن من دھن کی بازی لگا کر میدان کارزار میں کود گئی۔ اس نے اپنی دوست نما خالہ کو البتہ ضرور بتا دیا تھا۔ کہ اس شہر میں اس کی ہم شکل بھی موجود ہیں۔ اس پر نگو نے کہا تھا۔

''تم تو خوبصورت ترین لوگوں میں شامل تھیں ہُما۔ اب مجھے ڈر ہے لوگ تمہیں ''عام'' شکل کی نہ کہنے لگیں۔ بی ثریا پھوپھو میں تم بہت ملتی ہو۔ گویا ایک تم ایک ثریا۔ دو۔ نمبر تین وہ موصوفہ جنہیں مانی بھائی نے امریکہ میں دیکھا۔ ہو گی یہ جن کا تم تذکرہ کر رہی ہو۔''

''میں بھی بے وقوف ہوں نگو خالہ اتنی دیر وہاں بیٹھ کر آ گئی۔ تصویر ہی دیکھ لیتی۔ یہ اشتیاق کی آگ تو کم ہو جاتی''

''ارے سنو جب تم جاؤ تو مجھے بھی لیتی جانا۔ مجھے بھی شوق ہو چلا ہے۔''

''کس چیز کا شوق آنٹی۔'' ہارون اندر چلا آیا۔

''ارے بھئی اس شہر میں ایک ہُما کی ہم شکل مل گئی ہیں۔''

''ہم شکل۔ ہم شکل سے کیا ہوتا ہے۔ مکمل ترین کاربن کاپی ہونا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں شرارت جھلکنے لگی تھی۔

''کاربن کاپی ہوتی بھی تو کیا ہوتا۔ تمہارے تو پھر بھی کسی کام کی نہیں تھی۔ گیارہ بارہ سال کا تو بچہ ہے ان کا۔'' نگو ہنس پڑی۔

''ارے ہُما۔ تم عائشہ کے ہاں جانے کا کہہ رہی تھیں۔ ہارون کے ساتھ چلی جاؤ۔ یہ بھی تو اسی طرف جائے گا۔ گاڑی لینے ایک ہفتے سے ورکشاپ میں ہے۔؟''

''اب تو شام ہو چلی ہے نگو خالہ۔ عائشہ بھی کلینک چلی گئی ہو گی۔ کل دیکھوں گی۔

''اور یہ تم پڑھتے پڑھتے کدھر چلیں۔''

''ممانی جان کب سے چمن میں اکیلی کام کر رہی ہیں ذرا انہیں دیکھنے جا رہی ہوں۔''

مثلاً یہ دیکھنے کہ وہ پسینے میں بھیگ کر زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ یا۔''

''ارے نہیں خالہ جانی۔'' ہما بے ساختہ مسکرا دی۔ ''بڑے اکیلے کام میں مصروف ہوں تو یہ چھوٹوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ بڑوں کا ہاتھ بٹائیں۔'' وہ بولی۔

''کتنی مبارک ہوتی ہے میری آمد۔ لوگوں کو فرائض یاد آ جاتا ہیں۔'' ہارون کے لبوں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی مسکرا اٹھی تھیں...... ہما سپاٹ چہرے کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔

''ہارون۔!''

''جی آنٹی۔''

''کیا مجھ میں سینیارٹی کی جھلک کہیں سے بھی نظر نہیں آتی۔؟''

''خیریت آنٹی۔'' ہارون حیران ہوا۔

''بھئی بچے میرے سامنے بڑے بے ادب رہتے ہیں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''سوری آنٹی۔ چلیں معاف کر دیں۔''

نگو نے ایک دھپ لگایا۔ ''جا کر گاڑی لاؤ۔ قسم کھا کر نکلی ہوں اپنی گاڑی ہی واپس ہوں گی۔''

آج۔ پھر وہی دن چکر کھا کر آ گیا ہے۔ ان کی شادی کا یادگار دن۔

''شہلا...... کل ہی کی تو بات لگتی ہے۔ تیرے سرخ ریشمی جوڑے کی سرسراہٹ ابھی تک معدوم نہیں ہوئی میں کسی بھی چیز کا زیاں برداشت نہیں کر سکتا۔

نہ وقت کا زیاں نہ وسائل کا۔ اور نہ جذبوں والفاظ کا۔ مجھے کسی بھی چیز کی قدر کھونا پسند نہیں۔

بہت ہارڈ اسٹون سا مرد تھا میں...... شہلا...... تو قطرہ قطرہ اس پر گری تھی۔

میں نے تیری سادگی سے غلط اندازہ لگایا۔ میں نے تو تیرے اعصاب پر چھانے میں پہل بلکہ بڑی جلدی کی تھی۔ میں سمجھتا تھا تیرے چہرے کی طرح تیرے دل کا ورق بھی سادہ ہے۔ میں نے بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر اس پر نام لکھنا چاہا تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ کوئی مجھ سے بھی بڑا جلد باز موجود ہے۔ میں اولیت پسند ہوں۔ اور میری اس پسند پر اعتراض کرنے کا کوئی حق کسی کو بھی حاصل نہیں۔

لوگ مجھ سے پوچھ کر معیار زندگی بناتے ہیں۔

تو پھر میں کیوں پیپلز کانشس ہو کر معیار زندگی بناؤں۔

میں نے کہا۔ تو اس کے راستے بند کر دے۔ تو نے اس کی سادگی پر دلائل دیے۔ میں نہیں بھول سکتا تیرے لہجے کی بیزاری۔ جو اس کی مخالفت پر ظاہر ہوتی تھی۔ میں نہیں بھول سکتا۔ تیرا وہ خوف سے سفید پڑتا چہرہ۔ جب میں نے اس کا آسمانی الفاظ کا شاہکار خط یونہی پڑھ لیا تھا۔

میں کیسے بھول جاؤں۔ اس نے تیری خاطر میری زندگی بچائی تھی۔

اور میں کیسے بھول جاؤں اس کا وہ پپا سا لہجہ۔ کہ ''ان کی وائف کیوں نہیں آئیں۔؟''

میری وائف سے زیادہ اسے وائف کی آمد کی فکر تھی...... شاید......

وہ مجھ سے عشق نہیں کرتا۔ اور میں اس کی شدتوں سے آنچ محسوس کرتا ہوں۔ تیرے انجان ہونے پر کیسے ...ن لے آتا۔

میں نے تجھے کیا نہیں دیا شہلا۔ محبت۔ دولت خوبصورت۔ بچے۔ تو نے مجھ ہی کو محروم رکھا۔ کتنی بدشکل ہوتی ...ہو کے باز عورت۔ کوئی پوچھے مجھ سے۔

میں اپنے عشق میں سچا تھا شہلا۔ تیرے چہرے پر اپنی محبت کے آثار! اپنے جنون کے افتخار۔ دیکھنے کا طلبگار ...یہ نہیں جانتا تھا کوئی پہل کر کے بازی جیت چکا تھا۔

وہ تیرا ماضی ہے۔

وہ تیرا ملال ہے۔

وہ تیری یادداشت ہے۔

جو چیز مل کر بھی نہیں ملتی۔ وہ سب سے اہم یادداشت ہوتی ہے۔ یہ بات مجھے زندگی نے آہستگی سے بتائی ہے۔

اپنے بچوں کی طرف دیکھتا ہوں تو تیرے وجود سے نفرت ٹوٹ کر ہونے لگتی ہے۔ پتا نہیں کس قدر موتی ہر ...ت ان کی آنکھوں سے ٹوٹے ہوں گے۔ ان کے تکیوں کو بھگوتے ہوں گے۔ کس قدر شگاف میری بچیوں کے قلب پر ...ں گے۔

جو ممکن ہوتا تو میں کبھی یہ ظلم اپنے بچوں پر نہ کرتا۔

لیکن۔ مجھے شکست برداشت نہیں۔ زندگی اور موت کا سوال بن گیا تھا۔ یہ مرحلہ۔ اب تو عمر کے اس مقام پر ...گیا ہوں۔ جو چیزیں اول تھیں اب ثانوی ہو گئی ہیں۔ میرے روم روم پر صرف دعا نقش ہے۔ کہ خدایا میرے بچوں کو ...اب کی اس شکل سے محفوظ و مامون رکھنا عمر بھر کی کمائی ہیں۔''

بدگمانی کے زہر میں بجھے ہوئے تیر اندھیرے میں چلتے رہے۔ ملال۔ تاسف۔ دکھ۔ محرومی۔ انا۔ احساس ...لت۔ احساس اولیت کی توہین۔ اور جانے کیا کیا نام نقش تھے ان تیروں پر۔

آج رات بہت دنوں بعد حسن کے بستر پر پھر کانچ توڑ کر بچھا دیا تھا۔ کسی نے۔

''آپ بیٹھیے۔ میڈم غسل سے فارغ ہو کر آتی ہیں۔'' مس آمنہ پُرتپاک انداز میں ہما کا استقبال کیا تھا۔

''شہپر کہاں ہے۔؟''

''دونوں بہن بھائیوں کو مسٹر ملک۔ شہپر کے پپا۔'' مس آمنہ نے رک کر وضاحت کی ''مسٹر ملک کے بڑے ...ئی لاہور لے گئے ہیں۔ ویسے تو ہم سب کا ہی جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن مسٹر ملک...... کو یہاں کراچی میں کچھ ضروری ...نمٹانا باقی ہیں۔ ان کی دادی بہت تڑپ رہی تھیں بچوں سے ملنے کے لیے۔''

اسی وقت ایک ڈھائی تین سال کا خوبصورت سا بچہ بے حد نفیس بابا سوٹ پہنے اندر چلا آیا۔ اور ہما کو دیکھ کر ...ٹھٹھک سا گیا اور مس آمنہ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ شہپر کا چھوٹا بھائی۔ شہریار۔ ہم اسے شیری کہتے ہیں۔''

''ہم سے بات نہیں کرو گے شیری۔'' ہما نے بچے کو اپنی جانب بلایا۔

''شہ پارہ اور شیری۔ شہپر کے مقابلے میں بہت پُرسکون اور امن پسند بچے ہیں۔

شہپر تو آگ کی طرح ہے جو آس پاس بھی حرارت پہنچائی رہتی ہے۔ بہت کیوٹ بہت جنٹیس بچہ ہے۔ پیدائش کے روز سب سے پہلے وہ میرے بازوؤں میں آیا تھا۔ ابتدائی پرورش میں صرف میں ہی شریک رہی ہوں۔ اس لیے کہ اس کی ممی بیمار ہو گئی تھیں۔ اس لیے اولاد سے بڑھ کر پیارا ہے مجھے۔"

"یعنی آپ شروع ہی سے ان لوگوں کے ہاں ہیں۔؟"

"خدا دونوں میاں بیوی کو سلامت رکھے۔ صرف ان لوگوں کی وجہ سے۔ کہ اتنے اچھے لوگ کم ہوتے ہیں ایک مستقل فیملی ممبر کی حیثیت ہے میری۔ مسٹر ملک بہت عزت افزائی کرتے ہیں۔ ہر بات میں مشورہ لیتے ہیں۔ بہت مہربان لوگ ہیں۔" مس آمنہ تشکر کے جذبات پر حاوی نہ ہو پا رہی تھیں۔

"دولت ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ آپ ان کے مزاج دیکھیں گی تو ایسے جیسے عام سے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ بلکہ مسٹر ملک تو پھر بھی بہت ٹیپ ٹاپ سے رہتے ہیں۔ اور ان کے گھر والے تو بہت ہی سادہ ہیں۔ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میری تقدیر بہت اچھی ہے جو ان لوگوں میں آ گئی۔"

"امریکہ میں کس جگہ رہتے ہیں آپ لوگ۔؟" ہُما نے بھی کچھ بات کرنا مناسب سمجھا۔

"ہیوسٹن میں۔"

"اچھا۔ پہلے میری چچا جان بھی ہیوسٹن میں ہوتے تھے پچھلے سال ہی واپس وطن آئے ہیں۔"

"ہاں جی...... کافی پاکستانی ہیں وہاں۔ عموماً شاپنگ کے دوران ہم وطنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔"

"لیجیے۔ میڈم آ گئیں۔"

"ہُما بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

زرد رنگ کے کرتے پاجامے میں ملبوس گلے میں ہم رنگ دوپٹہ اٹکائے۔ تراشیدہ بالوں والی۔ مسز ملک۔ اس کی پھوپھو۔ کیسے ہو سکتی تھیں......؟"

"ہرگز نہیں۔"

"نہیں یہ پھوپھو ہی ہیں۔ جن کے بازوؤں کی گرمی اب بھی اس کے وجود پر حاوی ہے۔"

"ارے توبہ۔ بالکل ہی دماغ چل گیا ہے میرا۔" اس نے سر جھٹکا۔

"یہ مسز ملک۔ یہ ثریا پھوپھو۔"

جب وہ گم ہوئی تھیں وہ تقریباً بارہ برس کی ہوش مند بچی تھی۔ اس کے ذہن میں طوفان سا اٹھ چکا تھا۔ تحیر۔ بحر بیکراں تھا جس میں وہ غوطہ زن تھی۔

☆☆☆

ثریا کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ہُما کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے...... آپ تو بہت پریشان سی ہو گئی ہیں...... خیریت......؟ کہیں آپ کی بھی کوئی رشتے دار میری شکل تو نہیں۔؟"

"میڈم۔ ان کے چکرانے کی اور وجہ ہے۔ یہ اپنی کاربن کاپی دیکھ کر چکرا گئی ہیں۔" آمنہ ہنس کر بولیں۔ رشتے دار کی کیا کہی آپ نے تو خود ہی آپ جیسی ہیں۔" وہ مزید بولیں۔

"پھر تو مجھے بھی ٹکرانا چاہیے تھا۔" ثریا ہنس پڑی اور اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "بھئ

میرے بیٹے نے تو میرے کان کھا لیے آپ کی باتیں کر کر کے۔ ممی۔ آپ جیسی ہیں وہ۔ ممی لائیک یُو۔" ثریا نے ہنس کر بتاتے ہوئے اپنے بال بھی پیچھے کیے۔

"اور میڈم یہ بھی تو بتا رہا تھا آپ کو کہ ممی...... ہر آئیز سیم لائیک یُو" (اس کی آنکھیں بالکل آپ جیسی ہیں) آمنہ بولیں۔

"جی ہاں۔" ثریا نے پھر ہنس کر تائید کی۔

اتنی دیر میں ہُما خود کو سنبھال چکی تھی۔ اس قدر گریس فل عورت...... امیر وطرحدار عورت...... انگریزی آشنا عورت...... اس کی پھوپھو کیسے ہو سکتی ہے۔

"سچ آنٹی آپ کو تو ہمارے گھر کا کوئی بھی فرد دیکھ کر چکرائے گا۔ آپ کے فیچرز (نقش) آپ کی ہائٹ۔ (قد) آپ کا فگر...... سچ آنٹی......" ہُما کے منہ سے الفاظ ٹوٹ کر نکلنے لگے۔

"آمنہ۔ وہ جو ہیوسٹن میں ساحرہ لوگ تھے میرا خیال ہے انہیں کے رشتے دار ہیں۔ ساحرہ کے میاں بھی بالکل ہُما کی طرح چکرا آ گئے تھے......" ثریا نے آمنہ سے پوچھا۔

ساحرہ کے نام پر ہما کے کام کھڑے ہوئے۔

"ہیوسٹن میں کس جگہ کا ذکر کر رہی ہیں......؟" ہُما نے پُرشوق انداز میں پوچھا۔

"الفریڈ گارڈن۔" آمنہ نے جلدی سے کہا۔

"پھر تو میری چچی جان کا ہی ذکر کر رہی ہیں۔ ساحرہ میری چچی جان اور امان میرے چچا جان ہیں۔"

"جی...... جی...... ان کا بیٹا بھی تھا پیارا سا سلمان۔" آمنہ کی یادداشت عود کر آئی۔

"جی ہاں...... اب تو ان کی بیٹی بھی ہے ردا...... اور اب تو وہ مستقل پاکستان آ چکے ہیں۔"

"کہاں رہتے ہیں......؟" آمنہ بے چین سی ہو گئیں۔

"وہیں کوئٹہ۔ ہمارے ساتھ ہی۔"

"کوئٹہ...... تو آپ کوئٹہ سے آئی ہوئی ہیں۔" آمنہ بولیں۔

"جی...... پڑھنے کے لیے مجبوراً۔"

"کیا پڑھتی ہو......؟ میرا مطلب ہے کس ایریا میں۔" ثریا کو مانی ساحرہ کے ذکر سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا وہ پڑھائی کی سمت آ گئی۔

"میرا میڈیکل کا آخری سال ہے۔؟"

"واہ لگتی تو بہت چھوٹی سی ہو۔" ثریا مسکرا پڑی اور مس آمنہ سے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرنے کو کہا۔

"ارے نہیں آنٹی...... کچھ نہیں...... بس میں تو آپ سے ملنے چلی آئی تھی۔"

"دیکھو...... اتنی چاہت سے آئی ہو تو فارمل مت ہو...... سنا......؟ آمنہ کہتی ہیں...... ملک۔ میرے شوہر......" ثریا نے رک کر وضاحت کی۔ "بہت فارمل ہیں اور میں ان کی الٹ ہوں۔ مجھے بے تکلفی ہی میں زندگی کا احساس ملتا ہے...... تکلف میں دم گھٹتا ہے میرا۔ میرے بیٹے کو پتا چلے گا تو کیا کہے گا کہ ممی آپ نے ہماری دوست کے ساتھ اس طرح ٹریٹ کیا......؟ پتا نہیں کیا کر رہا ہو گا۔" ثریا کو ایک دم بیٹا یاد آ گیا۔ "میں تو منع کر رہی تھی کہ بے انتہا شرارتی ہے لیکن...... خیر اب تو ہم بھی جا رہے ہیں۔"

سب جا رہے ہیں......؟'' ہُمانے ان کے صبیح چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔

(ہائے اللہ۔ اگر میری ثریا پھوپھو بالکل ایسی ہوتیں تو کتنا مزا آتا۔ ایسی گریس فل...... اتنی ہی ماڈ...... ایسی ہی بال بچوں (والی امیریکی میڈم)۔

''دیکھیں ملک آج آ کر بتائیں گے کب کی سیٹیں ملی ہیں۔''

''شہپر ہوتا تو کتنا مزا آتا۔'' ہُما بولی۔

''ہاں...... میرا بیٹا اسی طرح دیوانہ بنا دیتا ہے لوگوں کو......'' ثریا کے لہجے میں ایک غیر معمولی سے بچے کی ماں ہونے کا فخر سا اُمڈ آیا تھا۔ ''بچپن ہی سے بہت تیز ہے۔ ایک دم پک کر لیتا چار سال کا تھا اور بہت اچھی انگریزی جان گیا تھا...... حالانکہ آمنہ...... میں اور ملک بالکل خالص اردو بولتے تھے گھر میں...... ایک لفظ انگریزی نہیں بولتے تھے۔ اس کی وجہ سے میری زبان بھی خراب ہوگئی ہے۔ آدھی انگلش آدھی اردو۔''

ہمارے ہاں اس خرابی کو فیشن کہا جاتا ہے آنٹی...... آدھی انگلش نہیں تو تھوڑا بہت چھڑکاؤ تو لازمی ہے رعب ڈالنے کے لیے۔''

ہُمانے مسکرا کر بتایا تو ثریا بھی ہنس پڑی۔ اور بولی...... ''اچھا...... پھر تو مجھے احتیاط کرنا چاہیے...... کیوں ہُما......؟''

''آپ کو جائز ہے آنٹی آپ تو اب غالباً پچانوے فیصد امریکی ہیں۔''

''میرے بیٹے کے سامنے امریکی مت کہہ دیجیے گا۔ ملک کہتے ہیں کہ ہمیں چاہیے ہم اپنے بچوں کو خاص طور سے بتاتے رہیں کہ ہم پاکستانی ہیں۔ اور پاکستان لوٹ کر جائیں گے۔''

''مجھے اس گھرانے کے سربراہ کے خیالات سن کر بہت خوشی ہوئی۔''

''سربراہ سے مل کر اور زیادہ ہوگی۔'' آمنہ نے اندر داخل ہو کر ٹکڑا جوڑا۔ ان کے پیچھے۔ خورشید کی بیوی ٹرالی دھکیلتی اندر آ گئی۔

''کیا ملک آ گئے...؟'' ثریا چونکی۔

''جی...... ابھی ابھی آئے ہیں...... میں نے ان کو بتا دیا ہے کہ شہپر کی دوست آئی ہیں۔ آ رہے ہیں۔''

آمنہ ذرا دور جا کر بیٹھ گئیں کہ میڈم کے نزدیک اب ''سر'' نے بیٹھنا تھا۔

ثریا نے مدارات شروع کر دی۔

اسی دم نیوی بلیو پینٹ اور دھاری دار شرٹ میں ملبوس ڈھیلی گرہ کی ٹائی لٹکائے شہپر کے پپا اندر داخل ہوئے۔ ہُما بے ساختہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام۔'' ملک نواز کی آنکھوں میں تحیر سا تھا۔ ''شہپر کی دوست؟'' وہ تو ایک چھوٹی سی بچی کا تصور لے کر اندر بڑی بے نیازی سے آیا تھا۔ دوئم ثریا کی گہری شباہت پر وہ ٹھٹک سا گیا تھا۔

''بھئی...... مس آمنہ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ شہپر کی دوست......''

''دوست ہی سمجھیے سر...... شہپر انہیں بہت پسند کرتا ہے۔ ویسے ان کا تعارف۔ چلیے میڈم آپ کرائیے۔'' وہ رک گئیں۔ ''فیملی ڈاکٹر'' بنا لیتے۔ ملک نواز ثریا کی بات پر بے ساختہ مسکرا دیا۔ پھر ثریا نے مختصراً وہ حالات بتائے جن کے سبب ہُما کی شہپر سے دوستی ہوئی تھی۔

ہُمانے بڑی گہری نظر سے ملک نواز کو دیکھا تھا۔ بلاشبہ شہپر کے پپا کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ملک نواز کے خون چھلکاتے لب بہت دھیما مسکرا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ سیاہ گھور اور باوقار آنکھیں۔ کنپٹیوں پر کہیں کہیں سفید بال بھی جھلک رہے تھے۔ مونچھیں البتہ نفاست سے بنی ہوئی ایک دم سیاہ تھیں۔ ناک کی نوک اور ہونٹ سرخی چھلکا رہے تھے۔ اس پر بیٹھنے کا باوقار سا اسٹائل۔ بھاری انگلیوں والے مضبوط سے ہاتھ۔ بائیں ہاتھ میں کسی قیمتی پتھر کی چاندی کی انگوٹھی بھی تھی۔ ناخن چمکدار اور گلابی اور بہترین صحت کے غماز تھے۔ وہ اٹھ کے جانے لگا تھوڑی دیر بعد ہی۔

تب ہُمانے کہا۔

''بیٹھیے انکل چائے تو لیجیے۔''

''ضرور بیٹھتا۔ لیکن اس وقت مجھے سگار کی طلب ہے بچوں کے سامنے سگار نہیں پیتا...... اس لیے کہ آدھی توجہ سگار یا سگریٹ کی طرف ہو جاتی ہے اور نامکمل توجہ بچوں کی انسلٹ ہے۔'' کیسی گمبھیرتا تھی۔ کیا انداز تکلم تھا اور کیا صاف گوئی تھی وہ چلا گیا۔ لیکن وہ پھر بھی ڈرائنگ روم ہی میں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اچھا آنٹی اب اجازت۔'' ثریا نے حیران ہو کر دیکھا۔

''ارے اتنی جلدی......؟''

''بس آنٹی...... مجھے عائشہ کے ہاں بھی جانا ہے۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولی۔

''اچھا بھئی پھر آنا...... ناں...... میں اپنے بیٹے کو فون پر بتاؤں گی کہ میں اس کی دوست سے ملاقات کر چکی ہوں...... پہلے تو ہمارے گاؤں میں فون نہیں تھا۔ بہت پرابلم تھی۔ اب ہوسٹن سے بھی ہم کال کر لیتے ہیں۔ اماں جی...... بڑی ساس اور میری خالہ بھی ہیں۔ وہ بھی بہت مطمئن ہوگئی ہیں۔'' ثریا مسکرائی۔

''بڑے سیدھے سادھے لوگ ہیں میری سسرال والے۔ میرے جیٹھ کا زیادہ تر وقت شوگر مل ہی میں گزرتا ہے۔ گھر میں بس عورتیں ہی رہ جاتی ہیں...... سیدھی سادھی...... اب بھی ملک کی ہی کوششوں سے لگا ہے ورنہ۔'' ثریا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شہپر کو میرا پیار دیجیے گا آنٹی'' ہما باہر نکلتے ہوئے بولی۔

''اور ہاں گاؤں سے واپسی پر آپ ہماری نانی جان کے گھر ضرور آئیے گا۔ سب کو آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے اور آپ بھی ماما۔''

''کیوں نہیں......؟'' مس آمنہ مسکرا کر بولیں۔

ہمارے خوشگوار سے احساس کے ساتھ گیٹ سے باہر آئی تھی۔

ثریا شہ پارہ کے بال بنانے میں مصروف تھی۔

''ممی۔ میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی اور میں روئی بھی تھی۔'' پارہ نے بسور کر بتایا۔

''ارے میرا بیٹا...... یعنی دادی جان کو بہت پریشان کیا۔'' اس نے جھک کر بیٹی کا رخسار چوم لیا۔

''نہیں......'' شہ پارہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

''آپ روتی ہوں گی تو وہ پریشان ہوئی ہوں گی۔ ایسے نہیں کرتے بیٹے۔ آپ کو فون پر بتایا تھا ناں کہ ہم آ رہے ہیں؟''

شہ پارہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''پھر......؟'' آپ نے خود ہی تو ضد کی تھی شہپر کے ساتھ آنے کے لیے۔

اس نے شہ پارہ کی چھوٹی چھوٹی پونیاں بنادیں۔ اسی دم اماں جی اندر آئیں۔

''خیر نال۔ گلاں کرئی اے ماں دے نال میری دھی...... گتاں کیتیاں ہیں۔؟'' انہوں نے پوتی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا (باتیں کررہی ہے ماں کے ساتھ۔؟ چوٹیاں بنائی ہیں)

''آئیں بیٹھیں اماں جی...... پوچھ رہی تھی میں کہ آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ اس نے۔!''

''لے پریشانی کیہڑی۔ میری تو اکھاں دے تارے ہیں۔ رب اناں نوں لمی عمراں دے۔ صحت تندرستی دے نال۔'' (پریشانی کیسی...... میری تو آنکھوں کے تارے ہیں۔ خدا نہیں لمبی عمر دے۔ صحت تندرستی کے ساتھ) انہوں نے شہ پارہ کا سراپنے سینے سے لگالیا۔

''ہورتے خیر خیریت اے؟''

''جی اماں جی۔ ایک تو ملک کو کام اتنے پڑ جاتے ہیں کراچی میں۔ جانے کب کب کے جمع کیے ہوتے ہیں۔ ورنہ ہم تو اگلے دن ہی یہاں آجاتے۔''

''چل خیر بچے آگئے سن...... تسلی ہوگئی سی۔''

''ارے تم...... میری اماں جی کی تسلی کرارہی ہو۔ بالکل اچھی بات نہیں ہے ثریا۔'' ملک نواز گیلے بال تولیے سے رگڑتا اندر چلا آیا تھا۔

''جان دے پتر...... فرانے دن لا کے آیا اے۔ گیا تے انج سی کہ سن ای آیا۔'' (جانے دے بیٹے۔ پھر اتنے دن لگا کر آیا ہے۔ گیا ایسے تھا جیسے ابھی آیا)

''فضول ہے اماں جی...... یہاڈے میرے سکوے تو مکن گے نئیں...... عمراں لنگیاں۔ بک اُوای گل ہے تہاڈے کولوں (آپ کے میرے شکوے تو کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ عمریں گزر گئیں۔ ایک ہی بات ہے بس آپ کے پاس) اس نے شرارت سے مسکرا کر ماں سے کہا تھا۔ ثریا مبہوت سی ملک نواز دیکھ رہی تھی۔ پنجابی بولتا ہوا ملک اسے بہت بھایا تھا۔

''واہ آپ کو تو اماں جی کی زبان بھی آتی ہے۔'' وہ تعجب سے بولی تو ملک نواز اپنے قہقہے پر قابو نہ رکھ سکا۔

''جی ثریا بیگم...... بالکل اسی طرح جس طرح آپ کے بچوں کو آپ کی زبان آتی ہے۔''

ملکانی بھی ثریا کی بات مسکرادی تھیں۔

''یہ ثریا کی بولی تے مینوں چنگی طراں سمجھ آوندی اے۔ پر پتر شیر (شہپر) تے انگریزی بناچھڈ ناتوں۔'' اماں جی نے اظہار ناراضگی کیا۔

''کیا ہوا اماں جی......؟'' ملک نواز نے بالوں میں بہت سنبھل کر برش چلایا۔

''انگریزی بولدا اے میرے نال......'' وہ افسردگی سے بولیں تو ملک نواز بے ساختہ مسکرادیا۔

''ماحول کا اثر تو ہوتا ہی ہے اماں جی۔ اس کے ساتھ کھیلنے پڑھنے والے بچے سب ہی انگریز ہیں۔'' اس نے ماں کو سمجھایا۔

''تے مینوں تے انگریزی سمجھ نئیں آوندی ناں۔ (مجھے تو انگریزی سمجھ میں نہیں آتی)''

''میں اسے سمجھادوں گا کہ وہ آپ کے ساتھ انگریزی نہ بولا کرے۔'' اس نے ماں کو دلاسا دیا۔

''پپا...... وہ جو سامنے کا مکان ہے ناں...... ان کے لان میں بہت سارے گدھے ہیں۔'' شہپر ہانپتا ہوا ر آیا تھا اور باپ سے براہ راست مخاطب ہوا تھا۔

''میں نے تم سے کہا نہیں تھا ثریا۔ اسے مسٹر پال کے چھوٹے کان برے لگتے ہیں۔ لہٰذا گدھے بہت پسند ئیں گے تمہارے بیٹے کو......؟''

''پپا...... آئی وانٹ ٹو رائیڈنگ......'' اس نے گویا اجازت مانگی۔ (میں سواری کرنا چاہتا ہوں)

''گدھے پر......؟'' اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا...... اس نے تعجب سے شہپر کو دیکھا۔

''بی کاز...... ہیز اٹ لونگ ایئرز (کیوں کہ اس کے کان لمبے ہیں؟)'' ملک نواز کو یقین نہیں آیا تھا کہ اس کا ا ایسی احمقانہ خواہش بھی کرسکتا ہے۔

''پپا...... آپ یقین نہیں کریں گے۔ سامنے والوں کے ہاں سے ایک عورت گدھے پر خود بھی بیٹھی اور تین رتن کے بڑے بڑے ڈبے بھی رکھے اور ایک بہت۔ بہت بڑے بیگ (بوری لٹ واز فل آف وسم تھنگ (وہ کسی چیز ں ماں کے برابر میں بیٹھ گیا اور شہپر کا ہاتھ کھینچ کر اپنے برابر میں بٹھالیا۔

''شہپر...... دیکھو بیٹے...... ہر ایک کو کاپی نہیں کرنا چاہیے۔ ہر کام کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے۔ سمجھے؟ ں عورت کی تم بات کررہے ہو۔ وہ اس تھیلے (بیگ) میں بیج بھر کر تیل نکلوانے جارہی ہوگی۔ یہاں گاؤں میں پورز ریب) اسی طرح کے کام کرتے ہیں...... بڑے بڑے تھیلوں میں بیج بھر کر تیل نکلوانے جاتے ہیں۔ کچھ تیل بیچ دیتے ں۔ کچھ یوز (استعمال) کرلیتے ہیں۔''

''صرف آئل ہی پرچیز کرتے ہیں یہ غریب لوگ......؟'' اب شہپر کا ذہن دوسری طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ ں کے چہرے سے فکر اور سنجیدگی جھلکنے لگی تھی۔

''نہیں اور بھی بہت سے کام کرتے ہیں...... فارمز میں...... گارڈنز میں۔''

''پپا...... آئی فیل سم پیتھی فار دیم'' (میں ان سے ہمدردی محسوس کرتا ہوں)

ملک کا قلب جیسے اس نے مٹھی میں بھینچ لیا۔ اسے اپنے بے پناہ خوبصورت وحساس بیٹے پر بہت سا پیار آ یا۔ زندگی کی بہت سی تھکن اتر گئی۔ اسے خوشی ہوئی کہ اس کا بچہ اچھی فطرت کا حامل ہے۔

ثریا اور ملکانی دلچسپی سے باپ بیٹے کی گفتگو سن رہی تھیں۔

''اور ہاں بیٹے...... یہ دادا جان آپ کی شکایت کررہی تھیں۔''

شہپر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں...... اس نے گھبرا کر باپ کی شکل دیکھی۔

''دادی جان کہہ رہی تھیں کہ آپ ان سے انگریزی بولتے ہیں...... بیٹے آپ کوشش کیا کریں کہ پوری اردو ں دادی جان انگریزی نہیں سمجھتیں...... جو آدمی جو زبان آسانی سے سمجھتا ہو اس سے اسی زبان میں بات کرنا چاہیے۔ ار کنہیں ہیں بیٹے پاکستانی ہیں ہم...... وہاں تو ہمیں مجبوراً بولنا پڑتی ہے۔ اپنے گھر میں اپنی زبان بولتے ہیں شہپر۔''

''پپا...... آپ دادی جان کو انگلش سکھا دیجیے۔ میں HABITUAL (عادی) ہو چکا ہوں۔'' اس نے ری ظاہر کی۔

''انسان کو اپنی چیزوں کا عادی رہنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا نہیں۔ میں آپ کی ممی اور پاپا اردو بولتے ہیں۔

آپ ہمیں غور سے سنا کیجیے۔۔واچ کیجیے ہمیں۔دادی جان آپ سے باتیں کرنا چاہتی ہیں۔آپ انہیں انگلش سے ڈرا دیتے ہیں۔''

''دادی جان بھی تو مجھے پنجابی سے ڈرا دیتی ہیں۔'' وہ بسور کر بولا۔کمرے میں قہقہے بلند ہو گئے۔شہپر نے قطعی نوٹس نہیں لیا۔

''میں نے اظہر (رب نواز کا بیٹا) سے پوچھا تھا کہ دادی جان کون سی لینگو یج بولتی ہیں۔اس نے مجھے بتایا تھا کہ پنجابی زبان ہے۔'' اس نے وضاحت کر دی۔

''مگر دیکھیے وہ کوشش کر کے آپ کے ساتھ اردو بولتی ہیں ناں؟'' اس نے بیٹے سے پوچھا۔

''ہم دونوں ہی ایک جیسی اردو بولتے ہیں..... وہ پنجابی ملا دیتی ہیں اور میں انگلش۔'' اس نے ہار نہ مانی پھر ایک دلیل دی۔اس نے اس کم عمر سے بیٹے کی بے پناہ ذہانت کا اعتراف کیا۔اور اپنے ''ماضی کے'' اعتراف کی افادیت کا احساس کیا۔

''پھر بھی اردو بہت اچھی زبان ہے۔'' اس نے شہپر کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

''یس پپا..... مجھے یقین ہے..... اس لیے کہ آپ پپا ہیں اور پپا کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔'' اس نے بہت یقین سے کہا۔

ملک نواز کا دل بڑے زور سے دھڑکا تھا۔

''کیا اس کے بیٹے نے اسے اپنا آئیڈیل بنا لیا ہے؟''

اور جب بچے ماں باپ کو اپنا آئیڈیل بنا لیں۔تو والدین کو بے انداز محتاط ہو جانا چاہیے۔!

''جائیں بیٹے۔کھیلیں۔لیکن گدھے پر نہیں بیٹھنا۔'' اس نے تنبیہہ کی! وہ اچھل کر باہر نکل گیا۔اس کی تقلید مین شہ پارہ بھی باہر لپکی تھی۔

''دیکھیں اماں جی..... آپ کے سامنے ہی شہپر کو سمجھا دیا ہے..... کہ میری ماں کو انگلش سے نہ ستاؤ۔''

''خوش رہ پتر..... خوش رہ..... میرے لال.....'' وہ بمشکل خود کو سنبھال کر باہر چلی گئیں۔

''میں تو آج تک یہی سوچ رہی ہوں کہ مین آپ کو پسند بھی ہوں یا نہیں۔''

اس نے چونک کر دیکھا..... یہ ثریا..... اتنی گہرائی میں بھی جا سکتی ہے.....؟ اسے شاید اندازہ نہیں تھا۔

''کیا مطلب۔؟'' وہ ثریا کی بات کو مذاق میں نہ ٹال سکا۔

''مطلب یہ کہ ہمیشہ آپ کی بات ماننا پڑتی ہے۔کبھی مجبوراً کبھی شوق سے۔ضد کرتی ہوں تو آپ کے غصے سے ڈر لگتا ہے۔خیال آتا ہے آپ کو تکلیف نہ ہو۔آپ مجھے اچھے لگتے ہیں۔مجھے آپ سے محبت ہے تب ہی تو آپ کا خیال رکھتی ہوں۔آپ کی بات مانتی ہوں۔لیکن آپ کبھی میرے ساتھ اس طرح نہیں کرتے۔اس کا مطلب ہے آپ کو میری پروا نہیں ہے ناں۔؟''

وہ اس کے نزدیک چلا آیا۔اب جھوٹ پر جھوٹ بولنا تھا۔

''دنیا کی ہر چیز تمہیں حاصل ہے۔اور کیا چاہیے۔؟'' وہ اس پر جھک آیا۔

''آپ.....!'' اس نے بھی پلکوں کی جھالر گرا کر جواب دے ہی دیا۔

''میں تو ہوں تمہارے پاس۔''

''بہت مرتبہ محسوس ہوتا ہے کہ نہیں ہیں۔'' وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ جو کچھ بھی پھوار کر مانند کہتے ہیں وہ مجھ میں اتر نہیں پاتا۔لیکن وہ ان خیالات کو الفاظ نہ دے پائی۔

''بیوقوف ہو ثریا۔اتنے سالوں سے گزر ہو رہی ہے۔اور کسی کو دیکھا ہے میرے ساتھ؟'' (آہ میں خوش نصیب ہوں ثریا ... تو صاحب نظر و صاحب ادراک نہیں)

حق تو یہ ہے کہ میرے ساتھ شاید کچھ بھی نہیں۔سوائے .....؟

''ہما نے مجھ سے کہا کہ آپ اسے بہت اچھے لگے ہیں۔میں نے سوچا جو آپ سے ملتا ہے آپ کی تعریف کرتا ہے شاید آپ مغرور ہو گئے ہیں۔'' وہ سادگی سے بولی تو ملک نواز مسکرا دیا۔

''اچھا..... ؟''

''جی..... ! اور آپ نے دیکھا وہ کس قدر مجھ میں مل رہی تھی۔'' معاً ثریا کو یاد آیا۔

''ہاں..... میں تو دیکھ کر ہی ڈر گیا تھ۔'' وہ تکیہ اونچا کر کے لیٹ گیا تھا۔

''ڈر گئے تھے۔؟'' ثریا کو تعجب ہوا..... ''کیوں؟''

''ارے ایسے ہی کہہ رہا ہوں۔وہیں رہتی ہے ہما۔؟'' اس نے سرسری پوچھا۔

''نہیں۔پڑھنے آئی ہوئی ہے کراچی..... اپنی نانی کے ہاں رہتی ہے۔ماں باپ دادا چچا سب کوئٹہ میں رہتے ہیں..... ارے ہاں یاد آیا..... وہ مسز امان وغیرہ نہیں ملے تھے ہیوسٹن میں.....؟ وہی..... مس آمنہ کی دوست..... جن کے ہاں آپ نے مجھے جانے نہیں دیا تھا۔وہ ہما کے چچی چچا ہیں۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو.....؟'' وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹا۔

ثریا ہکا بکا اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔

''جی.....؟''

یک لمحے میں سارے تتلی کے پروں میں لگے رنگ جیسے سکھ اڑنچھو ہو گئے تھے۔

کتنی مرتبہ آئی ہے وہ.....؟''

دو مرتبہ۔پہلی مرتبہ شہپر ہی اسے لایا تھا۔دوسری مرتبہ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔''

''کیوں۔؟''

''شاید اس لیے کہ شہپر نے اسے بتایا تھا کہ آپ میری ممی جیسی ہیں۔''

''کچھ کہہ رہی تھی تمہیں دیکھ کر.....؟''

''بہت حیران ہو رہی تھی.....''

ثریا نے حیرانی سے اسے دیکھ کر بتایا۔

''ذرا مجھے ایک کپ چائے بنوا دو ثریا..... پلیز۔'' معاً اس نے خود پر قابو پا لیا۔

''تمہارا نام جانتی ہے.....؟'' اس نے جاتی ہوئی ثریا سے جانے کیوں پوچھا۔

''شاید نہیں۔خود ہی آنٹی کہہ رہی تھی۔شہپر ممی کہتا ہے۔آمنہ میڈم کہتی ہیں۔میرا نام تو اس نے پوچھا نہیں۔ایک بار وانی میں مسز ملک کہا تھا۔کیا اسے میرا نام نہیں جاننا چاہیے۔؟'' ثریا نے گہری نظروں سے ملک کو دیکھا۔

''ارے نہیں..... بھئی..... میں ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔

نام تو سب کو معلوم ہونا چاہیے۔'' اور یہ کہتے ہوئے وہ خود کو کوس رہا تھا کہ ہوش کی دنیا میں توارد سے پہلے اس نے اس کا نام کیوں نہ بدل دیا۔ اس طرح تو مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔

''کیا نئے سرے سے امتحان شروع ہونے والے......'' وہ الجھ گیا۔

''ملک......!'' ثریا کی آواز میں پریشانی ظاہر تھی۔

''ہوں......؟ اس نے چونک کر ثریا کی شکل دیکھی۔

''کیا بات۔ آپ شاحرہ لوگوں سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں۔؟ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ ان لوگوں کو جانتے ہیں تب ہی تو ان کا نام سن کر پریشان ہو جاتے ہیں۔'' وہ بولی۔

''ذہنی مریض ایک دم ٹھیک نہیں ہوتے۔ ان کی ذہنی حالت آہستہ آہستہ درست ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر مائیکل آرتھر کی آواز سے کہیں نزدیک سنائی دی۔

ثریا...... آج سے دس برس پہلے کی ثریا نہیں۔ مستقل ٹریٹ منٹ اور مجلسی زندگی اس پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ وہ سوچنا اور سوچ کر کسی نتیجے پر پہنچنا سیکھ چکی ہے۔ ملک...... اسے ابتدائی ہوشمند ثریا سمجھ کر تم غلطی کر رہے ہو۔ اب احتیاط کی بہت ضرورت ہے...... وہ سنبھل گیا۔

''ارے نہیں بھئی...... ایسی کوئی بات نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تمہارا علاج ہوا تھا ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ نئے لوگوں سے ملنے جلنے میں احتیاط کی ضرورت ہوگی۔ یعنی کوئی حیران کرنے والی بات۔ جھٹکا لگانے والی بات تمہارے لیے نقصان دہ ہوگی۔ اس لیے میں فکر مند ہو جاتا ہوں۔ بابا...... گھر بار والا آدمی ہوں۔ میرے گھر کی روشنی تم سے ہے۔ میں تو آئینے کی طرح تمہاری حفاظت کرتا ہوں۔ تم مجھ پر شک کرتی ہو یار...... بہت افسوس کی بات ہے۔'' وہ پھر اسٹیج پر اپنا کردار کھیلنے لگا۔

اظہار اپنائیت...... وہ بھی ملک کا...... وہ سب کچھ بھول گئی۔ جی چاہا اس کے چرن چھو لے۔ میرے گھر کی روشنی تم سے ہے۔ ایسا دلپذیر فقرہ وہ ملک کے منہ سے بار بار سننے کی متمنی تھی۔

اظہار محبت کا سلیقہ ہو تو مرد کی مردانگی کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

اور ایسے ہی رفیق سفر سے ایک عورت کی زندگی میں اطمینان آتا ہے۔ اس کے گھر کی دیواریں استحکام پکڑتی ہیں۔ اور ایسی ہی عورت ہنسی کے بہانے ڈھونڈتی ہے۔ ملک کے دم سے تو اس کی دنیا میں روشنی تھی۔

جس نے اسے معاشرے میں وہ باوقار مقام دیا تھا جس کے خواب ہر عورت دیکھتی ہے۔ ہر قسم کی آسائش۔ اور ٹوٹ کر چاہنے والے بچے...... شیشے پر بال آتے آتے پھر رہ گیا۔

''لو پیپر والے دن ہی سر نے غائب ہونا تھا۔'' ہما کو سخت بوریت ہوئی۔

''کیوں...... بہت زیادہ ''ہیلپ'' کی امید تھی۔'' نازیہ نے اسے چھیڑا۔

''ارے نہیں...... ہم دیانت دار استاد کے دیانت دار شاگرد ہیں۔'' وہ فخریہ مسکرائی۔

''اچھا......؟''

''ویسے ڈاکٹر جمشید جیسے استاد بھی کسی کسی کو میسر آتے ہیں۔ ہے ناں نازیہ؟''

''بالکل......'' نازیہ نے مکمل تائید کی۔

''ارے وہ شمع دیکھو آج پھر ''بازار'' سجائے بیٹھی ہے......؟'' نازیہ نے چونک کر کہا۔

''آؤ دیکھتے ہیں...... کیا بتا رہی ہے وہ ہاتھ دیکھ کر...... اس کی گپ سنتے ہیں۔''

''ہاتھ دیکھتی ہے شمع......؟'' ہما حیران ہوئی۔

''ہاں...... لڑکیوں کے ہاتھ دیکھتی ہے' لڑکوں کو دکھاتی ہے۔'' نازیہ ہنسی پھر بولی۔

''کیوں میڈیکل کے اسٹوڈنٹ کیا انسان نہیں ہوتے...... زندگی تو انہوں نے بھی کرنا ہوتی ہے۔ ان کی خواہشات اور انسانوں ہی کی طرح ہوتی ہیں۔''

''ار...... رے...... خیریت تو ہے۔ کیا تمہارا بھی دل چاہ رہا ہے ہاتھ دکھانے کو۔؟'' نازیہ نے کھوج لگائی۔

''ہاتھ دکھانے کو نہیں۔ لکیریں دکھانے کو۔'' ہما نے تصحیح کی۔

دونوں شمع کے نزدیک جا پہنچی ہو۔ اب ایک کمرہ کرائے پر لے لو۔ اور باہر بورڈ لگوا لو۔ جو چاہو سو پوچھو۔ پتھر سے پتھر دل محبوب آپ کے قدموں میں۔ نام کی ڈاکٹر کام کی نیم پروفیسر شمع اقبال۔''

تمام لڑکیاں نازیہ کی تقریر پر بے ساختہ ہنس پڑیں۔

ہما دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ باقی سب لڑکیاں ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔

''ذرا اچھی طرح دیکھنا۔ یہ آج کل بہت پریشان ہے۔'' نازیہ نے پھر ٹکڑا لگایا۔

''کیا سچ مچ ہما؟'' شمع نے اس کی گلابی ہتھیلی تھام لی۔

''ایسے ہی بکواس کر رہی ہے۔'' ہما جھینپ گئی۔

شمع نے اس کا ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا۔ سب لڑکیاں اس پر جھک آئیں۔

''تم بظاہر تو بہت پرسکون اور مطمئن نظر آتی ہو مگر درحقیقت تمہارا ذہن ہر وقت پریشان رہتا ہے۔''

''دو غلی......'' نازیہ نے ہما کی کمر پر دھپ مارا۔

''بہت زیادہ پریشان رہنے کی عادت ہے تمہاری۔''

''حالانکہ مشہور شاعرہ اس کی امی ہیں اور آٹوگراف کے لیے لوگ انہیں پریشان کرتے ہوں گے۔'' نازیہ کود پڑی ہما نے اسے گھور کر دیکھا۔

''بلکہ بچپن ہی سے تم پریشانیوں میں گھری رہی ہو۔''

ہما کا دل دھڑک گیا۔ (نہیں ہتھیلی پر یہ تو نہیں لکھا ہوتا کہ حاملن کے والدین اکیلے رہتے ہیں۔؟

''حالانکہ تمہارا ہاتھ ایک کامیابی۔ بھئی اس عمر میں ایسی ہی خوشخبریاں ملنی چاہئیں۔'' نازیہ عادت سے مجبور تھی۔ بول پڑی اور قہقہے بلند ہو گئے۔

''شمع مجھے بتا دو کہ یہ خوشخبری کس لکیر سے پڑھتے ہیں۔ میں اپنا ہاتھ خود پڑھ لوں گی۔'' نازیہ نے ان کے بیچ رگھسا دیا۔ لیکن شمع نے اپنی نظریں ہما کی ہتھیلی پر گاڑ دی تھیں۔

''تم خود کوئی بات پوچھنا چاہو تو پوچھو۔ ہو سکتا ہے۔ بعض باتیں میرے ذہن میں آ نہ آئیں۔'' شمع واقعی بڑی سنجیدگی سے ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

ہما کا دل اس کے سینے سے ٹکرانے لگا۔

وہ کتنی حقیقت پسند لڑکی ہے۔

لیکن عشق انسان کو توہم پرست بنا دیتا ہے۔

عاشق ٹونے منتر تلاشنے لگتا ہے۔ سینکڑوں واہمے اسے ہولایا کرتے ہیں۔

میرے ماں باپ علیحدہ رہتے ہیں۔

لیکن مجھ پر جان دیتے ہیں۔

میرے بھائی بہن مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔

میرے گھر میں کبھی مسائل زیر بحث نہیں آئے۔

میری سہیلیاں مجھے عاشقوں کی طرح پوجتی ہیں

دادا جان دعا دیتے تھکتے لگتے ہیں۔

لوگ میرے قد کی تعریف کرتے ہیں۔

میری آنکھوں کے سحر کا ذکر کرتے ہیں۔

میرے اساتذہ میری ذہانت کو تسلیم کرتے ہیں۔

پھر مجھے کیا کمی ہو سکتی ہے......؟

لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''ہر کمی'' مجھ ہی میں ہے۔

''شمع تم لرزتے ہاتھ سے سوال پانے کا ہنر کیوں نہیں سیکھ لیتیں۔؟ یہ بتاؤ...... محرومی کی لکیر کون سی ہوتی ہیں؟ یہ بتاؤ...... بے خبروں تک بات کس طور پہنچائی جاتی ہے......؟

یہ بھی بتاؤ...... واہموں کے توڑ کیا ہوتے ہیں۔ رسائی کیوں کر ممکن ہوتی ہے۔ شب کو اگر تکیے بھیگیں تو صبح کو ان کی نمی کہاں محفوظ کرتے ہیں......؟

پھر اس نمی کو مطلوب کے سامنے کیسے لے کر جاتے ہیں......؟

شمع یہ ضرور بتادو...... عشق کا انجام کیا سر میں خاک ڈال کر صحرا نوردی کو جانا ہی ہوتا ہے......

مجھے کسی عشق کی کامیابی کا قصہ سنا کر ڈھارس دے دو۔

میرا دل کانپتا رہتا ہے...... مجھے قرار کا ہنر دے دو۔

''تمہارا ہاتھ مجموعی طور پر بہت اچھا ہے ہما۔'' شمع اسے سوچوں کے جزیرے سے کھینچ لائی۔

''اچھا......؟'' اس نے چونک کر اچھا کہا جیسے یقین نہ آیا ہو۔

''اور کوئی خاص بات......؟''

''بس تم حساس بے پناہ ہو۔''

(تم نے میری امی کی شاعری پڑھی ہے۔ آخر میں انہی کی بیٹی ہوں۔ کیا کروں۔ کیسے دامن بچاؤں اس حساسیت سے۔؟ اس نے پھر سوچا......؟

''ارے بس......؟'' نازیہ حیران ہوئی...... ''یہ باتیں تو میں بغیر دیکھے ہی بتا سکتی تھی۔ بتا سکتی۔ تو پھر ظالم تم ہی سنگ آستاں کیوں ہو......؟

بھئی یہ تو بتاؤ...... وہ کب اترے گا چھم سے......؟ اس کے نام کا پہلا حرف کیا ہوگا۔ تاکہ اس حرف سے شروع ہونے والے ناموں کی خاطر ہما بغل میں رجسٹر دبا کر مردم شماری کو نکل کھڑی ہو...... مجھے تو کسی نے بتایا ہے کہ نازیہ تمہارے ''ان'' کا نام ''ف'' سے شروع ہوگا۔ میں نے کہا پھر تو کوئی ''فالتو'' ہی ہوگا۔''

''کاش ''ف'' کے بجائے ''پ'' سے شروع ہوتا تو کم از کم ''پالتو'' تو ہوتا۔'' شمع نے نازیہ کی بات کاٹ کر چھیڑا تو فلک شگاف قہقہے لگے۔

''بھئی...... ہمیں تو تمہاری دست شناسی نے قطعی متاثر نہیں کیا۔'' نازیہ منہ بنا کر کھڑی ہوگئی۔

''تمہارا کیا خیال ہے......؟'' اس نے ہما سے پوچھا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔'' ہما نے غائب دماغی سے جواب دیا تھا۔

''ارے بس چھوڑو۔ خوب دیکھی تمہاری حاضر دماغی۔ نام تک تو پوچھا نہیں اور ہوگئیں شروع...... ایسی تھیں شہپر کی ممی پیلے سوٹ میں اتنی کیوٹ لگ رہی تھیں مسز ملک...... وغیرہ وغیرہ......'' نگو جل کر بولیں۔

''سچ خالہ جانی...... مجھے تو بالکل دھیان نہیں رہا۔ کبھی میڈم...... کبھی مسز ملک کر کے ہی ان کا ذکر ہوتا رہا۔ یعنی یوں سمجھئے کام چلتا رہا......'' ہما واقعی شرمندہ تھی' متاسف بھی۔

''ارے بس چھوڑو...... سارا تجسس بلکہ کھوج خاک میں مل گیا۔ اب خدا معلوم کب لوٹیں وہ گاؤں سے...... ارے اتنا ہی سوچ لیا ہوتا کہ کچھ تو بے چاری کا اپنا ہوگا۔ ''مسز'' وہ ملک صاحب کی۔ چودھرانی وہ گاؤں کی۔ ماں وہ دولت ملک صاحب کا۔ بچے ملک صاحب کے۔ گھر ملک صاحب کا۔ کم از کم بے چاری کا نام تو اپنے ہوگا۔ یہی سوچ لیتیں تو کبھی نہ بھولیں۔'' نگو کو حد درجہ اشتیاق تھا کہ ''ہما'' کی رپورٹ کیا کہہ رہی ہے۔ وہاں سرے سے نام ہی گول تھا۔

''آپ آخر اس خوش فہمی میں مبتلا کیوں ہیں کہ ثریا پھوپھو درست دماغی حالت کے ساتھ مل جائیں گی۔ اگر ان کا نام ثریا بھی ہو تو وہ ثریا پھوپھو پھر بھی نہیں ہو سکتیں۔

ہما کو خالہ بے قراری پر کوفت سی ہوئی تھی۔ ہر چند کہ افسوس اسے بھی تھا کہ اس نے نام کیوں نہ پوچھا۔

''ارے واہ۔ یہ تم ہی ہو۔ جو ثریا کی سیم کاپی دیکھ کر اطمینان سے بیٹھی ہو۔ مجھے تو چین نہ آتا جب تک میں ان کے اگلے پچھلے شجرے نہ کھلوا لیتی۔'' نگو' بڑی قطعیت سے بولیں۔ ''حد ہوتی ہے مماثلت کی۔ ٹھیک ہے بعض انسان ایک دوسرے کی شبیہ مارتے ہیں۔ مگر تھوڑا بہت فرق تو جڑواں ہم شکلوں میں بھی ہوتا ہے۔''

''میں نے آپ کی یہ دلیل تسلیم کی۔ لیکن یہ بھی خیال رہے...... ہماری پھوپھو جان اپنا آپ سنبھالنے کے قابل بھی نہیں تھیں۔ کجا کہ اتنی بڑی گھر داری...... آپ اگر کبھی مل گئیں ناں...... سچ شرمندہ کروادیں گی۔ خالہ جانی۔'' ہما نے مسکرا کر خدشہ ظاہر کیا۔

''ارے تو نری پاگل تو نہیں تھیں ثریا۔ اور نہ ہی خطرناک ذہنی مریضہ۔ کوئٹہ جاؤ تو ان کی پرانی میڈیکل رپورٹ دیکھنا جن میں لکھا ہے کامیابی کے ننانوے فیصد چانسز ہیں...... ڈاکٹرز کا کہنا تھا اگر بچپن میں آپریشن وغیرہ کیا گیا تو خطرناک ہو سکتا ہے...... لہٰذا سن بلوغت کے بعد ہی آپریشن وغیرہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ تو گھر والوں کی وجہ سے التوا میں پڑتا رہا معاملہ ورنہ تو تمہاری مسز ملک کی طرح ہی ہوتیں ثریا۔'' نگو نے بھانجی کو مضبوط انداز میں سمجھایا......!

''وہ تو ٹھیک ہے خالہ جانی...... لیکن یہ بھی سوچئے۔ آج کل لوگوں کو عیادت کا وقت تو ملتا نہیں...... کسی اجنبی اور انجان لڑکی کا علاج کوئی دوسرا کیسے کرا سکتا ہے۔ جس میں ٹائم ہی نہیں کثیر رقم بھی درکار ہو۔'' اس نے کتاب میز پر رکھ دی۔

''شاید کوئی اللہ کا نیک بندہ۔'' نگو کو جانے کیسی آس تھی۔

''آج کی دنیا میں کوئی اتنا فارغ نہیں...... ایک ہی کام ہو سکتا ہے ایک وقت میں یا تو وہ نیکیاں کر کے اللہ کا

بندہ بن جائے یا پھر کسی ذہنی مریض کا علاج کرا دے۔ بیک وقت یہ دونوں کام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔"

ہما خالہ کے پاس آ کر لیٹ گئی۔ خالہ جانی ایسے کرتے ہیں۔ مسز ملک کو ثریا پھوپھو بنا لیتے ہیں۔"

"تم مذاق سمجھ رہی ہو ہما...... میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہی ہو کہ کوئی کسی میں اس حد تک مل سکتا ہے۔ ناممکن۔ خود ہی تم کہہ رہی ہو ذرا فرق نہیں۔"

"جی خالہ جانی...... درست...... ذرا فرق نہیں ہے۔ اور سب سے بڑا فرق بھی ہے وہ یہ کہ مسز ملک ایک آسودہ معزز صحیح الدماغ اور بہت نفیس خاتون ہیں۔" اس نے خالہ کے گرد بازو حمائل کر دیے۔

"اچھا بھئی۔ میں ہاری تم جیتیں...... بس تم مجھے ان سے ضرور ملوانا خواہ کچھ ہو۔"

"بہتر...... ویسے خالہ جانی مزا نہیں آیا اس جیت میں۔ خالص زبردستی کا سودا لگ رہا ہے۔ ذہن تو آپ کا ابھی بھی وہیں ہے......"

"بہت شیطان ہے تو ہما......" نگو ہنس دیں اور جھک کر ہما کی پیشانی چوم لی۔

"کوئی نہیں ہے گھر میں......؟"

ہارون کی آواز پر ہما سنبھل کر بیٹھ گئی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

"فرمائیے۔" ناچار اس نے کہا۔

"آنٹی کہاں ہیں......؟"

"کھانا چاہیے؟" ہما کی آواز خشک تھی۔

"دنیا میں با مقصد لوگ کھانے کو درجہ دوئم کے خانے میں رکھتے ہیں۔ یعنی جینے کے لیے کھاتے ہیں۔ اور یہ آپ کو صرف ایک ہی بات یاد آتی ہے یعنی کھانے کی۔ مجھے تو آپ ڈاکٹر کے بجائے کسی ہوٹل کی ویٹرس لگتی ہیں۔ جہاں آنٹی کا پوچھا۔ آپ کی طرف سے اس قسم کا سوال آیا۔ یہ کام کرنے کے لیے گھر میں نوکر موجود ہیں۔ میں اور آنٹی محض غذا کی ڈور سے نہیں بندھے ہوئے ہیں۔

کھانا ہی ضروری نہیں ربط باہمی کے لیے
کچھ اور بھی چاہیے اے دوست دوستی کے لیے

وہ دروازے کی چوکھٹ تھامے شرارت سے گنگنایا۔ ہما بے ساختہ مسکرا دی۔ اس کے خیال میں شعر غالباً یوں تھا۔

خلوص دل ہی نہیں کافی ربط باہمی کے لیے
وفا بھی شرط ہے اے دوست دوستی کے لیے

اسے بھی سرسری سا یاد آیا تھا۔

"آنٹی تو نانی جان کے ہاں گئی ہوئی ہیں......" ہما...... اسی طرح رخ موڑے موڑے بولی تھی۔

"یہ آپ کو وہاں سے لا کر خود کیوں چلی جاتی ہیں آنٹی......؟" ہارون کو اچنبھا ہوا۔

"مرضی ان کی......" وہ تنک کر بولی۔

"بہر حال مجھے حیرانی ہے...... حالانکہ انہیں پتا تھا کہ شام کو میری فلائٹ ہے۔ شاید آپ کے بھروت ہو گئی۔ مجھے......" اس نے نچلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ روکی۔

"میں آپ کی بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔" ہما کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"بھئی۔ ایسی جوئی پہیلی تو نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ میرا سوٹ کیس تیار نہیں ہے اور میری پریشانی قدرتی ہے۔"

"سوٹ کیس تیار کرنا بہت بڑا معرکہ تو نہیں......" ہما نے جھک کر چپل ٹٹولی۔

"چلیے...... میں تیار کر دیتی ہوں آپ کا سوٹ کیس۔"

ہارون نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ "آپ یہ مہربانی کریں گی۔ یقین نہیں آتا۔"

"جب میں سوٹ کیس آپ کے ہاتھ میں تھما دوں گی تو خود بخود یقین آ جائے گا۔"

"اوہ......" اس نے چوکھٹ چھوڑ کر راستہ دیا۔ "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ سوٹ کیس کے ساتھ میری روانگی کا تصور کس قدر سکون بخش ہے...... پھر بھی...... بہر حال...... پیشگی شکریہ۔"

ہما نے اپنا چہرہ ہر تاثر سے عاری کر رکھا تھا۔ وہ بڑی خود اعتمادی سے اس کے بیڈ روم میں چلی آئی تھی۔

"آپ کپڑے منتخب کر لیجیے۔ میں سوٹ کیس میں لگا دوں گی۔" اس نے پلٹ کر ہارون سے کہا۔

"کاش میں ہفتے میں تین دن سفر کے لیے روانہ ہوا کروں......" وہ صرف سوچ کر ہی رہ گیا۔ "اور آنٹی میرا سوٹ کیس نامکمل چھوڑ کر چلی جایا کریں...... اور گھر میں صرف وہی ہو...... جواب ہے۔" وہ وارڈ روب کی سمت بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

"مس آمنہ......؟"

"بول رہی ہوں سر...... السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام...... ٹھیک ہیں آپ......؟"

"جی سر۔ خدا کا شکر ہے۔ دو دن بھائی کے ہاں رہی تھی پھر واپس آ گئی تھی۔ آپ لوگ کب واپس آ رہے ہیں......؟"

"فی الحال نہیں آ رہے۔ اس مرتبہ میرا ارادہ ہے بچوں کو پہاڑی مقامات پر لے جاؤں۔ تاکہ وہ بھی دیکھیں کہ ان کے وطن میں سب کچھ ہے۔ کراچی اور گاؤں کے علاوہ بھی۔"

"جی سر......!"

"مس آمنہ! میں نے بطور خاص فون کیا ہے......" اس کی گمبھیر آواز پیس میں ابھری۔

"میں ہمہ تن گوش ہوں سر......"

"وہ جو اس دن بچی آئی تھی...... شہیر کی دوست...... کیا نام تھا بھئی اس کا......؟" وہ الجھا۔

"ظل ہما سر......"

"ہوں...... کیا وہ ہمارے بلاک میں ہی رہتی ہیں۔ میرا مطلب آج کل ان کی رہائش......"

"نہیں سر...... اس بلاک میں تو ان کی دوست رہتی ہیں...... وہ تو......"

"اچھا اچھا...... مس آمنہ...... بات یہ ہے کہ مجھے اجنبی لوگوں سے ایک دم گھلنا ملنا پسند نہیں۔ اور خاص طور پر بچوں کے معاملے میں میں بہت محتاط ہوں۔"

"سر! وہ تو بہت اچھے گھرانے کی......"

"مس آمنہ......!" اس کے لہجے میں ترشی آ گئی۔

"میں سمجھ رہی ہوں سر...... لیکن آپ کے علم میں نہیں...... وہ ہیوسٹن میں مسٹر امان......"

"مجھے افسوس ہے مس آمنہ! میں آپ کے علم سے فائدہ اٹھانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" اس کا لہجہ پھر خشک ہو چلا تھا۔

"میں نے آپ کی خدمات اس لیے حاصل کی تھیں کہ آپ ثریا اور بچوں کی بہترین معاون اور نگراں ثابت ہوں گی۔"

"کیا آپ کو مایوسی ہوئی ہے سر......؟" ان کی آواز شکستہ سی ہوگئی۔

"ابھی تک تو نہیں ہوئی......"

"آپ بے فکر رہیئے سر...... آیندہ اجنبی لوگوں سے ملتے وقت احتیاط کی جائے گی۔"

"گڈ...... بات یہ ہے مس آمنہ...... نئے لوگ ثریا کے لیے پریشانی پیدا کر سکتے ہیں۔ خدا کی مہربانی سے انہیں ایک نئی زندگی ملی ہے۔ پچھلے واقعات ان کے حافظے میں محفوظ نہیں ہیں۔ لوگوں کی بیکار باتوں سے ان کا ذہن دوبارہ متاثر ہوسکتا ہے۔" اب اس سے سنبھل کر اپنی پوزیشن صاف کی۔

"میں سمجھتی ہوں سر۔"

"اور صرف یہ ہی نہیں کہ مسز امان یا ہما سے دور رکھا جائے...... بلکہ ہر اجنبی اور ناواقف شخص جو ثریا کی ذہنی بیماری سے لاعلم ہو ثریا سے دور رہنا چاہیے۔"

امال سرد پڑنے پر ملک کو احساس ہوا تھا کہ مس آمنہ شک و شبے میں پڑ سکتی ہیں کہ میں مسز امان کے گھرانے کے بارے میں اتنا کانشس کیوں ہو جاتا ہوں۔ لہٰذا اس نے وضاحت ضروری سمجھی۔

"آپ درست کہہ رہے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ آمنہ اس وضاحت سے مطمئن ہوگئی تھیں۔ وگرنہ ان کا ذہن بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

"اور کوئی بات سر......؟"

"نہیں بس اور کچھ نہیں...... خورشید کی بیوی کیسی ہے؟ ثریا بتا رہی تھیں کہ وہ بیمار ہے۔"

"اب تو کافی ٹھیک ہیں۔"

"اچھا بھئی...... او۔ کے......" ملک کی طرف سے ریسیور رکھنے کی واضح آواز آئی تھی۔

"کون آیا ہے خورشید......؟" آمنہ نے کچھ آوازیں سن کر کچن ہی میں سے پوچھا۔

"ایک تو چھوٹے مالک کی سہیلی ہیں بی بی اور ان کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔"

آمنہ نے لمحاتی توقف کیا...... پھر بولیں۔ "بٹھاؤ انہیں......"

"آپ آ رہی ہیں بی بی......؟"

"ہاں میں آ رہی ہوں...... تم انہیں بیٹھنے کو تو کہو......" وہ جھنجھلا گئیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں تو ہما کے چہرے ہی کھل سی گئیں۔ اور "سر" کی ہدایات فراموش کر بیٹھیں۔

"السلام وعلیکم......!" ہما نے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام......" کہتے ہوئے انہوں نے ہما کی ساتھی کو دیکھا۔ سفید رنگت والی خاتون بالکل سیاہ پلین قیمتی جارجٹ کی ساڑھی باندھے ہوئے تھیں۔ بال جوڑے کی شکل میں سمٹے ہوئے ہے۔ بازوؤں مین سونے کی چوڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ نہ کانوں میں کچھ تھا...... اور نہ گلے میں......"

"یہ میری خالہ جانی ہیں۔ نگہت......!" ہما نے مس آمنہ کو انہماک سے جائزہ لینے میں مصروف پایا تو رفع الجھن کی خاطر جھٹ متعارف کرا دیا۔

"اچھا......!" آمنہ خوشی سے مسکرائیں۔ "خوشی ہوئی آپ کی آمد پر......"

"بھئی ہماری ہما تو بہت امپریس ہے اس فیملی سے...... اور ہمیں کوئی اعتراض بھی نہیں۔" نگہت بولیں۔ تو وہ مس آمنہ کو خاصی دلچسپ لگیں۔

"ہم تو مسز ملک کی کھوج میں آئے ہیں۔ سنا ہے وہ ہماری ہما میں بہت ملتی ہیں۔ تعجب زیادہ نہیں ہے مگر ہے۔ اس لیے کہ ایک ہی فیملی میں دو افراد کے مابین خاصی مشابہت ہوسکتی ہے۔ لیکن دو الگ الگ خاندانوں میں مشابہت خاصی دلچسپ لگتی ہے۔

"کیوں......؟" نگہت نے مس آمنہ سے تائید چاہی۔

"جی ہاں پہلے دن تو میں واقعی بہت حیران ہوئی تھی۔ بلکہ بہت دلچسپ لگا تھا...... دراصل ہما کی اور مسز ملک کی آنکھیں ایک جیسی اس وجہ سے شاید......"

"اب خدارا ملا یئے بھی......" نگہت بے چین تھیں۔

آمنہ نے بے تکلف خاتون کی بے صبری ملاحظہ کی پھر بولیں۔

"آپ کا شوق انتظار...... مٹ نہ سکے گا۔ اس لیے کہ وہ لوگ ابھی تک نہیں آئے اور نہ آنے کا ارادہ ہے فی الحال......"

"اوہ اچھا چلیں آج ان کی تصویروں ہی سے بہل جائیں گے......" نگہت سوچ کر بولیں۔

"اتفاق کی بات ہے کہ تمام البمز ہیوسٹن ہی میں ہیں...... ہاں کچھ تصویریں ہیں یہاں......" آمنہ کو یاد آیا شہپر کی تیسری برتھ ڈے یہیں کراچی ہی میں منائی تھی۔

"میں تلاش کر کے لاتی ہوں......" وہ باہر نکل گئیں۔

"ارے مجھے تو یہ لوگ گھر سے بالکل ہی فارغ لگتے ہیں...... اتنی طویل سیر و تفریح......" نگہت کو درحقیقت بے حد کوفت ہوئی تھی ثریا کو نہ پا کر...... لہٰذا تیوریاں چڑھا کر بولی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد آمنہ ایک سفید لفافہ لیے اندر داخل ہوئیں۔

"پہلے تو آپ مسٹر اور مسز ملک کی صورت سے آشنا ہو جایئے پھر باقی تصادیر دیکھنے کا مزا آئے گا۔" انہوں نے ایک تصویر نگہت کی طرف بڑھائی۔

ہما ٹھیک کہہ رہی تھی۔ واقعی ثریا بے حد مشابہہ ضرور تھیں۔ لیکن ایک نفاست تھی جو ان کے وجود کے ہر حصے سے ہویدا تھی۔ بلا کی آسودگی اور اطمینان جسے دیکھ کر خوانخواہ رشک آئے۔

ملک صاحب کو دیکھ کر نگہت واقعی ثریا ٹھٹھک گئیں...... بھرپور مردانگی کا شہکار اثر انگیز شخصیت کے حامل لگے تھے...... ملک صاحب...... نک سک سے درست بے حد پر تکلف سے...... تصویر میں وہ اپنی بیگم کی جانب متوجہ تھے۔ جو منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکنے میں مصروف تھیں۔ ان کی اس ادا سے ایک دلکش پوز ہمیشہ کے لیے مقید ہوگیا تھا۔

ایک جگہ وہ شہپر کو جھک کر چھری تھما رہی تھیں۔ اور دوسری تصویر میں کیک کاٹنے میں مدد کر رہی تھیں۔ ان کے تراشیدہ اور خمیدہ زلفوں کے لچھے شانوں پر جھک آئے تھے۔

عنابی سلیولیس مختصر سے بلاؤز اور نفیس کام کی ہمرنگ ساڑھی میں ان کے کئی دلکش پوز محفوظ تھے۔ ایک تصویر مسٹر اور مسز ملک کی غالباً لان میں بنی تھی۔ ملک صاحب کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور مسز ملک چھوٹا سا نفیس پرس سینے سے لگائے کھڑی تھیں۔

"ان کا فگر بڑے غضب کا ہے......" نگہت بے ساختہ بولیں۔

''بہت محتاط ہیں مسٹر ملک اپنے بارے میں اپنے بیوی بچوں کے بارے میں یقین کیجیے۔ مسز ملک صرف ملک صاحب کی خوشنودی کی خاطر اس قدر اہتمام سے ڈریس اپ ہوتی ہیں ورنہ بہت لاپروا ہیں۔ ان کا لباس ملک صاحب کی پسند سے تیار ہوتا ہے۔''

''ارے...... اسقدر انوالو ہیں......'' نگہت کو حیرت ہوئی۔

''بے حد...... وہ کہتے ہیں مجھ سے وابستہ ہر شخص کو میرے معیار تک پہنچنا چاہیے۔'' آمنہ نے مزید بتایا۔

''واہ...... ایک ہمارے میاں ہیں۔ ہم خوب سج بن کر آنکھوں کے سامنے سے سو بار بھی گزر جائیں تو وہ سراغ نہ لگا پائیں کہ ہم ایسا کیوں کر رہے ہیں۔''

ہما اور آمنہ نگہت کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑیں۔

''یہ ان کے ساتھ کون ہیں......؟ عینک لگائے ہوئے......'' نگہت نے آمنہ سے پوچھا۔

''یہ مسز باقر ہیں...... ڈاکٹر باقر بہت مشہور معالج اور سائیکو جسٹ ہیں اور ملک صاحب کے بہت اچھے دوست ہیں۔''

''اچھا...... اچھا......!''

''بلکہ ڈاکٹر باقر ہی کے ذریعے میں ملک صاحب سے متعارف ہوئی۔''

''آپ پہلے...... ڈاکٹر باقر کے ہاں کام کرتی تھیں......؟''

''جی...... ان کے ہاسپٹل میں...... میں نرس تھی وہاں......''

''اچھا......!'' نگہت بدستور تصاویر میں مگن تھیں۔

''آپ نرسنگ چھوڑ کر ملک صاحب کے پاس کیوں آ گئیں......؟'' ہما نے دریافت کیا۔

''کیا بیماری تھی انہیں......؟''

''(مس آمنہ آپ کسی کو از خود کبھی نہیں بتائیں گی کہ ثریا ذہنی مریض رہ چکی ہیں۔)'' بر وقت انہیں مسٹر ملک کی بہت پہلے کی گئی تنبیہہ یاد آ گئی......

وہ سنبھل گئیں۔

''ایسے ہی معمولی بیمار تھیں...... بس ڈیلیوری سخت تھا...... وہیں شہپر ہوا...... اور پہلے پہل میرے بازوؤں میں آیا۔''

''یعنی بہت پرانا تعلق ہے آپ کا......؟'' نگہت نے ایک تصویر پر نظریں ٹکا دیں۔ یہ شہپر کی حالیہ تصویر تھی۔ وہ اپنے باپ کے بازو کے گھیرے میں دل کھول کر مسکرا رہا تھا اور اس قدر خوبصورت لگ رہا تھا کہ نگہت مبہوت سی تکتی رہ گئیں۔

''خالہ جانی پہلی فرصت میں نام پوچھ لیجیے...... بھول جائیں گی پھر...... گھر جا کر ڈانٹیں گی......'' ہما نے نگہت کو ٹہوکا دیا۔ نگہت کو واقعی یاد آ گیا......

''ارے ہاں...... نام تو ابھی تک پتا ہی نہ چلا۔''

''ان کا نام ملک نواز ہے......'' چونکہ نگہت ملک نواز کی تصویر لے کر بیٹھی ہوئی تھیں اس لیے آمنہ یہی سمجھیں کہ وہ ''سر'' کا نام پوچھ رہی ہیں۔

''ارے نہیں...... میں تو مسز ملک کا نام پوچھ رہی ہوں۔'' نگہت جلدی سے بات کاٹ کر بولیں۔

''اچھا...... میڈم کا نام...... ثریا ملک نواز ہے جی ان کا نام......'' انہوں نے بتایا۔

''اوہ میرے خدا......!'' ہما اور نگہت دونوں اپنی اپنی جگہ ساکت سی رہ گئیں۔

''ویسے ان کے کاغذات میں تو صرف ثریا ملک ہی لکھا ہوتا ہے۔ ہیں یہ آپ دونوں کو کیا ہو گیا......؟'' آمنہ بں دم بخود بیٹھا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

''شکلوں میں تو مشابہت سی تھی...... لیکن ناموں کی یکسانیت......''

''میں...... مسٹر ملک سے ملنا چاہوں گی......'' نگہت کی آواز میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔

''اب تو بہت مشکل ہے...... ویسے آپ مجھے فون نمبر دے جائیے۔ سر آئیں گے تو میں اطلاع کر دوں گی۔ لیکن مجھے آپ کی یہ بدلتی کیفیت سمجھ نہیں آئی۔''

''آپ لوگ کتنے عرصے سے ہیں امریکہ میں......؟'' نگہت اب خود پر قابو پا چکی تھیں۔

''میں تو بارہ سال سے ہوں لیکن مسٹر ملک اور میڈم تو بہت پہلے سے وہیں تھے۔''

''یعنی دونوں میاں بیوی......؟''

''جی ہاں دونوں شاید انہیں تو وہاں سترہ اٹھارہ سال یا اس سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔''

''شہپر ان کی پہلی اولاد ہے......؟''

''جی ہاں......!'' اب آمنہ پریشان ہو رہی تھیں۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے شاید ان کے ہاں شادی کے کافی عرصے بعد شہپر ہوا تھا۔''

نگہت کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیل چکے تھے۔

''مسز ملک کزن ہوتی ہیں ملک صاحب کی......؟''

''جی ہاں بہت ہی قریبی کزن...... سگی خالہ کی بیٹی ہیں۔''

نگہت نے تصاویر میز پر ڈال دیں...... ان کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا گویا کہہ رہی ہوں...... ناحق وقت برباد کیا...... لو بھلا ثریا کو گم ہوئے تیرہ برس ہوئے ہوں گے...... جبکہ یہ محترمہ اٹھارہ سال پرانی شادی شدہ ہیں۔

اسقدر امیر کبیر آدمی...... ہما درست کہہ رہی تھی۔ اتنے بڑے آدمی کو بھلا پوری دنیا میں عورت ہی نہ مل پائی تھی جو وہ کسی ذہنی مریضہ کو ٹھیک کر کے شادی کرتا......؟ لیکن اس دل کیا کریں جو خوش امیدی کے گھوڑے دوڑانے لگتا ہے...... نگہت نے دل کا قصور نکال کر خفت مٹانے کی کوشش کی۔

کیسی نکونی ہوں میں شہپر کی گورنس کے سامنے...... اور بھانجی کے سامنے دنیا تو ہے ہی اتفاقات کا نام...... اپنی ثریا کی ایسی قسمت تھی...... کہ اتنا چاہنے والا اور اتنا ڈیسنٹ انسان اسے ملتا......؟

''ایک بات پوچھوں...... برا تو نہ مانیں گی۔''

انہوں نے خیالات کے بیچ آمنہ کی آواز سنی اور چونک کر بولیں۔ ''جی کہیے۔''

''آپ کے انداز سے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ معلوم کرنا چاہتی ہیں مسز ملک کے بارے میں......''

''ارے نہیں...... بس ہمیں بہت اشتیاق تھا ان کو دیکھنے کا ملنے کا...... ہما نے دراصل بہت تعریف کی تھی...... اور میں تو ہما کی...... دوست ہوں خالہ بعد میں......'' نگہت نے بات بنائی۔

''لیکن آپ کا انداز تو ''شرلاک ہومز'' سے بہت مل رہا تھا۔'' آمنہ آخر کہہ ہی بیٹھیں۔

"یہ تو میری عادت ہے...... ہر بات کی تفصیل میں ضرور جاتی ہوں۔ اب دیکھیے ناں مسز ملک سے ملاقات کا اصل لطف تو اب آئے گا...... کہ میں ان کے بارے میں کچھ جانتی ہوں۔" نگہت ہنس پڑیں۔

ہما نے خالہ کی سمت دیکھا...... اسے بھی نگہت کی بدلتی کیفیت نے حیران کیا تھا۔ نگہت بھانجی سے نظر چرا گئیں۔

مس آمنہ نے چائے اور دیگر لوازمات سے ان کی تواضع کی تھوری دیر بعد وہ باہر آ گئی تھیں۔

"تم ٹھیک کہہ رہی تھیں ہما......" انہوں نے ڈرائیونگ کرتی ہما کے سامنے اعتراف کر لیا۔

"خالہ جانی اب تو نام بھی "سیم" نکل آتا ہے۔ اب تو صاف لگ رہا ہے کہ ملک صاحب نے ہماری پھوپھو کو "کڈنیپ" کر لیا تھا۔" ہما مسکرائی نظریں اس کی بدستور ونڈ اسکرین پر تھیں۔

"ملک صاحب کے بجائے کوئی اور آدمی ہوتا تو میں کارروائی جاری رکھتی۔" نگہت مسکرا کر بولیں۔ "بھئی بندہ بڑا ازوردار لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے عین عالم شباب میں تو ان حضرت کے پاؤں کے نیچے "دل" رہا کرتے ہوں گے...... اور اپنی ثریا...... اگر چچی جان یہ اعلان بھی کر دیتیں کہ وہ جہیز میں ثریا کے وزن جتنا سونا دیں گی تب بھی کوئی ثریا کو بیاہنے نہ آتا۔ یہ حقیقت ہے ہما۔"

"یہی حقیقت میں نے بھی آپ کو بتائی تھی خالہ جانی......!" ہما نے موڑ کاٹا...... لمحے بھر کے لیے گفتگو میں توقف ہوا۔

"واہ قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں......" نگہت نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

"اب یہ ہما آ رہی تھی اپیا...... اس کے پیپرز ختم ہونے کا انتظار تھا...... ہم نے سوچا ہم بھی اپنی کمانڈنگ فورس کے ہمراہ آپ کے ہاں دھاوا بول دیں......" نگہت ابھی ابھی باتھ روم میں سفر کی تکان اتار کر برآمد ہوئی تھیں۔

"مجھے تمہارے آنے کی قطعی کوئی خوشی نہیں ہوتی...... ایک دم ہوا کے گھوڑے پر سوار آتی ہو......" شہلا نے خفگی سے کہا۔

"بجا فرمایا...... جاتی بھی "ہوا کے گھوڑے" پر ہوں۔ کیا کروں ٹرین کے سفر سے بیمار ہو جاتی ہوں......" نگہت نے بہن کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ شہلا ہنس پڑیں۔

"سچ نگہت! اب تو سنجیدہ ہو جاؤ...... بچے بچی جوان ہو چکے ہیں...... کچھ دن جاتے میں بہوئیں لے آؤ گی...... کیا کہیں گی وہ...... ساس تو کہیں سے لگو گی ہی نہیں......"

"کیا کہیں گی......؟ سجدہ شکر ادا کریں گی کہ اس گھر میں ساس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ خیر پہلے تو کھلائیے اچھا سا کھانا...... ساحرہ پشاور سے اب تک نہیں آئیں......" معاً نگہت کو یاد آ گیا......

"ایک دو دن میں آنے والی ہیں...... ان کے والد کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔"

"اب کیسے ہیں......؟"

"اب تو کافی ٹھیک ہیں......"

"مانی بھائی بھی گئے ہوئے ہیں......؟"

ہاں...... ظاہر ہے مانی کا جانا بھی ضروری تھا......"

"اچھا چلیے...... باقی باتیں آرام سے کریں گے پہلے کھانا...... بہت مزے مزے کے واقعات ہوئے ہیں میرے اور ہما کے ساتھ سب بتائیں گے آپ کو......"

نگہت اپنے سفری بیگ سے ہیئر برش نکالتے ہوئے بولیں...... تب شہلا کچن کی سمت مڑ گئی تھیں۔ وہ جانتی نہیں بھوک میں نگہت کا کتنا برا حال ہو جاتا ہے۔ اور ان کے بچوں کا ان سے زیادہ......

بہت پیاری سی امی جان!

آپ یقیناً حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں نے آپ کے ساتھ والے کمرے میں موجود ہوتے ہوئے خط لکھا ہے۔ بات یہ ہے امی کو مجھ میں یہ سب آپ کے سامنے منہ در منہ کہنے کی ہمت نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا بہت پہلے خدشہ تھا۔ کیوں کہ خالہ جانی کئی مرتبہ کئی طریقوں سے اس کا اظہار کر چکی تھیں۔ مجھے ہارون سے نفرت یا بیر نہیں ہے۔ وہ بہت اچھا انسان ہے۔ مگر میں ہارون سے شادی کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں۔ آپ کا کہنا بجا کہ وہ مجھے بے حد پسند کرتا ہے لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں اسے اس حیثیت سے پسند نہیں کرتی یک طرفہ محبت اپنی جگہ مسلم لیکن اس کی سزا کسی بے گناہ کو نہیں ملنی چاہیے۔ ہارون کے علاوہ مجھے اور دوسرے بھی پسند کر سکتے ہیں کہ پڑھی لکھی اچھے گھر کی لڑکی ہوں اور بدشکل بھی نہیں ہوں...... ہر آدمی اپنی پسند ناپسند کے معاملے میں آزاد ہے۔ میں کسی کی آنکھوں پر ہاتھ نہیں رکھ سکتی۔ اگر کوئی مرد کسی کو اپنے طور پر پسند کر لیتا ہے تو اس میں لڑکی کا کیا قصور......؟ جبکہ وہ ایسا ہوچتی بھی نہیں۔

مجھے معاف فرمائیے گا...... میں آپ کے فیصلے کو پپا کے فیصلے کو اپنے حق میں کرنا چاہوں گی۔ مجھے یک طرفہ پسند کی بھینٹ نہ چڑھایا جائے۔ انسان ہوش مند اور سمجھدار ہو اور ساتھ ساتھ خوبصورت ہو تو اسے بیک وقت کئی افراد پسند کر سکتے ہیں چاہ سکتے ہیں۔ تو پھر اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ آپ کو ہارون پسند ہے واقعی وہ اچھا بھی ہے لیکن میں اس کے ساتھ چلنے کے لیے کسی طور آمادہ نہیں پاتی خود کو...... اگر حنا رضامند ہو اور ہارون بھی تو بھی آپ کی خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے حنا آپ کی بات مان لے گی۔

آپ کی بیٹی...... ہما!

خط حسن کے ہاتھوں میں لرزتا رہا تھا۔ ابھی ابھی آفس میں یہ خط بذریعہ ڈاک موصول ہوا تھا۔ اور یہ خط جا بجا انڈر لائن کیا ہوا تھا...... سرخ روشنائی کے قلم سے...... یہ خط ہما نے شہلا کو لکھا تھا۔ اور اب ان کے ہاتھوں میں تھا...... وہ جانتے تھے یہ خط ان کے آفس کے پتے پر کس نے ارسال کیا ہے...... کیوں......؟ اس "کیوں" نے ان کی حالت غیر کر دی تھی۔

ایک بار پڑھ کر انہوں نے دوبارہ پھر سہ بارہ بھی بیٹی کا خط پڑھا۔ انہیں ایسے محسوس ہوا کہ گویا اس خط میں ان کی "انا" کو زبان لگ گئی ہو۔

"انا" سنگدل ہوتی ہے۔ سرد مہر ہوتی ہے۔ اور اس کی زبان بھی کٹی ہوتی ہے اس کے باوجود تکلم سے عاجز نہیں ہوتی۔

غلط "انا" ہو تو اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا۔

"شہلا۔ تم یہ خط مجھے بھیج کر کیا باور کرانا چاہتی ہو......؟ بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن آج بھی میری انا یہی کہتی ہے کہ میں کسی طرح تمہیں یہ بتا دوں کہ مجھے سرے سے یہ خط ہی نہیں ملا۔ جو تم نے چاہا وہ پھر بھی یہیں ہوا۔ اگرچہ ہو گیا اس خط سے پہلے ہی۔

ادھیڑ عمر ہی کے راستوں پر چلتے ہوئے خضر نما خیالات سے مڈبھیڑ ہوئی ہے میری۔

عشق تھکتا نہیں ہے۔ لیکن اسے ایک دن عقل آ جاتی ہے۔ کہ یہ وہ ابال نہیں جو بیٹھ جائے۔

اسے بچی عورت! سن۔ ایک روز میرے عشق کو بھی ذرا دیر کو عقل آئی تھی۔ لیکن انا وہ بڑی مچھلی ہے جو شعور کی

چھوٹی مچھلی کو فوراً ہڑپ کر لیتی ہے۔ اس لیے میں پھر بھی وہیں ہوں۔

تجھ پر عورت کا فلسفہ ہی غلط ہو گیا۔

سنا تو یہی تھا کہ عورت کی کمزوری اس کی کڑکتی جوانی اور دولت ہوتی ہے۔ دولت سے تو تُو محروم نہیں تھی۔

مگر میں نے تجھے عین عروج ماہتاب جیسی جوانی مین تنہا کیا تھا۔

اور یہ سوچا تھا۔ اور منہ زور جوانی کے سامنے تو ایک دن گھٹنے ٹیک دے گی یا تو خود کو غلط ثابت کر کے مجھے منانے آ جائے گی۔ یا پھر طلاق مانگنے کی خاطر مجھے بار بار آواز دے گی۔ ہاں اس وقت میں نے واقعی یہی سوچا تھا وہ جو تیرا منتظر ہے۔ بیٹریاں ٹوٹنے کی آواز سن کر فوراً آئے گا اور شاید تجھے جیت لے گا۔

مجھے اس شخص کی دیوانگی نے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔

وہ سلگ رہا تھا۔ اتنا کہ تجھے آرام سے سلگا سکتا تھا۔

تو تُو انتقاماً بھی میرے پاس نہیں آئی شہلا۔

تُو نے تو خلع کے لیے مجھے عدالتوں میں بھی نہیں گھسیٹا۔

اور یوں ایک دن میرے تھکے جسم کو نیند آیا چاہتی تھی۔ عشق بھی ستا رہا تھا۔ عقل تو خوش نصیبوں کی گھات میں رہتی ہے۔ فوراً چلی آئی۔

اتنی بڑی سائنسدان کہ عشق وسفل جذبات کے مرکبات علیحدہ علیحدہ کر دیے۔ اتنی بڑی کیمیا گر کہ میری انا کے تیزاب کو جھٹ اپنی گرفت میں لے کر میرے مقدر کو "سونا" بنانے لگی۔ اس "سونے" کو تباہ کرنے والی ایک ایک چیز اس نے ہٹانا شروع کر دی۔

پھر ایسا ہوا کہ میرے کانوں میں آواز آئی "ان کی وائف نہیں آئیں۔؟"

اس دنیا میں وہی واحد شخص جس نے مجھے حساس کمتری میں مبتلا کیا تھا۔ اس کی آواز آئی۔ اور انا کا تیزاب گر پڑا۔ پھر نئے سرے سے اتنا جھلسا کہ برسوں ہوش نہیں آیا۔

پھر عشق جاگ گیا۔ نہ پھر کبھی ستایا نہ کبھی پھر عقل سونا بنانے آئی۔ اب جبکہ ہر چیز پر اپنی ذات اپنے نفس پر صرف بچے حاوی ہو گئے ہیں تو۔ میں نے منتیں کر کے عقل کو پکارا ہے۔ وہ آ بھی گئی ہے۔ مگر "انا" کا تیزاب بھی لبالب بھرا ہے۔

ہما......خدا کی قسم تیرا حرف حرف سچ ہے میری بیٹی۔

تو آئینہ ساز ہے۔

اور تیری ماں آئینہ بردار۔

لیکن اچھے بچے باپ کا سر نہیں جھکاتے۔ اپنی ماں سے کہو باز آ جائے۔ میرے پندار کے شیشے پر وہ پتھر مارنے قریب آ پہنچی ہے۔

میں اب بھی ہار نہیں مانوں گا۔

وہ ہمیشہ کی طرح کیوں نہیں چلی آئی تھی۔

اس نے ہار مان کر میرے عشق کا اعتراف کیوں نہیں کیا۔

انسان کا سب سے بڑا آسیب اس کی "انا" ہے۔ غلط انا کا آسیب ایک بار چمٹ جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتا۔

تیری ماں کو تو سینکڑوں منتر آتے تھے۔

میں مرد ہوں۔ ہر راہ اپنانے میں آزاد۔ جب ایک مرد پوری سچائی سے اپنا آپ ایک عورت کو سونپ دیتا ہے۔ تو عورت کو اپنا آپ وار دینا چاہیے۔ اس کی کیا انا......؟

ایک ایماندار شوہر کے سامنے ایک عورت کی "انا"؟ اس کی انا نہیں ہونی چاہیے کہ ایک مرد قطرہ قطرہ پگھل کر اس کا ہے۔ جبکہ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ وہ میرے جوانی کے جذبات تھے۔ درجہ دوئم کا احساس ذات تھا۔

لیکن۔ وقفے وقفے سے تجھے میری خبر گیری کرنا چاہیے تھی۔ یہ کیا کہ مردوں والی "انا" کے ساتھ تو میرے مقابل آ گئی۔ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں شہلا۔

ہما میری جان جو تو نے لکھا۔ درست لکھا۔ لیکن اپنی فطرت کے بموجب غلط میں بھی نہیں ہوں۔

عرصہ گزرا تو رقیب بھی دھندلا گیا تھا۔ ایک ہی چیز باقی رہ گئی تھی "انا"۔

وہ ان حالات سے بے خبر تھے۔ لیکن جب ہما کا انکار یہ خط پڑھ ہی لیا تو جی چاہا معلوم کریں کہ اس کی ماں نے کیا فیصلہ کیا۔

انہوں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ زید صاحب ہاسپٹل گئے ہوئے ہیں ان کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے۔

انہوں نے ہاسپٹل وغیرہ کی معلومات کیں۔ اور گاڑی کو غیر معمولی رفتار سے لے کر وہ ہاسپٹل کی سمت آئے تھے۔ ایک پریشان خیالی کا سلسلہ شروع تھا کہ ان کا ناراض بوڑھا باپ لب مرگ ہے۔

ایک مرتبہ کافی پہلے ان کی طبیعت اس طرح بگڑی تھی جب انہوں نے دوسری شادی کی دھمکی دی تھی۔ اور وہ موقع پا کر اسے تازیانہ مارنا چاہتے تھے۔

لیکن اس دھمکی کی شہلا پر تو کوئی اثر نہیں ہوا تھا البتہ۔ ان کے باپ کی جان پر بن گئی تھی۔

وہ جیسے ہی طویل برآمدے میں پہنچے سامنے سے امان آتا دکھائی دیا۔

"السلام علیکم......!" اس کے انداز میں حد درجہ تکلف ہوتا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے ابو کا۔؟"

"آکسیجن دی جا رہی ہے۔"

"تم کہاں جا رہے ہو......؟"

"کچھ ضروری میڈیسن درکار ہیں۔" بھائی سے حد درجہ شاکی ہونے کے باوجود وہ آج بھی اس طرح مؤدب تھا۔ حسن آگے بڑھتے تب ہی اس نے بھی قدم بڑھائے۔ وہ دروازہ آہستگی سے کھول کر اندر داخل ہوئے۔

شہلا کرسی پر ٹکی اخبار دیکھ رہی تھیں۔ دروازہ چر چرانے پر سر اٹھایا تو پھر اس کو سامنے پیا جس کا سامنا کرتے ہوئے وہ کتراتی تھیں۔ انہوں نے دوبارہ اخبار پر سر جھکا لیا۔

گہرا جامنی کرتا شلوار اور ہمرنگ دوپٹہ ان کی اجلی رنگت کو بے پناہ نمایاں کر رہا تھا۔ بالوں کا گھنیرا پن اگرچہ کم ہو گیا تھا لیکن دلکشی بدستور تھی چہرے کی تازگی ماندی پڑ گئی تھی۔ اور بے پناہ سنجیدگی آ چکی تھی پورے ہی وجود پر......اس کے باوجود دلکشی کا تاثر اپنی جگہ بدستور تھا۔

یہ سب کچھ ان کا اپنا تھا جو وہ خود پر حرام کر چکے تھے بغیر کسی ضابطے کے۔

ایک دوسرے کو ٹوٹ کر اور سچائی سے چاہنے والے میاں بیوی کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔

جوان اور نئی نسل انہیں محتاط کر کے باوقار ضرور بنا دیتی ہے لیکن۔

ع پیری بھی شباب ہے جو تمنا جوان ہے

شہلا کو ان کی نظروں سے الجھن وکوفت ہو رہی تھی۔ ان کا ارادہ تھا وہ دروازے سے ہٹیں تو وہ باہر نکل جائیں۔

ان نظروں سے ان کے اندر غصے کا طوفان سا اٹھ رہا تھا۔

کیا حق ہے اتنا بھی نہیں خوبصورت اور ذہین عورت چھوت کی بیماری بھی ہو سکتی ہے جو ''اکثر'' کو لگ سکتی ہے...... میں اس شخص نے مجھے کیوں دیکھا۔ اور دیکھ کر تھوکا کیوں نہیں...؟

کوئی حق نہیں اس شخص کو کہ مجھے ارادتاً دیکھے۔ میری سرد گرم راتوں کو تنہائی کے جہنم میں جھونکنے والا۔ میری بیساکھی توڑنے والا۔

اپنے باپ سے ملو۔ اور چلے جاؤ۔ انہوں نے اخبار چہرے کے سامنے کر لیا تھا۔

بیمار باپ بولنے سے قاصر تھا انہوں نے باپ کی کلائی چھو کر دیکھی۔ پاس کھڑی نرس سے متعلقہ ڈاکٹر کا پوچھا۔

اتنے میں شہلا تیزی سے باہر نکل گئی تھیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد امان آ گیا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر چیزیں رکھیں اور کمرے پر نظر دوڑا کر سیدھا ہو گیا۔

''بھابی کہاں گئیں......؟'' وہ بے ساختہ حسن سے پوچھ بیٹھا تھا اور پھر ایک دم اپنی جگہ چور سا ہو گیا تھا۔ بلکہ کافی نروس سا ہو گیا تھا۔

حسن جواب میں کچھ نہیں بولے تھے بلکہ امان کی لائی ہوئی دوائیں دیکھنے لگے تھے۔

''آپ کو کیسے پتا چلا......؟'' امان نے غور سے بھائی کی صورت دیکھی۔

''فون کیا تھا میں نے دارالسلام۔'' حسن نے بھائی سے نظر چرا کر جواب دیا اور غور سے ایک دوا کا نام پڑھنے لگے۔

اسی دم دروازہ کھلا۔ کاشف اندر داخل ہوا۔ باپ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا پھر آہستگی سے بولا۔

''السلام علیکم پپا!''

''وعلیکم السلام......!'' اس نے اپنے تقریباً نوجوان سے بیٹے کو بڑے جذبے سے جواب دیا۔

''سیریس بات تو نہیں چچا جان۔'' وہ امان کی طرف متوجہ ہوا۔

حسن کو ایک عجیب سی محرومی اور خلاء کا احساس ہوا۔ باپ سے حد درجہ تکلف اور چچا سے اپنائیت بھرا لہجہ۔

''نہیں یار۔ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔'' مانی نے بھتیجے کا شانہ تھپتھپا کر تسلی دی۔

''امی بھی تو آئی تھیں...؟'' کاشف امان سے پوچھ رہا تھا۔

''ہوں۔ باہر کام سے گئی ہوئی ہیں۔'' اس نے حسن پر اچٹتی سی نظر ڈال کر جواب دیا۔

''کس کام سے...؟'' وہ الجھا۔

امان نے بڑی گہری نظروں سے کاشف کی سمت دیکھا تو اس نے بہت کچھ جان کر باپ کی سمت دیکھا اور گہری سانس لے کر خود بھی باہر نکل گیا۔

''کون رہے گا ابو کے پاس...؟'' حسن نے اماں کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

''ظاہر ہے بھابی ہی رہیں گی۔ حالانکہ ساحرہ رہنے کو کہہ رہی تھیں مگر۔ آج شام عالیہ بھی آ رہی ہے شاید صمد بھی اس کے ساتھ ہوں۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی تفصیل بتائی۔

''ہوں۔ اچھا میں چلتا ہوں۔ ابو ہوش میں آئیں تو بتا دینا۔''

(آپ نے تو انہیں ضعیف ترین کر دیا ہے بھائی جان) ''اچھا۔ بتا دوں گا۔''

اس نے جواب دیا۔ چپ رہتا تو شاید اس گھر کا بالادستی پسند بھائی اپنی توہین گردانتا حسن نے ایک نظر باپ کو دیکھا اور باہر نکل گئے۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد شہلا اندر آ گئی تھیں۔

''مانی......!''

''جی بھابی......!''

''دیکھو خواہ مخواہ ساحرہ کو باتیں سنانے نہ بیٹھ جایا کرو۔''

وہ مدھم آواز میں بولیں...... خفگی کا تاثر نمایاں تا۔

''میں سمجھا نہیں بھابی۔'' وہ پریشان سا نظر آیا۔

''کیا ضرورت تھی۔ اسے ڈانٹنے کی۔ کیا وہ احساس سے عاری ہے؟ میں نے خود ہی کہا تھا اسے حالانکہ وہ بھی ضد کر رہی تھی۔ ردا کی طبیعت پرسوں سے خراب ہے۔ اس کی طرف سے وہ علیحدہ فکر مند ہے۔ وہ ہر کام میں خود آگے رہتی ہے۔ بعض اوقات تم ناحق اسے سنا دیتے ہو مجھے بہت کوفت ہوتی ہے۔''

''مجھے آپ کا بھی تو خیال رہتا ہے۔ اس قدر مصروف رہتی ہیں۔ ذہنی طور پر بھی جسمانی طور پر بھی انسان ہی ہیں مشین تو نہیں۔''

''اچھا چھوڑو۔ تمہارے جیسا قدر دان بھائی ساری تھکن اتار دیتا ہے۔ اب کل کی چھٹی مت کر بیٹھنا۔ کل سے تمہاری شفٹ پھر تبدیل ہو گئی ہے یاد رکھنا۔

ڈاکٹر تو کہہ رہے تھے ان کے ساتھ مرد کو ٹھہرنا چاہیے۔ میں نے کاشف کو کہہ دیا ہے کہ وہ رات دس بجے سے صبح چھ بجے تک یہاں رہے گا۔ ویسے بھی اس کے کالج بند ہیں۔ اور میرے خیال میں اچھا خاصا مرد ہے میرا بیٹا'' کاشف کے ذکر پر شہلا کے لہجے میں شیرینی سی گھل گئی۔

وہ وسیع وعریض سپیشل وارڈ کے ایک کونے میں بیٹھے بہت مدھم گفتگو کر رہے تھے۔ ایک چوکس نرس چچا جان کے نزدیک بیٹھی تھی۔

''بھائی جان پوچھ رہے تھے کہ یہاں کون رہے گا...؟''

''مجھے آپ کا کاشف والا پروگرام تو معلوم نہیں تھا میں نے آپ کا نام لے دیا۔''

''تم نے کہا نہیں کہ آپ رہ جایئے۔ آپ کے بھی تو باپ ہیں۔'' شہلا کا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا۔

''میں انہیں یہ کہہ نہیں سکتا تھا۔'' مانی نے اپنی حد کا اعتراف کیا۔

''نگہت اچانک ہی چلی گئیں...؟''

''اس کے تو سب کام اچانک ہوتے ہیں۔ ناراض ہو کر گئی ہے کہ میں ہما پر زور کیوں نہیں دے رہی۔''

''جی بھابی۔ ان سلسلوں میں زور دینا ٹھیک نہیں۔ وہ بھی باشعور ہے اپنا اچھا برا سوچ سکتی ہے۔''

''لیکن نگہت تو اس کی محبت میں دیوانی ہے۔''

''ویسے آپ نے ہما سے انکار کی وجہ نہیں پوچھی...؟'' مانی نے کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر لان میں جھانکا۔

''پوچھی تھی۔ وہ چپ ہے۔''

''ڈاکٹر خان ابھی تک نہیں آئے۔؟'' شہلا ایک دم کسی خیال سے چونک اٹھیں۔

''میں ان کے آفس سے ہو کر آیا ہوں۔ بتا رہے تھے۔ اب خطرے سے باہر ہیں ابو۔ آپ کو میرے اطمینان نے کچھ نہیں بتایا۔؟'' وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دیا۔

''ویسے آتے ہی ہوں گے۔ پندرہ منٹ بعد آنے کو کہا تھا۔'' اماں نے ریسٹ واچ پر نظر دوڑائی تھی

''ہیلو۔ جی اماں جی۔ میں ہما بول رہی ہوں کوئٹہ سے۔''

شہلا کچن جاتے جاتے ٹھٹھک گئیں۔ یہ رات دس بجے ہما کون سے شہر رنگ کر رہی ہے۔

''سر ہیں اماں جی۔؟''

''روزانہ دیر سے آ رہے ہیں۔؟ دیکھیے میں دو دن سے ان سے بات کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ پیغام تو کوئی نہیں ہے اماں جی۔ وہ جو سر نے آفر کی تھی اس سلسلے میں بات کرنا تھی۔''

''آپ نے انہیں میرا نمبر دیا تھا۔؟''

''دیا تھا۔؟ پھر بھی انہوں نے مجھے رنگ نہیں کیا۔'' ہما کے لہجے میں دکھ و حیرانی نمایاں تھی۔

''اب آپ میرا پیغام نوٹ کر لیجیے۔ سر سے کہیے گا اب میرا کوئی فون نہیں آئے گا خدا حافظ۔'' اس نے ریسیور آہستگی سے رکھ دیا۔

''کس کا فون تھا آپی۔؟'' حنا بیرونی برآمدے سے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''کسی کا نہیں۔ میں نے کیا تھا خود۔'' اس نے گم صم سے انداز میں کہا تھا۔

''اپنی کسی دوست کو......؟''

''نہیں۔ ڈاکٹر جمشید کو۔ وہ بہر حال دوست نہیں ہیں۔'' وہ بے دلی سے مسکرائی۔

''آپ نے انہیں رات کو ڈسٹرب کیا وہ بھی اتنی دور سے۔......'' حنا نے اس کی غلطی جتائی۔

''ہوتے تو ڈسٹرب ہوتے۔ وہ تو رات کو بھی نہیں ملتے۔'' وہ ناگوار سے انداز میں بولی۔

''آپی۔ کوئی کام ہے آپ کو ان سے؟''

''ظاہر ہے۔'' اسے حنا کے بچکانہ سوال پر کوفت ہوئی۔

''بہت اچھے سے ہیں آپی وہ......؟'' حنا نے ازلی سادگی و معصومیت سے پوچھا۔

اس نے چونک کر حنا کی شکل دیکھی۔

''اللہ کے بندے ہیں۔ لائق فائق۔ غیر معمولی ذہین آدمی ہیں اس لیے شاید زیادہ اٹریکشن ہے۔'' ہما نے بڑا چچا تلا تجزیہ کیا۔

''یعنی اٹریکشن ہے۔؟'' حنا نے شرارت سے کہا۔

''بیوقوفی کی باتیں مت کرو حنا۔ وہ ڈاکٹر جمشید ہیں۔ سنا۔؟''

''آپ تو ایسے کہہ رہی ہیں جیسے وہ ڈاکٹر جمشید نہ ہو شہنشاہِ کم از کم ایشیا ہوں۔'' ہما کو اس کے کم از کم کہنے پر بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ اس کا ہنسنے کا بہت دلکش انداز تھا پھر بھی وہ کبھی کبھار ہی ہنسا کرتی تھی۔

''آپی......!''

''ہوں......؟''

''مجھے اپنی سہیلی بنا لیں۔ بہت مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔'' حنا شرارت سے مسکرائی۔

''ایسی کوئی بات نہیں حنا۔ مجھے جو بات بھی کہنا ہو گی میں امی سے خود کہہ دوں گی۔ مجھے اس دنیا میں امی سے زیادہ راز دار دوست کی ضرورت نہیں۔ مجھے اعتماد ہے کہ امی میری ہر بات سن کر ضرور غور کریں گی۔ تم نے دیکھا حنا۔؟ ہماری امی تھکی ہاری چڑچڑی اکتائی ہوئی ماں نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہماری ہر بات چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ بہت غور سے سنتی ہیں۔ امی تو ہماری بہت اچھی دوست ہیں۔ حالانکہ خالہ جانی کے ارادوں کا علم مجھے بہت پہلے ہو چکا تھا مگر میں ذرا پریشان نہیں ہوئی کہ امی کے موجود ہوتے ہوئے مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔''

''ہاں آپی...... میں سب کی مائیں دیکھتی ہوں کوئی بھی امی کی طرح نظر نہیں آتی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو حنا......!''

''آپی اصلی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ وہ ڈاکٹر جمشید۔''

''پھر ہفتے میں کئی ٹیلی فون کیوں کیے جاتے ہیں۔؟'' حنا نے ترپ کا پتا پھینکا۔

''بدتمیز۔ بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ حنا۔ میں شہلا حسن کی بیٹی ہوں اب اتنی بھی گری پڑی نہیں کہ لوگوں کو فون کر کے متوجہ کروں گی۔ بات یہ ہے کہ ان کی مصروفیات ہی مختلف نوعیت کی ہیں۔ عموماً رات دس بجے کے بعد ہی ملتے ہیں۔ ایک جگہ تو ٹکتے نہیں ہیں دراصل انہوں نے مجھے آفر کیا تھا کہ رزلٹ کے بعد ان کے ذاتی کلینک میں ان کی اسسٹنٹ بن جاؤں۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ غور کر کے جواب دینا۔ اب امی تو منع کر رہی ہیں کراچی جانے سے۔ لہٰذا''

''تو یہ بات تو آپ فون پر کسی سے بھی کہلوا سکتی ہیں۔''

''نہیں۔ اچھا محسوس نہیں ہوتا۔ شاید وہ وجہ جاننا چاہیں تو وجہ تو میں ہی تفصیل سے بتا سکتی ہوں ناں۔ انہوں نے پیشکش بھی تو براہ راست کی تھی۔''

''آپ نے امی کی بات فوراً مان لی۔؟ حالانکہ کافی اچھی پیشکش ہے۔''

''کیا کروں پھر۔؟ وہ کہتی ہیں کام مجھے یہاں بھی مل سکتا ہے۔ ابھی میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جو امی کے شایاں شان ہو۔ اس لیے چپ ہوں۔'' وہ بہن کو دیکھ کر مسکرائی۔

شہلا نے کبھی ہما حنا کی باتیں چھپ کر نہیں سنی تھیں لیکن ہما کا ہارون کے لیے انکار سن کر وہ کچھ متجسس سی ہو گئی تھیں بیٹی کی سلجھی ہوئی باتیں سن کر انہیں عجیب سا اطمینان ہوا اور وہ آگے بڑھ گئیں۔

''ارے حنا! تمہیں ایک مزیدار بات بتانا تو بھول ہی گئی۔ مجھے کراچی میں ثریا پھوپھو ملی تھیں۔''

حنا اچھل پڑی۔ ''ثریا پھوپھو۔'' وہ تعجب سے ہما کی طرف دیکھ کر بولی۔

''بالکل ثریا پھوپھو جیسی۔''

''اوہ۔! حنا نے گہرا سانس لیا۔

ہما نے اسے تفصیل سے پوری بات سنائی وہ انہماک سے سنتی رہی۔

''ابھی میں یہی پروگرام بنا رہی تھی تمہیں اور امی کو یہ دلچسپ کہانی سناؤں گی۔''

''آپی کیا واقعی وہ ثریا پھوپھو جیسی ہیں۔''

''تمہیں یقین نہیں آئے گا ایک دم وہی۔''

''اچھا عادت وغیرہ کیسی ہے؟'' حنا مشتاق سی ہوگئی۔

''بہت اچھی۔ اتنی خوشحال زندگی گزار رہی ہیں جو قابل رشک ہے۔ اتنے پیارے پیارے بچے۔ اتنا ڈیسنٹ چارمنگ اور سوبر سا بندہ ان کا ہسبنڈ ہے۔ اٹھارہ سال سے باہر ہیں یہاں تو عزیزوں سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔''

''اور ہاں۔'' حما کو مزید یاد آیا۔ ''وہ لوگ تو چچا جان سے مل چکے ہیں ہیوسٹن میں تمہیں یاد ہے چچا جان اور ساحرہ چچی نے فون پر بھی بتایا تھا کہ انہیں ثریا پھوپھو کی ہمشکل مل گئی ہیں۔''

''ہاؤ اسٹرینج۔'' حنا نے مٹھیاں بھینچ لیں۔ ''آپی اگر کراچی گئے تو ملوایئے گا۔''

''ایسا ممکن تو نہیں ہوسکتا ہے جب ہم کراچی جائیں تو وہ واپس امریکہ جا چکے ہوں۔''

''سچ آپی میرا تو بہت دل چاہ رہا ہے اپنی پھوپھو کی کاربن کاپی دیکھنے کو۔''

''سنو...... حنا۔''

''ہوں۔؟''

''دیکھو عالیہ پھوپھو کے سامنے ذکر نہ کر بیٹھنا۔ ہوسکتا ہے وہ بھی خالہ جانی کی طرح جذباتی ہوجائیں۔ اور پہنچ جائیں کراچی۔۔ خواہ مخواہ مذاق بنے گا۔ کیا سوچیں گے وہ لوگ ہمارے بارے میں۔''

''آپ بے فکر رہیں۔ عالیہ پھوپھو سوگئیں۔؟'' حنا کو ایک دم دھیان آیا۔

''ہاں شاید تھکی ہوئی تھیں۔''

پھر وہ دونوں بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ اب سونے کی تیاری تھی۔

''میں سوچ رہا ہوں کیوں نہ ہم اسلام آباد سے فلائی کر جائیں۔ خواہ مخواہ کراچی جا کر وقت ضائع ہوگا۔'' ملک نواز نے کھڑکی سے باہر جھانکتی ثریا کو متوجہ کیا۔

وہ چونک پڑی۔ ''کیوں۔؟''

''بتایا ناں اب اتنا ٹائم نہیں رہا ہے۔''

''لیکن۔ مجھے تو کراچی والے گھر میں بہت سے کام نمٹانے ہیں۔'' وہ پریشان ہوگئی۔

''مثلاً...... دیواریں ادھیڑ کر دوسری جگہ۔''

''چچا۔'' ثریا جھلا گئی۔ ''کتنی چیزیں ہیں جو اسی طرح چھوڑ آئی تھی انہیں محفوظ کرنا ہے پھر پتا نہیں کب آئیں پاکستان سب خراب جو جائیں گی۔''

''مس آمنہ کرلیں گی۔''

''لیکن تمام اہم چابیاں تو میرے پاس ہیں۔'' وہ بولی۔

''کیا مصیبت آئی تھی تمہیں چابیاں ساتھ لٹکانے کی۔'' ملک کا موڈ خراب ہونے لگا۔ ''کیا پرانے وقتوں کی جاہل عورتوں کی طرح چابیاں جیب میں رکھے پھرتی ہو۔''

''تمام چیزیں نوکروں کی ذمہ داری نہیں ہوتیں۔ اپنے گھر کا خیال عورتوں کو خود کرنا پڑتا ہے۔ مرد کا گھر نہیں ہوتا۔ ریسٹ ہاؤس ہوتا ہے۔ گھر تو عورت کا ہوتا ہے۔ وہی اسے بناتی سنوارتی اور اس کی حفاظت کرتی ہے۔ آپکو کیا پتا۔''

''ہاں صاحب۔ مجھے کیا پتا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اتنی زبردست گھر والی لا رہا ہوں۔'' اس بار اس کے لہجے میں

شرارت تھی۔

''لائے کہاں تھے۔ گھر ہی میں تو تھی۔'' ثریا نے ہیئر برش اٹھا کر بالوں میں چلایا۔ پھر نیم دراز ملک کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

''ملک کیا آپ کو پتا تھا یہ گاؤں میں رہنے والی خالہ زاد آپ کی بیوی بن جائے گی۔'' (خدا کی قسم فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوگی)

''ہاں گھر والے کہا کرتے تھے۔'' اس نے پھر بات نبھا دی۔

''اچھا بتایئے۔ آپ تو اتنے عرصے سے باہر تھے۔ میں تو دیہاتن تھی۔ آپ کو کوئی پڑھی لکھی لڑکی پسند نہ آئی۔'' (ثریا۔ نمک پاشی بند کردو خدارا) ''نہیں'' ۔ اس نے مختصر ترین جھوٹ بولا۔

''کیوں۔؟''

''تم ہو آگئی تھیں۔'' اس نے خود پر جبر کیا۔ ثریا کے چہرے پر روشنی سی پھیل گئی۔

''اچھا پھر آپ نے اپنے گھر والوں پر زور کیوں نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے تعلیم دلائیں۔''

''اس وقت گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول نہیں تھا۔ اور پھر میں نے ساری کمی تو پوری کر دی ہے۔ تمہاری بہترین تعلیم کا انتظام نہیں کیا۔؟'' ملک نے ثریا کا چہرہ بغور دیکھا۔

''ہاں خیر یہ تو ہے۔'' اس نے اعتراف کیا۔

''ملک۔ میں کبھی کبھی حیران ہوتی ہوں۔''

''الٰہی خیر۔!'' ملک نواز نے دل ہی دل میں پناہ مانگی۔ (اب کیا ''نئی'' ہوگی۔؟)

''کس بات پر حیران ہوتی ہو۔؟''

''یہی کہ۔ گاؤں میں میری سہیلیاں بھی تو ہونی چاہئیں۔ لیکن سب ہی لوگ مجھ سے دور دور رہتے ہیں۔''

''یہ بات نہیں ہے ثریا۔ بات دراصل یہ ہے کہ گاؤں کے اکثر لوگ ہمارے ملازم ہیں وہ ہم سے کس طرح بے تکلف ہو سکتے ہیں۔''

''لیکن مجھے عجیب سا لگتا ہے۔ سب اس طرح دیکھتے ہیں مجھے جیسے میں ان سب کے لیے نئی ہوں۔'' وہ الجھی۔

''دراصل تم بدل بہت گئی ہو اس لیے۔''

''کیا بدل گئی ہوں میں۔؟''

''میری بیوی بن گئی ہو۔ میرے بچوں کی ماں بن گئی ہو۔ مس آمنہ جیسے پڑھے لکھے لوگوں کی میڈم بن گئی ہوا۔ اور بدلنا کسے کہیں گے۔''؟''

ثریا کے تمام تجسس اس نے ایک بار پھر مٹا دیے۔

اس نے ثریا کا خوبصورت ہاتھ تھام لیا۔

''مجھے ایسا لگتا ہے۔ تم یہاں آ کر کچھ میلی سی ہو جاتی ہو۔''

''ہاں۔ یہ تو ہے۔'' اس نے ملک کے ہاتھ کی گرم جوشی محسوس کی۔ ''وہاں تو واقعی میرا رنگ بہت سفید ہو جاتا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا مجھے زیادہ راس ہے۔ یہاں تو مجھ پر سستی سی چھا جاتی ہے۔'' اس نے لاشعوری طور پر ملک کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"تو پھر یہاں مستقل آ کر تو تم ڈل ہو جاؤ گی پھر ہمیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔"

"نہیں خیر یہاں تو ہم ضرور آئیں گے۔ رنگ روپ کب تک ساتھ دیتا ہے۔؟"

"میرے خیال میں تمہارا رنگ روپ جلد ماند نہیں پڑنا چاہیے۔ ورنہ مجھے کوئی دوسری تلاش کرنا پڑے گی۔"

"توبہ۔ مجھے تو لگتا ہے آپ سو سال کی عمر میں بھی بوڑھے نہیں ہوں گے۔"

"تم کیا چاہتی ہو۔؟" اس کے لبوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔

اسی وقت شہریار اندر داخل ہوا۔ ثریا والہانہ اس کی طرف لپکی تھی۔

"ایک تو یار یہ تمہارے بچے بے وقت آ دھمکتے ہیں۔" ملک نواز نے بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

"ملک! میں آپ کو بتا رہی ہوں میں کراچی جائے بغیر امریکہ نہیں جاؤں گی۔ آپ کو جلدی ہے تو آپ چلے جائیں میں بچوں اور مس آمنہ کو لے کر بعد میں آ جاؤں گی۔"

ثریا کا لہجہ ٹھوس تھا۔

ملک نواز نے آنکھوں پر سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔

"تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ بابا آ جائیں گے چند سال بعد مستقل خوب جی بھر کر اس گھر کی دیکھ بھال کر لینا۔"

"نہیں۔ میں تمام انتظامات کیے بغیر نہیں جاؤں گی۔" اس کے لہجے میں ہٹ دھرمی تھی۔ ملک کا پارہ پھر چڑھنے لگا۔

"ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے۔ ہیوسٹن سے آتی ہو تو وہاں تمہیں انتظامات کرتے کرتے مہینہ لگ جاتا ہے۔ اور یہاں آتی ہو تو۔ بھاگے جا رہے ہیں گھر۔ چیزیں محفوظ نہیں کیں یہ نہیں کیا۔ وہ نہیں کیا۔ لے جائیں گے چور ڈاکو یہی ہو گا زیادہ سے زیادہ۔ تو لے جائیں۔ اور آ جائیں گی۔ چیزیں۔"

"توبہ کس طرح بے دھڑک کہہ دیتے ہیں۔ مفت کی ہیں۔ اتنی محنت سے کماتے ہیں صبح سے گئے شام کو آتے ہیں۔ کس قدر تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ مجھے تو ترس آنے لگتا ہے۔"

(کامن۔ ہونہہ۔ یہ تو خود کو مصروف رکھنے کا بہانہ ہے۔ ثریا بیگم۔ خالی الذہن رہوں تو شاید نا آسودہ خواہشات سے نروس بریک ڈاؤن ہو جائے۔ ع آگ سلگی تھی بھڑکی ہے بجھتی نہیں۔ تم کیا جانو ثریا بیگم)

کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں تمہاری رفاقت میں۔ "اس کی" شرم نہ ہوتی تو آج تم بھی اس مقام پر نہ ہوتیں۔ دنیا کے بے رحم خود غرض لوگوں میں میرا بھی اضافہ ہو جاتا۔ اس کی جان کو دعا دو جس کے وسیلے سے تم یہاں ہو۔ وہ آج بھی کبھی کبھی میری شہ رگ کو چھو جاتی ہے۔ تمہارے واسطے سے میں اس کا ہوں۔ دل کافی مطمئن ہے۔ ایک دور وہ بھی گزرا جب صبر کے چھلکتے پیالوں کی طرح تھا۔ وہ میری نام آشنا بھی نہیں تھی۔ میں اس کی ایک نظر کے لیے پہروں سوچا کرتا تھا۔ اگر اس کے گھر کا ٹوٹا برتن جتنی تھی۔ ثریا۔

اب کیونکہ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ از خود گنجائش سی نکل آئی ہے میرے دل میں لوگ صحیح کہتے ہیں گھر میں بندھے جانور سے بھی انسیت ہو جاتی ہے۔ تم تو پھر ایک خوبصورت عورت اور پھر میری بیوی ہو۔ سب سے بڑھ کر "اس" سے نسبت ہے۔ بیوی تو شاید مجھے خوبصورت سی مل جاتی۔ اس سے نسبت تو نہ ملتی۔ اپنی ماں سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یا ان پھر اس سے۔ وہ گھڑی نہ آئے کہ وہ میرے اور تمہارے سامنے آئے اس روز ملک نواز مارے شرم کے خودکشی کر لے گا۔

اپنی شرم کی خاطر میں نے "دارالسلام" کے مکینوں کو روگ لگایا ہے۔ لیکن مجھے کوئی روگ اپنے روگ سے بڑا نظر نہیں آتا۔ میری شرم کا محور تم ہو شہلا حسن۔ بخدا میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتا بلکہ اس گھڑی سے پناہ مانگتا ہوں۔

ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ عشق قربت کا مشتاق ہی ہو گیا تھا۔ تمہیں چھونے کو بے قرار ہو ہی گیا تھا تو تمہارے پاؤں چھونا چاہیے تھے۔ تصور ہی ہیں۔ میں آج بھی اپنی نظروں میں ذلیل ہوں۔

بے حرمتی میں نے ثریا کی نہیں تمہاری کی تھی۔ منتظر پر تو تم تھیں شہلا حسن کیسی مفرور مجرم جیسی زندگی ہے میری۔ پریشانیوں نے میرا گھر دیکھ لیا ہے۔ کبھی تمہارا دیور مل جاتا ہے کبھی تمہارا شوہر کبھی تمہاری بیٹی۔ تم تو خود میرا پیچھا کر رہی ہو۔ خدارا۔

"کیا بات ہے ملک؟" ثریا اسے سر تھامے دیکھ کر گھبرا گئی۔ سر میں درد ہے۔؟" وہ فکرمند سی تھی۔

(خدا معلوم کہاں کہاں درد ہے) "ایک گلاس پانی پلا دو۔"

وہ جلدی سے پانی لے آئی۔

"اچھا چلیں چھوڑیں۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں آمنہ سے کہہ دوں گی وہ خود ہی چیزوں کو محفوظ کر لیں گی۔"

کس قدر سادہ تھی وہ۔ ملک پشیمان سا ہو گیا۔ تم تو میری روح کی بھی حقدار ہو ثریا مگر میری روح تو خود میری گرفت میں نہیں رہتی۔

"نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ ایک دن کے لیے چلیں گے کراچی۔ تمہاری بات مان لیتے ہیں کیا یاد کرو گی تم بھی۔"

ثریا نے بڑی حیرانی سے دیکھا تھا۔ اسے ہمیشہ کی طرح ملک ایک معمہ دکھائی دیا تھا۔ حالانکہ ضد کرتے وقت دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ جب ملک کو غصہ آتا تھا تو ہو کوئی انتہائی قدم بھی اٹھانے کو تیار رہتا تھا۔ اس کی محبت کا انداز بھی جان لیوا تھا اور ناراضگی کا بھی۔

ثریا لاعلم تھی۔ کہ نا آسودہ لوگ عموماً چڑچڑے یا بد دماغ ہو جاتے ہیں ان کی تمام محرومیاں ایک مرکز پر اکٹھی ہو کر لاوا بن جاتی ہیں جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔ بلکہ اکثر و بیشتر۔ پھٹتا ہی رہتا ہے۔

اس نے ہتھیار ڈال کر پھر ملک کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی آج وہ کبھی کبھار کی طرح پھر مہربان ہو گیا تھا۔

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تھا۔ شہپر اور شہ پارہ بدستور نیچے کھیل رہے تھے کل انہوں نے مری کا یہ ہوٹل چھوڑ کر لاہور روانہ ہونا تھا۔

"جی امی۔ آپ آپی سے پوچھ لیں۔ ہے ناں آپی۔"

"جی امی۔ واقعی وہ بالکل پھوپھو جیسی ہیں۔" ہما نے کتابیں قرینے سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"تو یہی وہ مزے دار باتیں تھیں، جو نگہت سنانے کو بے چین ہو رہی تھی اور پھر بغیر سنائے چلی بھی گئی۔" شہلا نے ایک لمحے کو نٹنگ کا سلسلہ روک کر ہما کو دیکھا۔

"جی امی......!"

"ہاں جہاں بہت سارے اتفاق ہو سکتے ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے۔ عموماً جڑواں بچوں کے بارے میں تو اس قدر مشابہت سنی ہے بلکہ دیکھی بھی ہے لیکن اس کے علاوہ۔ خیر۔ تم میڈم، پر تو آشکارا نہیں کر بیٹھیں کہ تم لوگ شک میں پڑی ہوئی ہو۔؟"

''نہیں امی۔ اب اتنے بھی بیوقوف نہیں ہیں ہم۔'' ہما نے شرارت سے کہا۔

''اچھا کیا۔ ورنہ الٹا مذاق ہی بنتا تم لوگوں کا۔ بہت ہنستی وہ تمہاری میڈم۔ اور ہاں یہ حنا کہہ رہی ہے کہ تم بتا رہی تھیں ان کا نام بھی ثریا ہے۔'' شہلا کو یاد آیا۔

''جی امی۔ سچ ہماری حیرانی کی انتہا نہیں تھی۔ بڑا مشکل سے سنبھلے ہیں۔ کہ کچھ پڑھے لکھے ہیں اور کچھ سوچ سمجھ سکتے ہیں۔'' اس کی دلکش مسکراہٹ شہلا کے دل میں اتر گئی۔

''اور امی ان کے شوہر تو مجھے بہت پسند آئے۔'' ہما سادگی سے بولی حنا نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ شہلا مسکرا دیں۔

''اچھا کیا خاص بات نظر آئی تمہیں۔؟''

''دیکھیں ناں امی خوبصورت تو ہمارے ہاں بھی اکثر مرد ہیں۔ بس پتا نہیں ان میں کیا خاص بات تھی ہو وہ اتنے اچھے لگ رہے تھے۔ حالانکہ تھوڑے تھوڑے پراؤڈ سے بھی تھے بس امی یوں سمجھ لیں اگر وہ اپنے ہم عمروں میں بیٹھے ہوں تو سب میں نمایاں نظر آئیں گے پتا نہیں کیا بات ہے ان میں۔'' ہما الجھی سی گئی تھی۔

شہلا پھر نٹنگ میں منہمک ہو گئی تھیں۔

پھر ہما نے شہپر کے قصے سے آخر تک تمام واقعات ماں کو سنا ڈالے۔

''کراچی گئے تو ملوانا مجھے بھی۔'' شہلا کے دل میں بھی ہلکا سا اشتیاق جاگا۔

''وہ بھی اگر ان دنوں پاکستان آئے ہوئے ہوں تب بات بن سکے گی۔''

''واقعی ثریا جیسی ہیں۔؟'' شہلا نے پھر پرشوق انداز میں پوچھا۔

''میں بتا نہیں سکتی۔ بس وہ، ذرا چودھرانی و میڈم کا حسین مکسچر ہیں۔ بے حد ماڈ ہیں۔ اس وجہ سے بے حد فرق ہے ورنہ شکل تو بے حد ملتی ہے۔''

''ہاں بیٹے۔ سب مقدر کے کھیل ہیں۔ تمہاری ثریا پھوپھو اس گھر کا سب سے بڑا المیہ ہیں۔ اس گھر کی قدرتی رونق تو اس کے نصیب سے تھی شاید۔ برسوں تڑپا ہے اس گھر کا ایک ایک فرد۔ بڑی مشکل سے بہلاوے ملے ہیں۔ چچا جان کو تو آج تک صبر نہیں آیا۔ مانی کی شوخیاں دیکھنے سننے کو لوگ ترس گئے۔ آج بھی اس میں وہ تازگی لوٹ کر نہیں آئی۔'' شہلا کو ماضی نے پھر افسردہ کر دیا۔

(سب سے بڑا المیہ ثریا پھوپھو نہیں امی۔ بلکہ۔؟ امی۔ آپ کو پیا ذرا یاد نہیں آتے) ہما نے اپنی ماں کے پاتال جتنے ظرف والے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا جہاں ہمیشہ کی طرح سمندر کی سطح جیسا سکون تھا۔ جیسے وہ اس دنیا کی دکھ نا آشنا عورت ہو۔ جیسے اس نے کبھی غم۔ کا نام بھی نہ سنا ہو۔

''چائے بناؤں امی! آپ کے لیے؟'' ہما اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چائے نہیں ہاں سبز قہوہ بنا دو۔ اور دیکھو سرخ بوتل میں سبز الائچی ہے وہ نئی ہے وہ ڈالنا۔'' انہوں نے سلائیوں پر نظریں جمائے جمائے ہی ہدایت دی۔

حنا اوندھی لیٹی کتاب دیکھ رہی تھی۔

''آپی میں بھی۔ پیوں گی۔ پلیز۔''

ہما باہر نکل گئی۔

(کاش تیرے باپ کے نصیب میں بھی تجھ سے خدمت لینا رقم ہوتا۔ آہ وہ بد نصیب انسان)

چچا جان کی حالت سنبھلی تو وہ ہما اور کاشف کے ہمراہ ایک ہفتے کے لیے کراچی چلی آئیں۔ وہ ہما کی شدید خواہش کی بنا پر کشاں کشاں چلی آئی تھیں کہ ہما کراچی میں جاب کرنا چاہتی تھی۔

آتے ہوئے حنا کا منہ پھولا ہوا تھا...... کہ اسے درحقیقت تفریح کے مواقع بہت کم ملتے تھے اور وہ ہما کے کراچی جانے سے ویسے بھی ناخوش تھی۔ اور کہتی تھی۔ آپی کوئٹہ کے مریضوں کا کیا ہو گا۔؟ جو آپ کی خاطر بیمار ہو رہے ہیں۔ شہلا اپنے طور پر تسلی کرنا چاہتی تھیں اور دیکھنا چاہتی تھیں کہ ہما کس طرح ایڈجسٹ ہو گی......؟

ان کی تو ہمیشہ سے میکے میں وی آئی پی کی حیثیت ہوتی تھی۔ مدتوں میں جو آتی تھیں۔

صبور کی دلہن بے حد باذوق تھیں ادب سے خاصا لگاؤ تھا۔ عموماً شہلا کے ہاں جائیں تو شہلا کو بے حد مصروف پا کر کچن ہی میں اچھے سے شعر کی فرمائش کر دیتیں اور کبھی شہلا کراچی آتیں تو وہ خود اپنی مصروفیت کی بنا پر کچن میں شہلا کے ہمراہ کام کرتے ہوئے کسی نظم کی فرمائش کر دیتیں۔

عموماً صبور سے کہا کرتی تھیں کہ میں نے صرف شہلا کی وجہ سے آپ سے شادی کی ہے کہ میں اس خوبصورت دہر دلعزیز شاعرہ کی بڑی بھابی کہلاؤں۔ اس پر صبور ٹکڑا لگاتے۔

''مجھے کچن میں برپا ہونے والے مشاعرے سے اس بات کا احساس دلاتے ہیں۔''

شہلا جھینپ جاتیں۔ بھابی کی بات رد کر دیتیں تو خدشہ ہوتا بھابی کہیں غرور سے تعبیر نہ کریں اس لیے اپنا ایک آدھ شعر سنانا ہی پڑتا اب بھی انہوں نے والہانہ شہلا کا سواگت کیا تھا کہ شہلا کی روح پر پڑے بوجھ سرک سے گئے تھے۔

اور امی۔ انہیں سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھیں۔

سب مجھے ملتے ہیں تو ہنستے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں۔ ن

اور ماں روتی ہے۔

آخر ماں اس قدر آگاہ کیوں ہوتی ہے۔؟

میرے کلیجے پر ٹپکتے قطرے ماں کی آنکھوں میں کیسے پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماں کتنی مقدس ہوتی ہے۔ جو اپنے دکھ خود پیتی ہے اور اولاد کے دکھ اس طرح سنتی ہے کہ زبان کو کلام کا گنہگار نہیں ہونے دیتی۔ یہ وہ گھڑی ہوتی تھی جب وہ خود پر قابو نہیں رکھ پاتی تھیں۔ ان کا برسوں کا زہر آنکھوں کے راستے بہہ نکلتا تھا۔

جو ماں بیٹی سے ملن کے لمحوں میں روتی ہے وہ بہت بڑی کہانی سنا جاتی ہے کہ آنسو تو جدائی کے موقع پر ہی معتبر و بھلے لگتے ہیں۔

عجیب سے غم و خوشی کے لمحے میکے میں گزرتے تھے۔

انہوں نے اپنی آمد کی خبر نہیں دی تھی کہ وہ۔ یہ مختصر عرصہ صرف اپنی ماں کے پاس گزارنا چاہتی تھیں۔ اور اپنی بیٹی کی مدد کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

''شکریہ سر۔ اس میں آپ کی بھرپور محنت و تعاون بھی تو شامل ہے۔''

''یہ تمہاری انکساری ہے۔ ویسے رزلٹ اس مرتبہ بہت اچھا رہا۔ بہت خوش ہوں میں۔'' ڈاکٹر جعفری ہما کو راہداری ہی میں مل گئے تھے۔ اور ہما کو کامیابی پر مبارکباد دے ڈالی تھی۔

''رزلٹ آؤٹ ہوئے آج پانچواں دن ہے آپ کہاں غائب تھے بیٹا۔؟''

''اپنے گھر کوئٹہ۔ یہاں تو میں پڑھنے کے لیے آئی ہوئی تھی سر۔ بس اتنی دور سے آتے آتے دیر تو ہو ہی جاتی ہے۔ مجھے عائشہ اور شمع وغیرہ نے فون پر بتایا تھا۔''

ڈاکٹر جعفری اپنے مخصوص مشفقانہ انداز میں مسکرائے اور آگے بڑھ گئے۔

وہ اوپر پہنچی تو ڈاکٹر جمشید کسی طالب علم سے محو گفتگو تھے۔ پہلے تو ہما نے کچھ سوچا۔ پھر جیسے زبردستی کے انداز میں کہا۔

''السلام علیکم سر۔!''

''وعلیکم السلام۔ ٹھیک ہو۔؟'' انہوں نے خیریت پوچھی۔

''ٹھیک ہوں۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''او ہاں بھئی مبارک ہو۔ آپ کو باقاعدہ ڈاکٹر ہوگئی ہو۔ ہاں۔؟''

''آپ کی دعا سے سر۔ میں دراصل ڈاکٹر صدیقی کو تلاش کر رہی تھی۔''

''آپ کو معلوم ہے سر۔؟ وہ کہاں مل سکیں گے؟'' ہما نے ان پر جانے کیا جتانا چاہا۔

''وہ تو آج چھٹی پر ہیں۔''

اوہ مجھے۔ پتا ہوتا میں کل ہی آ جاتی۔'' ہما نے افسوس ظاہر کیا۔

''کچھ کام تھا ان سے۔؟''

''جی سر؟ لیکن خیر۔ اچھا سر خدا حافظ۔'' وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی کہ ڈاکٹر جمشید کچھ کہہ نہ سکے پھر وہ دوبارہ طالب علم کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

ہما کو یہ انداز اپنا کر بڑی طمانیت کا احساس ہوا تھا۔ اب جیسے اس پر کچھ بوجھ نہیں رہا تھا۔ لیکن جب شام کو اسے سوتے سے جگا کر بتایا گیا کہ اس کا فون ہے تو دل بے تحاشا دھڑک گیا تھا۔ لیکن ریسیور اٹھا کر کان سے چپکایا تو پتا چلا ''اماں جی'' ہیں۔

''ارے بیٹا اتنے دنوں بعد کراچی آئیں اور ملنے بھی نہیں آئیں۔ بیٹیاں ایسی ہوتی ہیں؟''

وہ درحقیقت شرمندہ سی ہوگئی۔

''نہیں اماں جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ابھی تو میں کہیں بھی نہیں گئی۔ نہ عائشہ کے ہاں نہ نازیہ کے ہاں وہ دونوں بہت لڑیں گی مجھ سے انہیں تو اطلاع بھی نہیں دی ابھی۔

''پرسوں ہی رات کو تو آئی ہوں اماں جی۔ کیوں نہیں۔ آپ سے ملنے ضرور آؤں گی۔ اب ت رہنا ہی مجھے کراچی میں ہے۔''

''نہیں اماں جی۔!'' ہما شرما کر ہنس پڑی ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ ایسا فی الحال کوئی چکر نہیں۔''

''نہیں سر کے ساتھ میں ہرگز پریکٹس نہیں کروں گی۔ بس کوئی وجہ نہیں۔ اچھا اماں جی۔ باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔ خدا حافظ۔'' اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''کون تھیں یہ اماں جی۔؟ ہما اور شہلا حیران سی تھیں۔

''ارے وہ ہما کے پروفیسر جمشید کی والدہ ہیں۔ بہت اچھی عادت کی ہیں۔ میں ملی ہوں ان سے۔'' ہما کے بجائے شہلا کی امی بولیں۔

''جی امی بہت اچھی ہیں۔ اکثر اسٹوڈنٹس ان سے مل کر ''سر'' کو بھول جاتے ہیں۔ اور پھر زیادہ تر اماں جی سے ملنے جاتے ہیں۔ اتنے مزے کے پکوڑے بنا کر کھلاتی ہیں کہ کیا بتاؤں۔''

''تو یوں کہو کہ پکوڑے کھانے جاتے ہیں۔'' وہ ہنس دیں۔

''نہیں۔ امی۔ ایسی بات نہیں۔'' ہما جھینپ کر خود ہی ہنس دی تھی۔

☆☆☆

''تھوڑی دیر اور بیٹھ جاؤ ہما۔ چار بجے وہ تیار ہو کر باہر آئے گا۔ کلینک جانے کے لیے۔ بس دن بھر میں یہ واحد ایک گھنٹہ اس کے آرام کا ہے۔''

''مجھے نازیہ کی طرف بھی جانا ہے اماں جی پھر شام ہو جائے گی۔'' اس نے پریشانی ظاہر کی۔

''ارے کیسے جانے دوں وہ مجھ سے خفا ہوگا کہ میں نے تمہیں جانے کیوں دیا۔؟ جب آئی ہو تو مل کر جاؤ اب کالج سے نکل گئی ہو تو کیا سلام بھی نہیں کرو گی۔'' انہوں نے چھیڑا۔

ہما مسکرا پڑی۔ اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

''اچھا اماں جی۔ کر لیتے ہیں انتظار۔''

''میں اس احسان پر مس حسن کا مشکور و ممنون ہوں۔'' اسے عقب سے جمشید کی آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر دیکھا وہ مدھم سا مسکرا رہے تھے۔ ہما کھسیا سی گئی تھی۔

''السلام علیکم سر۔!''

''وعلیکم السلام۔ مزاج بخیر۔''

''ارے آج تو ہما پر جلدی سوار ہے۔ چائے تک پینے پر آمادہ نہیں۔'' اماں جی نے بیٹے سے شکوہ کیا۔

''خیریت تو ہے ہما۔؟''

''بالکل خیریت ہے سر۔''

''آپ چائے کے لیے کہہ دیں اماں جی۔'' جمشید ماں سے مخاطب ہوئے ان کے لہجے میں مضبوطی تھی۔ اب حنا کو انکار کرنا مصنوعی لگا لہٰذا خاموش ہو رہی۔

''اب کیا ارادے ہیں۔؟'' انہوں نے بڑے وقار سے پوچھا۔

''پریکٹس کا ارادہ ہے سر۔''

''یہ اسپشلائزیشن کا دور ہے۔ آپ کے بہت کلاس فیلوز ایسا ہی سوچ رہے ہیں!''

''لیکن جانے کیوں مجھے پر پریکٹس کرنے کی جلدی ہے۔ سر۔'' وہ فوراً بولی تھی۔

''مرضی ہے آپ کی۔ کہاں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔؟''

''کسی ماہر کی زیر نگرانی۔ تمہیں تو قطعی ماہر ماننے پر آمادہ نہیں لہٰذا تمہارے زیر نگرانی تو پریکٹس کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

اماں جی اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔ تو ہما شرمندہ سی ہوگئی۔

''واقعی ہما......؟ جمشید حیران سے ہوئے۔

''یہ بات نہیں ہے سر۔'' اس کا لہجہ مدھم سا تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے ایسی ہی پیشکش میں نے بھی کبھی کی تھی۔"

"آپ کو یاد ہے سر۔؟" ہما کا لہجہ استہزائیہ سا تھا۔

"بہت اچھی طرح۔" انہیں ہما کے اس انداز پر تعجب سا ہوا۔ "شاید تم خود بھول گئی تھیں۔ ہما۔ کمال ہے تم میری بات کو کوئی وقعت ہی نہیں دیتیں۔"

ہما۔ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

ڈاکٹر جمشید بوکھلا گئے۔ اماں جی لپک کر ہما کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

"کیا ہوا بیٹا......؟ ہما......ارے بیٹی۔ خیر تو ہے۔" وہ بہت پریشان تھیں۔

"اماں جی۔ میری انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں کراچی ڈائل کرتے کرتے۔ بتایئے میں نے کتنے فون کیے۔؟"

"میں نے بتایا تھا جمشید کو......لیکن اس میں رونے کی کیا بات ہے۔" خواہ مخواہ پیچھے پھروں اور کوئی میری بات کا جواب بھی نہ دے۔" اس نے ہچکیاں بھریں۔

اماں جی بے ساختہ مسکرا دیں۔ پھر ضبط کرتے ہوئے بولیں۔

"کیوں نہیں ہے تمہاری حیثیت۔ بلکہ زوردار ہے۔

اسے دراصل کام بہت رہتے ہیں بیٹی۔ اکثر بھول جاتا ہے۔ چلو جانے دو۔ اتنے حساس نہیں بنتے بیٹی زندگی کا ٹنا دوبھر ہو جائے گی۔"

اب ہما بے وقت نکل پڑنے والے آنسوؤں کی وجہ سے خجل تھی۔

"تین فون آئے تھے ہما کے کوئٹہ سے ..... کہ امی آمادہ نہیں ہیں لہٰذا تم اس کی امی سے بات کر کے انہیں اطمینان دلا دو۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا جمشید۔"

"جی اماں جی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" جمشید جو ہما کے رونے سے حیران پریشان تھے جلدی سے بولے تھے۔ "دراصل میں نے سوچا تھا جب ہما رزلٹ آؤٹ ہونے پر کراچی آئیں گی تو بات ہو جائے گی۔ بے وقت بات کرتا تو ہو سکتا ہے ان کی امی اس اصرار کو کوئی اور رنگ دیتیں۔" وہ صاف گوئی سے بولے۔

ہما کا دل دھڑک گیا (آپ کیا رنگ دیں گے؟)

اب تو اسے اپنے رونے پر مزید ندامت ہوئی مارے شرمندگی کے اس سے نظریں نہ اٹھائی گئیں۔

ملازمہ چائے لے آئی تھی۔ ہما نے بمشکل پی۔ جمشید سامنے بیٹھے تھے اور وہ اپنی بیوقوفی پر نادم تھی۔ اماں جی چائے پیتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دیر ہو گئی ہے اب میں چلتی ہوں اماں جی۔ گھر میں سب پریشان ہو جائیں گے۔

"جھٹپٹا ہو چلا ہے۔ جمشید جاؤ ہما کم از کم اس کے اسٹاپ تک تو چھوڑ آؤ۔"

"نہیں اماں جی!" وہ گھبرا گئی ڈرکا کا ٹائم ضائع ہوگا۔ میں چلی جاؤں گی۔"

"کوئی ٹائم ضائع نہیں ہوتا۔ لگے بندھے معمولات سے کبھی کبھار ہٹ بھی جانا چاہیے۔" وہ اس لیے گھبرا رہی تھی کہ راستے میں "آنسوؤں" پر بات آ گئی تو وہ کیا کرے گی۔؟ کیا کہے گی۔

اماں جی پورچ تک آئیں۔

"ہما۔ اب تو انشاء اللہ جلد ملاقات ہوا کرے گی۔ اب آخر جمشید کی اسسٹنٹ ہو گئی ہو۔"

"ہوئی کہاں ہوں اماں جی۔؟"

"ارے۔ سمجھو ہو ہی گئیں۔ اور ہاں۔ تم نے اپنی امی سے نہیں ملوایا بہت غلط بات ہے۔"

"میں کوشش کروں گی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

جمشید نے فرنٹ ڈور کا لاک اگرچہ کھول دیا تھا لیکن دروازہ نہیں کھولا تھا۔ احتیاط میں گہری سوچ کا عکس ہوتا ہے۔

حد درجہ احتیاط بھی بہت سے بھید کھول دیتی ہے۔

جن کی پروا نہیں ہوتی ان سے احتیاط بھی نہیں کی جاتی۔

بعض اوقات۔ احتیاط بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اور خاص لوگوں کے لیے ہوتی ہے۔ ع دور بیٹھو گے تو چرچا ہوگا کے مصداق! اس نے دروازہ کھولا اور بیٹھ گئی۔

"خدا حافظ اماں جی۔"

تھوڑی دیر اسی پروقار انداز میں جمشید گاڑی ڈرائیو کرتے رہے۔ پھر ہما پر اچٹتی سی نظر ڈال کر بولے۔

"تم نے مجھے اماں جی کے سامنے اچھا بھلا شرمندہ کروا دیا ہما۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں سر۔ پتا نہیں مجھے آپ کا اگنور کرنا اپنی انسلٹ کیوں لگا تھا سر۔"

ہر بات جان پر نہیں لیا کرتے۔ لائف بہت ٹف ہے ہما۔ بہت امتحان کے گی ذرا ذرا سی بات پر اس طرح ٹل کرو گی تو زندہ کیسے رہو گی۔"

"میں نے اپنی زندگی میں بہت کڑے امتحان دیے ہیں سر۔ اور میں اس طرح سب کی پروا بھی نہیں کرتی اور اس طرح روتی بھی نہیں ہوں۔" اس نے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔ جمشید ایک دم خاموش ہو گئے۔ پھر بولے۔

"تم بہت اچھی۔ بے حد اچھی لڑکی ہو ہما۔"

"شکریہ سر۔!"

"کیونکہ ایک حقیقت پسند شخص ہوں لہٰذا زندگی سے ہر چیز حقیقی انداز میں لینے کی کوشش کروں گا۔ کسی بھی چیز کے حصول سے پہلے خوابوں میں مگن رہنا زندگی کے ساتھ ناانصافی ہے اس لیے کہ عمل میں توقف آ جاتا ہے۔" ہما کا دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آیا چاہتا تھا۔

کالج میں مشہور تھا۔ ڈاکٹر جمشید مشکل سے مشکل بات بہت آسانی سے ہر کیٹیگری کے اسٹوڈنٹ تک منتقل کرنے میں لاثانی ہیں۔

ہما کو یقین آ گیا۔

اتنی مشکل بات اتنا مشکل مرحلہ۔ آ کر گزر بھی گیا پتا بھی نہ چلا۔

وہ بات جس کے لیے دفتر ہو جاتے ہیں۔ ایک پیرائے کی محتاج بھی نہیں ہوئی تھی آج جو ہما نانی کے گھر داخل ہوئی تھی۔ محروم نہیں تھی۔

☆☆☆

شہلا سے اور دوسرے گھر والوں سے ملاقات کے بعد اماں جی شہلا کے کوئٹہ جانے کے بعد کچھ ہی دن گزرنے پر خود بھی کوئٹہ جا پہنچی تھیں کہ شہلا کا کہنا تھا وہ ہما کے والد اور دادا سے بات کریں۔ اور کچھ تلخ حقائق بھی حاصل نہ کریں۔

اماں جی کو جہاں گھر بار، خاندان وتہذیب نے متاثر کیا تھا وہیں ایک پھانس بھی ان کے سینے میں گڑ گئی تھی۔

ایک رات جب شہلا سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ وہ خاموشی سے اندر چلی آئیں۔

انہوں نے بہت اپنائیت سے دونوں میاں بیوی کی علیحدگی کا سبب جاننا چاہا۔ ان کے انداز میں اتنی اپنائیت اور سادگی تھی کہ شہلا کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"باجی۔ مجھے آنسو بہاتے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس ایک بات کی وجہ سے آپ تعلق قائم کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں تو۔ میں صبر کرلوں گی اور ہما کو بھی صبر کرنا ہوگا۔"

شاید آپ کو حیرانی ہو کہ وہ بات سوائے میرے سسر کے کوئی نہیں جانتا۔ وہ بار جس سے کوئی فائدہ نہ ہو بتانے کا کیا فائدہ؟"

"کم ازکم شہلا آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔ نئی رشتہ داریاں قائم کرنے سے پہلے مجھے اطمینان کرنے کا پورا حق حاصل ہے یا نہیں۔؟"

"بالکل حاصل ہے۔ لیکن باجی! وہ وجہ جان کر بھی سب کچھ لا حاصل ہوگا۔"

"تم مجھے اپنی بڑی بہن سمجھ کر ہی جی ہلکا کرسکتی ہو...... میں ہنسی اڑانے والوں میں سے نہیں ہوں شہلا!"

ان کے لہجے میں جانے کیا تھا۔ شہلا نے انہیں حرف حرف جو سراسر حقائق پر مبنی تھا بتا ڈالا۔

وہ دم سادھے سنتی رہیں۔ شہلا زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کے سامنے جی کھول کر روئیں۔

"کیسی ناحق کاٹی ہے آپ نے شہلا۔" انہوں نے سنہری عینک اتار کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"آپکے کردار کی گواہی تو آپ کے سسر کا رویہ ہے جو اب کے ساتھ ہے۔"

شہلا کے دل کو یہ جملہ سن کر بہت تقویت ملی۔

خدا معلوم وہ ظالم اب خود کس حال میں ہوگا۔ آہ۔ جب ہی تو ہما اتنی سنجیدہ اور بے حد حساس ہے۔ اس طرح کے ماحول میں بچے اسی طرح غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی آفرین ہے آپ پر کہ آپ نے اپنے بچوں کی اتنی بہترین تربیت کی۔ شاباش ہے آپ کو......"

میں تو بیوہ تھی ساری زندگی محرومی کے ساتھ جیتی رہی اور خود کو کم نصیب سمجھتی رہی اور آپ۔ کنواں ہوتے پیاسی رہی ہیں۔

مرد کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی بیوی بھی اس دنیا کی ایک کارآمد اور بامعنی حصہ دار ہے۔ آپکا کہنا بھی بجا۔ کوئی انسان خود کو کہاں تک گرائے ہما مجھے بہت پہلے سے اس نیت سے پسند تھی۔ لیکن کیونکہ جمشید کا اس سے بڑا معتبر سا رشتہ تھا اس لیے میں چپ رہی کہ جانے بچی اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ جمشید سے ایک دو بار پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ بلکہ پہلی بار تو یہ کہا تھا کہ کیسی باتیں کرتی ہیں اماں جی؟

اب اس نے از خود کہا کہ کوشش کر دیکھیں۔ مجھے خوشی ہوئی۔ اب یہاں سے جا کر میں اپنے دیور سے مشورہ بھی کروں گی۔"

(اب بھی مشورے کا مرحلہ باقی ہے؟) شہلا چونک پڑیں۔

انہیں اماں جی الجھی الجھی سی لگیں۔

"اللہ رکھے میرے بھائی بھی ہیں۔ وہ بھی میرے گھر کے افراد کی طرح ہیں۔ زندگی کے ہر مرحلے پر وہ میری

ڈھارس بندھاتے رہے ہیں۔ ابھی تو میں آپ لوگوں سے ملنے کی نیت سے آئی تھی۔ وہاں جاتے ہی باقاعدہ پیام بھیجوں گی۔"

وہ دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے اپنے رہائشی کمرے میں چلی گئیں۔ شہلا کو گہری سوچوں میں ڈال کر۔

محترمی ومکرمی حسن زید!

السلام علیکم!

الحمدللہ، خیریت سے مطلع کرتے ہوئے آپ کی خیریت کی طالب و بصد خلوص دل دعا گو ہوں میں ڈاکٹر جمشید کی والدہ آپ سے مخاطب ہوں۔ آپ سے کوئٹہ میں ملاقات کی سعادت حاصل ہو چکی ہے آپ کی بیٹی ہما کو اپنی بیٹی بنانے کے ارادے سے میں کوئٹہ گئی تھی اور آپ پر اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس رشتے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تقریباً سب کی تائید حاصل تھی۔ لیکن یہاں آ کر مجھے بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

میرے بے حد قریبی عزیز اس بات سے سخت پریشان ہوئے کہ ہما کے والدین علیحدگی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں۔ خاندانی لوگ تو تمام تر نزاکتوں کا خیال رکھتے ہیں اور پھر جب کسی نئے خاندان میں رشتہ قائم کیا جاتا ہے تو بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

میرے خیال میں منتشر خاندان کی بیٹی کو سسرال میں وہ مقام نہیں مل پاتا جس کی وہ حقدار ہوتی ہے۔ اور جو اسے بیاہ کرلاتے ہیں۔ انہیں بھی وہ خوشی نہیں ہوتی جو ہونا چاہیے۔

ہر چند کہ ہما اور جمشید ایک دوسرے کی رفاقت پر دلی طور سے آمدہ ہیں لیکن خاندن کی مخالفت مول لے کر شاید میں کوئی فیصلہ نہ کرسکوں۔ کیونکہ جو لوگ مخالف ہیں وہ میرے مشکل دنوں کے آزمائے ہوئے اور قابل اعتبار رفقاء ہیں۔ اگر آپ اپنی بچی کی خوشی عزیز رکھتے ہیں تو بھی راستہ آپ کے سامنے ہے یہ ہما کی خوش نصیبی ہوسکتی ہے کہ آپ نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی۔ امید ہے آپ غور فرمائیں گے۔

آپ کی مخلص

بیگم سطوت عبدالرحمٰن

حسن نے خط پھاڑ دینا چاہا مگر رک گئے۔ کس بات پر نازاں ہیں یہ خاتون؟ ہونہہ۔ کیا ہما کو جمشید سے بہتر کوئی رشتہ نہیں مل سکے گا؟ انہوں نے خط فائل کے نیچے دبا دیا۔

دو دن دو راتیں یہ خط ان کے اعصاب پر سوار رہا۔ تیسرے دن باپ کا فون آ گیا وہ فوراً ان سے ملنے آ جائیں۔ انہیں شبہ تھا کہ انہیں اسی سلسلے میں بلایا جا رہا ہے۔ ناچار جانا تو تھا ہی نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنی رہائش کی جانب مڑنے کے بجائے دارالسلام کو رخ کر گئے۔

ان کی گاڑی عموماً گیٹ کے باہر ہی کھڑی ہوتی تھی۔ لیکن اس روز وہ سیدھے پورچ ہی میں لے گئے۔ دائیں جانب لان میں مانی اور کاشف شطرنج کی بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ دونوں نے سر اٹھا کر اس کلف دار سے شخص کو دیکھا۔ جو بہرحال ان کا بہت اپنا تھا۔ دونوں اٹھ کر نزدیک آنے لگے۔

سامنے شہلا رائل بلو ساڑھی میں ملبوس سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ پیچھے پیچھے حنا منہ بسورتی آ رہی تھی۔ شاید شہلا کہیں جا رہی تھیں۔

(کوئی فرق نہیں بڑا حسن زید تمہارے اس گھر سے چلے جانے سے) پھر کوئی چیز ان کے اندر ٹوٹی تھی۔ اور

پھر وہ سنبھل گئے تھے۔

''السلام علیکم بھائی جان۔

''السلام علیکم پپا۔'' کاشف بھی مودبانہ بولا۔

''اوہ۔پپا آئے ہیں۔'' حنا نے ایک جست میں زینے پھلانگے اور شہلا اسی وقار سے باہر کھڑی گاڑی کی طرف بڑھ گئیں۔(کیوں اتنا چہک کر استقبال کرتی ہے تو حنا۔اس پتھر میں کچھ تو ملال رہنے دے)وہ گاڑی آگے بڑھا گئیں۔

''ابو۔اپنے کمرے میں ہیں؟'' وہ مانی کی طرف متوجہ ہوئے۔

''جی آیئے'' وہ بھی اپنے باپ کی طرح آج بھی خوش امید تھا۔ بھائی کو لے کر باپ کی طرف بڑھ گیا۔

جب آدھے گھنٹے بعد حنا ٹرالی لے کر دادا کے کمرے کی طرف آئی تو اس کے قدم رک گئے

''انہوں نے مجھے بھی اسی قسم کا خط لکھا ہے۔میرا خیال ہے بیگم رحمٰن غلط نہیں ہیں۔یہ تو خیر میں بھی کہتا ہوں۔''

''ابو میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی آپ آخر ایک بات کو بار بار کیوں دہراتے ہیں۔معاف فرمایئے گا۔''

''حسن!میں نے تم سا خود غرض انسان اس دنیا میں نہیں دیکھا امان کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ یہ بھی تمہارا سگا بھائی ہے۔تمہارے بچوں کو جس طرح اس نے اپنے بچوں سے بڑھ کر سمجھا ہے۔تم سوچ بھی نہیں سکتے ہم نے تمہاری خوشیاں پوری کی تھیں۔تمہیں اپنے بچوں کے احساسات کا خیال رکھنا چاہیے۔کیا تمہارے سینے میں پتھر ہے تم کیسے باپ ہو۔آخر تم نے دیا ہی کیا ہے اپنے بچوں کو؟''

''آپ کیا جانتے ہیں۔ہم گر کر بیٹی دیں؟جھک کر ملیں؟'' وہ جھنجلائے۔

''تمہیں بیٹی کا باپ بننا نہیں آیا حسن!بیٹیاں جھک کر ہی دی جاتی ہیں۔جو جھک کر نہیں دیتے وہ دینے کے بعد جھک جاتے ہیں۔بیٹی خود نہیں جھکاتی اس کی تقدیر جھکا سکتی ہے۔ان راستوں میں انا نہیں گزرتی حسن!صاف صاف کہہ دو تمہیں ہما حنا کی نہ پرواہ ہے نہ فکر۔تم میرے کس گناہ کی سزا ہو حسن؟''

باپ کی آواز بھراتی تو مانی کے اندر بھی کچھ ٹوٹ گیا اور پگھلنے لگا۔

''بھائی جان!میں نے کبھی تکرار کی کوشش نہیں کی آپ سے لیکن اب میں بھی کہہ رہا ہوں۔ہم اپنی زندگی جی چکے۔ہمیں اب اپنے بچوں کی زندگی گزارنا ہے۔''

''ایک تو میری یہ سمجھ میں نہیں آتا آپ لوگ دوسروں کے آگے اس قدر گر کیوں جاتے ہیں؟''

''معاشرتی و خاندانی رابطے کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر قائم ہوتے ہیں۔حسن!تمہیں ابھی تک اس دنیا میں رہنا نہیں آیا۔''

نعوذ باللہ،تم قادر کن نہیں ہو کہ ہر شے تمہاری انا اور منشا کے مطابق ہوگی۔''

''حنا اندر داخل ہوئی تو گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لیے منقطع ہو گیا۔تھوڑی دیر بعد حسن یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے کہ غور کروں گا۔'' مانی کو ایسا محسوس ہوا گویا دارالسلام سے کوئی نور کا فرشتہ گزر رہا ہو۔اور روشنی کا جھماکا سا ہوا ہو۔

شہلا نے ہما کے کھلے گلاب جیسے چہرے کو دیکھ کر سکون کا سانس بھرا تھا۔

حالانکہ جمشید عمر میں اس سے کافی بڑے تھے۔اسی بات کو انہوں نے ہما کے سامنے رکھ کر وجہ جاننا چاہی تو اس نے ماں سے کہا تھا۔

امی!مجھے میچور لوگ پسند ہیں۔جو ٹھوس بنیادوں پر سوچتے ہوں اور پھر فیصلہ کر کے ایک انچ پیچھے نہ ہٹتے ہوں

۔جو ہر شے کو اس کی حقیقت کے ساتھ دیکھیں اور سنیں۔محض ظاہر ہی پر مطمئن ہونے والے نہ ہوں۔میں کسی کھلنڈرے سے ہم عمر لڑکے کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔مجھے بڑی عمر کے لوگ پسند ہیں۔ہمیشہ سے......''

شاید اس پسند کی تہہ میں بھی کوئی محرومی پڑی کراہ رہی ہو۔شہلا نے دکھ سے سوچا۔

درحقیقت جمشید انہیں بے انتہا پسند آئے تھے۔بلکہ بیٹی کے انتخاب نے ان پر اس کی سوچ آشکار کر دی تھی۔ہما جیسی سنجیدہ باوقار لڑکی کے لیے انہیں جمشید موزوں ترین لگے تھے۔

وہ چاہتی تھیں کہ ان کی حساس سی بیٹی کو اتنی خوشیاں ملیں کہ وہ اپنی ہر محرومی بھول جائے۔شہلا واڈروب ٹھیک کرنے لگیں......حنا اندر داخل ہوئی۔

امی۔میں آپی کو فون رک رہی ہوں۔آپ نے تو بات نہیں کرنی؟''

یہ کیا تم روز روز فون کھڑکانے لگی ہو؟''

آپی کو تو آپ کبھی نہیں کہتیں اس طرح۔''

''وہ تمہاری طرح فالتو باتیں نہیں کرتی۔'' انہوں نے گڑیا سی حنا کو بظاہر خفگی سے دیکھا۔

''آپ بس آپی کو بہت چاہتی ہیں۔ہم سوتیلے ہیں نا۔'' اس نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''بس تمہیں اس سے مقابلے کی پڑی رہتی ہے۔اس کی تو میں شادی بھی کر رہی ہوں۔تم کہو گی میری بھی کر دیں۔ابھی بتا دو اگر ضد کرنے کا ارادہ ہے تو عین وقت پر ریڈی میڈ داماد کہاں سے لاؤں گی؟''

''امی!'' حنا شرما کر ان کے کندھے سے لگ گئی۔

''امی......جب کوئی عورت ماں بنتی ہے تو اس کی اپنی خوشی وا پنے غم نہیں ہوتے۔اس کے بچے خوش و آسودہ ہوں تو وہ بھی خوش ہوتی ہے۔بچے اداس ہوں تو میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔ماں اس سے زیادہ اداس ہوتی ہے۔''

شہلا نے ہینگر پر جرسی لٹکائی اور حنا کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''جی امی......جب ہی تو ہمارا دل چاہتا ہے۔آپ کے پاؤں دھو دھو کر پئیں۔''

وہ اتنی معصومیت و سادگی سے بولی کہ شہلا نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

''میرے منہ سے نکلنے والی ہر دعا تمہارے لیے ہے میرے بچو!''

حنا باوجود کوشش کے باپ دادا اور چچا کے مابین ہونے والی گفتگو شہلا کو نہ بتا سکی۔اسے تو یہ سوچ کر ہی خوف آ گیا تھا اگر ماں کے لبوں پر کھیلتی یہ سچی مسکراہٹ پر غائب ہو گئی تو؟

ملک نواز،آمنہ،شہپر و شہ پارہ امریکہ جا چکے تھے۔ملکانی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔اس لیے ثریا از خود ٹھہر گئی تھی۔شہریار کافی چھوٹا تھا۔لہٰذا وہ بھی ماں ہی کے ساتھ تھا۔

وہی اپنی مہربان ساس کو اپنی طرف سے شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔اس کی غیر موجودگی میں ان کی حالت بگڑتی تو اور بات تھی۔اب انہیں بستر علالت پر چھوڑ کر جانا سے اچھا نہیں لگا۔

اس نے یہ بات نوٹ کی کہ ملکانی سخت بیماری کے باوجود اس کی طرف سے بے حد چوکس ہیں۔وہ کبھی کسی کے ساتھ اسے اکیلا نہیں چھوڑتی تھیں۔

اسے بے حد عجیب سا لگتا تھا۔جب کہ اس کی جٹھانی تو ہر جگہ دندناتی پھرتی تھی۔بعض اوقات تو عجیب بے ربط سی باتیں کیا کرتیں۔

"دھیے...... مجھے معاف کریں۔"

وہ پریشان ہو جاتی کہ وہ اس سے کس چیز کی معافی مانگتی ہیں۔ ایک دن اسے قریب بلا کر بولیں۔

"جو زخم لگاندا ہے ثریا! اگر اسے مرہم رکھنے کا خیال آ جائے تو اس کی بڑی مہربانی۔ ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں تو لوگ پچھانے (پہنچانے) سے انکار کر دیندے نیں۔" وہ اپنی اسی لنگڑی اردو میں بولیں۔

ثریا حیران و پریشان ان کی صورت تکا کرتی۔

"اماں جی...... مجھے تو آپ کی بات سمجھ نہیں آئی۔"

"ثریا!"

"جی اماں جی......؟"

"دھیئے...... توں۔ تے میری دھی اے۔ ہم تے سارے تینوں پیار کردے نہیں میری دھی۔ معاف کردویں سانوں۔"

"اماں جی...... اس طرح نہ کریں...... آپ تو میری ماں ہیں۔ معافی تو مجھے آپ سے مانگنی چاہیے۔ آپ کی خدمت بھی نہیں کر سکی......" ثریا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسے ملکانی کی بگڑتی حالت سے بہت خوف آ رہا تھا۔

"ثریا......؟"

"جی اماں جی......؟"

"دھیئے...... میرا پتر...... زبان دا کوڑا اے پر دل دا برا نہیں...... اودا خیال رکھیں۔ اسے پیار دیویں۔ اور ہدی گلاں دا برا نہ منیں۔" (بیٹی...... میرا بیٹا زبان کا کڑوا ہے مگر دل کا برا نہیں۔ اسے پیار دینا۔ اس کی باتوں کا برا نہ ماننا)

"اماں جی...... آپ یہ سب سوچ کر پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔ بے فکر رہیں۔"

"ثریا۔ میری اکھاں وچ اودی تصویر پھردی اے...... اونوں کہہ...... آ جا...... امڑی کول۔" اب وہ رو رہی تھیں۔

"میں انہیں آج ہی فون کردوں گی اماں جی۔ آپ روئیں مت۔"

سعیدہ بہت سی رشتے دار خواتین کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سب ملکانی کے اردگرد بیٹھ گئیں۔ ملکانی نے ثریا کو اشارے سے کہا وہ باہر چلی جائے۔

جن لوگوں کی محبت کی اصلیت پر کوئی شک وشبہ نہ ہوا اور مکمل بھروسا ہو ان کی طرف خواہ مخواہ بدگمانی پیدا نہیں ہوتی۔

ثریا نے ان کو آزمایا تھا۔ ملکانی کی چاہت بے ریا پائی تھی...... اس لیے وہ اٹھ کر باہر چلی آئی۔ سوچا بھی نہیں کہ ملکانی نے اسے ان عورتوں کے پاس سے کیوں ہٹایا......؟

اگر میں ملک کو فون کردوں تو کیا ملک آ جائیں گے......؟

انہیں آنا تو چاہیے ہر حال میں۔ ماں دوبارہ تو نہیں ملتی۔ ملازمت دوبارہ مل سکتی ہے۔ کہوں گی آپ شہپر وشہ پارہ کو مس آمنہ کے پاس چھوڑ کر چاہے دو دن ہی کے لیے آ جائیں۔ کہیں خدانخواستہ......

اس کے دل کو انجان واہموں نے ستایا...... ملک...... وہ ڈھارس تو آپ سے بھی نہیں ملتی جو اماں جی سے ملتی ہے۔ اور آپ بھی تو کہتے ہیں آپ کی ماں آپ کی خاطر کتنا بدل گئی ہے۔ ورنہ سنا ہے وہ کافی گرم مزاج تھیں۔ آہ ماں...... ملک آپ کو آنا چاہیے۔

☆☆☆

مزید کئی طوفانوں سے نبرد آزما ہو کر شہلا بظاہر خوش کراچی آئی تھیں۔ ان کا دل جمشید کی والدہ کی طرف سے میلا سا ہو گیا تھا...... ان کا خیال تھا کہ ان کی والدہ نے سیدھی سادھی بات میں خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کی تھیں۔ لیکن اب ہما کی خاطر انہوں نے بہت کچھ برداشت کرنا تھا۔ انہیں احساس تھا ہما کی اس خواہش کی تکمیل کس قدر ضروری ہے۔ لہٰذا بہت سے جبر سہہ کر وہ مزید بات آگے بڑھانے کراچی آئی تھیں۔ اس مرتبہ کے ہمراہ حنا بھی تھی۔

بھائی جان نے اس مخصوص دوستانہ انداز میں سرگوشی کر کے کہا تھا۔

"مبارک ہو شہلا......"

شہلا کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر رو پڑیں......" کس بات کی مبارک باد بھابی......؟ میرے وجود کو صحرا کی خاک بنا کر وہ واپس پلٹا ہے...... میں آج بھی اس کی شکل سے بیزار ہوں۔ اب نہ وہ مجھے سہاگن کر سکے گا...... نہ میں ہو سکوں گی...... لوگ زبردستی کر کے کتنے خوش ہوتے ہیں بھابی۔

جسم کو قید کیا ہے تو کیا؟
روح کو قید کرے کوئی زندانوں میں

کیسی معصوم ہیں ہما کی ساس...... وہ اس عمر میں مجھے وہ دینا چاہتی ہیں جس کی مجھے ذرا طلب نہیں...... وہ میری روح کی سچائیوں میں جھانک لیتیں تو۔ شاید یہ ڈرامہ نہ کرتیں۔ کیوں کہ اس عمر میں اس آدمی کا سر جھکا بھی دیا تو مجھے کیا ملا......؟

لاؤ کوئی دلیل
لے کر آؤ کوئی برہان
جو ثابت کر سکے کہ روح کے گھاؤ بھی بھر جاتے ہیں۔
دل آزادی کرنے والے......
اگر اس سیاہ کفر کی حقیقتوں میں جھانک لیں......
تو کانپ کر ماتھا ٹیک کر معافی چاہیں۔

مصیبت تو یہی ہے جو دل آزاری کرتے ہیں وہ اکثر ذہن رسا نہیں رکھتے...... اور تمام عمر خود کو دانش مند منوانے کی سعی میں مصروف ہوتے ہیں۔

حالانکہ جو دل آزاری کرتا ہے...... وہ دانش مند کب ہوتا ہے......؟"

انہوں نے ماں کی طرف دیکھا۔ وہ پھر سب سے زیادہ خوش تھی۔ جس طرح وہ دکھی بھی سب سے زیادہ ہوتی تھیں معاملات اگرچہ یہ حسن وخوبی انجام پا رہے تھے لیکن شہلا جب بھی ہارون کی طرف دیکھتیں ان کے حساس قلب پر تازیانہ سا لگتا۔

انہوں نے نگہت سے کہہ دیا تھا کہ اگر ہارون بخوشی چاہے تو وہ حنا کے لیے انکار نہیں کریں گی۔ انہوں نے سوچا تھا وہ اس بن ماں باپ کے لائق سے نوجوان کو اپنا داماد بنا کر اتنا پیار دیں گی اتنی عزت افزائی کریں گی کہ وہ اپنے سب غم بھلا دے گا۔

ان کی بیٹی بے حد شائستہ اطوار معصوم ہے۔

اس کی صورت بھی پیاری ہے۔

وہ کسی سے کم نہیں ہے ہارون۔

وہ تمہیں بے ساختہ دوالہانہ پیار دے گی...... ہو تمہیں ہما جیسی محتاط لڑکی سے شاید نہ مل پاتا۔ شاید تمہاری ساری عمر اسے بازیافت کرتے گزر جاتی۔

نگہت نے ہارون سے بات کرنے کے بعد جواب سے جلد مطلع کرنے کو کہا تھا۔

"یہ تو میرے لیے انتہائی اعزاز کی بات ہے۔ کہ جمشید کے واسطے ہی سے سہی آپ ہمارے رشتے دار کہلائیں...... پچھلی دو ملاقاتیں تو بے حد تشنہ رہیں۔ اسی لیے آج میں نے آپ کو تنہا مدعو کیا ہے۔ آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے میرا۔ ایک بات کہوں شہلا آپ سے......؟"

"جی؟"

"آپ تصاویر میں اتنی پیاری نہیں دکھائی دیتیں جتنی حقیقت میں ہیں۔"

"ارے......!" شہلا ہنس پڑیں...... "اب کیا عمر ہے میری اور کیا تعریف کر رہی ہیں آپ۔" "سچ آپ تو لگتی ہی نہیں کہ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہیں۔ البتہ آپ کے شوہر یقیناً کافی عمر کے یعنی اصل عمر کے لگتے ہوں گے۔"

"نہیں وہ بھی نہیں لگتے اتفاق سے......" شہلا نے جبراً اور زمانہ ساز مسکراہٹ کر ساتھ جواب دیا۔

"بہت خوب...... اب تو آپ بے پناہ مصروف ہو جائیں گی۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے بھی اپنی ایک بیٹی کی شادی کی ہے...... بہت کام ہوتا ہے بیٹی کی شادی میں۔ اسے بھی بلایا ہے۔ اسے بھی بہت شوق ہے آپ سے ملنے کا۔ اس دن پتا نہیں کیوں وہ اپنی پھپھو کے ہاں نہیں پہنچ سکی......"

تھوڑی دیر مسز باقر شہلا سے خاندانی اتار چڑھاؤ جیسی روایتی گفتگو کرتی رہیں۔ پھر ایک دو البم تھما کر کچن میں چلی گئیں۔

ایک ان کی بیٹی کی شادی کی تصاویر سے پر اور نیا تھا ایک کافی پرانا۔

البم کھولتے ہی ایک دو تصاویر جو علیحدہ ہوں گی پھسل کر نیچے قالین پر گر پڑیں۔ شہلا نے دونوں کارڈ سائز تصاویر پر نظر ڈالی۔ کائنات کی گردش گویا ٹھہر سی گئی۔

ان کے سامنے خوبصورت سے لانگ ڈریس میں ملبوس ثریا بیڈ کی پشت سے ٹکی ہوئی تھی۔ اس کی گود میں ایک بے حد خوبصورت وتندرست بچہ تھا۔ اس کے برابر میں وہ بیٹھا تھا۔ چہرے پر بیزاری سجائے۔ وہ جسے وہ کروڑوں انسانوں میں پہچان سکتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی خوبصورت وپُر بہار عمر دہکتے کوئلوں کی طرح سلگتے گزری تھی۔ شہلا کا ذہن خالی برتن کی طرح بج رہا تھا۔ وہ سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سے عاری ہو چکی تھیں۔ ایک دم خالی الذہن ہق دق بیٹھی رہ گئی تھیں۔ ایک عجیب سا دحشت زدہ سناٹا ان کے وجود میں بول رہا تھا۔

جانے وہ کب تک اس طرح بیٹھی رہتیں۔ کہ مسز باقر پھر اندر آ گئیں۔

"ارے آپ نے کیا تصاویر نہیں دیکھیں...... میں تو سمجھ رہی تھی دیکھ لی ہوں گی۔ کیا دیکھ لیں؟"

شہلا نے ایک دم خود کو سنبھال لیا۔ "نہیں دیکھ رہی ہوں۔" انہوں نے کانپتے ہاتھوں سے البم کھولی۔ وہ ثریا سے متعلق کوئی بات فی الحال نہیں کرنا چاہ رہی تھیں کہ ان کو ابھی اپنی حالت پر قابو نہیں تھا۔ انہوں نے البم کے صفحات پلٹ

کر اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی۔ مگر حالت اتنی غیر تھی کہ وہ پھٹ پڑنا چاہ رہی تھیں۔ معاً وہ ایک مرتبہ پھر چونک پڑیں۔

ثریا بے پناہ تبدیلیوں کے ساتھ باقر کے ساتھ کھڑی تھی۔ شاید کسی تقریب میں خوبصورت ساڑھی میں ملبوس بے ساختہ ہنسی کے ساتھ۔ موتی جیسے دانتوں سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ اتنی طرح دار...... اتنی اسمارٹ۔ ہنسنے کا دلکش انداز...... شہلا کو ایک مرتبہ پھر چکر آ گیا۔

ایک اور تصویر میں وہ کسی خوبصورت سے بچے کے ساتھ برتھ ڈے کیک کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک تصویر میں اس کا خصوصی کلوز اپ محفوظ تھا۔ جو سائیڈ سے لیا تھا۔ اس کی ستواں ناک میں پڑی ہیرے کی لونگ قیامت جگا رہی تھی۔

"پانی منگا دیجیے پلیز......" اب شہلا حد سے گزر گئیں۔

پانی پی کر اس نے گہرا سانس لیا۔ نگاہ تصویر ہی پر تھی۔

"یہ آپ کی غالباً کوئی بہت قریبی رشتے دار ہیں......؟"

مسز باقر نے فوراً جھک کر تصویر دیکھی اور مسکرا کر بولیں۔

"رشتے دار ہی سمجھئے...... ویسے بہت پیاری دوست ہیں میری حالانکہ ہماری عمروں میں بے حد فرق ہے۔ ارے کیا غضب کی چیز بنا دیا ہے انہیں ملک صاحب نے۔"

"ملک......؟ پانی حلق میں رک گیا۔

"جی...... ملک نواز ان کے شوہر کے نام ہے...... ڈاکٹر صاحب کے بے حد قریبی دوستوں میں سے ہیں......"

شہلا کو ایسا محسوس ہوا ان کا دماغ ایک دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ ان کے ہر سوال کا جواب اس ایک جملے میں موجود تھا۔ لیکن ملک نواز نے یہ سب کیوں کیا......؟

اب انہیں اس سوال کا جواب چاہیے تھا۔

"یہیں کراچی میں رہتے ہیں یہ لوگ......؟"

"یوں سمجھے تین جگہ رہتے ہیں۔ ہیوسٹن میں، لاہور میں اور کراچی میں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" شہلا الجھ گئیں۔

"ملازمت ان کی امریکہ میں ہے اس لیے پوری فیملی وہیں رہتی ہے۔ چھٹیاں گزارنے پاکستان آئے ہیں۔ کچھ دن کراچی میں گزارتے ہیں اور کچھ دن لاہور کے قریب ایک گاؤں میں جہاں ان کی آبائی زمینیں ہیں۔ ویسے کراچی میں ان کا اپنا ذاتی گھر ہے...... ان کا بیٹا مجھے بہت پسند ہے...... شہپر...... غضب کا بچہ ہے۔ ماشاء اللہ۔"

"شہپر......!" شہلا کو پھر چونکنا پڑا۔ یہ نام تو ہما نے بھی بتایا تھا (یقیناً وہ لوگ یہی ہیں)

"یہ غالباً ان کی پرانی تصویر ہے۔؟" شہلا نے وہی پرانی تصویر دیکھی جس میں ثریا اور ملک نواز ننھے شہپر کے ہمراہ تھے۔ اور ثریا کی بے شعور دحیران آنکھیں کیمرے کی طرف تھیں۔

"جی...... جی ہاں۔ یہ شہپر کے پیدائش کے وقت کی ہے۔"

اس میں تو خاتون کچھ ایبنارمل سی دکھائی دے رہی ہیں۔" شہلا نے تاک کر نشانہ لگایا اور مسز باقر کی جانب غور سے دیکھا۔

"واللہ۔ کیا غضب کی نظر ہے آپ کی......" مسز باقر تو مارے عقیدت کے دوہری ہو گئیں۔ انہوں نے شہلا

کے پروقار چہرے کو بغور دیکھا اور بولیں۔

''اگر آپ رازداری کا وعدہ کریں تو میں ان کی دلچسپ لیکن حقیقی کہانی سناؤں؟''

''آپ اطمینان رکھیے میں کسی پر ظاہر نہیں کروں گی۔''

مسز باقر نے ڈاکٹر باقر کی زبانی سنی ہر بات بلکہ خاص خاص حصہ شہلا کو بتا دیا۔ شہلا سناٹے میں رہ گئیں۔ ان کی پہلے سے زیادہ بری حالت ہو رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو پرسکون رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔

''آپ مجھے ان کا ایڈریس دیجیے۔ میں ان کو ہما کی شادی میں انوائٹ کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن وہ تو اکثر یہاں نہیں ہوتے۔''

''چلیں دونوں جگہ کا دے دیں۔'' وہ ہما سے بھی مانگ سکتی تھیں لیکن انہوں نے مصلحتاً ایسا کیا ٹھیک ہے۔

ویسے آپا جان۔ جمشید کی والدہ شہپر سے ملی تھیں تو کہہ رہی تھیں۔ اس بچے کے والدین سے ملنے کا بہت حد اشتیاق ہے۔ ایک روز شہپر آیا ہوا تھا ہمارے ہاں۔ نمیر سے دیور کی اور ملک صاحب کی تو دانت کاٹنے کی دوستی ہے۔ اور آپ تو شاید ان سے واقف ہوں۔ آج کل تو وہ اپنے ذاتی پرچے کی ادارت کرتے ہیں۔''

''ناصر صاحب......؟'' شہلا کو فوراً یاد آ گیا۔ انہوں نے ناصر صاحب کے ساتھ اکثر ملک نواز کو دیکھا تھا۔

''جی ہاں۔ بڑا مختصر سا سسرال ہے۔ آپا جان ان دونوں سے بڑی ہیں۔ ماں کی طرح ہیں باقر صاحب اور ناصر کے لیے۔ میرے شوہر اور میرے دیور سیف میڈ ہیں لیکن اس میں آپا جان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ بہت ہمت والی ہیں۔ دیکھیے گا ہما کو بیٹی کی طرح رکھیں گی۔ ایسی ساس بھی خوش نصیبوں کو ملتی ہیں۔ میری گڑیا ان کے بیٹے جعفر سے منسوب تھی۔ لیکن وہ ایک حادثے میں چل بسا۔ آپا جان جمشید سے چاہنے لگیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ وہ ہمیشہ گڑیا کو جعفر کی منسوبہ کی حیثیت سے دیکھتے رہے ہیں۔ وہ ذہنی طور سے خود کو آمادہ نہیں کر پاتے ہم بھی خاموش ہو گئے۔ بات ٹھیک بھی تھی۔''

مسز باقر بدستور باتیں کیے جا رہی تھیں۔

شہلا کا ذہن اس قدر ماؤف ہو چکا تھا کہ وہ مسز باقر سے ٹھیک طرح باتیں کر سکیں اور نہ ٹھیک طرح کھانا کھا سکیں۔ لہٰذا جلد ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

''تم کون ہو......؟''

''جی میں ملک صاحب کا ملازم ہوں۔''

''کیا وہ ہیوسٹن میں ہیں......؟''

جی ہاں لیکن بیگم صاحبہ گاؤں میں ہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ جی ملک صاحب کی والدہ بیمار ہیں ناں!''

''ملک صاحب کب تک آئیں گے۔ کچھ بتا سکتے ہو......؟''

''پتا نہیں جی...... ملکانی کی حالت بہت خراب ہے۔ ہو سکتا ہے جلد آ جائیں۔

ویسے جی آپ کا نام کیا ہے؟'' ملازم کو آخر خیال آ ہی گیا۔

''میرا نام صوفیہ ہے۔ میں پھر فون کروں گی۔'' شہلا نے فون رکھ دیا۔

وہ تقریباً ایک ماہ کراچی میں رہیں۔ بہت سے معاملات طے کیے۔ لیکن وہ ایک ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا بیٹھیں۔

سب نے ان کی غیر معمولی کیفیت کو محسوس کیا تھا۔ بھابی نے چپکے سے کہا تھا۔

''ملاپ کے بعد دن نہیں کٹ رہے......؟''

وہ تلخی سے ہنس پڑیں۔

''ملاپ۔ ہونہہ......'' لیکن انہیں پھر سے بھرم رکھنے کا سلسلہ شروع کرنا تھا۔ ان کا جی چاہتا تھا وہ سیدھی ان کے ہاں پہنچ جائیں اور ثریا کو لے آئیں۔ سب سے چھپا کر اور جو وہ آ کر پوچھے تو...... نفرت سے تھوک کر کہہ دیں۔

''چور...... اپنی چیز لائے ہیں۔ تجھ سے کیا چھیننا ہے......؟

خبطی تو نے تو ہمیں تباہ کر دیا۔

''بتا...... تو نے یہ ظلم ہم پر کس حساب کیا......؟''

ایک رات انہوں نے مضطرب ہو کر پھر نمبر ڈائل کر دیے۔

''کون......؟''

''صوفیہ بول رہی ہوں۔''

''اچھا جی۔ السلام علیکم۔''

''صاحب کب آ رہے ہیں......؟''

''وہ تو آ چکے جی......؟''

''ہیں......؟ کب......؟'' شہلا کا پورا وجود جھکولوں کی زد میں آ گیا۔

''ایک ہفتہ ہو گیا...... ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا ہے جی...... اب تو چہلم کے بعد ہی جائیں گے...... وہ......!''

''اوہ...... اناللہ وانا الیہ راجعون۔'' شہلا نے بے ساختہ کہا۔

''کتنے دن ہو گئے ان کے انتقال کو......؟''

''دس دن ہو گئے جی آج۔''

گویا اس کی واپسی میں پورا ایک ماہ باقی تھا۔

انہوں نے کچھ سکون سا محسوس کیا تھا۔

جاتے ہوئے وہ گھر والوں کو کہہ گئیں کہ ایک ماہ بعد دوبارہ آئیں گی ضروری کام کے سلسلے میں۔ وہ حنا کو ساتھ لے کر نہیں گئی تھیں۔

☆☆☆

وہ لان میں موٹا سا پائپ تھامے اپنے شوق کی آبیاری کر رہا تھا۔ معاً اسے محسوس ہوا باہر گیٹ پر کوئی گاڑی آ کر رکی ہو۔ ابھی وہ ادھر متوجہ ہی تھا کہ گیٹ وا ہوا اور اس کی سوچ کا دروازہ بند۔ فیروزی سادہ سی ساڑھی میں ملبوس یقیناً وہی تھی۔

اگر وہ کسی اور حالت میں اس کے گھر آتی تو وہ خوشی سے جھوم کر کہتا۔

اے میرے گھر کی روشنیوں اسے سلامی دو۔

اے میرے گھر کی ہوا......اس کے پاؤں چوم

اے قادر کن میرے گھر کی فصیلیں اونچی کر کے قلعہ بنادے کہ وہ پھر باہر نہ جا سکے۔

بارے خدا...... یہ میرے گھر کون آیا......؟

لیکن......اب اس کا قلب نیچے...... کہیں گہرائی میں جا رہا تھا۔ وہ مضبوط جی دار مرد تھا۔

مگر اس وقت کے لیے نہیں...... پائپ سے پانی بہہ کر اس کے کپڑے بھگو رہا تھا۔

اس کی اس کیفیت نے شہلا کے ہر یقین کو مضبوط ترین کر دیا۔ وہ دھیمی چال سے اس کے نزدیک آئیں۔

''السلام علیکم ملک صاحب!''

وہ چونک پڑا......''وعلیکم السلام۔'' اس کی آواز کہیں پاتال سے ابھری۔

''آپ نے پہچانا مجھے ملک صاحب؟'' ان کے لہجے میں کاٹ تھی کہ ملک نے ہی محسوس کیا تھا۔

''جی......ہاں......'' (ساری دنیا میں صرف تمہیں ہی پہچانا ہے شہلا حسن) ''آپ مسز حسن ہیں۔''

''آپ مجھے بیٹھنے کو نہیں کہیں گے......؟''

ملک نواز خجل سا ہو گیا۔

''اوہ۔ آیئے۔'' ''آیئے۔'' وہ انہیں لے کر ڈرائنگ روم میں چلا آیا اور صوفے کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا اور غیر ارادی طور پر ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ بند کر دیا۔ شہلا نے یہ بات بھی نوٹ کی۔

''خیریت سے ہیں آپ ملک صاحب؟''

''جی الحمدللہ۔'' اس نے بغور شہلا کی سمت دیکھا...... جانے کیا دیکھنا چاہ رہا تھا۔

''بچے کہاں ہیں آپ کے......؟''

''وہ تو امریکہ میں ہیں۔'' وہ اس کی آمد پر سخت حیران پریشان تھا۔ کچھ سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

''ملک صاحب۔'' شہلا کی ٹھہری ہوئی آواز ابھری۔ ''ہماری ثریا کہاں ہے......؟''

ملک نواز کی گردن پر یہ جملہ بھاری طوق بن کر لٹک گیا۔ وہ سر نہ اٹھا سکا۔

سب کو بہلا سکتا تھا ''اسے'' نہیں۔

''آپ نے کس طرح جانا کہ......''

''ملک صاحب! کیا ہم یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آپ نے ہمارے ساتھ یہ بھیانک کھیل کیوں کھیلا؟''

سر کا جھکنا بھی اسی کے سامنے تھا۔ حالانکہ ثریا کو پہچان کر کون کون نہیں آیا۔ جس کی شرم تھی حقیقت اسی کے سامنے عریاں ہے۔

''مسز حسن......!'' اس کی آواز بے حد شکست خوردہ تھی۔

''آپ یہ تو پوچھیے کہ وہ مجھے کس طرح ملی۔ بخدا اسے میں آپ کے گھر سے اٹھا کر تو نہیں لایا۔''

''ہاں مجھے یہ تو یقین ہے کہ آپ کے پاس اس قسم کی حرکت کا کوئی جواز بھی نہیں تھا۔'' وہ بولیں۔

''مسز حسن...... حقیقت ایک بار ماں کے سامنے بیان کی تھی۔ ماں کے پائیدار جذبوں نے مجھے بے حد جرات دی تھی۔ ماں کی طرح اب مجھے کسی کے پائیدار جذبوں کا یقین نہیں لہٰذا میں خود میں اخلاقی جرات نہیں پاتا۔ میں ہر قسم کی

سزا کے لیے تیار ہوں۔''

شہلا نے حیرت سے اس مضبوط و عظیم الشان سے مرد کو دیکھا۔ وہ شکست و اعتراف کی دلدل میں دھنسا ہوا قابل رحم نظر آیا تھا۔

''لیکن حقیقت تو بہر حال آپ کو بتانا ہے ملک صاحب......آپ نے مجھے تباہ و برباد کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

ملک نے بے تحاشا چونک کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ تو اس کی مضبوطی سے خوف کھائے بیٹھا تھا اور اس کی آواز میں تو اس کی اپنی شکستگی کراہ رہی تھی۔

اور روح فرسا حقیقت کہ اس نے اسے تباہ و برباد کر دیا۔ کس طرح......؟

''مسز حسن......آپ کے شوہر اور دیور مجھے گولی مار دینا چاہیں گے......کیا آپ اس بھیانک المیے سے بچنے کے لیے یہ بات نہیں ختم کر سکتیں۔ حالانکہ میں آپ سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اتنے یقین سے آپ یہاں کس طرح پہنچیں۔'' اب اس کی آواز میں کچھ سکون تھا......!

''نہیں۔ کم از کم مجھے تو حقیقت کا علم ہونا چاہیے۔ پھر یہ فیصلہ بھی میں ہی کروں گی۔ کہ المیہ ہونا چاہیے یا نہیں۔ اور سن لیجیے......میری رائے میں آپ ایک اخلاق باختہ شخص ہیں۔ اس کا اظہار آپ کی سالوں پہلے لکھی احمقانہ سی تحریر ہے جس نے میرے نصیب کے ہر چراغ کو بجھا دیا تھا۔ میں حقیقت ضرور سنوں گی۔ ہر صورت میں۔''

شہلا کو اپنی محرومیاں یاد آئیں تو اس کا وجود تھرا اٹھا۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

''مسز حسن......حقیقت کی ہر صورت پر اصرار نہ کیجیے۔''

''مسٹر نواز......میرا جی چاہ رہا ہے آپ کا خون کر دوں۔'' وہ پھٹ پڑیں۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے۔

''مسز حسن......انجام کار اگر موت حادثاتی ہے تو پھر سب حقیقتیں سن لیجیے۔ وہ خط جسے آپ نے میرے احمقانہ پن سے تعبیر کیا ہے......وہ میری زندگی کا سب سے معتبر سچ تھا۔ ہے نہیں۔ وہ میری وحشیانہ جرات تھی جس میں برسوں سے نادم ہو رہا ہوں۔ واقعی بعض سچ نقصان دیتے ہیں۔

اور رہی ثریا کی بات......اس کی اس بد قسمتی کا سبب آپ ہیں۔ وہ میری بیوی ہے تو اس کا سبب آپ ہیں وہ میری توجہ کا مرکز ہے تو آپ کی وجہ سے۔ نہ میں با ضمیر تھا۔ نہ اس قدر حساس۔ نہ اتنا فیاض......اگر شرم تھی تو آپ کی۔ اگر خیال تھا تو آپ کا......ہر چند کہ میری گفتگو آپ کے مزاج پر گراں گزر رہی ہوگی۔ لیکن یہ سچ ہے۔ جس کے لیے آپ کا شدید اصرار ہے۔''

شہلا کے آنسو راستے ہی میں رک گئے تھے۔

''میں نے ثریا کو سب دینے کی کوشش کی ہے جس کی دعائیں اس کی ماں نے مانگی ہوں گی۔

مسز حسن پردہ رہنے دیجیے......اب وہ میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس کا ذہن شاید جھٹکا نہ برداشت کر سکے۔'' اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

شہلا نے سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ بھی جو اس نے کہہ دیا تھا۔ وہ بھی جو وہ کہہ نہیں سکا تھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھیں۔

معاً خورشید کی بیوی ڈرائنگ روم میں دوڑی چلی آئی۔

''صاحب......وہ بیگم صاحب باہر گری ہوئی ہیں۔''

وہ گھبرا کر تیزی سے باہر نکلا تھا۔ ڈرائنگ روم کے بیرونی دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ثریا گری ہوئی تھی۔

ملک نے جھک کر ثریا کو اٹھا لیا۔ شہلا ایک عجیب سی کیفیت میں ثریا کو دیکھ رہی تھیں...... اتنی اچھی سی ثریا ان کی اپنی تھی۔

سیاہ پلین ساڑھی میں سے اس کا سفید جسم روشنی دے رہا تھا۔ ملک صاحب نے ثریا بھابھی پر لاکھوں روپیہ لٹا دیا ہے۔ اتنا باضمیر انسان میری نظر سے آج تک نہیں گزرا...... مسز باقر کے الفاظ شہلا کے ذہن کے بازگشت کی طرح ٹکرائے۔

''آپ کی وجہ سے...... مسز حسن آپ کی وجہ سے۔'' ملک نواز پھر ان کے کان میں بولا تھا۔

ملک نواز نے ثریا کو بیڈروم کی طرف لے جانا چاہا...... شہلا نے خالی پورچ کی طرف دیکھا۔ اور ملک نواز سے گویا ہوئیں۔

ملک صاحب باہر میری گاڑی ہے۔'' انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ملک نواز ان کا مجرم نہ ہو بلکہ وہ اس کی مجرم ہوں۔ ثریا نے یقیناً ان کی گفتگو سن لی تھی۔ اندرونی دروازہ بند دیکھ کر وہ غالباً بیرونی دروازے سے اندر آ رہی تھی۔

ملک نواز نے قدم گیٹ سے باہر بڑھا دیے۔ شہلا نے بڑھ کر پچھلا درواہ کھولا۔ ملک نے ثریا کو لٹا دیا۔ اسی وقت شہریار بلکتا ہوا آیا۔ اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر وہ پریشان تھا۔ شہلا نے اسے گود میں بھر لیا۔ مگر وہ مچلنے لگا۔

''شیری......!'' ملک نے گویا ڈانٹا تھا۔ وہ سہم کر چپ ہو گیا۔

شہلا نے پرس سے چابی نکال کر ملک نواز کی طرف بڑھائی۔ وہ تیزی سے اندر بیٹھ گیا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ شہلا دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئیں۔ شیری ان کی گود میں تھا۔

''گیٹ بند کر لو......'' اس نے خورشید کی بیوی سے کہا۔ خورشید غالباً باہر گیا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد...... وہ ہاسپٹل کے چمکتے برآمد میں بے چین ٹہل رہے تھے۔ معاً ملک نواز ٹھہر گیا۔ اس نے شہلا کی طرف دیکھا...... اس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا۔ شہلا ساری جان سے کانپ گئیں۔

''مسز حسن...... میں نے آپ کو تباہ و برباد نہیں کیا۔ درحقیقت میری تباہ کاری و بربادی کا سلسلہ آپ سے شروع ہے۔ ثریا آپ کی ہرگز نہیں ہے...... آپ کے ہاں ثریا نام کی کوئی بھیڑ یا بکری ضرور تھی...... یہ نہیں تھی...... یہ اس شہر کے ممتاز شخص کی معزز بیوی ہے...... سنا آپ نے......؟''

''ہاں...... سن لیا...... اب آپ خاموش ہو جائیں پلیز'' وہ تلخی سے بولیں۔

''میں گھر فون کر کے ابھی آتی ہوں۔'' وہ شیری کا ہاتھ تھام کر دائیں جانب مڑ گئیں۔ ملک نے اپنے چکراتے سر کو تھام کر پہلی مرتبہ ثریا کے لیے سچائی سے دعا کی تھی۔

اس کی نظروں کے سامنے اس کا پیارا بیٹا شہپر اور معصوم سی بیٹی آ گئے جو اس سے جواب طلب کر رہے تھے۔

بمشکل ثریا ہوش میں آئی تھی...... ملک کو دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا تھا۔ اس نے اگرچہ نفرت کا اظہار کیا تھا لیکن ملک نے سکون کا سانس بھرا تھا کہ وہ ذہنی طور پر نارمل تھی۔

کتنے یقین کے ساتھ شہلا نے...... ملک نواز کو نارمل کیا تھا۔ شہلا نے گھر فون کیا تھا۔ حسن اور مانی نائٹ کوچ سے اپنے باپ کو لے کر پہنچے تھے۔

یہ سب ملک کے سسرالی تھے...... اور سسرالیوں کی طرح اس کے گھر پر چھا گئے تھے! وہ کب سے اندر کمرے میں بند تھا...... شہلا نے وعدہ کیا تھا وہ ہر بات کا نتیجہ اس کے حق میں کروا کر رہے گی۔

حسن اور شہلا...... دو اجنبی دو متوازی لکیریں...... روبرو تھے۔ اس نے حسن کو مانی کو الو تو بنا دیا تھا۔ لیکن اس

طرح بتایا تھا کہ ڈاکٹر باقر جیسے ہمدرد انسان نے اس بے یار و مددگار لڑکی کا علاج کیا تھا اور ملک سے دوست ہونے کے ناتے شادی کے لیے اصرار کیا تھا...... اور ثریا ملک کو نہیں ڈاکٹر باقر کو ملی تھی۔ مزید یہ کہ ملک نواز کو علم نہیں تھا کہ ثریا کون ہے۔

اور حسن...... حیران پریشان سوچ رہے تھے...... وہ مجنوں...... وہ خبطی...... اس قدر عالی ظرف ہے؟ وہ کیسے جھٹلا دیں کہ...... ان کی دیوانی بہن...... ایک ہوش مند...... اور باوقار خاتون کی حیثیت سے ان کے سامنے ہے۔ کیا کوئی شخص کسی دوست کے کہنے پر اس قدر بڑا قدم اٹھا سکتا ہے......؟ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

وہ رقیب روسیاہ جس کو شوٹ کرنے کے لیے وہ تڑپا کرتے تھے کتنا قریبی عزیز بنا ان کا سر جھکائے ہوئے تھا۔

لیکن مانی کسی اور سوچ میں گم تھا...... اسے اچھی طرح یاد تھا ہیوسٹن کے شاپنگ سینٹر میں وہ ثریا باجی سے ملا تھا...... اور یہ شخص وبے پاؤں آگے بڑھ گیا تھا۔

اگر یہ اتنا عالی ظرف اور باضمیر ہے تو مجرموں کی طرح اس سے کیوں چھپا تھا۔

ثریا کی عجیب گومگو کیفیت تھی۔ ابو اسے سینے سے لگا کر کس قدر روئے تھے اور وہ باوجود کوشش کے رو نہ سکی تھی۔

اسے ملک کے وجود سے کراہیت آ رہی تھی۔

مانی سوچ رہا تھا۔ جب اس نے بے ساختہ ثریا باجی'' کہا تھا تو کیا ثریا نے ملک کو نہیں بتایا ہوگا...... ملک کو تو اس کے رشتے داروں کی تلاش ہونا چاہیے تھی۔ اسے تو چونک کر مانی سے ملنے آنا چاہیے تھا۔ اسے پہلے مرتبہ اپنی بھابی پر شبہ ہوا کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔

جب رات گئے سب لوگ آرام کرنے گئے...... ملک نواز ثریا کے قریب خاموش بیٹھا تھا۔

ثریا کی ایک تکرار تھی کہ اس سے اس قدر جھوٹ بولے گئے......؟ اس نے اس کے رشتے دار تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی......؟

جب وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر اس کے قابو سے باہر ہونے لگی تو ملک نے سوچا...... کہ وہ اسے حقیقت بتا دے۔ لیکن اس طرح کہ یہ نہیں بتائے گا کہ وہ اس کی بھابی کا الہ و شیدا رہا ہے۔ بس وہ یہ بتا دے گا کہ وہ اسے ایک شاعرہ کی حیثیت سے جانتا تھا اور دوسرے لوگوں کی طرح۔

دوسری طرف مانی نے اپنی بھابی کا گھیراؤ کر لیا تھا اور حقیقت معلوم کرنے کے لیے انہیں اپنی جان کی قسم دے ڈالی تھی

میں اس معاشرے کا وہ انسان ہوں جو خود غرض و خود پسند ہوتا ہے۔

میں نے...... درحقیقت برسوں صرف اپنے لیے سوچا۔

میں ایک نفس پرست انسان رہا۔

مجھے اعتراف ہے۔ کہ جو خود غرض ہوتا ہے وہ انسان نہیں ہوتا۔

میں نے درندے کی طرح اس شہر کے جنگل میں وقت کاٹا۔

درندگی اور بربریت کا کبھی اتنا خوبصورت انجام نہیں ہوتا۔ لیکن شاید پہلی مرتبہ ہوا ہے۔

ثریا میری بیوی ہے۔ اس سے مجھے تین خوبصورت بچے بھی ملے ہیں!

شہپر...... شہ پارہ۔ شہریار۔ میں پہلی شبہ کا نام جان بوجھ کر نہیں لے رہا۔ میری شہ رگ کو چھوتے رہے ہیں اور شاید چھوتے رہیں۔

میں عالی ظرف نہیں...... باضمیر نہیں۔ نیک دل نہیں۔

چوری کی خوبصورت پلیٹ میں سے جیسے لڈو کھا رہا ہوں۔

میں کون ہوں......؟

میں سچ مچ سماجی جانور ہوں۔

میں گنہگار ہوں...... مجھے...... خاکسار...... نہیں۔نہیں...... گنہگار کہتے ہیں (ملائکہ)

مین اسی معاشرے مین رہنے والا ایک آمر، ہوں۔

میرا پسندیدہ مشغلہ خودستائی ہے۔

میری ہر سوچ اس بات کے گرد گھومتی ہے کہ انسان کو کس طرح اپنے کنٹرول میں رکھا جائے لوگوں سے کس طرح خود کو برتر منوایا جائے۔

مجھے ناز ہے کہ میں صحیح ہوں......اور سب غلط

میرا فلسفہ ہے کہ مرد ہر طرح سے بااختیار ہے۔عورت کو اس کے سامنے سر نہیں اٹھانا چاہیے۔

میں شک کروں تو مان لیا جائے کہ درست کیا ہے۔

میں الزام لگاؤں تو تسلیم کیا جائے کہ ٹھیک لگایا ہے۔

میں کہوں کہ رات ہے تو کہو رات ہے۔

میں کہوں کہ دن ہے تو کہو دن ہے۔

میں کون ہوں؟

میں ایک انا پرست ہوں۔

مجھے کم از کم دیوتا ضرور سمجھا جائے (صرف شوہر نہیں)

میں معزز ہوں...... مشہور ہوں۔

لیکن عورت ہوں......

میں شوہر کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔بچوں پر نثار ہو سکتی ہوں۔کنواں کھود سکتی ہوں لکڑیاں چن سکتی ہوں۔

لیکن کردار پر حملہ برداشت نہیں کر سکتی۔

تم مجھے اپنے شوہر نہیں لگتے دور دیس سے آئے مہمان لگتے ہو۔محبت کا دریا میرے دل مین رواں ہے۔

لیکن چونکہ میں انسان بھی ہوں لہٰذا اپنے تن کو صحرا کی خاک میں بدل دینے پر کبھی معاف نہیں کر سکتی۔

میری روح پر تاک کر نشانہ لگانے والے، تم دوسرے جنم کے بعد بھی وہ مقام حاصل نہیں کر سکتے...... جو پا سکتے تھے۔

چونکہ تم میرے بچوں کے باپ ہو اور میں تمہارے بچوں کی ماں لہٰذا انسانوں کی طرح والدین کی طرح اپنے بچوں کے لیے سمجھوتے کر لیتے ہیں......اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو ڈھور ڈنگر کہلائیں گے۔چونکہ تم جھکے ہو اس لیے میں بھی اپنا ظرف بڑا کر رہی ہوں۔اگر چہ وہ مہک میرے پاس نہیں جو سرخ جوڑے میں بس کر میرے ساتھ آئی تھی۔

میں کون ہوں؟

میں ایک مہذب عورت ہوں...... پاک دامن عورت ہوں......

حساس اور لاچار عورت کہ ماں بھی ہوں۔

مجھ میں بہت کچھ فراموش کرنے کا ظرف ہے (لیکن شک کی گالی

ہما حنا کی رخصتی کے بعد بہت بڑے بوجھ سے سر کے تھے۔

بہت دنوں بعد پھر گھر میں لوگ اپنے اپنے کاموں میں مگن تھے اور مطمئن تھے۔ثریا اور عالیہ بھیا بھی دارالسلام میں موجود تھیں......ملک نواز کراچی جا چکا تھا......ثریا جیسے خواب میں پھرتی تھی......اسے سب کچھ بے پناہ اچھا لگ رہا تھا۔

گھر بھر میں مانی اور شہلا ہی تمام تر حقیقتوں سے واقف تھے......اس کے باوجود مانی نے بڑے ظرف، ضبط و تحمل کا مظاہرہ کر کے ملک نواز کی عزت افزائی کی تھی۔

ابھی بھی کئی آوازیں شہلا کا پیچھا کرتی تھیں۔

"بھابی......شہلا......بیٹی......ثریا تمہیں کیوں کر ملی......؟"

جواب میں شہلا صرف مسکرا دیتی تھیں۔

جمشید کی والدہ نے بھی شہلا سے معذرت کی تھی کہ انہوں نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چاہا کہ وہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھائیں......اور اسے پھر سے سہاگن بنا دیں......حسن نے شہلا سے پوچھا تھا......کیا وہ خوش ہے......؟

شہلا نے جواب دیا تھا......"ہاں......صرف اس لیے کہ میرے بچے خوش ہیں......"

اس سچ نے حسن کو آزردہ کر دیا تھا......وہ پھر بھی نہیں جھکی تھی......اور دور تھی......

اے خدا!

میری ہری بھری نسل کو......

"انا" کا ادراک دینا......

جو کسی "آہ" کی ریت سے نہ بنا ہو......

وہ شیشہ پندار دینا......

جس طرح زمین پر گرنے والا خون کا قطرہ......

شہید کا قطرہ نہیں ہوتا......

اسطرح "ہر" انا" "انا" نہیں ہوتی......

"جس طرح چھانے والا ہر" ابتر ابر نیساں نہیں ہوتا......

جس طرح ہر سیپ میں ہوتے نہیں موتی......

اس طرح ہر "آنا" "آنا" نہیں ہوتی......

اے خدا......

میری ہری بھری نسل کو......

"انا" کا ادراک دینا......

جو کسی آہ کی ریت سے نہ بنا ہو......

وہ شیشہ پندار دینا......

جس نے آج کے تازہ اخبار میں شائع شدہ شہلا حسن کی تازہ نظم پڑھی......

"شاید میرا المیہ یہ ہے کہ مجھے مجھ سے زیادہ جاننے والی بیوی ملی......

انہوں نے دوبارہ نظم پڑھنا شروع کر دی تھی......

''جی مس آمنہ...... بچوں کو ایک ہفتے کی چھٹیوں پر بھجوادیں۔''

''نہ میں ابھی آ سکتا ہوں اور نہ ثریا...... وہ اپنے میکے گئی ہوئی ہیں۔''

''ہا...... ہاہا...... اچانک مل گیا ہے کیا کریں......؟

''بچوں کو جلد بھجوادیں...... ثریا کے میکے والوں کا اصرار ہے۔''

''ملاقات پر سب پتا چل جائے گا...... فکر کی کوئی بات نہیں۔''

وہ دوبارہ ناشتے کی میز پر آ گیا...... آج صبح ہی صبح مس آمنہ کا فون آ گیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھالیا جو کراچی وکوئٹہ سے بیک وقت شائع ہوتا تھا۔

شہلا حسن کی نظم ''آنا'' چھپی تھی۔

اے خدا......

میری ہری بھری نسل کو......

''آنا'' کا ور [illegible]......